WWW.PAKSOCIETY.COM
چاند گگن اور چاندنی
اقرا صغیر احمد
WWW.PAKSOCIETY.COM

چاند گگن اور چاندنی

اقراء صغیر احمد

علم و عرفان پبلشرز

40-الحمد مارکیٹ، اُردو بازار، لاہور

فون 042-7352332-7232336

نام کتاب	....	چاند گگن اور چاندنی
مصنفہ	....	اقراء صغیر احمد
ناشر	....	گل فراز احمد
		علم و عرفان پبلشرز، لاہور
مطبع	....	زاہدہ نوید پرنٹرز، لاہور
کمپوزنگ	....	ساجد، انیس
سن اشاعت	....	اگست 2011ء
قیمت	....	=/500 روپے

......ملنے کے پتے......

ویلکم بک پورٹ

اُردو بازار، کراچی

خزینہ علم و ادب

الکریم مارکیٹ اُردو بازار، لاہور

اشرف بک ایجنسی

اقبال روڈ کمیٹی چوک، راولپنڈی

کتاب گھر

اقبال روڈ کمیٹی چوک، راولپنڈی

ادارہ علم و عرفان پبلشرز کا مقصد ایسی کتب کی اشاعت کرنا ہے جو تحقیق کے لحاظ سے اعلیٰ معیار کی ہوں۔ ادارے کے تحت جو کتب شائع ہوں ان کا مقصد کسی کی دل آزاری یا کسی کو نقصان پہنچانا نہیں بلکہ اشاعتی دنیا میں ایک نئی جدت پیدا کرنا ہے۔ جب کوئی مصنف کتاب لکھتا ہے تو اس میں اس کی اپنی تحقیق اور اپنے خیالات شامل ہوتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ آپ اور ہمارا ادارہ مصنف کے خیالات اور تحقیق سے متفق ہوں۔ اللہ کے فضل و کرم، انسانی طاقت اور بساط کے مطابق کمپوزنگ، طباعت، تصحیح اور جلد سازی میں پوری احتیاط کی گئی ہے۔ بشری تقاضے سے اگر کوئی غلطی یا صفحات درست نہ ہوں تو از راہ کرم مطلع فرما دیں۔ انشاء اللہ اگلے ایڈیشن میں ازالہ کیا جائیگا۔ (ناشر)

انتساب!

ہر اُس ذی شعور

قاری کے نام

جس کا شعور ہر اچھی تحریر سے

بلند اخلاقی و تہذیبی اقدار کو

اپنے اندر جذب کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

معزز قارئین!

السلام علیکم:

ہمارے آس پاس کتنے ہی ایسے واقعات آئے روز رونپذیر ہوتے رہتے ہیں کہ اگر ان کو دیکھنے والی آنکھ، گہری اور لطیف، نظر کی حامل ہو، ان کو سوچنے والا ذہن رسا ہو اور ان کو محسوس کرنے والا دل گداز ہو۔ پھر خالق لوح و قلم نے ہاتھوں میں قلم و قرطاس اور طبیعت میں ان کو استعمال کرنے کا فن و سلیقہ بھی عطا کیا ہو تو ایسی کہانیوں کا وجود میں آ جانا کوئی عجیب اور بڑی بات نہیں ہے۔ جو ہمارے ذہن و دل کو متاثر کرنے کا قرینہ رکھتی ہوں۔ ''چاند گگن اور چاندنی'' ایسی ہی ایک کہانی ہے۔

ہمارے معاشرے کے حسن کو جہاں اور بہت سی بدصورتیاں گہنا رہی ہیں وہیں ''تعلیم نسواں'' کے ضمن میں ہماری اجتماعی غفلت اور کوتاہ نظری ہماری معاشرتی اقدار کو گھن کی طرح کھا رہی ہے اور ہمارے معاشرے کو اندر سے کھوکھلا بنا رہی ہے مستزاد اس پر ہمارے قبائلی علاقوں میں غیرت کے نام پر قبیلوں کی باہمی عداوت اور آویزش ہے کہ جس نے ہمارے پس ماندہ ذہان کے حامل بعض افراد کو اسلام اور انسانیت سے بھی نا آشنا کر رکھا ہے۔ محبت اور جرأت ایسے فضائل ہیں جو ایسی ہی معاشرتی برائیوں اور بدصورتیوں کو دور کرنے میں معاون و مددگار ہو سکتے ہیں۔'' چاند گگن اور چاندنی'' ایسے ہی حقائق کا آئینہ ہے۔

یہ ناول ماہنامہ آنچل میں قسط وار شائع ہو کر اپنے قارئین سے داد و تحسین پا چکا ہے۔ کتابی صورت میں اس کے نئے ایڈیشن (بڑے سائز) کا بیڑہ علم و عرفان پبلشرز کے جناب گل فراز احمد نے اٹھایا ہے۔ وہ اس سے قبل میرا ایک اور ناول ''تیری الفت میں صنم'' بھی کتابی صورت میں آپ کے ذوق کی نذر کر چکے ہیں جس کی پذیرائی و پسندیدگی کے لیے راقمۃ الحروف اپنے قارئین کی از حد مشکور و ممنون ہے۔

محترم جناب گل فراز احمد اور محترمہ فرحت آراء کے لیے از بس تشکر و ممنونیت کے جذبات کے ساتھ قارئین زیر نظر ناول کے لیے آپ کی آراء کی منتظر۔

اقراء صغیر احمد

''ورشا! پلیز اپنا موڈ درست کرو، اس کی تمام پارٹی یہاں موجود ہے۔ تم نے اگر ذرا بھی معمولی سی جذباتیت کا اظہار کیا تو اسکینڈل بن جائے گا۔ اس کی یہی کوشش پچھلے سال سے رہی ہے کہ کسی طرح تمہارا نام اس کے ساتھ آئے۔ تم برداشت سے کام لو۔'' سنبل نے اس کے خوب صورت چہرے پر پھیلتے ہوئے طیش اور جنون آمیز غصے کو محسوس کر کے کہا۔ اس کی نیلی آنکھوں سے نکلتے شعلے جارحانہ تھے۔

''تم ہمیشہ مجھے سمجھانے بیٹھ جاتی ہو، جانتی ہو اچھی طرح، ہمیشہ زیادتی اس خبیث شخص کی طرف سے ہوتی ہے۔ ہر بار جان بوجھ کر میری راہ میں حائل ہوتا ہے۔ آج مجھے اس کا دماغ درست کرنے دو پھر کبھی بھول کر بھی میری راہ میں آنے کی کوشش نہیں کرے گا۔'' ورشا نے لائبریری روم کے باہر کوری ڈور سے ملحقہ سیڑھیوں پر صارم آفریدی کو اپنی پارٹی سمیت براجمان دیکھ کر دانت پیستے ہوئے کہا۔

جب کہ وہ اردگرد سے گویا بے خبر و بے نیاز ہو، پہلی سیڑھی پر آنکھیں بند کیے گمبھیر آواز میں گا رہا تھا۔ اس کے ساتھی بالترتیب سیڑھیوں پر بیٹھے بہت محویت و خاموشی سے سن رہے تھے۔ ان کا انداز ایسا ہی تھا جیسے وہ اس کی آواز کی سحر انگیزی کے باعث مجسموں میں تبدیل ہو گئے ہوں۔ اس نے معمولی سی آنکھ کھول کر دیکھا تھا ورشا کی جانب، ورشا بری طرح سلگ اٹھی۔

''پلیز راستے سے تو ہٹ جائیے، راستہ دیں پلیز!'' فارحہ کے بعد سفیرہ نے درخواست کی۔

دل کا دروازہ کھولے کب سے کھڑا ہوں
آؤ میرے مہمان آؤ
گھر میں اندھیرا کیے کب سے پڑا ہوں
چاند ستارے لیے آؤ
دل کا دروازہ کھولے کھڑا ہوں......

گیت مکمل ہوا اور وہاں ہر جانب سے تالیاں اور سیٹیاں...... واہ...... واہ کے نعرے بلند ہونے لگے۔ کیوں کہ وہاں اور بھی طلباء آ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ صارم خان خالصتاً لکھنوی انداز میں جھک جھک کر ماتھے پر ہاتھ رکھ کر شکریہ ادا کر رہا تھا۔ اس کے چہرے پر ازلی شوخی و شرارت لشکارے مار رہی تھی۔ وہ راستہ دانستہ طور پر نہیں چھوڑ رہا تھا۔ وہ پانچوں اس کی شرارت سے انجوائے، ورشا کی وجہ سے نہ ہو پا رہی تھیں جس کی آنکھوں سے شعلے سے نکلنے لگے تھے، چہرے کا رنگ مزید سرخ ہو گیا تھا۔

''کیوں چڑتی ہو اتنا؟ وہ شخص تمہیں ستانے کے لیے ایسی حرکتیں کرتا ہے۔'' سفیرہ ہنستی ہوئی اس سے گویا ہوئی۔ کافی دیر بعد انہیں نیچے اترنے کا موقع ملا تھا۔ صارم خان کی مسکراتی، بے باک، شوخ نگاہیں ورشا نے دور تک محسوس کی تھیں۔ جواباً وہ اسے گالیاں بکتی ہوئی ان کے ساتھ آگے بڑھ رہی تھی۔

''چھوڑو یار! انجوائے کیا کرو۔ یہ دن انجوائے منٹ کے ہیں پھر بھلا کہاں پلٹ کر وقت آتا ہے۔''

''میں لطف اندوز ہوں گی؟ وہ بھی اس ڈفر، فراڈ، ''کمینے'' گھٹیا انسان کی بے ہودہ حرکتوں سے......؟ احمق!'' ورشا کا بی پی بدستور بلندی کی طرف محوِ پرواز تھا۔

''چھوڑو ڈیئر! لوکوک پیو، اب تھوڑا عرصہ ہی تو رہ گیا ہے چند ماہ بعد سسٹرز ہوں گے پھر چھٹی۔ مزید آگے تعلیم کا سلسلہ دراز کرنے کی اجازت ہم میں سے کسی کو بھی نہیں ہے۔ پھر شجرِ حیات کی دھوپ چھاؤں میں یہاں پر گزرا ہوا ایک ایک لمحہ کسی ماورائی خواب کی طرح سے لگے گا۔ دلکش، حسین سی، بے شمار خوب صورت چمکتے رنگوں والی تتلی کی طرح'' فارحہ نے کیفے میں پہنچ کر ٹھنڈی یخ کوک اسے پکڑاتے ہوئے ناصحانہ انداز میں سمجھایا۔

''مائنڈ یو ورشا! صارم خان کی شرارتوں وشوخیوں کو ہوا تمہارے از حد اجتناب اور اپنے خول میں بند رہنے والے رویے نے دی ہے۔ دو رویے شخصیت کو بہت زیادہ نمایاں کر دیتے ہیں۔ پہلا وہ جس میں بندہ پہاڑ کی چوٹی پر کھڑا ہو کر نگاہوں کا مرکز بن جاتا ہے، دوسرا وہ جس میں ہجوم بیکراں میں شامل ہو کر خود کو سب کی نگاہوں سے پوشیدہ رکھنا چاہتا ہے اور از خود دوسروں کو شدت سے اپنی جانب متوجہ کر بیٹھتا ہے۔ تمہارا شمار دوسری کیٹیگری میں ہوتا ہے۔ تم جامعہ میں آئیں اور خود کو اس قدر ریٹسٹ سینٹ کر رکھنا چاہا کہ اس ماحول کا ایک حصہ ہونے کے باوجود خود کو الگ تھلگ سمجھا اور تمہاری یہی احتیاط واجنبیت بہت سے دوسرے لوگوں کے ساتھ صارم خان جیسے شوخ بندے کو بھی شدت سے متوجہ کر گئی۔ دوسرے اسٹوڈنٹس تمہارے سرد وخشک رویے کے باعث پیچھے ہٹ گئے مگر صارم تمہارے پیچھے کسی بھوت کی طرح لگ گیا ہے۔ اگر تم اسے، اس کی بکواس اور شاعری کو کوئی اہمیت نہ دیتیں تو وہ بھی دوسرے لوگوں کی طرح راستہ بدل چکا ہوتا۔'' شعوانہ نے کوک کا سپ لیتے ہوئے بھرپور تجزیہ پیش کیا، ورشا کا موڈ قدرے درست ہو گیا تھا۔

''تم لوگ میری مجبوریوں سے ناواقف ہو۔ میرے قبیلے کے رسم ورواج سے قطعی نابلد ہو۔ اس لیے ایسا سوچ سکتی ہو، کہہ سکتی ہو۔ میرا وجود، رواجوں، اصولوں کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ اوے کے اعتماد ویقین کی چادر میرا احصار کیے ہوئے ہے۔ ایک دشت خارزار کو ننگے پاؤں، عبور کر کے میں یہاں تک پہنچی ہوں۔ اپنے اوپر باغی، خود سر وضدی ہونے کا لیبل چسپاں کروا کر۔ بابا جان نے زندگی میں پہلی مرتبہ شمشیر لالہ کی نہیں مانی، اس اعتماد وافتخار کے تفاخر کے ساتھ کہ ان کی روایت کے برخلاف ایک لڑکی نے تعلیم کے حصول کے لیے قدم باہر نکالے ہیں۔ ان کے اونچے شملے کی سر بلندی وتابندگی میرے کردار واعمال کی زد پر ہے اور میں نہیں چاہتی میری معمولی سی لغزش، انجانی بھول، ذرا سی انجوائے منٹ ان کے اعتماد اور فخر کی عمارت کو زمین بوس کر دے اور میرے بعد باقی نسلیں میری عاقبت نااندیشی وخود غرضی کی بھینٹ چڑھ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جہالت و پسماندگی کے مہیب، سیاہ، تاریک صحراؤں میں بھٹکتی رہیں۔ میرے شانوں پر بہت عظیم ونازک بوجھ ہے۔ میری ذرا سی لڑکھڑاہٹ اس کو چکنا چور کر کے تمام راہیں مسدود کر سکتی ہے اس لیے میں خود اپنی پرچھائیں سے خائف ومحتاط رہتی ہوں ڈیئرز۔'' اس نے بوتل خالی کر کے ٹیبل پر رکھتے ہوئے سنجیدگی سے اپنی ذات سے وہ تاریک پہلو پہلی مرتبہ اجاگر کیے جن سے وہ ناواقف تھیں۔

''اونو؟ تمہارا قبیلہ ابھی تک ان پرانے فرسودہ رسموں رواجوں میں مقید ہے۔ جب کہ دنیا چاند پر پہنچ چکی ہے۔''

''میرے خیال میں چاند اگر زمین پر بھی اتر آئے تو ہمارے رواجوں ودستور کو نہیں بدل سکتا اس لیے میں نے ضد کر کے کچھ تبدیلی لانے

کی کوشش کی ہے۔" اس کے سرخ گلاب جیسے چہرے پر سوز تھا۔

"ویری بریو گرل ورشا آفریدی! بہت اچھا کیا تم نے تعلیم کے حصول کے شوق میں کہکشاں راستے کا انتخاب کیا ہے۔ انشاء اللہ تم اس راستے کی ایسی جگمگاتی مشعل ثابت ہو گی کہ آئندہ کوئی جہالت کے اندھیروں میں نہیں بھٹکے گا۔ میرے نزدیک دنیا کی سب سے بڑی محرومی تعلیم و عمل کی محرومی ہے۔ اس سے بڑا دکھ شاید ہی دنیا میں کوئی دوسرا ہو۔" دوسرے درد و دکھ تو مشترک ہوتے ہیں۔

سنبل کے ساتھ اس کو سب نے حوصلہ بخشا تھا۔ ورشا کے سرخی مائل ہونٹوں پر آسودہ مسکراہٹ ابھری تھی۔

"پروفیسر دانیال کا پیریڈ شروع ہونے میں دس منٹ رہتے ہیں چلو کلاس روم تک پہنچتے پہنچتے دس منٹ گزر جائیں گے۔" اس نے رسٹ واچ دیکھتے ہوئے کہا تو وہ بھی سب ساتھ اٹھ گئیں۔

☆☆☆

گا میلے منوا گاتا جا لے، جانا ہے ہم کا دول

گا میلے منوا گاتا جا لے، جانا ہے ہم کا دول

(ٹھوک) ٹھومک ٹھومک نہیں چل لے بیلوا اپنی نگریہ ہے دول

اپنی نگریا ہے دو ل

''فدا حسین صاحب! خیریت تو ہے نا؟ آج بہت غمگین گانے گائے جارہے ہیں۔ کہیں بیگم سے تو کھٹ پھٹ نہیں ہوگئی؟'' بہروز نے ٹیبل پر سے کھانے کے برتن سمیٹتے ہوئے فدا حسین سے استفسار کیا۔ اس کی اداس صورت اور زبان کی تتلاہٹ پر اس نے بمشکل مسکراہٹ کو ضبط کر رکھا تھا۔

''اے چھولو صاحب! سالی عولت (عورت) ذات ہوتی ہی بے مولوت (بے مروت) اور بے وفا ہے۔ شکر کرنا تو جانتی ہی نہیں ہے سالی! آتمان (آسمان) سے تالے (تارے) بھی توڑ کر اس کے قدموں میں ڈھیل (ڈھیر) کر دو تب بھی اس کی خواہشیں پوری نہیں ہوتی ہیں۔''

فدا حسین نے کافی جلے کٹے لہجے میں داستان غم سنائی۔

''صارم! ہوشیار خبردار ہوجاؤ مسز فدا حسین کی سر تے پھر کسی نئی ساڑھی کی یا کسی جیولری سیٹ کی فرمائش کی ہوگی۔ فدا حسین کی آہیں، سسکیاں اور نالے تمہارے والٹ کی طرف بڑھنا شروع ہو چکے ہیں۔'' بہروز نے باتھ سے برآمد ہوتے ہوئے صارم کو باآواز بلند مطلع کیا۔

''صارم کیوں ہوشیار ہو؟ بیگم، فدا حسین کی ہیں صارم کو کیوں مطلع کر رہے ہو؟'' مامون جو فدا حسین کی حرکتوں سے کم کم واقف تھا حیرانگی سے دریافت کرنے لگا۔

''کچھ نہیں یار اس کو تو عادت ہے یونہی بک بک کرنے کی۔ فدا حسین کافی بنا کر لاؤ۔'' وہ ان دونوں کے درمیان بیٹھتا ہوا مامون کے بعد فدا حسین سے مخاطب ہوا۔ فدا حسین جو مٹھی گرم ہونے کے تصور میں گم ہو گیا تھا۔ صاحب کا بے تاثر چہرہ اسے دوبارہ اداسیوں کے ساگر میں غوطہ زن کر گیا۔ برتن سمیت کر اس نے ٹرالی میں رکھ دیے تھے۔ ٹیبل صاف کر کے ٹرالی لے جاتے ہوئے حسب عادت پھر گنگنانے لگا تھا۔

دل ویراں ہے تیری یاد ہے تنہائی ہے

زندگی ولد (درد) کی باہوں میں سمٹ آئی ہے.....

''خدا کی قسم صارم! تمہارا یہ ملازم زبردست تفریح ہے۔'' بہروز بے ساختہ ہنس پڑا تھا۔

''بہت فراڈیا ہے دونوں ہاتھوں سے اسے لوٹ رہا ہے۔ ایک ماہ سے قبل تنخواہ بٹور لیتا ہے اور مہمانوں سے الگ لمبی لمبی رقمیں گھسیٹتا ہے۔ یہ حاتم طائی کے گدی نشین دل کھول کر پیسہ بہاتے ہیں۔ میں چند ماہ سے اس کے پاس رہ رہا ہوں اور تنگ ہوں اس کی فضول خرچیوں سے۔'' باسط نے اندر سے آتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔

''اگر تمہیں صحت مند رہنا ہے تو یہ جلنا کڑھنا عورتوں کی طرح کی حرکتیں چھوڑ دو۔ صارم دل والا بندہ ہے۔ ویسے بھی دولت کی کمی نہیں ہے

میرے یار کو۔'' آفتاب عرف ٹنکی نے اپنی آگے کو نکلی توند پر ہاتھ پھیرتے ہوئے صارم کو فدویانہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیا ہوا ہے یار، آج خلاف عادت بہت خاموش خاموش ہو؟'' بہروز نے اس کی طرف دیکھا۔

''شاید اسے کیوٹ یاد آرہی ہیں؟'' باسط نے اس کی آنکھوں سے جھانکا۔

''یاد انہیں کیا جاتا ہے جو نگاہوں سے دور ہوں وہ تو میرے ''ہارٹ روم'' میں ہمہ وقت براجمان رہتی ہے۔ مکمل مالکانہ حقوق کے ساتھ۔'' وہ ایک دم ہی ترنگ میں آگیا تھا۔ اس کے چہرے پر روشنیاں جگمگا اٹھی تھیں۔

''بات دل لگی سے شروع ہوئی تھی پھر دل کی لگی کیسے بن گئی؟'' بہروز حیران تھا۔

''ابے یار! کس کی باتوں میں آرہا ہے؟ اس سے جو بھی لڑکی ملتی ہے پھر وہ فوراً ہی اس کے ہارٹ روم پر قابض ہو جاتی ہے۔ مگر یہ قبضہ عارضی ہوتا ہے۔ یہ ظالم مالک مکان کی طرح فٹافٹ گھر خالی کروا لیتا ہے۔ کسی نئے کرائے دار کے لیے۔'' ان چاروں کے قہقہوں میں اس کا قہقہہ زیادہ بلند تھا۔ فدا حسین اس دوران خاموشی سے ان کو کافی سرو کرنے میں لگے رہے تھے۔ گویا ٹنکی بھی ساتھ پکڑا گیا تھا۔

''مس کیوٹ کو یہ ابھی تک زیر محبت نہ کر پائے ہیں اس لیے وہ اتنے عرصے سے اس کی یادداشت میں موجود ہیں۔ جس دن ان کا گریز اور اکڑ ختم ہوئی سمجھو اسی دن یہ صاحب اپنی سابقہ محبوباؤں کی طرح ان سے بھی کنارا کشی کر بیٹھیں گے یا سے بائے کہتے ہوئے۔''

''نہیں پیارے! مجھے معاملہ یہاں سنگین محسوس ہو رہا ہے۔'' باسط عقل خیزی سے گویا ہوا۔

''فی الحال تو معاملہ سنگین نہیں ہے اگر میرے پیٹ میں اچھل کود کرتی ہوئی ''گیس'' خارج ہو گئی تو۔''

''او موٹے! خبردار اگر تو نے یہاں کی فضا کو زہر آلود بنانے کی کوشش کی تو۔'' اس کا اشارہ سمجھ کر وہ سب ہی اچھل کر کھڑے ہو گئے تھے۔ جب کہ آفتاب بے ہنگم انداز میں ہنس رہا تھا۔

''جس دن بھی میرا دماغ گھوما اس موٹے کی ٹنکی لیک کر دوں گا۔ موٹا! کھا کھا کر بھینسا ہو گیا ہے۔''

''نکھار رہا ہوں تو نظر تو آرہا ہوں۔ تمہاری طرح کھایا پیا تو نہیں ڈبو رہا کہ کھاتے بکری کی طرح ہیں اور سوکھتے لکڑی کی طرح ہیں۔'' آفتاب جو ان سب میں اپنی بھاری بھرکم جسامت کے باعث نمایاں رہتا تھا، انہیں چڑاتے ہوئے بولا اور پھر حسب معمول وہ اسے پکڑنے کے لیے اس کی طرف بڑھے تھے تاکہ اسے اس کے موٹاپے کا مزہ چکھایا جائے۔ لاؤنج میں ایک ہنگامہ سا مچ گیا تھا۔ بہروز اور عامون ایک طرف سے اسے گھیرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ صارم اور باسط اس کی پشت کی جانب سے قابو کرنے کی جدوجہد کر رہے تھے مگر آفتاب چاروں پر بھاری تھا۔ اس کے بھاری بھرکم جسم میں بلا کی پھرتی و چستی تھی کہ مست ہاتھی کی طرح وہ دھما دھم کرتا ان کی گرفت سے نکل جاتا تھا۔ دن مست کی اس شدید اچھل کود میں لاؤنج بکھر کر رہ گیا تھا مگر آفتاب کسی کے ہاتھ نہیں آیا تھا ان کے سانس بری طرح پھول گئے تھے۔ آفتاب ان کی گرفت سے بچنے کے لیے آگے بھاگا تھا اور اسی دم فدا حسین ان کا شور و ہنگامہ سن کر اندر آرہا تھا وہ دونوں آپس میں شدت سے ٹکرائے تھے۔ آفتاب کے گرنے کے زوردار دھماکے کی آواز کے ساتھ فدا حسین کی خوف ناک چیخ بھی ابھری تھی۔ اس کا آدھا جسم آفتاب کے نیچے تھا۔

''ارے ٹوٹ گیا میرا...... ارے ٹوٹ گیا۔'' وہ ٹانگ پکڑے بری طرح چیخ رہا تھا۔

''ارے کیا ٹوٹ گیا؟'' وہ سب مستیاں بھول کر اس کے اردگرد بیٹھ کر تشویش سے پوچھنے لگے۔

''میرا گھٹنا ٹوٹ گیا..... ہائے، ہائے ربا!'' اس کی آہ و زاری بتدریج بڑھ رہی تھی۔

''ابے چپ کر کیا لڑکیوں کی طرح ہائے، ہائے لگا رکھی ہے۔ کچھ نہیں ہوا تمہارا گھٹنا صحیح سلامت ہے..... چلو اٹھو کم آن فرینڈز! اب آیا ہے ہاتھی پہاڑ کے نیچے۔'' صارم نے فدا حسین کو ایکٹنگ کرتے دیکھ کر للکارا اور ساتھ ہی گرگراتے ہوئے آفتاب کو چھاپ لیا۔ اب وہ سب مل کر اسے گدگدیاں کر رہے تھے۔ آفتاب کی اس عمل سے جان جاتی تھی۔ سو اس وقت بھی اس کے مجبوراً فلک شگاف قہقہے فضاؤں میں بکھرے ہوئے تھے۔ کافی دلچسپ صورت حال تھی۔

☆☆☆

شام سرمئی آنچل پھیلا چکی تھی۔ دور افق پر غروب ہوتے سورج کی گہری سرخی میں گویا آگ دہک رہی تھی۔ پرندوں کی قطاریں بہت سرعت سے اپنے آشیانوں کی طرف محو سفر تھیں۔ بدلتے موسم کے اثرات ظاہر ہو رہے تھے۔ ہوا میں خنکی رچی ہوئی تھی۔ سردیوں کا مخصوص خشک و سرد سناٹا اور ویرانی، دھیرے دھیرے در و دیوار کو لپیٹ میں لینے لگی تھی۔ ہمیشہ کی طرح اب بھی یہ موسم اپنی شدتوں سمیت اس کے اندر آ بسا تھا۔ اس کی نیلگوں آنکھوں میں اداسی اپنے پورے رنگ کے ساتھ موجود تھی۔ دل ادے جان اور بہنوں سے ملنے کو شدت سے چاہ رہا تھا جن سے ملے ہوئے دو سال ہونے کو آئے تھے۔ وہ شمشیر لالہ کی چنگیز خانی طبیعت کے باعث خود پر جبر کر رہی تھی۔ وہ اس کی تعلیم کے خلاف تھے۔ ان کا خیال تھا زیادہ تعلیم لڑکیوں کو بے حیا اور بے غیرت بنا دیتی ہے۔ وہ جو حساس اور نڈر طبیعت کی مالک تھی پہلی بار ان کے آگے ڈٹ گئی تھی۔ ان کی اس ذہنی اختراع ، مفروضے کو وہ ماننے کو تیار نہ تھی۔ اعلیٰ تعلیم اس کی حیات کا واحد خواب تھا۔

''ورشا! تم یہاں ہو؟ میں سب کمرے اور کوری ڈور دالان گھوم کر تمہیں ڈھونڈ کر تھک گئی ہوں۔ اوہ! آج پھر گھر والوں کو یاد کر رہی ہو؟''

سنبل چھوٹی ٹرے میں چائے کے کپ اور برگر لیے کرے نذر داخل ہوئی تھی۔ کمرے سے باہر بالکونی میں ریلنگ سے چہرہ ٹکائے، اس کے چہرے پر ڈھلتی شام کے عکس بہت دل کش و دلفریب رنگ میں ڈھل رہے تھے۔ اسکی گہری نیلی آنکھوں میں ہلکی سی نمی تھی۔ سنبل کو دیکھ کر اس نے اپنی گلابی ہتھیلیوں سے آنکھیں رگڑ ڈالیں۔

''کبھی کبھی دل بہت اداس ہو جاتا ہے۔'' اس کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ ابھر آئی۔

''ہاں یقیناً ہو رہا ہوگا۔ دراصل اپنوں کی محبت اور قربت میں جو تسکین اور راحت ہوتی ہے وہ دوسروں کی کمپنی میں آپ محسوس نہیں کر سکتے۔ حالانکہ ہم نے پوری کوشش کی ہے کہ تمہیں بالکل گھر جیسا ماحول دیں، تمہیں اپنوں کی کمی کسی حد تک محسوس نہ ہونے دیں مگر پھر بھی میں سمجھتی ہوں۔ سگے پھر سگے ہی ہوتے ہیں۔ اپنوں کے چہرے ہی نگاہوں کو ٹھنڈک و سکون بخش دیتے ہیں۔ لمحے بھر کو نظر آ جائیں تو..... تم تو ڈیڑھ سال سے ان محبت کرنے والوں سے نہیں ملی ہو۔''

سنبل نے سینٹر ٹیبل پر ٹرے رکھتے ہوئے اس کی طرف دیکھتے ہوئے آزردہ انداز میں کہا۔

''ایسی بات نہیں ہے سنبل! میں تم لوگوں کی کمپنی بہت انجوائے کرتی ہوں۔ انکل، آنٹی، فارحہ، سفیان اور ارباز کی اتنی محبت و اپنائیت مجھے ملی ہے تو میں اتنا عرصہ یہاں ٹھہر گئی ہوں ورنہ ایک مرتبہ اور شمشیر لالہ سے جنگ کرنی پڑتی ہاسٹل میں رہنے کے لیے۔'' اس نے خلوص سے مسکراتے ہوئے صوفے پر بیٹھ کر کہا۔ وہ کمرے میں آ چکی تھیں۔ صوفے پر جا بیٹھی تھیں۔

''تمہارے شمشیر بھائی ہٹلر ٹائپ نیچر ہیں کیا؟ تم سے فقط ایک بار میں نے ان کا فون اٹینڈ کیا تھا..... اف! اس قدر رعب و دبدبے والی آواز جیسے پہاڑوں چٹانوں کو گویائی مل گئی ہو۔ میں نے فوراً ہی ریسیور ڈیڈی کو تھما دیا تھا اور کافی دیر بعد جا کے میرے دل کی دھڑکنیں اعتدال پذیر ہوئی تھیں۔ میں نے زندگی میں کبھی ایسی آواز نہیں سنی تھی۔''

''تم اعتراف کرتی ہو؟ میرے لالہ نے فقط چند لمحوں میں ہی تمہارے دل کی دھڑکنیں منتشر کر دی تھیں۔'' ورشا برگر پر ٹماٹر سوس ڈالتی ہوئی

شرارتی انداز میں بولی۔

''ارے نہیں، کیا بات کرتی ہو؟ ورشا ڈارلنگ! کوئی معمولی سے تیز لہجے میں بات کرے تو میں خوف زدہ ہو جاتی ہوں۔ تمہارے لالہ کی بلند آواز کے چند جملے ہی میرے ہارٹ فیل کے لیے کافی ہیں۔'' سنبل نے کچھ ایسی مسمسی شکل بنا کر وضاحت کی کہ وہ بے اختیار کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

''آل رائٹ! جانتی ہوں کیسا چڑیا جیسا دل ہے تمہارا! مگر انسان کو اتنا بھی بزدل نہیں ہونا چاہیے۔''

''بہادر تو تم بھی نہیں ہو۔'' سنبل کا لہجہ خاصا معنی خیز تھا۔

''دیکھو مجھے بزدل نہ بولنا ہاں۔'' اس کا پٹھانی خون ایک دم ہی جلال میں آیا تھا۔

''بہادر تمہیں جب مانوں گی، جب تم صارم خان سے دوبدو مقابلہ کرو گی۔''

''صارم خان! اس جیسے تھرڈ کلاس شخص کی کوئی اہمیت و وقعت نہیں ہے میری نگاہ میں اور مقابلہ ان سے کیا جاتا ہے جو برتری یا برابری کے درجے پر ہوں۔'' وہ حسب توقع تپ اٹھی تھی۔

''کیا ہوا بھئی! اس کمرے میں ابھی میں نے چنگاریاں سے اڑتی دیکھی ہیں۔'' مسکراتی ہوئی پرس جھلاتی فارحہ اندر آ کر ورشا کے تپے تپے چہرے کو بغور دیکھتی ہوئی شوخی سے بولی۔

''کچھ نہیں۔۔۔ تم نے اتنی دیر کیوں لگادی؟'' وہ موڈ کو نارمل کر کے اس سے استفسار کرنے لگی۔

''دیر تو نہیں ہوئی زیادہ۔۔۔ ایک پارٹی پنجاب سے اچانک ہی آ گئی تھی۔ مما اس چکر میں بیٹھ گئی تھیں۔''

''چائے پیو گی؟'' سنبل اسے آرام سے کشن کے سہارے نیم دراز ہوتے دیکھ کر پوچھنے لگی۔

''نیکی اور پوچھ پوچھ!'' حسب عادت وہ کندھے اچکا کے گویا ہوئی۔

''آنٹی نہیں آئیں؟'' ورشا چائے پی کرنگ ٹیبل پر رکھتے ہوئے سرسری انداز میں بولی۔

''نہیں۔۔۔ پنجاب سے آنے والی پارٹی سے ان کی میٹنگ ہو رہی تھی۔ ڈیڈی کے ساتھ آئیں گی۔''

''او کے۔۔۔ تم چائے پیو میں ذرا اسائن منٹ مکمل کرلوں۔'' وہ اٹھتی ہوئی گویا ہوئی۔

☆☆☆

''ہائے صارم!'' انگلش ڈپارٹمنٹ کی شازمہ وحید ہاتھ ہلاتی ہوئی اس کی طرف بڑھنے لگی۔ کینٹین میں دوستوں کے ساتھ بیٹھے چائے پیتے صارم خان کے وجیہہ پرکشش چہرے پر بھرپور مسکراہٹ ابھری تھی۔ آج کل ان سے اس کی زبردست دوستی چل رہی تھی۔ شازمہ خاصی خوب صورت لڑکی تھی۔ مستزاد اس کے عشوے و انداز، جدید کپڑوں کی جامہ زیبی، میک اپ کی مہارت و بے باک آزادانہ طبیعت، صارم خان سے ان کی دوستی کے چرچے جامعہ میں خاصے شہرت پا رہے تھے جس سے وہ دونوں ہی بے نیاز تھے۔

''آ گئی مس ایلفی! فیشن تو ایسے کر کے آتی ہے جیسے جامعہ نہیں کسی فیشن شو میں آئی ہے۔'' باسط نے اسے دیکھتے ہی بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

دوسرے ساتھیوں کے موڈ بھی بگڑ گئے تھے۔

''جلد از جلد اسے فارغ کرنا کہیں کمبل ہو جاؤ'' ماموں تنگ ہو کر زور سے ٹیبل پر پٹخا۔

''ہیلو ایوری باڈی! کیا ہو رہا ہے؟'' شازمہ نے ان کے قریب آ کر مسکرا کر پوچھا۔

''یہ سب لوگ تمہاری تعریف کر رہے تھے کہ تم کتنی کیوٹ، سندر، دلکش ہو۔'' صارم نے شرارتی لہجے میں کہا۔

''اوہ ! ریئلی؟'' اس نے بوب کٹ بالوں کو دلربائی سے جھٹک کر آنکھیں گھمائیں۔

''یس..... بلکہ یہ اصرار کر رہے تھے کہ تمہیں آئس کریم کھلانے لے جاؤں۔'' صارم انہیں کن انکھیوں سے دیکھتا ہوا اٹھ گیا۔ اس کی روشن آنکھیں مسکرا رہی تھیں۔ سرخ و سپید چہرے پر شرارت و شوخی رقصاں تھی۔ جب کہ ان چاروں کے چہرے رنگ بدلنے لگے تھے۔

''اوہ! اوہ ویری ویری تھینکس فرینڈز!'' شازمہ مسرت سے جھوم اٹھی تھی۔ اس کی غلط بیانی پر بہروز نے بیٹھے بیٹھے اپنی ٹانگ صارم کی ٹانگ پر ماری تھی وہ سمجھ گیا تھا کہ وہ شازمہ کے ساتھ لمبے وقت کے لیے نکل جائے گا۔ شام میں انہوں نے شاپنگ کا پروگرام بنایا تھا جواب مکمل ہوتا نظر نہیں آ رہا تھا۔ دوسرے لمحے شازمہ کی بہری چیخ گونجی تھی۔ اس کے جوتے کی زوردار ضرب صارم کے بجائے شازمہ کی ٹانگ پر لگی تھی۔ وہ سیدھی آفتاب کی گود میں جا کر بیٹھنے کے انداز میں گری تھی۔

''مبارک ہو آفتاب! گود بھر گئی تمہاری، مٹھائی کھلاؤ بھائی!'' اس وقت کینٹین میں چند ہی طلبا تھے اور انگلش ڈیپارٹمنٹ سے تعلق رکھتے تھے۔ سب ایک سے بڑھ کر ایک شریر۔ سامنے ٹیبل سے فقرہ اچھالا گیا تھا۔ زوردار قہقہوں سے کینٹین گونج اٹھا تھا۔

''نہیں بھئی! ایسی گود بھرنے سے میں خالی گود ہی بہتر ہوں کہ جلد از جلد بیٹی کے ہاتھ پیلے کرنے کی بھاری ذمے داری ادا کرنی پڑے۔'' آفتاب نے بگڑے تیوروں کے ساتھ کھڑی شازمہ کو دیکھتے ہوئے کچھ ایسی بے ساختگی سے کہا کہ دوسرے ابھرنے والے قہقہے پہلے سے بھی زیادہ زوردار تھے۔

''شٹ اپ ایڈیٹ!'' شازمہ غصے سے کھولتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔

☆☆☆

''مائی گاڈ! میری ٹانگیں آگے بڑھنے سے اب انکاری ہیں۔ نہیں چلا جاتا مجھ سے آگے اور۔'' سنبل نے فٹ پاتھ کے کارنر پر بیٹھتے ہوئے دہائی دیتے ہوئے کہا۔

''تمہیں عادت ہوگئی ہے کار میں گھومنے پھرنے کی۔ ذرا چلا بھی کرو پیدل، پیدل چلنے سے بہت زیادہ فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ مثلاً.....''

''بس.....بس! محترمہ فارحہ ارسلان صاحبہ! آپ کی بک بک سننے سے بہتر ہے بندہ، بلکہ بندی چل پڑے، خوامخواہ تم نے آرٹس سلیکٹ کیا ہے ورنہ مزاج تمہارا ڈاکٹروں جیسا ہے۔ مٹھائی نہ کھاؤ شوگر ہو جائے گی۔ اگر ذرا چکنی چٹ پٹی چیزیں کھاؤ تو تمہیں ہارٹ اٹیک ہو جانے کا اندیشہ لاحق ہونے لگتا ہے۔ ذرا آرام کرلو تو تم اس فکر میں گھلنے لگتی ہو کہ اس طرح ویٹ بڑھ جائے گا۔ تمہیں کسی طرح سکون نہیں ہے۔'' سنبل نے حسب عادت ایک ہی سانس میں فارحہ کو لیکچر دیا اور فٹ پاتھ سے اٹھ کر چلنے لگی۔

جامعہ سے ملحقہ سڑک دور دور تک ویران تھی۔ بسیں تمام روانہ ہو چکی تھیں۔ ٹیسٹ کی تیاری کے سلسلے میں نوٹس بنانے میں انہیں لائبریری میں کافی ٹائم گزر گیا تھا۔ وہ باہر آئیں تو جامعہ تقریباً خالی تھی بہت کم طلبا وہاں تھے۔ شام کے گلابی سائے سبک خرامی سے اتر رہے تھے۔ ہلکی ہلکی ٹھنڈک ہواؤں میں سرسرا رہی تھی۔

''پلیز! اب تم دونوں یہیں جنگ شروع نہ کر دینا۔ جلدی جلدی چلو آگے سے کوچ مل جائے گی۔'' فارحہ کو آنکھیں نکالتے دیکھ کر اس نے ایک ہاتھ سے اسے آگے دھکیلا تھا۔

''تم! ہمیشہ ثالثی کا کردار ادا کرتی رہنا۔ جس دن یونیورسٹی میں دیر ہو جاتی ہے اس دن ڈرائیو بھی اتفاقیہ غائب ہو جاتا ہے۔'' سنبل شانے سے پھسلتے بیگ کا اسٹرپ درست کرتے ہوئے بولی۔

''مجھے تو اکثر ورشا کے سامنے بے حد شرمندگی ہوتی ہے۔ کیا سوچتی ہوگی؟ کیسے پھٹیچر لوگ ہیں ایک کے علاوہ دوسری کار بھی افورڈ نہیں کر سکتے۔'' فارحہ کے لہجے میں کم مائیگی کا احساس غالب تھا۔

''ہاں بھئی اس کے ہاں تو لینڈ کروزر اور مرسڈیز کاریں بھری پڑی ہیں۔ ہمارا ورشا آفریدی سے کیا مقابلہ؟ یہ ایک وسیع علاقے کے سردار کی بیٹی، ہم چھوٹے سے بزنس مین کی اولاد ہیں۔''

''فارحہ، سنبل قسم سے! جب تم نے اس طرح سے میرا اور اپنا تقابل کیا تو میں ہاسٹل جوائن کرلوں گی۔ مجھے کتنی شرمندگی ہوتی ہے اس طرح تم محسوس نہیں کر سکتیں۔ یہ زر، زمین، جائیداد سب خلوص، مساوات، بے لوث محبت وچاہت کے آگے بے وقعت و بے معنی ہیں۔ تمہارے ہاں تو اتنی فراوانی سے بے انتہا یہ دولت ہے کہ میں خود کو فقیر محسوس کرتی ہوں تمہارے آگے۔''

''شکریہ! اب تم سیریس مت ہو جانا پلیز۔'' اسے سنجیدہ ہوتے دیکھ کر ان دونوں نے بے ساختہ ہاتھ جوڑے تھے۔ ورشا چادر درست کرتی ہوئی مسکرانے لگی۔

وہ تینوں باتیں کرتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھیں۔ معا بوائز ہاسٹل اسٹریٹ سے نکل کر گرین کلر کی لشکارے مارتی گاڑی بہت سرعت سے ان کے قریب آ کر رکی تھی۔ تینوں نے بے ساختہ دیکھا تھا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر براجمان شخص کو دیکھ کر ورشا کے ماتھے پر شکنیں نمودار ہو چکی تھی۔

''ہیلو لیڈیز! یقیناً آپ کو کوئینس پرابلم ہے.... آیئے میں آپ لوگوں کو ڈراپ کر دوں گا۔'' مسٹرڈ جینز اور بلیک شرٹ میں ملبوس سن گلاسیز ہسا ئیڈ پاکٹ میں اٹھائے وہ اپنی تمام تر وجاہت و اسمارٹ نیس سمیت خوب صورت شام کا شاہکار حصہ لگ رہا تھا۔ اس کے ملبوس سے پھوٹتی مسحور کن مہک ان کے اطراف میں پھیلنے لگی۔ وہ کار سے نکل آیا تھا۔ اس کے چہرے اور آنکھوں پر وہی شوخ و شنگ رنگ تھے۔ روشن روشن، بے حد شفاف آنکھیں، گاہے بگاہے ورشا کے چہرے پر پھیل رہی تھیں۔

''تھینکس مسٹر صارم! آگے اسٹاپ سے ہمیں کوچ یا ٹیکسی وغیرہ مل جائے گی۔ آپ تکلیف نہ کریں۔''

''آپ بھی کیسی بیگانوں کی طرح گفتگو کر رہی ہیں مس فارحہ! بسیں تمام جا چکی ہیں۔ شام گہری ہوتی جا رہی ہے۔ آپ خواہ مخواہ تکلف کر رہی ہیں۔ آیئے پلیز!'' اس وقت وہ انہیں بہت مہذب و شائستگی و شرافت کا مرقع لگا۔ اس کے سادہ پر وقار بھاری لہجے میں کچھ ایسی ہی تاثیر و کشش تھی کہ فارحہ اور سنبل ڈھلمل ہو گئی تھیں۔ جب کہ ورشا نے اس کی نگاہوں کی تاک جھانک سے بچنے کے لیے بلیک چادر سے اپنا آدھا چہرہ چھپا لیا تھا اس طرح صارم کی طرف اس کے چہرے پر چادر تھی۔

''نہیں آپ جائیں پلیز ہم چلے جائیں گے۔'' ورشا کے چہرے پر ناگواری و غصے اور تنفر کے شدید تر تاثرات دیکھ کر سنبل نے سرسری انداز میں صارم سے کہا۔

''دیکھیے ہم میں زیادہ دوستی نہیں ہے تو مکمل اجنبیت و بیگانگی بھی نہیں ہے کہ آپ مجھ پر بھروسا نہ کریں اتنی شناسائی و حوصلہ تو آپ رکھتی ہیں کہ مجھ پر اعتبار کر سکیں۔''

''سنبل! جب ہم نے کہہ دیا کہ ہم لفٹ نہیں لیں گے۔ چلو دیر ہو رہی ہے۔'' ورشا کی سخت و بے زار کن آواز اس کے کانوں میں جیسے جلترنگ بجا گئی۔ وہ ان ڈائریکٹ اس سے ہی مخاطب تھی۔ سنبل نے اسے آگے قدم بڑھاتے دیکھ کر صارم کا شکریہ ادا کیا اور اس کے ساتھ آگے قدم بڑھا دیے۔

''آپ مجھ سے خوف زدہ ہیں؟'' اس نے ورشا کا راستہ روک کر براہ راست اس کی نیلگوں آنکھوں میں اپنی سحر طراز نگاہیں ڈالتے ہوئے معنی خیز انداز میں کہا۔ ورشا کے گویا انگ انگ میں شعلے بھڑکنے لگے۔ اس کی اس بے باک جسارت و نڈر انداز نے اسے سخت طیش دلا دیا تھا۔

''جی.... آپ سے ہر وہ لڑکی خوف زدہ ہو سکتی ہے جو اپنے کردار کے بے داغ لباس کو کسی رسوائی کے چھینٹوں سے بچا کے رکھنا چاہتی ہے۔ اور میں بھی ان میں سے ایک ہوں۔'' طویل عرصے میں وہ پہلی بار مخاطب ہوئی تھی اور اس کے خوب صورت، سرخ، گلاب کی پنکھڑیوں جیسے ہونٹوں سے نکلنے والے جملے کچھ ایسے نفرت و حقارت بھرے انداز میں تھے کہ صارم آفریدی جو اپنی از حد وجاہت و شوخ و شریر طبیعت کے علاوہ پیسہ پانی کے انداز میں خرچ کرنے کے باعث جامعہ میں ہر دل عزیز تھا۔ اپنی پرسنالٹی کی تمام تر سحر انگیزی سے وہ واقف تھا۔ اکی ڈریسنگ غضب کی ہوتی تھی، جو اس کی پرسنالٹی کو مزید نکھار دیا کرتی تھی۔ وہ فطرتاً حسن کا، حسین چہروں کا شیدائی تھا۔ ہر خوب صورت و منفرد چیز اسے فوراً متاثر کر دیتی تھی۔

مری کونونٹ سے جامعہ تک اس کی لڑکیوں سے دوستی رہی تھی۔ اس کی ایک نگاہ التفات کے لیے لڑکیاں ارد گرد رہتی تھیں اس معاملے میں اس نے حاتم طائی کو بھی پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ مہ جبینوں، نازنینوں، ماہ رخوں کے لیے اس کا وقت کبھی کم نہیں ہوتا تھا۔ ورشا کی بے التفاتی و بیگانگی، سرد مہری و بے رخی نے اسے چونکا گئی تھی۔ اس کے تصور میں بھی نہ تھا کہ کوئی لڑکی اسے نظر انداز بھی کر سکتی ہے۔ مگر ورشا کی ثابت قدمی اور ازحد محتاط روی نے ثابت کر دیا تھا کہ وہ اعلیٰ و منفرد لڑکی تھی جسے اپنا نسوانی وقار اور حرمت کی پاسداری حد درجہ عزیز تھی۔ وہ ان لڑکیوں میں سے ہرگز نہیں تھی جو ان کے ساتھ ہوٹلوں میں جانا، پکنک وزٹ پر جانا اور گفٹس وصول کرنے میں مسرت محسوس کرتی ہیں اور اپنی عصمت و عظمت کے مقابل گفٹس کو عزیز رکھتی ہیں۔

ورشا آفریدی اپنی خودداری و دوشیزگی کے وقار کے ساتھ اس کے لیے چیلنج بن گئی تھی۔ اس نے اپنی ضد و ہٹ دھرم سرشت کے باعث سوچ لیا کہ وہ ورشا آفریدی کا غرور ضرور توڑے گا اور اس وقت تک اس کا پیچھا نہیں چھوڑے گا جب تک وہ تمام لڑکیوں کی طرح اس کی محبت کا دم بھرتی نظر نہیں آئے گی۔

اپنے چاروں دوستوں سے شرط لگانے کے بعد اس نے ہر وہ طریقہ اپنایا جو ورشا کو متاثر کر سکتا تھا۔ ہر اس راہ پر پہلے سے موجود ہوتا جس پر محسوس کرتا کہ وہ وہاں سے گزرے گی۔ پہاڑوں کے علاقے میں پلنے والی وہ لڑکی ابھی تک چٹان ثابت ہوئی تھی جس میں دراڑ تک وہ نہ ڈال سکا تھا۔ اور ابھی جو فقرے اس نے اس کے لیے استعمال کیے تھے، لہجے سے تیروں کی طرح برستی حقارت و نفرت، آنکھوں کی نیلی جھیل سے نکلتے شراروں نے لمحے بھر میں اسے کچھ اس طرح بھسم کیا تھا کہ وہ پہلی بار دم بخود کھڑا رہ گیا تھا۔ ان کا لہجہ ان کے الفاظ اسے آئینہ دکھا گئے تھے۔ وہ جو اپنی دولت و ثروت، خوبروئی و وجاہت سے لڑکیوں کو دلچسپی و وقت گزاری کا بہترین مشغلہ سمجھتا تھا، اس کی نگاہوں میں صنف نازک کی حیثیت محض کھلونوں کی سی تھی مگر آج اسے عورت کے باعزت اور بلند مقام ہونے کا ادراک ہوا۔ اس کی رفعت و تابندگی اس نے ابھی محسوس کی تھی۔ ورنہ بہت حقیر و کمتر مخلوق گردانتا تھا۔ ''صارم خان! کیا تم ایک لڑکی سے مات کھا بیٹھے؟ وہ بہت دلیری سے تمہاری غیرت کو للکار گئی اور تم کچھ نہ کر سکے۔ جنگجو، دلیر، غیرت مند و بہادر قبیلے کے سردار کے بیٹے ہو تم۔ تمہارے باپ نے کبھی ہارنا نہیں سیکھا، دشمنوں کی گردنیں با آسانی توڑی ہیں اس نے۔ تم ایک معمولی سی لڑکی سے شکست کھاؤ گے؟'' اس کے اندر اس کا پٹھانی خون جیسے ایک دم ہی کھولنے لگا۔ ''نہیں صارم خان آفریدی ہے اور آفریدی قبیلہ کبھی شکست نہیں کھاتا ہیں اس لڑکی کا غرور، اس کی انا، اس کا فخر خاک میں ایک نہ ایک دن ضرور ملا ڈالوں گا۔ اس نے صارم کے کردار پر انگلی اٹھائی ہے۔'' اس نے خون آشام نگاہوں سے کچھ فاصلے پر ''ٹیلو کیب'' میں سوار ہوتی ورشا کو گھورتے ہوئے خود سے عہد کیا۔ ورشا کی صاف گوئی و تحقیر نے اس کی عزت نفس و انا کے پندار پر کاری ضربیں لگائی تھیں۔

☆☆☆

آ پیال دل میں داگا آ دھکوں میں تھما

غذ کو کسم میری ضاں آ سکے نہ چھل دول دانا

''آ پیال دل میں داگا.....'' فدا حسین، صارم کے کپڑے پریس کرتے ہوئے حسب عادت گنگنا رہا تھا۔ باسط اور صارم صوفے پر بیٹھے

تھے۔ باسط آنکھیں بند کیے فدا حسین کی گنگناہٹ سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر گہری مسکراہٹ تھی جیسے ہنسی ضبط کر رہا ہو۔ جب کہ صارم بہت سنجیدگی و انہماک سے گاؤں سے آنے والے لیٹر کو پڑھ رہا تھا۔ جیسے جیسے خط کی سطریں آگے بڑھ رہی تھیں ایسے ہی اس کی پیشانی پر تردد کی شکنیں نمودار ہو رہی تھیں۔ فدا حسین کی آواز انسے ڈسٹرب کر رہی تھی جو ایک گیت مکمل کر کے دوسرا شروع کر رہا تھا۔

''تھنو (جنتو) تھنو بولو بولو میلا تم پ دل آدیا

اوچھل کینا؟ میلا تم پ دل آدیا......

تو پھل جیسے تامدا آدیا آدیا

وہ لہک لہک کر گانے میں مگن تھا۔

''فدا حسین! جس اسپیڈ سے تمہاری زبان چلتی ہے ہاتھ بھی اسی اسپیڈ سے چلایا کرو۔''

''صاحب! میں تو آپ تا دل بہلانے کے لیے گالیتا ہوں۔'' فدا حسین نے چونک کر صارم کی طرف دیکھا۔

''فکر نہیں کیا کرو پیارے! اس کا دل بہلانے کے لیے بہت ساری پریاں ہیں۔ ارے کیا ہوا؟ کیا لکھا ہے خط میں؟ خیریت تو ہے نا؟''

باسط جو ہنستا ہوا فدا حسین سے مخاطب ہوا تھا۔ صارم کے سنجیدہ اور پریشان کن چہرے پر نگاہ پڑی تو بے اختیار گئی سوال ایک دم پوچھ بیٹھا۔

''ہاں خیریت ہے۔'' اس نے لیٹر تہ کر کے سائیڈ ٹیبل کی دراز میں ڈالتے ہوئے فدا حسین کو چائے کا آرڈر دیا۔ باسط بغور اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کا جائزہ لے رہا تھا۔

''کچھ گڑبڑ ہے صارم! تم شاید مجھ پر اعتماد نہیں کرتے یا پھر مجھے اپنے فیملی افیئر بتانا نہیں چاہتے۔''

''او نو ایسی کوئی بات نہیں تم میرے بہترین دوست ہو اور میں دوستی میں غیریت برتنے کا قائل نہیں ہوں۔''

''پھر کیا بات ہے؟ تمہارے چہرے پر پریشانی کے تاثرات ہیں۔'' باسط اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر گویا ہوا۔

''تبریز خان کا لیٹر ہے۔ اس نے لکھا ہے گھر میں سب خیریت ہے۔ زمینوں پر مخالف قبیلے کے خان کے بیٹے سے کچھ جھگڑا ہو گیا ہے۔ اس میں کچھ بندے ہلاک ہوئے ہیں۔''

''اوہ...... یعنی قتل ہو گئے کچھ آدمی۔'' باسط علی جو فطرتاً صلح جو و بزدلی کی حد تک شریف نوجوان تھا اور ایک چھپکلی تک مارنے سے خوف زدہ ہو جاتا تھا قدرے بوکھلا کر کہنے لگا۔

''ہوں...... ایسا اکثر ہوتا رہتا تھا۔ پہلے میرے دادا جان زندہ تھے اکثر خون بہتا رہتا تھا مگر جب سے بابا کے ہاتھ میں انتظامات آئے تھے بابا جان کی دیانت، تدبر و حکمت عملی نے اس خون خرابے کو کافی حد تک کم کر دیا تھا۔ اب کچھ عرصے سے وہی قبیلے والے پھر اسی روش پر چلنا شروع ہو چکے ہیں جہاں آگ و خون کے دریا بہتے ہیں۔ ان کا ارادہ سرسبز پہاڑیوں والے علاقے پر قبضہ کرنے کا ہے کیوں کہ اس علاقے کی زمین سونا اگلتی ہے۔ وہاں کی زمین بہت زرخیز و کارآمد ہے۔ پہلے بھی اس زمین کے لیے کئی نسلیں ختم ہوئی تھیں۔ اب پھر لگتا ہے یہ کہانی دوبارہ شروع ہونے والی ہے۔''

''یہ ولی قبیلہ کون ہے؟ کیا بہت بے رحم ظالم لوگ ہیں اس قبیلے میں؟''

''ہاں مگر ایک نام بہت دہشت کی علامت بن کر ابھرا ہے چند سالوں سے۔خان کا چھوٹا بیٹا ہے شمشیر خان۔اس کی سفاکی و ظلم و بربریت کا بہت چرچا ہے مخالف قبیلے میں۔سنا ہے عزرائیل کا دوسرا روپ ہے۔اس سے ہی سبریز خان کی مڈبھیڑ ہو گئی تھی۔اس نے فائر کھول دیا تھا۔ ملازمین نے سامنے آکر سبریز کے، اپنے سینوں پر گولیاں کھا لیں۔'' صارم نے خطاکے کچھ حصے سنائے۔سبریز اس کا چچا کا بیٹا تھا۔بہت گہری دوستی تھی دونوں میں۔پشاور کالج تک دونوں نے ساتھ پڑھا تھا۔پھر ایم بی اے کرنے وہ کراچی آ گیا تھا۔سبریز کو آگے پڑھائی سے دلچسپی نہیں تھی۔وہ اپنی زمینوں پر کام کرنے لگا تھا۔دونوں کی دوستی میں سر مو فرق نہیں آیا تھا۔دونوں ایک دوسرے کو ہر بات فون یا خط کے ذریعے بتایا کرتے تھے۔اکثر سبریز اس سے ملنے کراچی آتا رہتا تھا۔چھٹیوں میں وہ بھی گاؤں جاتا تھا۔

''یہ تو بہت برا ہوا تمہاری برادری میں تو یار! نسل در نسل دشمنیاں چلتی ہیں۔''

''ہاں ہم دشمن کو کبھی معاف نہیں کرتے اور لگتا ہے شمشیر خان کے بھی برے دن دور نہیں ہیں۔''

صارم خان کے چہرے پر جو ہر وقت شوخی و شرارت اور کھلنڈرا پن مچلتا تھا اس سے غائب تھا۔اس کی نیلی کانچ جیسی چمک دار آنکھوں میں چھائی سرخی میں روایتی پٹھان نظر آ رہا تھا۔باسط نے ٹھنڈی سانس بھری تھی۔

☆☆☆

وادی رات کے اندھیرے میں گم تھی۔ایک سرد سکوت، روح کو بے کل و متوحش کر دینے والا سناٹا اور ویرانی ہر سو پھیلی ہوئی تھی۔کھیتوں کے سبزے اور پھولوں کی خوابیدگی سے گہری پر تاثر مہک فضا میں محو گردش تھی۔اردگرد کے بلند و بالا پہاڑوں سے گرتے آبشار و جھرنے جو دن کی روشنی میں نگاہوں کو تراوٹ و سرخوشی بخشتے تھے رات کی اس مہیب تاریکی میں ملفوف از حد ہیبت ناک لگ رہے تھے۔برف کی سفید ٹھنڈک ہوا میں گھلی ہوئی تھی۔کہر کی دبیز چادر سے ہر شے نمی میں بھیگی ہوئی تھی۔دھند میں لپٹے صاف و شفاف نیلے گگن پر چاندنی سے منور چاند کسی تھکے ہارے مسافر کی طرح آہستگی سے اپنی منزل کی طرف سفر میں تھا۔گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ ماحول میں برفیلی ٹھنڈک بڑھ رہی تھی۔ایسے سرد ترین موسم میں جہاں معمولی سی بے احتیاطی رگوں میں دوڑتے لہو کو برف کر دے وہ لمبا چوڑا وجود تمام سرد موسم کے تقاضوں سے یکسر بے نیاز کسی بے چین و بے قرار روح کی مانند کمرے سے نکل کر صحن میں ٹہل رہا تھا۔اس کے از حد سرخ چہرے سے درندگی و خشونت مترشح تھی۔بادامی آنکھیں خون چھلکاتی محسوس ہو رہی تھیں۔لاشعوری انداز میں وہ اپنی گھنی و سیاہ مونچھوں کو انگلیوں سے مسلسل بل دے رہا تھا اس کے انداز میں اضطراب و اضطرار بے انتہا تھا۔ وائٹ شلوار سوٹ پر مخصوص انداز میں چادر شانوں پر ڈالے اس کا بلند قامت و چٹانوں جیسا ٹھوس و مضبوط جسم نیم تاریکی میں بھی خاصا نمایاں تھا۔اس کے اٹھتے گرتے قدموں کی دھمک سے زمین لرز اٹھی تھی۔

''شمشیر خان! کیا بات ہے بچے! اتنی رات گئے اتنی سردی میں اس طرح گرم کپڑوں کے بغیر کیوں یہاں گھوم رہے ہو؟'' شہباز ولی خان تہجد کی نماز سے فارغ ہو کر حسب معمول حویلی کا راؤنڈ لگانے نکلے تو شمشیر کو وہاں دیکھ کر اس کے نزدیک آ کر گویا ہوئے اور اپنی گرم چادر اس کے گرد

پھیلا کر ڈال دی۔ وہ مکمل گرم کپڑوں میں ملبوس تھے۔ ''جو آگ میرے اندر بھڑک رہی ہے بابا جان! اس کے آگے ایسا ہزار ہا سرد برفیلا موسم کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ ایک ہفتہ گزر گیا ہے اور میرے دل سے یہ ملال نہیں جاتا کہ آپ۔۔۔ محض آپ کی وجہ سے میرا شکار میرے سامنے زندہ واپس لوٹ گیا۔ یہ میری زندگی میں پہلی دفعہ ہوا اور بہت برا ہوا ہے۔'' اس نے ایک جھٹکے سے شال اپنے جسم سے الگ کی تھی اور زخمی چیتے کی مانند غرایا تھا۔

''اوہ! شمشیر خان! تم ابھی تک اس بات کا سوگ منا رہے ہو؟ جو گزر گیا، وہ گزر گیا اور جو گزر جاتا ہے وہ واپس نہیں آتا خانان! پھر ہم سوگ کیوں منائیں۔'' انہوں نے ہلکے سے تبسم کے ساتھ اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے گمبھیر لہجے میں کہا۔

''نہیں بابا جان! شمشیر خان کا راستہ روکنے والا آج تک کوئی پیدا نہیں ہوا۔ کسی ماں نے اپنے بیٹے کو ایسا دودھ نہیں پلایا جو شمشیر خان کے مقابل آسکے۔ سرمئی پہاڑ پر شمشیر اپنی فتح کا جھنڈا لگا کر رہے گا چاہے اس کے لیے مجھے خون کی ندیاں بہانا پڑیں یا لاشوں کے انبار لگ جائیں۔'' اس کے لہجے میں سفاکی در آئی تھی۔ طاقت و دولت کے غرور و فخر سے اس کا وجود اکڑا ہوا تھا۔

''جو جنگیں عقل و ٹھنڈے مزاج سے لڑی جاتی ہیں ان میں ہمیشہ فتح و کامرانی قدم چومتی ہے۔ جلد بازی اور جذبات میں لڑی جانے والی جنگ ہمیشہ شکست و ذلت سے دوچار کرتی ہے اور ہمارے بڑوں پر بھی تمہاری طرح جذبات حکمرانی کرتے تھے۔ جلد بازی غیر دانش مندی ان کا شیوہ تھی۔ تو دیکھو آج وہ کہاں ہیں؟ جس زمین کے حصول کے لیے، جس پر قبضے کے لیے انہوں نے اپنی زندگیاں قربان کیں آج اس زمین کے نیچے کفن میں لپٹے پڑے ہیں۔ جس زمین پر وہ قبضہ چاہتے تھے اب ان کے جسم ان کی روحیں اس زمین کے قبضے میں ہیں اور اس زمین پر بھی دشمنوں کی حکمرانی ہے اور تم بھی جذبات و جلد بازی میں وہی حماقت کرنا چاہتے ہو جو ہمارے بزرگ کر کے قبروں میں جا سوئے۔ صبر سے کام لو صبر سے۔ لوہا گرم دیکھ کر چوٹ مارتے ہیں ورنہ خود چوٹ کھا بیٹھتے ہیں۔ سرمئی پہاڑ والی زمین ہماری ہوگی، ہمارے بڑوں کی قربانی رائیگاں نہیں جائے گی۔ وقت کا انتظار کرو بچے!'' ان کے پر جلال چہرے پر عزم اور لہجے میں پتھریلا پن تھا۔

''میرے بڑے بہادر و جی دار تھے۔ میں بھی ایسا ہی ہوں۔ مجھے جذباتی و جلد باز کہہ کر بزدلی و بے غیرتی کا سبق پڑھائیں مت۔ شمشیر خان صرف دو باتیں جانتا ہے۔ مارو یا مر جاؤ، تیسرا کوئی راستہ میرے پاس نہیں ہے۔ صبر وہ کرتے ہیں جو کمزور اور بزدل ہوتے ہیں اور میرا واسطہ کبھی ان چیزوں سے نہیں پڑا۔ یہ بات تو پتھر پر لکیر ہے بابا جان! شاہ بہرام خان کے بھتیجے سبریز خان کا نام مردوں کی فہرست میں لکھ دیا گیا ہے۔ میں نے کبھی اپنے دشمن کو معاف نہیں کیا ہے۔'' اپنی بات کے اختتام پر وہ دھم دھم کرتا راہداری کی طرف مڑ گیا جہاں اس کا کمرہ تھا۔ ولی شہباز خان کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔ انہیں اپنے بیٹے کی یہی سرکشی و دلیری از حد پسند تھی۔

''بڑے خان!'' انہوں نے بے ساختہ مڑ کر دیکھا۔ ستون کی اوٹ سے خانم گل نکل کر ان کے سامنے آئی تھی۔ سفید کشمیری چادر میں لپٹا ان کا پر نور و پر وقار چہرہ اس عمر میں بھی خاصا پرکشش و شاداب تھا۔ ایک لمحے کو ان کی نگاہیں شوہرانہ استحقاق کے ساتھ ان کے چہرے پر جمی تھیں مگر ان کے کپکپاتے ہونٹ اور پریشان کیفیت سے انہیں نگاہوں کے زاویے بدلنے پڑے پھر ایک دم ہی انہیں گل جانان کا خیال آ گیا تھا کہ اگر وہ اتفاقاً چلی آئی تو اس وقت بھی شور مچا کر سب کو اکٹھا کر لے گی اور وہ اس عمر میں اپنا یا خانم گل کا تماشا بنوانا نہیں چاہتے تھے۔ حالانکہ وہ کوئی غیر نہیں ان کی

بیوی تھی۔ ان کی چار بیٹیوں کی ماں تھی۔ مگر گل جاناں نے تو شادی کے بعد ان پر ایسے پہرے لگائے تھے، اتنی کڑی نگرانی رکھتی تھی کہ وہ کبھی ان سے دو گھڑی تنہائی میں بات نہ کر سکتے تھے۔ پھر گل جاناں کی قسمت اچھی تھی وہ یکے بعد دیگرے چھ بیٹوں کی ماں بن گئی اور اس کی حکمرانی ہر جگہ چھا گئی...... اور خانم گل کو انہوں نے ملازموں سے بھی بدتر مقام دیا تھا۔ وہ چھ بیٹوں کی ماں بن کر شہباز خان جیسے رعب و دبدبے والے آدمی پر راج کر رہی تھیں۔

شہباز خان کے مزاج و غصے سے پورا علاقہ خوف زدہ تھا۔ کسی میں جرأت نہ تھی ان کے آگے نگاہ اٹھا کر بات کر سکے۔ لوگوں کے آگے شیر نظر آنے والے شہباز خان دوسری بیوی کے آگے کبھی زبان نہ ہلا سکے۔ خانم گل کی حیثیت پہلے ہی تین بیٹیاں پیدا کرنے کے جرم میں بے وقعت تھی پھر شمشیر خان کی پیدائش کے سات سال بعد چوتھی مرتبہ بھی بیٹی ہی پیدا ہوئی تو ان کی حیثیت ان کی ذات شہباز خان کی نگاہوں سے بالکل ہی اوجھل ہو گئی۔ وہ اور چاروں بیٹیاں گھر میں پڑے کاٹھ کباڑ کی طرح حویلی کے ایک کمرے میں مقید ہو گئیں۔ یہ ساری چالاکی و سیاست گل جاناں کی تھی۔ شہباز خان کے کان بھر بھر کر ان ماں بیٹیوں کے خلاف انہیں کر دیا تھا اور انہوں نے بدظن ہو کر ان کی خبر گیری ہی چھوڑ دی تھی۔ گل جاناں یہی چاہتی تھی۔ انہوں نے پھر انہیں گھر کے کاموں میں لگا دیا۔

''کیا بات ہے خانم گل! اتنی رات گئے یہاں کیا کر رہی ہو؟'' انہوں نے دبے دبے انداز میں کہا۔

''میں تہجد کی نماز روزانہ یہیں پڑھتی ہوں خان! میں نے سب باتیں سن لی ہیں۔ شمشیر خان کے بڑھتے ہوئے قدم روک لو خان! ورنہ پھر راکھ میں دبی ہوئی چنگاریاں شعلے بن کر اٹھیں گی اور سب خاک ہو جائے گا۔ ایک صدی بعد آگ اور خون کے تماشے تھمے تھے۔ شمشیر خان پھر شعلوں کو ہوا دینا چاہتا ہے۔ اسے سمجھاؤ روک لو اسے۔ ورنہ پھر، ایک بار پھر، گھر برباد اور قبرستان آباد ہونے لگیں گے۔ بچے یتیم اور سہاگنیں بیوائیں ہو جائیں گی۔ زر و زمین کی ہوس نے کتنے جسموں کو نگل لیا ہے۔ لاتعداد جوانیاں، بے شمار بچپن وقت سے پہلے ہی قبروں کی تاریکیوں میں اتار دیے ہیں۔''

وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔ آنے والے وقت کی دہشت و خوف سے وہ زرد ہو رہی تھیں۔

''خاموش ہو بدبخت عورت! شمشیر خان، شیر خان ہے۔ اس کا مقابلہ کوئی نہیں کر سکتا۔ اب دشمنوں کے گھر برباد اور قبرستان آباد ہوں گے۔ میرا بیٹا اپنی فتح کا جھنڈا لگائے گا۔ سرمئی پہاڑ پر جو کام ان کے بڑے نہیں کر سکے وہ کر دکھائے گا۔'' شہباز خان پر یکلخت بیٹے کی زور آوری و سرکشی حملہ آور ہوئی تھی۔ انہوں نے تیزی سے قدم آگے بڑھا دیے تھے۔

☆☆☆

''آنٹی! طبیعت کیسی ہے اب؟'' درشہوار خشندہ بیگم سے پوچھنے لگی جو رات سے فلو اور ٹمپریچر کے باعث بستر پر دراز تھیں۔ یکارد اور سنبل ساتھ ہی اس کے اندر داخل ہوئی تھیں۔

''موسم نے پوری قوت سے حملہ کیا ہے بیٹا! پورے بدن میں درد ہے۔ آج تو مارکیٹ جانے کی بھی ہمت نہیں ہے۔ بہت ہمت کرنا چاہ رہی ہوں کہ بوتیک جا سکوں کیوں کہ کچھ کسٹمرز کو برائیڈل ڈریس دینے ہیں آج ضروری مگر......'' انہوں نے رومال سے اپنی رگڑنے سے سرخ ہوتی ناک رگڑتے ہوئے پریشان کن لہجے میں کہا۔ نقاہت و بخار کی کمزوری سے نڈھال نظر آ رہی تھیں۔

''ممی! آج ہم تینوں چلے جاتے ہیں بوتیک؟ آپ گھر پر آرام کریں۔''

''میں بھی یہی سوچ رہی ہوں۔ کیوں کہ فارحہ ڈیلنگ بہتر طور پر کر سکتی ہے۔ آپ کو بھی گائیڈ کرے گی۔ اگر کوئی پرابلم ہو تو مجھے کال کر کے ڈسکس کر سکتی ہو۔'' انہوں نے تکیے سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔

''اوکے مما! آپ پریشان مت ہوئیے گا ہم اچھی طرح سب کچھ سنبھال لیں گے۔'' تینوں نے باری باری ان کے رخسار چومے تھے۔ ان کے چہرے پر آسودہ مسکراہٹ تھی۔

''ورشا بیٹے! مجھے آپ کو بھیجنا مناسب نہیں لگ رہا۔'' انہوں نے کسی خیال کے تحت چونک کر کہا۔

''کیوں آنٹی! میں فارحہ، سنبل کی طرح ہی لڑکی ہوں۔'' اس نے رک کر سنجیدگی سے جواب دیا۔

''میں جانتی ہوں ورشا! مگر میری جان! ہمارا اسٹینڈرڈ آپ کے اسٹینڈرڈ سے کمپائن نہیں ہے۔ آپ کے پاپا اور بھائیوں کو خبر لگ گئی تو سمجھتی ہیں آپ کیا ہوگا؟''

''انہیں خبر کون دے گا؟ ایسی معمولی باتوں کی آپ پرواہ نہ کیا کریں آنٹی! جب تک تو میں آپ کے پاس ہوتی ہوں تو آپ ہی میں سے ہوں۔ فضول سوچوں کو دل میں جگہ نہ دیا کریں۔''

''خوش رہو! اللہ نے آپ کو چہرہ ہی نہیں دل بھی بہت خوب صورت دیا ہے۔ اوکے..... بائے۔''

انہوں نے بستر پر دراز ہوتے ہوئے انہیں خدا حافظ کہا۔ وہ تینوں کمرے سے نکل آئیں۔

ملازمہ کو مما کا خیال رکھنے اور پرہیزی کھانا پکا کر وقت پر کھلانے کی تاکید کرتی ہوئیں وہ گیراج میں کھڑی کار کی طرف بڑھ گئیں۔ ڈرائیور آج چھٹی پر تھا۔ کار ڈرائیو کرنے کی ذمے داری ورشا پر عائد ہوئی کیوں کہ اس نے پچھلے ماہ ہی موٹر ٹریننگ اکیڈمی سے ٹریننگ حاصل کی تھی۔ اسے بہت شوق تھا کار ڈرائیو کرنے کا۔ بہت ڈرتے ڈرتے اس نے ٹریننگ لی تھی۔

''ورشا! یاد رکھنا، ہمیں طارق روڈ چلنا ہے کہیں ''اوپر'' مت پہنچا دینا۔'' فارحہ نے اس کے برابر میں بیٹھتے ہوئے شرارت سے کہا۔

''یہ تمہاری لک ہے اگر اوپر کا ٹکٹ کٹ چکا ہوگا تو میں کیا کر سکتی ہوں۔'' ورشا نے ہنستے ہوئے کہہ کر کار اسٹارٹ کی اور تیزی سے گیٹ کی طرف بڑھ گئی۔

''او شٹ اپ! ایسے وقت ایسی منحوس باتیں کرنے کے بجائے اچھی باتیں کرو۔'' سنبل سہم کر بولی۔

''کلمہ پڑھنے سے اچھا اور بہتر کام بھلا کیا ہو سکتا ہے۔ اس لیے کہہ رہی ہوں کلمہ پڑھ لو۔''

''فارحہ..... فارحہ! میں چھلانگ لگا دوں گی کار سے اگر ایسی باتیں کرتی رہو گی تو۔''

''پھر تو کلمہ پڑھنا اور بھی لازمی ہے۔'' فارحہ کی شرارت پر سنبل غصے سے سرخ ہو رہی تھی جب کہ ورشا ہنس دی تھی۔ ان دونوں کی نوک جھوک کے درمیان راستہ طے ہو رہا تھا۔ ورشا کافی اعتماد سے کار ڈرائیو کر رہی تھی کیوں کہ وہ بوتیک اکثر ان کے ساتھ آتی رہی تھی۔ راستے اس کو ازبر تھے۔

''کراچی میں اکثر لڑکیاں، عورتیں کار ڈرائیو کرتی ہیں۔ مگر لوگ اتنی حیرانگی سے دیکھتے ہیں جیسے کوئی عجوبہ دیکھ لیا ہو۔ اور خصوصاً مرد حضرات کی نگاہوں و چہروں پر حیرانگی و دلچسپی از حد ہوتی ہے۔'' فارحہ نے اردگرد سے گزرتی گاڑیوں میں بیٹھے لوگوں کی نگاہوں کا تجزیہ کرتے ہوئے منہ بنا کر کہا۔ ورشا نے کارٹرن کرتے ہوئے اس کی بات کی تائید کی۔ بوتیک میں کپڑوں کی ورائٹی اعلیٰ اور موسم کے مطابق تھی۔ شادیوں کا سیزن بھی چل رہا تھا اس وجہ سے بھی کسٹومرز کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ آنے کے بعد انہیں ذرا بھی فرصت نہیں ملی تھی۔ فارحہ اور سنبل ڈریس سیکشن میں مصروف تھیں ساتھ ہی ان کے چار ہیلپر گرلز بھی تھیں۔ وہ آنٹی کی سیٹ پر بیٹھی تھی یعنی کسٹمرز سے کپڑوں کی ادائیگیاں وصول کر رہی تھی۔ دوپہر سے شام ہونے کو آئی تھی اور شام کے ساتھ کسٹمرز کی آمد و رفت مزید بڑھ گئی تھی۔ وہ کرسی پر بیٹھی چائے کے سپ لیتی ہوئی فارحہ، سنبل اور ان چاروں لڑکیوں کو دیکھ رہی تھی جو بڑی خوش دلی و خوش گفتاری سے ڈیلنگ کر رہی تھیں۔ معاً گلاس ڈور کھول کر اندر آنے والے ایک کپل کو دیکھ کر وہ چونک گئی۔ لائٹ گرے سے کوٹ سوٹ پر میچنگ ٹائی لگائے ہنستے مسکراتے دو کیوٹ سے بچوں کا ہاتھ پکڑے ساتھی خاتون سے باتیں کرتے شخص کو دیکھ کر اسے اپنی بصارت پر دھوکے کا گمان گزرا اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ وہ بچوں کا ہاتھ پکڑ کر چائلڈ پورشن کی طرف بڑھ گئے تھے۔ خاتون جو سرخ و سبز پرنٹ کے جدید سوٹ میں ملبوس تھیں خاصی ماڈرن و فیشن ایبل دکھائی دے رہی تھیں۔ تراشیدہ ڈائی کیے گئے بال شانوں سے بھی اوپر تھے۔ سفید چہرے پر از حد آسودگی و اطمینان موجزن تھا۔ ہونٹ اس کے سرخ لپ اسٹک سے خوب صورت لگ رہے تھے۔ گولڈ جیولری اس کی صاف رنگت پر خوب جچ رہی تھی۔ وہ لیڈیز پورشن میں ملبوسات کو جانچ رہی تھی۔ فارحہ اسے نئی ورائٹی سے متعارف کروا رہی تھی۔

''ہیلو میڈم! آپ ان کو جانتی ہیں شاید، یا پہچاننے کی کوشش کر رہی ہیں؟'' سیلز گرل جو مسلسل اس کی محویت اس طرف محسوس کر رہی تھی ایک دم اس سے مخاطب ہوئی۔

''آں..... ہاں جی مجھے ایسا لگ رہا جیسے میں نے انہیں کہیں دیکھا ہے مگر یاد نہیں آ رہا۔'' سیلز گرل کی پر اشتیاق آواز پر اسے اپنی حماقت و محویت کا احساس ہوا اس نے فوراً ہی نگاہوں کا زاویہ بدل کر بات بناتے ہوئے کہا۔

''یہ مسز مغیث خان ہیں۔ بہت کنجوس، نک چڑھی و بدمزاج عورت، اور اپنے شوہر پر حد درجہ شک کرتی ہیں کیوں کہ وہ ان کے مقابل بہت حسین اور خوبرو ہیں۔'' سیلز گرل اور بھی بہت کچھ کہہ رہی تھی مگر اس کے اردگرد تو جیسے سناٹے پھیل گئے تھے۔ وہ کسی تودے کی طرح کرسی پر ڈھے گئی۔ کسی خاتون کی آمد پر وہ لڑکی چلی گئی تھی۔ اس کی سماعتوں میں ایک ہی آواز گردش کر رہی تھی۔ مسز مغیث خان..... مسز مغیث خان! کتنا اندھوناک انکشاف تھا یہ۔

''ایکسکیوزمی مس!'' کچھ دیر بعد وہ کپڑوں کے ہینگرز اٹھائے اسی طرح بچوں کا ہاتھ پکڑے کاؤنٹر کے پاس کھڑے ہو کے اس سے مخاطب ہوئے تھے۔

''یس!'' اس نے چہرہ اٹھا کے سلگتی ہوئی نگاہیں ان کی طرف معنی خیزی سے ڈالی تھیں۔

''اوہ ورشا آفریدی تم!'' وہ قدرے بوکھلا کے، گڑبڑا سے گئے تھے۔

''جی..... شکر ہے آپ نے پہچان لیا ورنہ میں تو سمجھ رہی تھی پہچانتے سے ہی انکار کردیں گے۔'' وہ سیلز گرل کو وہ سوٹس پیک کرنے کا کہہ کر ان سے طنزیہ وشاکی لہجے میں مخاطب ہوئی۔

''ارے نہیں بھئی! میری یادداشت بہت پاورفل ہے اور تم تو میری سالی یعنی آدھے گھر والی ہو۔ تمہیں تو بھولنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' انہوں نے لہجے کے ہزاروں میں حصے میں اپنی حواس باختگی وخجالت پر قابو پالیا تھا اور بہت اعتماد وشگفتگی سے مخاطب ہوئے تھے۔

''بیوی اور ان دو بچوں کی موجودگی میں آپ کو ایسے الفاظ زیب نہیں دیتے مغیث لالہ!''

''اوہ! تم بغیر تعارف کے ہی سمجھ گئیں چلو اچھا ہوا تمہاری ذہانت وزیرک نگاہ کی داد دیتا ہوں مگر یہ تم نے کیا کہا ابھی؟ مجھے کیا زیب نہیں دیتا؟'' وہ کم فہم نہ تھے جتنا پوز کر رہے تھے۔

''آپ نے شادی کرلی ہو آپ ایک پیاری سی بیوی اور دو عدد خوب صورت بچوں کے باپ ہیں پھر اب کس بنا پر آپ مجھے پرانے رشتے کے حوالے سے یاد کر رہے ہیں؟'' اس نے پرائس سلپ بناتے ہوئے دبے دبے لہجے میں کہا۔ اس کا چہرہ دھواں دھواں تھا۔ نیلگوں آنکھوں میں نمی کی چمک تھی۔

''یہ شادی میری ضرورت تھی۔ مجبوری تھی میری۔ یہاں میرا بزنس ہے گھر ہے۔ وسیع حلقہ احباب ہے جو میں تنہا نہیں سنبھال سکتا تھا۔ سو مجبوراً مجھے یاسمین سے شادی کرنی پڑی۔ میری اصل شریک حیات تو سحادیہ ہی بنے گی.... بس ذرا.....''

''شٹ اپ مغیث لالہ! کوئی اختیار نہیں ہے آپ کو میری بہن کا نام اپنی زبان پر لانے کا۔ میری بہن اتنی خود غرض و بے ضمیر نہیں ہے کہ اپنی مسرتوں کا تاج محل کسی کے مقبرے پر بنائے۔''

''مجھ پر پہلا حق سحادیہ کا ہی ہے ورشے! وہ میری بچپن کی منگیتر ہے.....''

''ہونہہ..... کتنا مضحکہ خیز تصور ہے۔ ایک شادی شدہ دو بچوں کے باپ کا منگنی شدہ ہونا۔'' اس نے نفرت سے ہونٹ بھینچ کر کہا۔ پر پل دوپٹے کے ہالے میں اس کے چہرے پر شدید طیش وکبیدگی تھی۔

''یہ بڑوں کے فیصلے ہیں جو تمہاری سمجھ میں نہیں آئیں گے۔ سحادیہ کو موت مجھ سے جدا کر سکتی ہے اور کسی میں دم نہیں جو اسے مجھ سے جدا کر دے۔ بہر حال یہ باتیں ابھی تمہاری سمجھ میں نہیں آئیں گی یہ بتاؤ، یہ گھٹیا جاب تم کیوں کر رہی ہو؟ مجھے یہ تو معلوم تھا تم یہاں پڑھنے آئی ہو مگر یہ جاب.....''

''میں جاب نہیں کر رہی ہوں۔'' اس نے ان کی غلط فہمی رفع کرنے کے لیے بتایا کہ وہ کس وجہ سے آئی ہے۔

''شہروز خان کی پوتی، شہباز خان کی بیٹی، شمشیر خان کی بہن کے شایان شان یہ دو ٹکے کی جگہ سراسر توہین ہے یہ تم حاکموں کی اولاد ہو ورشا! یہ محکوموں جیسا شوق کیوں اٹھا تمہیں؟''

''مغیث لالہ! آپ میرے محسنوں کی بے عزتی کر رہے ہیں۔ یہ جگہ آپ جسے دو ٹکے کی کہہ رہے ہیں اس مارکیٹ کی سب سے مہنگی و اعلیٰ بوتیک ہے۔ اس کی ویلیو لاکھوں میں ہے۔''

''لیکن تمہارے شایانِ شان ہرگز نہیں ہے۔ تمہارے پاپا اس جیسی دس مارکیٹیں خرید سکتے ہیں۔''

''یہی بدقسمتی ہے ہماری لالہ! حویلی والوں کے دل محبتوں سے خالی ہیں۔ ان کے لاکرز ہیروں سے بھرے ہوئے ہیں اور آپ کو تو میں حویلی کے خود ساختہ خداؤں سے مختلف سمجھتی تھی مگر آپ تو اعلیٰ انسان بھی نہیں نکلے لالہ! اپنے نفس، خواہشات و خود غرضی و خود پسندی کے بت کی پوجا کرنے والے ارزاں ترین انسان ہیں آپ!'' اس کی نگاہوں کی کاٹ اور آنکھوں سے نکلتی حقیر نے لمحے بھر کو ان کی خود اعتمادی و چرب زبانی ہوا کر دی تھی۔

''ورشا! حد میں رہو اپنی۔ جانتی ہو کس سے مخاطب ہوا؟''

''میں جوتے کی ٹھوکر مارتی ہوں ایسے رشتے پر۔ کبھی معاف نہیں کروں گی آپ کو۔ شادی کر کے باپ بن کر عیش و عشرت میں زندگی گزارنے کے باوجود خود کو مجبور و مظلوم سمجھ رہے ہیں۔ آپ اُدھر میری بہن کو برسوں سے انتظار کی سولی پر لٹکا رکھا ہے آپ نے۔ آپ معاف کرنے کے قابل نہیں ہیں۔'' اس نے بمشکل اپنی آواز پر قابو رکھا ہوا تھا۔ سخاویہ کا گلابی چہرہ اس کی نگاہوں میں گھوم رہا تھا۔ وہ تین سال سے مغیث کا انتظار کر رہی تھی اور وہ یہاں لائف انجوائے کر رہا تھا۔

مغیث گھبرائی ہوئی نگاہوں سے اس طرف آتی اپنی بیوی کو دیکھ رہا تھا جس نے کئی سوٹ اٹھائے ہوئے تھے اور اسے ورشا سے باتیں کرتے دیکھ کر حسبِ عادت اس کی تیوریاں چڑھ گئی تھیں۔ ورشا نے بھی مجبوراً اپنا موڈ خوش گوار کیا تھا۔ بہر کیف خاندانی رنجشیں وہ سرِعام لانا نہیں چاہتی تھی۔

''کیا بات ہے؟ اتنی دیر سے میں نوٹ کر رہی ہوں تم یہیں جمے ہوئے ہو۔ یہ تمہاری چیپ عادت کب ختم ہوگی؟ جہاں کوئی خوب صورت چہرہ دیکھا وہیں پھسل گئے۔ لعنت ہے تمہاری اس عادت پر۔'' انہوں نے ایک جھٹکے سے سارے سوٹ کاؤنٹر پر رکھے تھے اور خاصے جارحانہ تیوروں سے مغیث سے مخاطب ہوئی تھیں۔ واقعی وہ خاصی تیز و طرار، منہ پھٹ و بد دماغ، شکی عورت تھی۔ سیلز گرل نے فٹافٹ سوٹوں کی پیکنگ شروع کر دی تھی۔ سلپ بناتی ورشا نے تمسخرانہ نگاہ مغیث پر ڈالی تھی۔ اس کے اندر کہیں لمحے بھر کو ٹھنڈک سی پڑی تھی۔

''بیگم! یہ میری بہنوں جیسی ہے۔'' وہ دم دبا کر منمنائے تھے۔

''ہونہہ.... پہلے سب بہنوں جیسی ہوتی ہیں۔ بیویوں جیسی تو بعد میں بنتی ہیں۔'' وہ غرا کر بولی۔ ''چلو بچوں کو لے کر جاؤ میں پے منٹ کر کے آتی ہوں۔'' حکم سنتے ہی مغیث بچوں کو لے کر آگے بڑھ گئے۔ ان محترمہ نے کافی نخوت بھرے انداز میں پے منٹ کی پھر ایک سرد نگاہ ورشا کے چہرے پر ڈال کر گیٹ کی طرف بڑھ گئی۔ ورشا نے گہری سانس لیتے کر سر کرسی سے ٹکا دیا۔ اس کا ذہن ابھی تک نارمل نہیں ہوا تھا۔ وہ لاشعوری طور پر بازغہ کا موازنہ سخاویہ سے کر رہی تھی غیر جانب داری سے مگر ہر بار پلڑا سخاویہ کا بھاری تھا۔ خوب صورتی و خوب سیرتی میں، عادات و مزاج میں، گفتار و اخلاق میں۔ بازغہ سب میں کوری تھی پھر کیوں مغیث لالہ نے ہیرے کو چھوڑ کر پتھر کا انتخاب کیا ہے؟ اور کیسے بے دام ہو کر غلام بنے ہوئے ہیں۔ مردانگی و حمیت جیسے بالکل ہی فروخت کر ڈالی ہو۔ اس کی سوچوں کا دائرہ ان کے گرد ہی گردش کر رہا تھا۔

رات نو بجے کے بعد وہ گھر کے لیے روانہ ہوئی تھیں۔ فارحہ اور سنبل پوری طرح تھک گئی تھیں مگر خوش بھی بہت تھیں کہ آج سیل بہت اچھی

ہوئی تھی۔ واپسی میں بھی وہی کار ڈرائیو کر رہی تھی مگر اب اس کے ذہن پر الجھنوں کے جال بچھے ہوئے تھے۔ ان دونوں کی بھی باتوں کا جواب وہ غائب دماغی سے دے رہی تھی۔ آج سردی میں اضافہ ہوا تھا۔ باہر سے سرد ہوا کے جھونکے اندر آ رہے تھے۔ ماحول پر خاموشی کا راج تھا۔ سخت سردی کے باعث ٹریفک بھی برائے نام تھی۔ گلشن اقبال کی طرف جانے والی سڑک پر اکا دکا کاریں تھیں۔ فارحہ کے کہنے پر اس نے شارٹ کٹ لے کر کار موڑ دی تھی۔ یہاں سے گھر جلدی آجاتا تھا کیوں کہ اس طرف پارک اور کھیل کا میدان تھا جس کے درمیان سے جاتی پتلی سی سڑک اکثر خالی رہتی تھی شام کے وقت یہاں خوب رونق ہوتی تھی۔ اس وقت یہاں صرف واک کے شوقین لوگ ٹہلتے نظر آتے تھے ورنہ راستہ کلیر رہتا تھا۔ سو اس وقت وہاں بالکل خاموشی تھی۔ اسٹریٹ لائٹ کی روشنی میں سیاہ سڑک چمک رہی تھی۔

ورشا کی خاموشی محسوس کر کے وہ دونوں بھی خاموش ہو گئی تھیں۔ ورشا راستہ کلیر دیکھ کر فل اسپیڈ میں کار دوڑا رہی تھی۔ ان کے دماغ پر سیاہ آندھی کے جھکڑ ابھی بھی پوری رفتار سے قیامت مچا رہے تھے۔ وہ سوچ رہی تھی۔ بالفرض محال سجادیہ کو اگر مغیث خان شادی کر کے لے آتا ہے تو اس کے گھر میں پہلی خون خوار و جلاد نما بیوی کی موجودگی میں اس کا کیا مقام ہوگا؟ کیا اسے گھر کی مالکن اور بیوی کے حقوق باعزت طریقے سے مل سکیں گے؟ بازغہ اسے سوکن کے روپ میں برداشت کرے گی؟ مغیث لالہ سجادیہ کو خوش حال و پر اعتماد زندگی دے سکیں گے؟ وہ شخص جو بیوی کے آگے زر خرید غلام کی مانند حکم کا منتظر رہتا ہو، بچوں کو باپ کی طرح نہیں ملازم کی طرح سنبھالتا ہو، وہ بھلا اتنی جرات کہاں کر سکتا ہے کہ دوسری بیوی کو اعتماد و تحفظ دیا عزت مقام دے سکے۔ مگر یہ بھی حقیقت تھی ان کی اٹل روایت تھی کہ جو لڑکی ایک بار کسی مرد کے نام سے منسوب ہو جائے پھر وہ آخری سانس تک اس کی ملکیت رہتی ہے۔ دوسری صورت میں بات خون خرابے تک جا پہنچتی ہے اور خاندان میں ایک سے زائد شادیاں کرنا باعث فخر سمجھا جاتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ مغیث لالہ نے اگر مزید شادیاں اور بھی کر ڈالیں تو کوئی برا نہیں سمجھے گا۔ سجادیہ ان کے نام پر بیٹھی رہے گی۔

”اوہ! ورشا! بریک لگاؤ سامنے بائیک پر تین اشخاص ہیں۔“ فارحہ کی متوحش چیخ اسے حواسوں میں لائی۔ ان سے کچھ ہی فاصلے پر بائیک تھی جو شاید ابھی سائیڈ سے نکل کر سامنے آئی تھی۔ اس نے گھبرا کر بہت تیزی سے بریک لگائے تھے۔ کار خوف ناک چرچراہٹ کی آوازیں نکالتی رکتے رکتے بھی بائیک سے ٹکرا گئی تھی۔ ان کی لاشعوری انداز میں نکلنے والی چیخوں کی آواز میں بائیک سے گرتے ان لوگوں کی آواز دب گئی تھی۔ کار بہت آہستگی سے بائیک سے ٹکرائی تھی پھر بھی زوردار طریقے سے سلپ ہوئی تھی۔ ان تینوں نے برق رفتاری سے دروازے کھولے تھے اور بھاگ کر ان تینوں کی طرف بڑھی تھیں جو ٹیڑھے میڑھے انداز میں سڑک پر پڑے تھے۔ بائیک ان سے کچھ فاصلے پر گری ہوئی تھی۔

”ورشا! مجھے تو ڈر لگ رہا ہے کہیں یہ مر نہ گئے ہوں۔“ فارحہ نے کانپتے ہوئے خوف زدہ نگاہ ان تینوں پر ڈالتے ہوئے کپکپاتے لہجے میں کہا۔

”فا... فا... فارحہ... خدا ایسی باتیں نہیں کرو اگر یہ تینوں مر گئے تو مجھے پھانسی ہو جائے گی۔“ ورشا کا چہرہ لٹھے کی طرح سفید ہو گیا تھا اس کی نیلی آنکھوں میں وحشت و دہشت چمک رہی تھی۔ ”ہاں اور پھانسی کے بعد معلوم ہے چہرہ کیسا ہو جاتا ہے؟ ایسا۔“ سنبل نے پوری زبان باہر لٹکا کر آنکھیں بری طرح پھاڑتے ہوئے بے جان ہو کر بتایا۔ کوئی اور موقع ہوتا تو اس کی شکل دیکھ کر وہ لوٹ پوٹ ہو جاتیں مگر اس وقت خوف سے تھر تھر کانپنے لگیں۔

”ایسا کرتے ہیں بھاگ چلتے ہیں۔ ہمیں کسی نے نہیں دیکھا۔“ فارحہ نے تجویز دی۔

''نہیں...... یہ انسانیت واخلاقیات کے خلاف ہے اور ہمارا ضمیر کبھی اس جرم کو معاف نہیں کرے گا۔ انہیں دیکھتے ہیں شاید زندہ ہوں۔''

ورشا جو اپنے خوف پر قابو پا چکی تھی پر امید لہجے میں بولی۔

''ہاں یہ درست ہے۔'' وہ دونوں بھی آگے بڑھ کر ان کی طرف جھکی تھیں۔ ان میں دو خاصے اسمارٹ نوجوان تھے جو ایک دوسرے سے فاصلے پر تھے اور ایک بھاری جسامت کا شخص ٹرک کے سائیڈ میں پڑا تھا۔ ورشا ان کی طرف بڑھی اور خاصی جدوجہد کے بعد اس شخص کو سیدھا کر پائی۔ اس کی شکل دیکھ کر وہ چونک پڑی۔ وہ آفتاب تھا جو بے ہوش پڑا تھا حالانکہ چوٹ اس کے کہیں بھی نہیں آئی تھی۔

''فارحہ! یہ آفتاب ہے۔'' اس نے حیرانگی سے چیخ کر کہا۔

''یہ باسط ہے۔'' فارحہ کی آواز میں حیرانگی تھی۔ ''اس کے بھی چوٹ نہیں لگی مگر بے ہوش ہے۔''

''اور یہ صارم ہے۔'' سنبل کے لہجے میں ایسی سرخوشی تھی جیسے اس نے کوئی نیا سیارہ دریافت کر لیا ہو۔

''یہ تینوں یہاں کیا کر رہے تھے؟'' ورشا نے کھڑے ہوتے ہوئے جھنجلاہٹ سے کہا۔

''یہ بھی ہماری طرح گھر جا رہے ہوں گے۔ اوہ! صارم کو ہوش آ رہا ہے۔'' فارحہ نے تیز لہجے میں کہا۔ ورشا بھی بے اختیار آگے بڑھی تھی اور جھک کر اس کے چہرے کو دیکھنے لگی جو کچھ بے چین سا ہو رہا تھا پھر تیزی سے اس نے آنکھیں کھول دی تھیں۔ عین نگاہوں کے سامنے ورشا کا چہرہ تھا۔

لازم نہیں کہ اس کو بھی میرا خیال ہو
جو میرا حال ہے وہی اس کا بھی حال ہو
کوئی خبر کہیں سے خوشی کی ملے منیر
ان روز و شب میں ایک دن ایسا کمال ہو

اس نے اپنے مخصوص انداز میں بیٹھتے ہوئے شعر پڑھا۔ ورشا کو جہاں اسے زندہ و سلامت دیکھ کر اطمینان ہوا تھا، وہیں اس کی بے ہودہ گوئی سے سخت چڑ ہوئی تھی۔ وہ ناگواری سے منہ بناتی ہوئی پیچھے ہٹ گئی۔

''صارم بھائی! کیسے ہیں آپ؟ چوٹ تو نہیں آئی آپ کے کہیں؟'' فارحہ اور سنبل نے جھٹ ''بھائی'' کا اضافہ کیا۔ اس اثنا میں وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا اور اپنے ساتھیوں کو دیکھ رہا تھا۔

''نہیں جناب چوٹ نہیں آئی اچانک گرنے کے باعث سر پہ چوٹ لگی تھی جس سے دماغ ماؤف ہو گیا تھا۔ یہ ری بائیک کو ٹکر آپ نے ماری ہے؟'' اس نے باسط کو جھنجوڑتے ہوئے استفسار کیا۔

''جی...... وہ آپ اچانک ہی سامنے آ گئے تھے۔ ورشا نے بریک تو لگایا تھا مگر پھر بھی......''

''کار وہ محترمہ ڈرائیو کر رہی تھیں؟ جس طرح نیم حکیم جان کے لیے خطرہ ہوتا ہے اس طرح نیم ڈرائیور بھی زندگی داؤ پر لگا دیتے ہیں۔'' اس نے کن انکھیوں سے ورشا کو دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔

''آہ....آہ! میں کہاں ہوں؟'' اسی ساعت باسط کو ہوش آ گیا تھا۔

''بیٹا! یہیں ہیں آپ! جنت میں جاتے جاتے واپس دنیا میں لوٹ آئے ہو۔'' صارم نے اسے سہارا دے کر بٹھاتے ہوئے مسکراتے ہوئے کہا۔ باسط ان تینوں کو دیکھ کر حیران ہو گیا تھا۔ اس کو مختصراً صارم نے تفصیل بتائی تھی اور اسے کچھ اشارے کر کے آفتاب کی طرف بھیجا۔

''بائی دا وے! آپ کو ڈرائیونگ لائسنس اللہ دِکّل نے کیا ہے؟'' وہ کار کے پاس کھڑی ورشا سے مخاطب ہوا تھا۔ اُن کی نگاہوں میں وہی روشنی و شوخی تھی جس سے وہ چڑتی تھی۔

''دیکھیے مسٹر! غلطی میری نہیں تھی۔ آپ کو ہارن دے کر سڑک پر آنا چاہیے تھا۔ جس طرح آپ آئے ایسی بلائنڈ موڑ پر ایسے ہی ایکسیڈنٹ ہوتے ہیں۔'' اس کے لہجے میں بڑا اعتمادی تھی۔ صارم کی نگاہیں اس کے کاسنی دسیاہ سوٹ میں ملبوس دل کش سراپا میں الجھ رہی تھیں۔ جب کہ باسط، آفتاب کو ہوش میں لانے کی کوشش کر رہا تھا اور آفتاب اسی طرح بے حس و حرکت پڑا تھا۔ فارحہ اور سنبل کے ساتھ ساتھ ورشا کے چہرے کا رنگ بھی متغیر ہوتا جا رہا تھا۔

''صارم بھائی! آفتاب صاحب کو ہوش کیوں نہیں آ رہا؟ ٹائم گزرتا جا رہا ہے۔ گھر پر ممی ڈیڈی ہمارے لیے پریشان ہو رہے ہوں گے پلیز کچھ کیجیے۔'' سنبل نے رندھے ہوئے لہجے میں اس سے کہا۔

''پریشانی کی تو بات ہے۔ آفتاب کو ہوش کیوں نہیں آ رہا؟'' وہ بھی متفکر سا آگے بڑھ کر اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگا۔ مگر آفتاب اسی طرح بے حس و حرکت تھا۔

''آفتاب! او آفتاب آنکھیں کھول یار۔ اب تنگ نہ کر، ہوش کر۔'' وہ دونوں ہی پریشانی سے اسے آوازیں دے رہے تھے۔ آفتاب کی بے ہوشی ہنوز برقرار تھی۔

''صارم! کیا ہو گیا میرے یار کو؟'' باسط گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔

''کیا ہوا آفتاب کو؟ اسے ہوش کیوں نہیں آ رہا؟'' وہ تینوں ہی از حد پریشان تھیں۔

''لگتا ہے یار آفتاب اپنا ساتھ چھوڑ گیا۔'' باسط اس کے سینے کے دائیں سائیڈ ہاتھ رکھ کر بلبلا کر گویا ہوا۔ ان تینوں کو اپنا سانس رکتا ہوا محسوس ہوا۔

''بکواس مت کر یار! اتنی جلدی ہمیں چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔'' صارم سخت تشویش ہوا۔

''اس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر دیکھ یار! دل بالکل خاموش ہے۔'' باسط کراہا۔

''اوہ! ہاں.....یہ کیا کیا تو نے آفتاب! ہمیں اتنی جلدی چھوڑ کر چلا گیا۔ ارے ریس میں تو ہمیشہ ہم سے ہارتا تھا پیچھے رہ جاتا آج اتنی بڑی جمپ لگائی تو نے سیدھا اوپر پہنچ گیا۔

''ارے میری جان! اس بیوی کا کیا ہوگا تیری جو بیوی بننے سے قبل ہی بیوہ بن گئی۔''

''ان بچوں کا کیا ہوگا؟ جو دنیا میں آنے سے قبل ہی یتیم ہو گئے۔'' صارم اور باسط عورتوں کی طرح دہائیاں دے کر خشک آنکھوں سے رو رہے تھے۔

''کیا..... کیا؟ ان کا انتقال ہو گیا؟'' ورشا حواس باختگی سے دونوں سے مخاطب ہوئی۔

''ہاں قسمت دیکھیے اس کی بیوی کو پیارا ہونے سے قبل ہی اللہ کو پیارا ہو گیا۔ آپ نے ایسی ٹکر ماری جان ہی لے لی غریب کی۔'' باسط کی آواز اسے دور سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔ پھانسی کا پھندا اسے اپنے گلے میں پڑا ہوا محسوس ہونے لگا۔ نگاہوں کے سامنے اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ اس کا دم بہت زور سے گھٹا تھا۔ دوسرے لمحے اس کے حواس ساتھ چھوڑ گئے اور وہ بے جان مورتی کی طرح گرنے لگی تھی۔

☆☆☆

''ورشا..... ورشا! پلیز ہوش میں آؤ۔'' فارحہ اور سنبل پریشانی و فکر مندی سے اس پر جھکی ہوئی تھیں۔ صارم کی مدد سے وہ گھر پہنچی تھیں۔ وہ انہیں یہاں چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ اسے آفتاب کو بھی اسپتال پہنچانا تھا۔ ان دونوں نے روتے ہوئے اس کی منت سماجت کی تھی کہ وہ پولیس میں رپورٹ نہ کر دیں اور انہوں نے تسلی دی تھی وہ ایسا نہیں کریں گے۔ مگر وہ دونوں از حد خوف زدہ و پریشان تھیں۔ ایک آدمی کا قتل ہونا یا حادثے میں ہلاک ہو جانا دو واقعات کا انجام ایک ہی تھا یعنی موت تو واقع ہو چکی تھی اور موت بھی حادثاتی، جو کسی جرم سے عبارت تھی۔ ان خیالات نے ہی انہیں متوحش و حواس باختہ کر رکھا تھا۔ ورشا کو ڈاکٹر سجاد جو کہ ان کے فیملی ڈاکٹر تھے، سکون کا انجکشن لگا کر جا چکے تھے۔ ان کے کہنے کے مطابق وہ بے حد ذہنی دباؤ کے باعث بے ہوش ہوئی تھی۔

ساری رات ان کی اسی پریشانی میں گزری تھی۔ اب صبح ہو جانے کے باوجود اس کی حالت ہنوز وہی تھی۔ وہ دونوں از حد پریشان ہو رہی تھیں۔

''فارحہ! یہ نہیں اٹھ رہی، کیا کریں؟'' سنبل بھرائے لہجے میں گویا ہوئی۔

''میرے خیال میں ایک گھنٹہ اور انتظار کرتے ہیں۔ مما چلی جائیں پھر ڈاکٹر صاحب کو دوبارہ کال کر کے بلاتے ہیں۔ تم مما کے پاس چلی جاؤ، ہم تینوں کو کمرے میں دیکھ کر وہ پریشان ہوں گی۔''

''اوکے۔ مما تو صورت حال سے بے خبر ہیں۔ رات کو آئے تھے تو وہ سو رہی تھیں۔ اب بھی اگر مما کو بتا دیں تو سمجھو قیامت ہی آ جائے گی۔ میں منہ ہاتھ دھو لوں پھر جاتی ہوں، یونی ورسٹی نہ جانے کا کوئی بہانہ کرنا پڑے گا۔''

فارحہ ورشا کے قریب ہی لیٹ گئی۔ وہ بھی سنبل کی طرح گم صم و متفکر تھی۔ ایک ہی رات میں تفکرات، اضطراب، ذہنی الجھنوں اور خوف و ہراس نے ان کے چہروں کی شادابی و شگفتگی نچوڑ کر رکھ دی تھی۔ گھبراہٹوں، وحشتوں، توہمات نے ان کے چہروں کی رنگت میں زردیاں بھر دی تھیں۔ دوسرے احساسات سے وہ بے بہرہ تھیں۔

''گڈ مارننگ مائی چارمنگ گرلز! دس بج رہے ہیں اور آپ لوگ ابھی تک اپنے کمروں میں ہیں۔''

لائٹ پرپل جارجٹ کی وہائٹ بارڈر والی ساڑھی میں ملبوس سادہ سا جوڑا بنائے۔ سادے فریش چہرے پر مخصوص دھیمی و پر شفقت

مسکراہٹ سجائے وہ کمرے میں از خود چلی آئی تھیں۔

''گڈ مارننگ مما! ہم ابھی آ رہے تھے۔'' دونوں نے بیک وقت کہا تھا کیوں کہ سنبل باتھ روم سے نکل آئی تھی۔

''ارے، ورشا ابھی تک نہیں اٹھی ہیں؟ خیریت ہے؟ طبیعت ٹھیک ہے نا؟'' وہ پریشان سی آگے بڑھ کر اس کی پیشانی چھو کر اطمینان کرنے لگیں۔

''یس مما! ورشا ٹھیک ہے۔ بس تھکن بہت زیادہ محسوس کر رہی تھی۔ میں نے اٹھایا نہیں کہ اچھا ہے سو کے اٹھے گی تو تھکن بھی اتر جائے گی اور طبیعت بھی فریش ہو گی۔''

''اچھا کیا۔ بلکہ مجھے تو آپ دونوں بھی بہت تھکی تھکی نڈھال لگ رہی ہیں۔ ایک ہی دن میں چہرے مرجھائے ہوئے پھولوں کی طرح بے رنگ ہو رہے ہیں اور آنکھوں میں لگتا ہے لوڈشیڈنگ کا پروگرام طویل ہے۔'' انہوں نے ممتا بھرے انداز میں ان کے چہروں اور آنکھوں کی ویرانی و بے خوابی کا تجزیہ کیا۔

''نو مما! ایسی بات نہیں۔ دراصل ہمیں عادت نہیں ہے بوتیک ڈیل کرنے کی۔ فرسٹ ٹائم تو ایسی کنڈیشن ہوئی ہے۔ اب ہم نے فیصلہ کیا ہے ہفتے میں دو دن ہم بوتیک جایا کریں گے تاکہ آپ کو سپورٹ بھی ملے اور ہمیں تجربہ بھی حاصل ہو گا پھر ہم رفتہ رفتہ ایکسپرٹ ہو جائیں گے۔''

''اوہ نو... تھینکس مائی ڈیئرز! پہلے آپ اپنی ایجوکیشن کمپلیٹ کریں پھر دیکھا جائے گا۔ سنبل آپ میرے ساتھ کچن میں آ جاؤ۔ آج زہرا نہیں آئی ہے۔ آپ کے ڈیڈی پراٹھے کھانا چاہ رہے ہیں۔ فارحہ آپ ورشا کے پاس ہی ٹھہرو میں آپ دونوں کا ناشتہ یہیں بھیج دوں گی۔'' وہ اپنی سادہ مزاجی کے باعث ان کی پریشانی رفع کر گئی تھیں۔ سنبل اور فارحہ نے اطمینان بھری نگاہوں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔

''مما! آپ آج اور ریسٹ کر لیتیں، ابھی آپ کی طبیعت مکمل طور پر سیٹ نہیں ہوئی۔''

''اب کل کے مقابلے میں تو کافی بہتر ہوں۔ زکام تو مجھے سرد موسم میں ہمیشہ سے رہتا ہے اب یہ دو تین ماہ ہی ہم گارمینٹس والوں کے سیل کے دن ہوتے ہیں۔ میں چھٹی کر کے نقصان نہیں کرنا چاہتی۔'' وہ سنبل کے ساتھ باتیں کرتی ہوئی کمرے سے چلی گئیں۔ فارحہ نے جو ان کو دیکھ کر چہرے پر بمشکل بشاشت پیدا کی تھی ان کے جاتے ہی وسوسے و اندیشے پوری طاقت سے وارد ہوئے تھے۔

ناشتے سے فارغ ہو کر مما، ڈیڈی چلے گئے تھے۔ سنبل ملازماؤں سے صفائی اپنی نگرانی میں کروا کر واپس اپنے کمرے میں آ گئی۔ فارحہ کی حالت ورشا کو دو گھنٹے گزرنے کے باوجود بھی بے سدھ پڑے دیکھ کر ابتر ہو چکی تھی۔ سنبل بھی متفکر سی اس کے نزدیک بیٹھ گئی اور آہستگی سے اسے جھنجوڑتے ہوئے پکارنے لگی۔

''ورشا...... ورشا! آنکھیں کھولو نا۔'' فارحہ نے ٹھنڈے پانی کے چھینٹے اس کے چہرے پر ڈالے۔ گرم بستر میں ٹھنڈے پانی کی تاثیر نے اس کے سوئے ہوئے اعصاب بیدار کر ڈالے تھے۔ پہلے تو وہ آنکھیں کھولے چند ثانیے ان کے سوگوار و بدحواس چہرے دیکھتی رہی جنہوں نے اسے آنکھیں کھولتے دیکھ کر اطمینان کا سانس لیا تھا۔ پھر جیسے ذہن بیدار ہوتے ہی تمام احساس بیدار ہو گئے تھے۔ وہ فوراً اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"مجھے یہاں کون لایا؟ اور آفتاب کا کیا ہوا؟" اس نے اٹھتے ہی کئی سوال متوحش ہو کے ان دونوں سے پوچھے۔

"تھینکس گاڈ! تم اٹھ کر تو بیٹھیں ورنہ تم نے تو ہماری جان نکال رکھی تھی۔" سنبل نے دعائیہ انداز میں ہاتھ اوپر کی طرف پھیلا کر تشکر بھرے انداز میں چہرے پر پھیرے۔

"اب اٹھ جاؤ دوپہر ڈھلنے کو ہے۔ کچھ کھا پی لو۔ ہم نے کچھ نہیں کھایا پیا۔" فارحہ نے اسے تمام تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔ جب کہ وہ کچھ لمحے قدرے گم صم سی ہو کر رہ گئی تھی۔

"کیوں نہ کال کر کے پوچھیں کہ وہاں کیا صورت حال ہے؟ شاید آفتاب کو اب تک سپرد خاک....."

"پلیز فارحہ! اس طرح مت کہو، بلکہ..... بلکہ مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے ہم سوچی سمجھی اسکیم کے تحت بے وقوف بنائے گئے ہیں۔" درشا کچھ سوچتے ہوئے گویا ہوئی۔

"کیا مقصد؟" وہ دونوں اس کے انداز پر سراسیمہ ہو کے چیخیں۔

"اوہ..... بس مجھے یاد آ رہا ہے۔ ایسا کچھ نہیں ہوا جیسا ہمیں بتایا گیا ہے بلکہ پھنسایا گیا ہے۔"

"بھئی! ہمیں بھی تو کچھ بتاؤ خود ہی قیاس کے گھوڑے دوڑا رہی ہو۔" سنبل تجسس سے بولی۔

"بتاتی ہوں، بس صبر کرو۔" اس نے قریب اسٹینڈ پر رکھے فون کی طرف بڑھ کر نمبر ڈائل کیے تیسری بیل پر ریسور دوسری جانب سے اٹھایا گیا اتفاقاً سفیرہ نے فون ریسیو کیا تھا۔

"تم تینوں کل سے کہاں غائب ہو؟ آج بھی یونیورسٹی نہیں آئی ہو۔" دوسری طرف سے اس کی دھاڑتی ہوئی آواز سنائی دی۔ فارحہ اور سنبل بھی پر تجسس سی اس کے سر سے سر جوڑے کھڑی تھیں۔

"یہ بعد میں بتاؤں گی پہلے یہ بتاؤ آفتاب آج جامعہ آیا تھا؟"

"اوہ! خیریت؟ یہ آج آفتاب کے متعلق کیوں پوچھا جا رہا ہے؟ تم اس گروپ سے خار کھاتی ہو بلکہ صف اول کی دشمن ہو۔" سفیرہ کی معنی خیز شرارت اسے تپا گئی۔

"ہر وقت احمقوں کی طرح بلا سوچے سمجھے مت بولا کرو۔ بتاؤ وہ آج آیا تھا یا نہیں؟"

"ہاں بھئی! وہ آیا تھا بلکہ آج ان کا پورا گروپ بہت خوش تھا۔ سارا وقت کینٹین اور لان میں ان لوگوں کے قہقہے گونجتے رہے ہیں۔ کسی کو فول بنایا ہے ان لوگوں نے اور خصوصاً صارم خان تو بہت چہک رہا تھا۔ اتنے بلند و بے ساختہ قہقہے لگاتے ہوئے اسے میں نے پہلی دفعہ....."

اس کے شک کی تصدیق ہو گئی تھی۔ اس نے ایک جھٹکے سے ریسیور کریڈل پر پٹخا تھا اور سفیرہ کی گفتگو قطع کر دی تھی۔ فارحہ اور سنبل مارے خفت و خجالت کے ایک دوسرے سے نگاہیں چرا رہی تھیں۔

درشا آفریدی مارے غصے و شرمندگی کے گویا جلتے توے پر جا کھڑی ہوئی تھی۔ رگوں میں خون کے بجائے کھولتا ہوا لاوا دوڑ رہا تھا۔ تن بدن میں جیسے انگارے دہک اٹھے تھے۔ آخر کار وہ اسکے فریب کے جال میں پھنس کر حماقت کر بیٹھی تھی۔ اف، درشا آفریدی! تف ہے تمہاری ذہانت و

لیاقت پر، ایک دھوکے باز فریبی، مکار شخص کی چاپلوسی میں کس طرح، بے وقوف و بے عقل اور نا سمجھ بچے کی طرح آ گئیں؟" وہ خود کو بری طرح لعن طعن کر رہی تھی۔ اسے خود پر شدید غصہ آ رہا تھا۔ درحقیقت اس کا قصور اتنا بھی نہ تھا۔ اس وقت وہ مغیث لالہ اور سجاد یہ لیا کے متعلق پریشان کن خیالات میں اس حد تک مستغرق تھی۔ سوچنے سمجھنے، حقیقت اور دھوکے کا ادراک کرنے کی پوزیشن میں ہرگز نہ تھی ورنہ اس طرح بے وقوف ہرگز نہ بنتی۔

"کس طرح بے وقوف بنایا ہے ہمیں؟ قسم سے زبردست ایکٹرز ہیں۔ ہمیں ذرا سا بھی شبہ نہیں ہوا۔ بوکھلاہٹ میں ہم اس قدر ہولتی ہو گئے تھے کہ یہ بھی محسوس نہیں کیا کہ کس قدر مضحکہ خیز جملے کہہ رہے تھے۔ آفتاب کے پاس بیٹھ کر۔" سنبل نے ڈھیلے انداز میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

"ہاں واقعی اس وقت میں بھی یہی سمجھی تھی۔ اچانک اندوہناک حادثے کے باعث وہ حواس باختہ ہو گئے ہیں جو الٹی سیدھی بکواس کر رہے ہیں۔" فارحہ نے غصے میں ٹہلتی ہوئی ورشا کی طرف دیکھ کر دھیمے سے کہا۔

قبل اس سے کہ ان کے درمیان کوئی اور بات ہوتی فون کی بیل بج اٹھی۔ فون سنبل نے ریسیو کیا تھا۔ دوسری طرف صارم خان تھا جو ورشا کے متعلق پوچھ رہا تھا۔ اس کی آواز سنتے ہی ورشا نے اسے اشارہ کیا کہ وہ خوش اخلاقی سے بات کرے اسے شبہ نہ ہو کہ وہ ان کی شرارت سمجھ چکی ہیں۔

"ورشا ابھی تک بے ہوش ہے صارم بھائی! دو دفعہ ہوش میں آ کر خوف سے دوبارہ بے ہوش ہو گئی ہے۔"

"سنبل صاحبہ! اپنی دوست کی ہمت بندھائیں۔ اسے یقین دلاؤ کہ اسے کچھ نہیں کہا جائے گا" دوسری طرف سے صارم کی آواز میں درد بھری سنجیدگی و لہجہ بھیگا بھیگا تھا۔

"کس طرح یقین دلائیں؟ اس کی ہی ضد ہے۔ وہ ایک مرتبہ آفتاب کو دیکھنا چاہتی ہے۔"

"آہ۔۔۔ آفتاب اب ہم میں کہاں۔ وہ آرزومند شخص کئی ارمان لے کر چلا گیا۔ اپنی دوست سے کہیے اب تو خوابوں میں ملاقات ہو سکتی ہے صرف۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے کہ۔۔۔۔"

اب کے ہم بچھڑے تو شاید کبھی خوابوں میں ملیں
جس طرح سوکھے ہوئے پھول کتابوں میں ملیں

اس نے لہک لہک کر پرسوز طرز پر شعر پڑھا۔ ورشا نے اسی دم آگے بڑھ کر پلگ کھینچ لیا۔

"نان سنس! بہت احمق بنا لیا۔ اب ان کی باری ہے۔" ورشا نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

ایک مدت سے مری سوچ کا محور تو ہے
ایک مدت سے مری ذات کے اندر تو ہے
میں ترے پیار کے ساحل پہ کھڑا ہوں تنہا
میری الفت، میری چاہت کا سمندر تو ہے

''ہا۔۔۔۔۔ہا۔۔۔۔۔بہت اسمارٹ بنتی تھیں میڈم! ایسا داؤ کھیلا کہ چودہ طبق روشن ہو کر فیوز ہو گئے۔ لمحوں میں تمام بے اعتنائی و بے رخی کا بدلہ لے لیا ہے میرے یار نے۔'' باسط ناشتے کے دوران ہنستا ہوا بولا۔ اس وقت سب صارم کے ہاں ناشتے میں مصروف تھے۔ پرسوں رات سے ان کی شوخیاں و قہقہے عروج پر تھے۔ ان تینوں کو ان تینوں نے بے وقوف بنایا تھا۔ پرسوں رات کو وہ ڈنر کرنے کے لیے گھر سے نکلے تھے۔ اس نے ہوٹل پہنچنے کے لیے شارٹ کٹ وے استعمال کیا تھا۔ کیوں کہ آفتاب کو شدید ترین بھوک نے نڈھال کر رکھا تھا۔ وہ مسلسل واویلا کر رہا تھا کہ اسپیڈ بڑھا کر جلد از جلد ہوٹل پہنچا جائے۔ اس نے بھی بائیک فل اسپیڈ میں دوڑانی شروع کر دی تھی معاً اسپیڈ بریکر سے بائیک لڑکھڑائی تھی اس نے بائیک سنبھالنے کی کوشش کی مگر ان تینوں خصوصاً آفتاب کے بھاری بھرکم وجود کی وجہ سے بیلنس ڈسٹرب ہو گیا تھا۔ قبل اس کے کہ وہ بریک لگاتا سامنے سے آنے والی فل اسپیڈ میں دوڑتی ہوئی کار ان کی بائیک سے ٹکرائی تھی اور زوردار ٹکر کے نتیجے میں وہ بے اختیاری انداز میں بائیک سے اچھل کر فضا میں اڑتے طائر کی طرح لمحے بھر میں زمین پر ڈھیر ہو گئے تھے۔ سر میں لگنے والی ضرب کے باعث وہ چند لمحے دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گیا تھا۔ پھر اسے ہوش آیا تو اپنی بصارت پر دھوکے کا گمان ہوا۔ وہ آفتاب کے پاس بیٹھی حیران و پریشان وہی تھی، بالکل وہی سرخ گلابوں کا عکس۔۔۔۔۔ حسن و دلکشی، دل ربائی و رعنائی کا پیکر۔۔۔۔۔کلیوں کا تبسم۔۔۔۔۔شوخ پھولوں کی شگفتگی۔۔۔۔۔جھلملاتے ستاروں کی کہکشاں جس کی نگاہوں میں جھلملاتی رہتی تھی۔ جس کے رخساروں پر سرخ گلابوں کے رنگ ٹھہر گئے تھے۔ جس کے یاقوتی ہونٹوں پر گلابوں نے اپنا آپ نچھاور کر ڈالا تھا۔ ہاں وہ وہی تھی۔ جیسے کوئی مصور حاصل زیست، شاہکار بنا کر قلم توڑ ڈالے۔ وہ حسن و رعنائی کا نادر شاہکار تھی۔ وہ حسن و دلکشی کا دیوانہ، پروانہ بن کے اس پر مر مٹنے کو تیار تھا۔ اس لمحے اس ساعت اس کا بوکھلایا، گھبرایا خوف زدہ حسن اسے شرارت پر اکسا گیا اور اس نے محض شرارت میں باسط کو اشارے میں سمجھایا اور باسط نے آگے بڑھ کر بھرپور ایکٹنگ کرنی شروع کر دی اور ساتھ میں وہ خود بھی شامل ہو گیا کیوں کہ آفتاب خوف کی وجہ سے واقعی بے ہوش تھا۔ مگر اس نے پچویشن ہی ایسی بنا دی تھی کہ وہ بوکھلاہٹ و خوف کے باعث ان کی شرارت کو نہیں سمجھی۔ اور اس نے پہلی مرتبہ اس سرد مزاج، لاتعلق و بے گانگی کا مرقع اس دشمن جاں کو عام لڑکی کی طرح کمزور و جذباتی دیکھا۔ اور اس کو اس انداز میں دیکھ کر اس کے اندر کے انا پرست و خود پسند شخص کو نہ معلوم تسکین محسوس ہوئی تھی۔ اکڑے ہوئے لوگ اسے قطعی پسند نہیں تھے اور ایک ''لڑکی'' تو ہرگز نا قابل برداشت تھی۔

''جلدی جلدی ہاتھ چلاؤ دو پیریڈ تو مس ہو گئے ہوں گے تیسرا مس نہیں ہونا چاہیے۔'' صارم نے بھاپ اڑاتی چائے کا کپ ہونٹوں سے لگاتے ہوئے عجلت بھرے انداز میں کہا۔ وہ اب اس ٹاپک سے بور ہو گیا تھا یا ضمیر کی آواز نے اس کا احاطہ کر لیا تھا۔ درحقیقت اس کو اب اپنی شرارت زیادتی لگ رہی تھی۔ پرسوں رات تک وہ بہت خوش تھا بے حد مسرور و شادماں۔ اس کی بے بسی و خوف زدگی نے اسے بہروز بخشا تھا۔ مگر اب وہ جیسے جیسے اپنے آپ کا محاسبہ کر رہا تھا، پشیمان و نادم ہو رہا تھا۔

''کیوں ڈیئر! اتنے خاموش و اداس کیوں ہو؟ افسوس ہو رہا ہے اب کیا؟''

''وہ زندگی کی بہت گھٹیا شرارت تھی۔ مجھے سب سے زیادہ افسوس ہو رہا ہے۔ نہ معلوم کس طرح میں اس حد تک پہنچ گیا تھا کہ اپنے دوست کو بھی خود غرضی کے باعث فراموش کر دیا اور ان تینوں کے جذبات سے بھی گیم کھیلا خدانخواستہ ورشا کو کچھ ہو جاتا تو۔۔۔۔۔تو میں خود کو کبھی معاف نہ کر پاتا۔

شرارتیں بے ضرر اور دلچسپ ہوں تو لطف دیتی ہیں۔ تکلیف و پریشانی شرارت میں نہیں خباثت میں شمار کی جاتی ہے۔" خلاف عادت، خلاف مزاج وہ بے حد متفکر و شرمسار نظر آرہا تھا۔

"ورشا! کو کچھ ہو جاتا، او ہو...... ہو...... ہو۔" ان چاروں نے معنی خیز آوازیں بیک وقت نکالیں۔

"وہی ہوتا جو ہوتا چلا آتا ہے۔ مجنوں عرب کے صحراؤں میں لیلیٰ...... لیلیٰ! پکارتا پھرا کرتا تھا۔ تم 'تھر' کے صحراؤں میں ورشا...... ورشا! پکارتے پھرتے۔" ان چاروں کا قہقہہ فلک شگاف تھا۔

"شٹ اپ میں سیریس ہوں۔" وہ بری طرح بھنا کر چیخا تھا۔

"نئی بات نہیں ہے تم شروع سے ہی یوں ہی سیریس ہوتے ہو۔" آفتاب نے سلائس پر جیم لگاتے ہوئے کہا۔

"تم پریشان مت ہو۔ میں نے صبح یعنی تمہارے اٹھنے سے قبل وہاں فون کر کے معلوم کیا تھا کال ریسیو سسٹر کی مدر نے کی تھی۔ انہوں نے بتایا کہ وہ یونی ورسٹی جا چکی ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ ٹھیک ہیں۔ بلکہ تندرست ہیں۔ جبھی تو یونی ورسٹی گئی ہیں۔" اسے از حد سنجیدہ و متفکر دیکھ کر وہ بھی اپنی شوخیاں بھول گئے تھے۔ باسط نے سنجیدگی سے اسے مطلع کیا تھا۔

"تم فکر مت کرو۔ ہم خود ان سے معذرت کر لیں گے۔" وہ اسے بچوں کی طرح بہلانے لگے تھے۔ وہ اس کے انداز پر مسکرا کر رہ گیا۔ یہ بے لوث و بے غرض جذبے ہی ان کی دوستی کو معتبر کرتے تھے کہ وہ آپس میں ایک دوسرے کو پریشان نہیں دیکھ سکتے تھے۔ ناشتے سے فارغ ہو کر وہ یونی ورسٹی جانے کی تیاری کرنے لگے۔

"فدا حسین کب تک آئے گا گاؤں سے؟ کافی پریشانی ہو گئی ہے اس کے جانے سے۔"

"ایک ہفتے کا کہہ کر گیا ہے۔ شاید چند دن مزید لگ جائیں وہاں۔" صارم خان نے جیکٹ پہنتے ہوئے اطلاع بہم پہنچائی۔ وہ سب ریڈی تھے آفتاب کا انتظار تھا جو ابھی تک ٹوائلٹ سے برآمد نہیں ہوا تھا۔

"مجھے اس کی اسی حرکت پر غصہ آتا ہے۔ کھانا بھی جنوں کی طرح ہے اور......"

"بس...... بس آگے مت کہنا، تمہیں عادت ہے فضول بولنے کی۔" بہروز نے باسط کو آنکھیں دکھائیں تو ان کا اور صارم کا مشترکہ قہقہہ لاؤنج میں گونج اٹھا۔ اسی دم اطلاعی گھنٹی بجی تھی۔ بہروز نے آگے بڑھ کر گیٹ کھولا تو گھبرا کر پیچھے ہٹا تھا مگر اسی پل کاشف اور ریحان اس سے لپٹ کر زار و قطار رونے لگے تھے اور باقی کے باسط اور صارم کی طرف بڑھے تھے۔ پل بھر میں ان کا پورا اپارٹمنٹ وہاں سنگریزوں کی طرح بکھرا ہوا نظر آرہا تھا۔ آدھا افغان کا ایک طوفان تھا جو وہاں برپا ہو رہا تھا۔ وہ تینوں ہونقوں کی طرح ان کی طرف دیکھ رہے تھے جو بڑے جوش سے ان سے لپٹ لپٹ کر رو رہے تھے۔

"ارے بھیا! یہ عمر تو نہیں تھی آفتاب کے جانے کی، کیسے چلا گیا چھوڑ کر ہمیں۔"

"ارے بھائی! موت کوئی عمر تھوڑی دیکھتی ہے۔ بہانہ بن جاتا ہے۔"

"کتنی مرتبہ سمجھایا تھا آفتاب، وزن کم کرلو! دل کہاں برداشت کر پاتا ہے اتنا لوڈ مگر....."

"ڈیئر برادرز! ڈیئر فرینڈز! میری بات سنو۔ آفتاب الحمد اللہ خیریت سے ہے۔" صارم نے سینٹر ٹیبل پر کھڑے ہو کے چیخ چیخ کر کہنا شروع کیا۔ اس نے اس ناگہانی آفت پر بمشکل خود کو سنبھالا تھا۔ اندرونی طور پر وہ بے حد ڈسٹرب ہو گیا تھا کہ یک دم یہ ہوا کیا تھا۔

"کیا مطلب؟ کیا اوپر جانے کی اطلاع بھیجی ہے اس نے؟" ایک ساتھی نے کہا۔

"آفتاب زندہ ہے۔" صارم نے پہلے سے زیادہ چیخ کر کہا۔ لمحے بھر کو وہاں سناٹا چھایا تھا۔ پھر پہلے سے بھی زیادہ جوش و اضطراب پھیل گیا تھا۔ وہ سب جاننے کو بے چین ہو گئے اور اشتعال انگیز بھی کہ ایسی غیر اخلاقی و غیر سنجیدہ حرکت کس نے کی ہے؟ کیوں کہ جامعہ میں نوٹس بورڈ پر کسی نے یہ خبر تحریر کی تھی کہ آفتاب گزشتہ دن حرکت قلب بند ہو جانے کے باعث دنیا کو چھوڑ کر جا چکے ہیں۔ جنگل میں آگ کی مانند لمحوں میں یہ خبر پوری جامعہ میں پھیل چکی تھی اور تمام اسٹوڈنٹس ہی یہاں آنا شروع ہو گئے تھے۔ باسط، بہروز، صارم از حد پریشان ہو گئے تھے۔ پہلے تو ان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ ایسی سنگین شرارت کس کی جانب سے ہو سکتی ہے۔ لوگ تھے کہ تعزیت کے لیے بڑھتے جا رہے تھے۔ ان کے ڈپارٹمنٹ کے علاوہ دوسرے ڈپارٹمنٹ سے تعلق رکھنے والے طلبا کی تعداد خاصی بڑھتی جا رہی تھی۔ بنگلے سے باہر بھی لوگوں کی تعداد ایسی ہی تھی جیسے کوئی عظیم الشان جلسے کا انعقاد ہوا ہو۔ آفتاب سب سے ہاتھ ملاتا پھر رہا تھا۔ ایک ایک کو یقین دلاتا کہ وہ مرا نہیں زندہ ہے۔ یہ "ہوائی" کسی دشمن کی اڑائی ہوئی ہے۔ ایک دم ہی اس کے ذہن میں دھماکا ہوا تھا وہ جو بوکھلاہٹوں و بدحواسیوں کا شکار تھا کوئی خیال برق کی طرح کوندا تھا۔

☆☆☆

''ایکسکیوزمی مس ورشا!'' کلاس روم سے باہر نکلتی ہوئی ورشا کے اس آواز نے گویا شعلے دہکا دیے۔

''شٹ اپ.... شٹ اپ مسٹر! دوبارہ کبھی آپ کی زبان پر میرا نام نہیں آنا چاہیے ورنہ....''

وہ آتش فشاں کی طرح پھٹی تھی۔ اس کی نیلی آنکھوں سے نکلتے شعلے چہرے پر چھائے غیظ وغضب نے لمحے بھر کو اس کی دوستوں کے علاوہ صارم کو بھی متحیر کر ڈالا تھا۔ اس کی زندگی میں حسین سے حسین تر چہروں کی بھرمار تھی۔ اس کی صبح وشام نت نئے دل نواز وسحر انگیز چہروں کے ساتھ گزرتی تھی۔ مگر یہ چہرہ، یہ انداز، یہ خون خوار لہجہ پہلی بار اس کے مقابل تھا۔ اس کی چرب زبانی، خود اعتمادی، لمحے بھر کو ہوا ہوگئی تھی۔ گرین چادر کے ہالے میں اس کا پرجلال چہرہ نگاہوں سے نکلتے نفرت وتحقیر کے شرارے۔

''میں.... میں بہت شرمندہ ہوں۔ میں معذرت....''

''کچھ نہیں سننا ہمیں! اور آئندہ اگر آپ راستے میں آئے تو اپنے بھائی سے آپ کے ٹکڑے ٹکڑے کروا دوں گی۔ آپ اتنے گھٹیا اور بے حس ہیں کہ انسان کہلوانے کے مستحق نہیں ہیں۔''

''اوہ.... کیا آپ کے بھائی قصائی ہیں؟ ہائی داوے! کتنے ٹکڑے کروائیں گی آپ میرے؟'' لمحے کے ہزارویں حصے میں وہ اپنی جون میں آچکا تھا۔ خاصے پراشتیاق انداز میں ورشا سے مخاطب ہوا۔ ورشا کا قبائلی خون رگوں میں لاوا بن کر دوڑ رہا تھا۔ اسے اپنی عزت کا خیال نہ ہوتا یا شمشیر خان کے بیان چھوڑتے ہوئے جاسوس کا خوف نہ ہوتا تو بلا لحاظ اس کے چہرے پر حقارت سے تھوک دیتی۔ اس وقت وہ ضبط وغصے کی کٹھن راہ سے نہ گزر رہی ہوتی۔

''اتنا غصہ ہونے کی کیا بات ہے؟ میں نے تو مذاق کیا تھا جس کا آپ نے بھی خوف ناک بدلہ لے لیا ہے۔ پوری جامعہ آپ نے کل میرے گھر بھیج دی۔ آفتاب کی تعزیت کے لیے۔ جانتی ہیں آج رات تین بجے تک لوگ تعزیت کے لیے آتے رہے۔ لوگوں کی آمد وخاطر ومدارات نے بے حال کر دیا تھا۔ ہماری چھوٹی سی شرارت کا آپ نے بہت بڑا انتقام لیا ہے۔ پھر بھی آپ میری فراخدلی وخوش مزاجی دیکھیے کہ آپ سے معذرت کا طالب ہوں۔ پلیز....''

اتنے اچھے موسم میں روٹھنا نہیں اچھا

یہ ہار جیت کی باتیں ہم کل پہ اٹھا رکھیں

آؤ آج دوستی کرلیں

اس نے حسب عادت لہک لہک کر ترنم سے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے گنگنایا۔ سفیرہ، فارحہ، سنبل، شعوانہ کے ہونٹوں پر بے ساختہ تبسم چھلکا تھا جو ورشا کے بدستور بگڑے تیور اور چہرہ دیکھ کر بمشکل ضبط کیا گیا تھا۔

''دوستی جا کر کیجیے ان تھرڈ کلاس ذہنیت رکھنے والی لڑکیوں سے جو آپ سے دوستی کی متمنی ہوں۔ میں پرنسپل سے آپ کی شکایت کر دوں گی، ہٹیے راستے سے۔'' وہ اس کی راہ میں پرشکوہ عمارت کی طرح ایستادہ تھا۔ دائیں بائیں چوڑے پلر تھے جن سے بیلیں لپٹی تھیں۔

''بصد شوق کیجیے! کیوں کہ ان کے علاوہ تمام اسٹوڈینٹس بہت اشتعال انگیزی سے اس گمنام وجود کی تلاش میں ہیں جس نے نوٹس پر اس تحریر کے ذریعے ان کے جذبوں، محبتوں اور وقت کے ساتھ ناقابل معاف زیادتی کی ہے اور پھر بات دوبدو ہوگی تو سوچ لیجیے؟''

''ہونہہ۔'' وہ لمحے بھر کو ایک سائیڈ پر ہوتے ہوئے بولا تھا۔ اور اسی لمحے وہ بے نیازی سے ہونہہ کہتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔

''مسٹر سنبل! آپ بھی میرے خلاف ووٹ دیں گی؟'' اس نے پیچھے جاتی سنبل سے کہا۔

''صارم بھائی! آپ نے حرکت ہی اتنی ناقابل برداشت کی تھی۔'' سنبل نے صاف گوئی سے کہا۔

''آپ لوگوں نے بمعہ سود اس کا بدلہ لے تو لیا پھر ناراضگی کیسی؟''

''کیا چاہتے ہیں آپ؟'' سنبل فائلیں اور بیگ دوسرے ہاتھ میں منتقل کرتی ہوئی قدرے شوخی سے بولی۔

''آپ کی فرینڈ سے فرینڈ شپ کرنا۔'' صارم خان صاف بات کرنے کا عادی تھا۔

''سوری صارم بھائی! یہ کبھی ممکن نہیں ہو سکتا۔ ورشا قبائلی فیملی سے تعلق رکھتی ہے۔ ان کے قبیلے میں عورت کا کسی غیر شرعی رشتے کے حامل مرد سے بات کرنے پر قتل کر دینا معمولی بات ہے۔ کجا کہ دوستی؟ بھول جائیں آپ اس خیال کو..... ورشا نے جس تگ و دو کے بعد یہاں ایڈمیشن لیا ہے وہ صرف ہم جانتے ہیں اور بائی نیچر وہ خود بھی بہت مضبوط کردار اور اپنے قبیلے کی روایات کو عزیز از جان رکھنے والی لڑکی ہے۔ پلیز میری آپ سے یہی استدعا ہے اسے عام لڑکی مت سمجھیں۔'' وہ کہتی ہوئی تیز تیز قدموں سے آگے بڑھ گئی۔ کیوں کہ ورشا، فارحہ، شعوانہ وغیرہ وہاں نہیں تھیں۔ اسے یقین تھا وہ کیفے کی طرف ہی گئی ہوں گی۔

''عام لڑکی نہ سمجھیں..... اونہہ! پہلے سب یوں ہی ''خاص'' ہوتی ہیں پھر عام ہی عام۔ ورشا آفریدی! تمہیں تو میں ایک مرتبہ اپنی چاہت کا جام پلا کر ہی رہوں گا۔ اگر تمہاری رگوں میں قبائلی خون گردش کر رہا ہے تو میرا خمیر بھی قبائلی مٹی سے اٹھا ہے۔ دیکھتے ہیں؟ سرکشی، ضد، خودسری وخود پسندی میں کون کسے شکست دیتا ہے؟'' اس نے عزم سے سوچا۔

☆☆☆

دسمبر کا مہینہ تھا۔ وادی نے گویا سفید لباس زیب تن کر لیا تھا۔ برگ، شجر، پھول و سبزہ، چھوٹی بڑی پہاڑیاں اور بلند و بالا آسمان کی حدوں کو چھوتی چوٹیوں تک برف ہی برف بکھری ہوئی تھی۔ برف کے ننھے ننھے ذرے ابھی بھی آکاش سے سفید پریوں کی طرح اتر رہے تھے۔ سردی اپنے عروج پر تھی۔ دو دن سے جاری برف باری نے جس کو مزید تقویت بخشی تھی اور یہاں کے لوگوں کو اپنے گھروں تک ہی محدود کر کے رکھ دیا تھا۔ سڑکیں برف میں دب گئی تھیں۔

''ادے جان! کیا بات ہے؟ کیوں اتنی رنجیدہ ہو؟'' سجادیہ سبز قہوہ لیے اندر داخل ہوئی تو ماں کو گم صم و رنجیدہ خلاؤں میں گھورتے دیکھ کر قریب آ کر اپنائیت سے استفسار کرنے لگی۔

''کوئی بات نہیں بچے! کبھی کبھی ایسے ہی دل اداس ہو جاتا ہے۔'' انہوں نے گرم چادر پوری طرح اپنے گرد لپیٹتے ہوئے آہستگی سے ہلکا

اس سے چھپ کر آنکھوں میں آئی نمی صاف کی۔

''ادے! ماں ایک جسم ہوتی ہے اور اولاد اس جسم کے حصے۔ پھر یہ کس طرح ممکن ہے کہ جسم کے کسی حصے میں درد و بے چینی ہو اور اس کو محسوس ہی نہ ہو؟ اور ادے! آپ کو معلوم ہے؟ بیٹیاں جسم کا کون سا حصہ ہوتی ہے؟ وہ حصہ دل کہلاتا ہے۔ دل ہی تو جسم کی ہر حرکات و سکنات کو سمجھتا ہے... پھر میں کس طرح اپنی ادے کی بے چینی و بے قراری نہ جان پاؤں گی؟ ورشا کی یاد نے آپ کو بے کل و بے قرار کر رکھا ہے ناں؟'' اس نے نزدیک بیٹھتے ہوئے پیار سے ان کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا تو وہ جو آنسوؤں کو روکنے کی کوشش کر رہی تھیں آنسوؤں پر اختیار کھو بیٹھیں۔

''یہ درست ہے ادے! اس کی جدائی، اس کی دوری، اس کی غیر موجودی ہمارے لیے کڑی سزا ہے مگر یہ بھی تو سوچیے حویلی کی فضا کتنی خاموش ہے۔ چھوٹی ادے کی بدزبانی و بدکلامی سے ہم بچے ہوئے ہیں اور وہ بھی۔ ورنہ چھوٹی ادے کی جابرانہ حکمرانی، شمشیر لالہ کے بے جا ظالمانہ رویے اور روک ٹوک کے آگے وہ ہمیشہ مقابل آجاتی تھی۔ پھر گھر میں ختم نہ ہونے والی محاذ آرائی جاری رہتی تھی۔'' سخاوہ نے ماں کے آنسو نایاب موتیوں کی مانند اپنی چادر کے پلو میں سمیٹتے ہوئے انہیں دلاسا دینا چاہا۔

''ہاں میں جانتی ہوں۔ گل جاناں کی حکمرانی میں کوئی اب دخل دینے والا نہیں ہے۔ اسے حق و ناحق کی پہچان کرانے والی جائز و ناجائز کی پہچان کرانے والی چلی گئی ہے۔ آہ...... یہ سوچیں بھی کیسی ظالم ہوتی تھیں۔ کس طرح اپنے ترکش میں تیر چھپا کر رکھتی ہیں۔ جب میری بچی، میری جان، یہاں تھی تو میں سوچتی تھی وہ اس حویلی کے پتھر دل بے حس لوگوں کی دنیا سے کہیں دور چلی جائے۔ جہاں اس کی طرح شیشہ دل، شیشہ وجود لوگ رہتے ہوں۔ ان پتھروں میں رہ کر تو وہ روز چکنا چور ہوتی تھی۔ روز ٹوٹتی، روز بکھرتی تھی۔ اب اس حویلی سے، اس شہر سے، ان آنکھوں سے دور ہوگئی ہے تو دل پر ہر وقت اس کی حکمرانی ہے۔ میرے دل کی دھڑکن وہی تھی۔ وہ نہیں ہے تو کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا ہے۔ ڈیڑھ سال بیت گیا اسے آنکھیں دیکھنے کو ترس گئی ہیں۔ کان اس کی آواز سننے کو بے قرار ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں؟ کس طرح اپنی جان کو ایک نظر دیکھ لوں۔'' گل خانم بہت باحوصلہ و باہمت عورت تھیں۔ انہوں نے وقت کے بہت سیاہ و بھیانک باب دیکھے تھے۔ شوہر کی بے رخی و بے نیازی، سوکن کی زیادتیاں و بے انصافیاں، اپنے علاوہ اپنی بیٹیوں کے حقوق بھی انہوں نے خاموشی سے سلب ہوتے دیکھے۔ اس کے باوجود کبھی صبر و استقامت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔

آج سب سے چھوٹی ولاڈلی بیٹی کی یاد نے اس چٹانی حوصلے والی عورت میں شگاف ڈال دیے تھے۔

''ادے جان! یہ کیا ہو رہا ہے آپ کو آج؟ پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا۔ اب چند ماہ کی تو بات ہے۔ پھر ورشا یہاں آجائے گی آپ کے پاس۔ سخاوہ انہیں روتے دیکھ کر خود بھی رو پڑی تھی۔ مگر جلد ہی اس نے اپنے آنسوؤں پر قابو پالیا۔ جانتی تھی وہ ماں بیٹی کتنا ہی رو لیں، کوئی انہیں خاموش کروانے نہیں آئے گا۔ انہیں وہ میٹھے انداز میں تسلیاں دے رہی تھی۔

''سخاوہ بچے! مجھے محسوس ہو رہا ہے ورشا وہاں پریشان ہے۔ ایک ہفتے سے مجھے بہت خاموش و اداس خواب میں نظر آرہی ہے۔ مجھے محسوس ہو رہا ہے وہ پریشان ہے۔''

''ادے! (ماں) خواب کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا یہ تو بس یوں ہی نظر آتے ہیں۔''

''نہیں بچے جو دل میں بستے ہیں، جن سے خون کا رشتہ ہوتا ہے، ان سے نازک احساسات کی ایک مضبوط غیر مرئی زنجیر بندھی ہوتی ہے جو ہمیں ان کے سکھ و دکھ، مسرت و رنج کے احساس سے فوری آگاہ کرتی ہے۔ میں اسی خیال سے پریشان ہوں کہ نہ معلوم میری ورشا کس حال میں ہے؟''

''ادے کیا ہو گیا؟ کون مر گیا تیرا سگا! کس کو رو رہی ہے؟ ہر وقت نحوست پھیلاتی ہے۔ یہ منحوس عورت!'' دھڑ سے دروازہ کھول کر چیختی چنگھارتی گل جانان (چھوٹی ماں) اندر داخل ہوئی تھیں۔

''اللہ نہ کرے چھوٹی ادے! ورشا کی یاد میں رو رہی تھیں ادے۔'' سخاویہ نے آہستگی سے کہا۔

''کیوں؟ کیا اس چنڈال کے مرنے کی خبر آئی ہے؟''

''اللہ نہ کرے۔ اللہ میری بچی کو میری عمر بھی لگا دے۔'' گل خانم نے دہل کر کہا۔

''ہاں..... ہاں وہ کہاں مرے گی۔ قیامت کے بورے تو وہی سمیٹے گی۔''

''کیا کام تھا گل جانان؟ مجھے بلوا لیا ہوتا۔'' گل خانم نے مصالحتی انداز اپناتے ہوئے متاثر جبر کر کے قدرے خوشامدی انداز میں اس سے کہا۔ کیوں کہ وہ ایسی ہی فطرت کی مالک تھی۔ خوشامد اور چاپلوسی کرنے والے لوگ پسند کرتی تھی۔ جو ان کی ہاں میں ہاں ملاتے رہیں۔ سو مجبوراً ماں بیٹی نے بھی انہیں خوش رکھنے کا یہ وتیرہ اپنا رکھا تھا جس کے باعث وہ اس چھت کے نیچے نظر آ رہی تھیں۔

''بڑے خان کی انڈوں کا حلوا کھانے کو طبیعت چاہ رہی ہے۔ مہرو جا رہی ہے اس کی ماں کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ تم حلوا بناؤ۔'' انہوں نے اپنے مخصوص نخوت بھرے انداز میں ملازمہ کی واپسی کی خبر کے ساتھ انہیں حلوا بنانے کا حکم دیا۔

''حلوا میں بنا دیتی ہوں چھوٹی ادے! ادے کی آج ٹانگوں میں درد ہے۔'' سخاویہ نے ماں کی دل گیر و افسردہ حالت کے پیش نظر اپنی خدمات پیش کیں۔

''اوہو بس بیٹھی رہو ادے کی بچی! اس عمر میں عورت کو بستر نہیں سنبھال لینا چاہیے۔ چلتے پھرتے کام کرتے رہنا چاہیے ورنہ ہڈیاں جڑ کر رہ جاتی ہیں۔ محتاج ہو جاتا ہے بندہ۔''

''تم جاؤ میں بنا کر بھیج رہی ہوں نا۔'' گل خانم جانتی تھیں وہ اب خاموش نہیں رہیں گی۔ وہ چادر سنبھالتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئیں۔ گل جانان اس وقت کمرے سے نہیں گئیں جب تک ان کو گرم بستر سے گرم کمرے سے باہر نکلتے نہ دیکھ لیا۔ ان کے نکلتے ہی خود بھی وہ منکتی ہوئی بائیں ہاتھ سے شیشے و ریشم کا بنا پراندہ جھلاتی نکل گئیں۔ ان کے ہونٹوں پر آسودہ مسکراہٹ تھی۔

''اے رب العالمین! تو ایسے جہالت کے اندھیروں میں گم لوگوں کے ہاں بیٹیوں کا نور کیوں اتارتا ہے۔ جو بیٹی کی پیدائش کو ذلت و پستی سمجھتے ہیں۔ میری ماں، بیٹیاں پیدا کرنے کے جرم میں عمر قید با مشقت کاٹ رہی ہے اور شاید آخری سانس تک کاٹتی رہے گی۔'' سخاویہ گھٹنوں میں چہرہ چھپا کر رو پڑی۔ قریب رکھی سبز چائے کب کی یخ ہو چکی تھی۔

''سخاویہ! کیا ہوا بیٹا کیوں رو رہی ہو؟'' کمرے کے قریب سے گزرتے شمروز لالہ اس کی سسکیوں کی آواز سن کر کمرے میں چلے آئے۔

بہت اپنائیت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر گویا ہوئے۔

"وہ...... وہ کچھ نہیں لالا ایسے ہی۔" اس نے گھبرا کر آنسو پونچھے تھے۔

"اوہ...... اچھے بچے جھوٹ نہیں بولتے۔ بتاؤ کیا ہوا؟ چھوٹی ادے نے ڈانٹا ہے؟ بھابھی نے کچھ کہا ہے؟ یا شمشیر خان کے زیر عتاب آ گئی ہو؟" وہ اس کے قریب بیٹھ کر ملائمت سے پوچھ رہے تھے۔ وہ شمشیر خان سے دو سال بڑے تھے مگر فطرتاً اس کی ضد تھے اور ان میں سب سے بہترین خوبی یہ تھی کہ حویلی کے مردوں کی طرح عورتوں کو حقیر و بے وقعت نہیں سمجھتے تھے بلکہ گھر کی خواتین کی طرح ملازماؤں تک کو قابل احترام نگاہ سے دیکھتے تھے۔ خصوصاً ان بہنوں میں ان کی جان تھی۔

"لالہ! ورشا بہت یاد آ رہی ہے۔ کیا وہ یہاں چند دنوں کے لیے نہیں آ سکتی؟"

"نہیں ہرگز نہیں۔ اس نے اپنی روایات سے، اپنے قبیلے سے، اس ماحول سے بغاوت کی ہے۔ وہ انقلابی بن کر ابھری ہے۔ ہماری روایات بدلے گی وہ! عورتوں کو ان کے حقوق دلوائے گی؟ انقلاب..... انقلاب برپا کرے گی وہ یہاں۔ وہ اب اس حویلی میں قدم نہیں رکھ سکتی۔" شمشیر خان اسی دم چیختا دھاڑتا اندر داخل ہوا تھا اسے دیکھ کر سخاویہ خوف زدہ ہو کر شمروز کے بازو سے لپٹ گئی تھی۔ خوف سے اس کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔ وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔

"شمشیر خان! آواز دھیمی کرو اپنی۔ ملازموں سے اور گھر کے افراد سے بات کرنے کا انداز ایک نہیں ہوتا اور بہنوں سے تو بہت نرمی و ملائمت سے بات کی جاتی ہے۔" ان نے خفگی بھرے انداز میں بھائی کو ڈانٹا۔

"بہنیں! ہونہہ..... نہیں پسند مجھے یہ رشتے، جو ہمارے شملے کو زمین بوس کر دیں۔ ہمیں دوسرے مردوں کے آگے نگاہیں جھکانے پر مجبور کر دیں۔ چھوٹی ادے درست کہتی ہیں بیٹیوں کو تو پیدا ہوتے ہی زندہ دفن کر دینا چاہیے بس۔" اس نے سرخ انگارہ آنکھیں نکالتے ہوئے کہا۔

"نعوذ باللہ! شمشیر خان! ایسے کفر کے جملے بولتے وقت تمہارا دل خوف الٰہی سے نہ کانپا؟ مسلمان ہونے کے باوجود تمہارے دل میں اتنا کفر بھرا ہوا ہے۔ اس دور میں تمہارے دل میں صدیوں پرانی جاہلانہ غیر اخلاقی سوچ زندہ ہے۔ بیٹیاں اللہ کا نور ہوتی ہیں۔"

"وقت نہیں ہے میرے پاس۔ سب جانتا ہوں میں۔ صرف مجھے اس وقت کا انتظار ہے ذرا بھی مجھے اس 'انقلابی' کی ایسی خبر مل گئی جو ہمارے قبیلے و روایات سے متصادم ہوئی تو پھر وہ دن اس کا آخری دن ہوگا۔ میرے آدمی اس کی کڑی نگرانی کرتے ہیں اور تمہاری بھی کوئی خبر مل گئی تو سمجھو زندہ جلا ڈالوں گا۔" اس نے قہر آلود لہجے میں سخاویہ سے کہا اور دھپ دھپ کرتا وہاں سے نکل گیا۔ شمروز خان نے تاسف بھری نگاہ سخاویہ پر ڈالی۔ جس کے آنسو خوف و ہم کے مارے آنکھوں میں ٹھہر گئے تھے۔ اس کا دل دکھ سے بھر گیا۔ شمشیر خان کے آگے کسی کی نہیں چلتی تھی۔

☆☆☆

اسے کہنا!

کوئی آج بھی تم بن

ہجر کی جلتی دوپہروں میں سلگتا ہے

حسین زودہ راتوں میں

پلکوں سے ستارے گنتا ہے

شام کے اداس لمحوں میں

دریا کنارے بیٹھ کر تمہیں یاد کرتا ہے

اکثر درختوں پر تمہارا نام لکھتا اور مٹاتا رہتا ہے

ہواؤں سے تمہاری باتیں کرتا ہے

تمہیں لوٹ آنے کو کہتا ہے

کوئی تم سے بچھڑ کر بہت اداس رہتا ہے

کوئی تم سے بچھڑ کر بہت اداس رہتا ہے

فارحہ بہت ہی دل سوزی سے ہاتھ میں پکڑے "I Miss You" کے خوب صورت کارڈ پہ درج تحریر پڑھ رہی تھی۔ یہ کارڈ کچھ لمحے پہلے چوکی دار نے گیٹ کے پاس سے پا کر سنبل کو تھمایا تھا جس نے لفافہ کھول کر نکال کر اسے تھمایا تھا اور فارحہ نے حسب عادت جھٹ دیر کیے بغیر پڑھنا شروع کر دیا تھا۔ وہ تینوں اس وقت لان میں بیٹھیں چائے و دیگر لوازمات سے لطف اندوز ہو رہی تھیں۔ حسب معمول آنٹی اپنے بوتیک اور انکل اپنے دفتر گئے ہوئے تھے جبکہ ان کے دو بیٹے کچھ عرصے کے لیے ملک سے باہر تھے بزنس کے سلسلے میں۔

"آہ! کوئی تم سے بچھڑ کر بہت اداس رہتا ہے۔ آہ...... ہائے بے چارہ اداس؟" فارحہ نے کارڈ سنبل کے چہرے کے آگے لہراتے ہوئے بڑی بے چارگی و اداسی کا اظہار کیا مگر اس کے چہرے پر شوخ مسکراہٹ تھی جب کہ سنبل یک دم گم صم سی ہو گئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں پکڑا چائے کا مگ دھیرے دھیرے لرز رہا تھا۔

"ارے بھئی! کیا سسپنس ہے؟ کچھ معلوم بھی ہو۔ یہ اداس ہیں کون صاحب؟" ورشا کو فارحہ کی شوخیاں، سنبل کی خاموشی و اضطراب کچھ کچھ آگہی دینے لگا تھا۔

محبتوں کا مجھ سے تقاضا مانگتا ہے

چاہتوں کا اپنی حساب مانگتا ہے

عجیب شخص ہے سب جانتے ہوئے بھی باوجود

وہ اپنی اکثر باتوں کا جواب مانگتا ہے

''فار گاڈ سیک فارحہ! مجھے بے سکون مت کرو۔'' فارحہ کی مسلسل چھیڑ چھاڑ نے سنبل کو روہانسا کر ڈالا تھا۔ اس کی ڈارک براؤن آنکھوں میں موتیوں کی سی جھلملاہٹ تیرنے لگی تھی۔ چہرے پر ضبط کے رنگ تھے۔

''میں نے بے سکون کیا ہے؟ اڈیٹ!'' وہ اطمینان سے بیٹھ کر ڈش سے پاپڑ اٹھا اٹھا کر کرر کرر کی آواز کے ساتھ کھانے لگے۔ سنبل ایک جھٹکے سے وہاں سے اٹھ کر اندر چلی گئی۔ ''انا کی اسیری میں خود کو روگ لگانے والی احمق جذباتی لڑکی ہے یہ سنبل؟''

''میرے خیال میں یہ زیادتی ہے۔ اگر ہم کسی کو مسرت نہیں پہنچا سکتے تو افسردہ کرنے کا بھی حق نہیں رکھتے۔''

''پلیز..... پلیز مائی ڈیئر! ابھی دیکھنا کئی دن اس کے وجود پر خزاں چھائی رہے گی۔ خوامخواہ۔ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ غلطی یا غلط فہمی فرد واحد کی اور ملوث کیا جائے سب کو؟''

''سوری ڈیئر! مجھے کبھی بھی الجھی ہوئی یا مبہم باتیں سمجھ میں نہیں آئی اور اس وقت بھی مجھے یہی پریشانی درپیش ہے۔ مزید سردرد سے بچنے کے لیے میں یہاں سے جا رہی ہوں۔ سنبل کا موڈ نارمل ہو گا تو وہ خود ہی بتا دے گی۔ تمہاری طرح اسے بات گھما پھرا کر کرنے کی عادت نہیں ہے۔''

''یعنی اب تم بھی ناراض ہو کر جا رہی ہو؟ پھر میں اکیلی کیا کروں گی؟''

''ان پھولوں سے، پودوں سے، درختوں، پھلوں سے باتیں کرنا کیوں کہ یہ تمہارے لیے من پسند سامع ہوں گے۔'' ورشا دوپٹا سنبھالتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔

''کیا؟ اچھا..... تمہارا مقصد ہے۔ صرف میں بولنا جانتی ہوں؟''

''یس رئیلی۔'' ورشا نے اسے چڑانے والے انداز میں کہا اور پھرتی سے اندر کی طرف دوڑ گئی۔

سردیوں کی خنک راتیں اور خشک دن اپنے مخصوص ڈھب سے گزر رہے تھے۔ اس کے اندر جیسے اضطراب و بے چینی کسی آسیب کی طرح پنجے گاڑ کر بیٹھ گیا تھا۔ بظاہر وہ سمندر کی اوپری سطح کی طرح تھی پرسکون، پراعتماد بے فکر مگر اس کی تہ میں ہمہ وقت ایک ہی جستجو ایک ہی خواہش مچلتی رہتی کہ ایک مرتبہ..... صرف ایک بار حویلی جا سکے تو فون کے ذریعے ہی ادے سے بات کرے۔ انہیں مطلع کرے کہ وہ جس مغیث خان کا انتظار کر رہی ہیں جس کی آس پر سجادیہ کی سنہری زندگی کے دن تاریکی میں بدلتے جا رہے ہیں وہ شخص جو کوسوں دور کسی کو اپنے نام و آس کی زنجیر میں جکڑ آیا ہے یہاں بھرپور ازدواجی زندگی گزار رہا ہے اور قبیلے کے بڑوں کی جہاندیدہ و زیرک نگاہوں سے کس طرح اس کی یہ خود غرضی و جی داری مخفی ہے؟ اسے یقین تھا کوئی اس حقیقت سے واقف ہو یا نہ ہو مگر بابا جان بے خبر نہیں ہو سکتے۔

ایک ماہ سے زائد عرصہ گزر جانے کے باوجود حویلی سے رابطہ نہ کر سکی تھی۔ شمشیر خان نے اس کی خواہش کو اپنی انا، آن و غیرت کا مسئلہ بنا لیا تھا۔ اپنے قول کے مطابق وہ ڈیڑھ سال سے اپنوں کو دیکھنے کو، ان سے ملنے کو تڑپ رہی تھی اور اب جیسے اس کے اندر صبر و انتظار کا پیمانہ لبریز ہوا چاہتا تھا جس پر وہ قابو پانے کی جدوجہد میں سرگرداں تھی۔ سنبل پر آج کل مکمل خاموشی و تنہائی کا دورہ پڑا تھا وہ تقریباً سب گھر والوں سے کٹ کر رہ گئی تھی۔ خلاف عادت گھر میں کسی نے بھی اسے ڈسٹرب نہیں کیا تھا۔ جو اس کے لیے یقیناً حیرت انگیز بات تھی۔ (کیوں کہ حویلی میں تنہائی متمنی لڑکی کے

ایسے ردعمل کا تصور محال تھا) لیکن جلد ہی اس نے محسوس کیا کہ یہاں وقت کی کمی تھی۔ لوگ وقت سے بھی آگے دوڑنے کی تگ ودو میں حواس باختہ تھے۔ ایسی افراتفری، تیز رفتاری میں کسی کے پاس اتنی فرصت کہاں کہ کسی کی مزاج پرسی و دلجوئی کی جائے۔ حویلی میں عورتوں پر تمام گھر کی، مردوں کی اور بچوں کی ذمہ داری تھی جو وہ جھٹ پٹ نبٹا کر ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک ہو جاتی تھیں مگر جیسے یہاں وقت کی گاڑی کے بریک فیل ہو گئے تھے اور وہ سرپٹ دوڑتا جا رہا تھا اور ساتھ ہمنوا لوگوں کو بھی بوکھلائے ہوئے تھا۔ اسے کبھی کبھی یہاں کی بھاگتی دوڑتی زندگی سے وحشت ہونے لگتی تھی۔ کبھی وہ اس ماحول کو بے حد پسند کرتی کہ ''جیو اور جینے دو'' کے فارمولے پر سب عمل پیرا تھے۔

ورشا نے جان بوجھ کر سنبل کو نہیں چھیڑا تھا بلکہ وہ خود اس کوشش میں رہتی کہ سنبل کی تنہائی میں مخل نہ ہو کیوں کہ سنبل سے وقتی طور پر بے نیاز ہونے کے باوجود اسے بھرپور کمپنی دینے کی کوشش کرتی تھی۔ شاید میزبانی کا خیال کر کے کہ بہر حال وہ یہاں چند ماہ کی مہمان تھی۔ اس کی حساس طبیعت کبھی یہ گوارہ نہیں کرتی کہ کوئی اس کی خاطر خود پر جبر کرے۔ البتہ فارحہ آج کل موڈ میں تھی اور اکثر رسالوں میں سے المیہ شعر چن چن کر پڑھتی جس پر سنبل بھڑک اٹھتی اور اسے چڑانے میں اسے خوب لطف آتا۔

''جامعہ نہیں چلنا ہے آج؟'' وہ تیار ہو کر آئی تو سنبل کو رات والے سوٹ میں بیٹھے دیکھ کر بولی۔

''آج ہمت نہیں ہو رہی کل جاؤں گی۔'' اس نے بکھری زلفیں بائیں ہاتھ سے سمیٹتے ہوئے کہا۔

''طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟'' ورشا نے آگے بڑھ کر اس کی نبض چیک کی۔

''ہاں..... بس..... ایسے ہی سستی سوار ہے۔'' وہ دھیمے سے مسکرائی۔

''میرے خیال میں حمزہ بھائی کو کال کر دوں وہ خود آ جائیں تو.....''

''فارحہ! خبردار جو تم نے ایک لفظ بھی آگے کہا۔'' وہ غصے سے کھڑی ہو گئی۔

''کیا بات ہے؟ سنبل! کیوں بہن پر بگڑ رہی ہو؟'' اس دم آنٹی اندر آ کر گویا ہوئیں۔

''مما! اسے کہیں ہر وقت حمزہ کا نام نہ لیا کرے۔''

''میں نے صرف نام تو نہیں لیا بھائی بھی ساتھ لگایا ہے۔ کیوں ورشا! سچ کہہ رہی ہوں نا؟''

''فارحہ! بڑی ہو گئی ہو بیٹا! یہ طفلانہ حرکتیں چھوڑ دیں آپ اب۔'' انہوں نے نرمی سے سمجھایا۔

ورشا! کیا بات ہے جان! کچھ دنوں سے آپ کو بہت خاموش اور اداس دیکھ رہی ہوں۔ فارحہ کے بعد وہ ورشا کی طرف بڑھ کر پیار سے اس کے گال تھپتھپاتے ہوئے حلاوت گھلے لہجے میں گویا ہوئیں۔

''میں بالکل ٹھیک ہوں آنٹی! آپ فکر مند مت ہوا کریں میرے لیے۔'' جواباً اس نے مسکرا کر کہا۔

''یہ کس طرح ممکن ہے؟ آپ یہاں ہماری ذمہ داری ہیں بلکہ میری اور ارسلان کی خوش بختی اور عزت افزائی ہے کہ شہباز بھائی نے ہم پر اعتماد کر کے بہت معتبر احساس بخشا ہے۔ ورنہ ہم اور ہماری کوئی حیثیت نہیں ہے۔ بھلا چٹان اور ذرے کبھی مقابل آ سکتے ہیں؟ آپ کو کوئی پریشانی

ہے تو مجھے بتائیں۔ میں نہیں چاہتی شہباز بھائی یا ان کی فیملی کو معمولی سی بھی شکایت ہو ہم سے۔''

''ایسی کوئی بات نہیں ہے آنٹی! گھر کے افراد سے ہی نہیں، در و دیوار سے بھی مجھے اتنی اپنائیت، محبت و انسیت ملی ہے کہ میں محسوس ہی نہیں کرتی کہ کسی دوسرے گھر میں ہوں۔''

''سدا خوش رہو۔'' انہوں نے فرط مسرت سے اس کی پیشانی چوم لی۔

☆☆☆

''فدا حسین..... فدا حسین! کہاں ہو بھئی؟'' صارم جیکٹ قریبی صوفے پر ڈالتے ہوئے آوازیں لگا رہا تھا۔ وہ ابھی باہر سے آیا تھا۔

''جی صاب!'' فدا حسین کا وجود گویا خزاں رسیدہ شجر لگ رہا تھا۔

''خیریت! کیا ہوا؟ یہ چہرے پر بارہ کیوں بج رہے ہیں؟'' اس نے بغور اس کی طرف دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔ مہربان و نرم لہجہ سن کر فدا حسین گویا آندھی کے ستم سے کسی بھی لمحے زمین بوس ہونے والے درخت کی حالت میں آ گیا۔

''کیا ہوا؟ کچھ معلوم بھی تو ہو۔'' صارم جھلایا۔

''تیا (کیا) بتاؤں صاب! تھالی حولت نے دندگی خلاب کر دی ہے۔ میں تو.....''

''مسئلہ کیا ہے؟'' صارم نے بمشکل اپنی مسکراہٹ چھپا کر اس کی تمہید قطع کی۔

''وہی ایک مسئلہ جو ہر غلیب (غریب) کے ساتھ لوز اول (روز اول) سے لدا ہوا ہے۔''

''ابھی تم پندرہ دن گاؤں میں گزار کر آئے ہو۔ جاتے وقت اچھی خاصی رقم لے کر گئے تھے۔ ایک ہفتے بعد پھر تمہاری مسز نے مسئلے پیدا کرنا شروع کر دیے؟'' باسط اندر کے کمرے سے نکل کر وہیں آ گیا۔ اسے دیکھ کر فدا حسین نے منہ بنایا تھا۔

''یہ لو اور اچھی سی چائے بنا کر لاؤ۔'' صارم نے والٹ سے نکال کر ایک بڑا نوٹ اس کی طرف بڑھایا۔ نوٹ گرفت میں آتے ہی فدا حسین کی تمام حسیات بیدار ہو گئی تھیں۔ چہرے کی رونق بحال ہو گئی۔ وہ خاصا مسرور سا کچن کی طرف بڑھا تھا۔

''یہ تم اچھا نہیں کر رہے صارم! آج کل سخاوت و دریا دلی لے ڈوبتی ہے بندے کو۔''

''کیا حرج ہے یار! اگر ہم کسی کے کچھ کام آ جائیں تو..... میں زندگی میں کسی شے کے لیے نہیں ترسا۔ جو چاہا وہ پایا، پھر میں کس طرح کسی کو ضروریات زندگی کے لیے ترستے ہوئے دیکھوں؟ زندگی سب کے لیے ہے پھر زندگی پر کچھ لوگوں کی حکمرانی کیوں ہے؟''

''کیا تم ہر اس شخص کو سپورٹ کر سکتے ہو جو فدا حسین کی طرح غربت کا شکار ہے؟''

''ہاں..... اگر میرے دائرہ اختیار میں جتنے بھی لوگ آئیں گے بلا تفریق وہ میرے لیے قابل اعتناء ہوں گے۔ انسان کی معراج انسانیت ہے۔ دولت، ثروت، عیش و طرب وقتی خود نمائیاں ہوتی ہیں۔''

''بھائی! پیسہ تمہارا، اڑاؤ۔ میں خوامخواہ کیوں برا بنوں۔''

''اخاہ، ناراض ہو گئے؟'' صارم اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

''نہیں یار، یہ یور لیڈیز ڈپارٹمنٹ ہے۔ مردوں پر نہیں جچتا۔ تم آفتاب کے پاس گئے تھے، ملا وہ؟''

''نہیں..... چند روز کے لیے حیدرآباد گیا ہے۔ اس کی ماسی نے بتایا ہے۔''

''اچھا جبھی مجھ سے پوچھ رہا تھا۔ حیدرآباد جاؤں گا تمہارے لیے کیا لاؤں؟ میں نے کہہ دیا جو بھی مشہور چیز ہو وہاں کی لے آنا۔ تو بولا۔ وہاں کی چوڑیاں مشہور ہیں وہ لے آؤں۔''

''تم نے ہاں کہہ دیا ناں؟'' صارم نے شوخی سے اس کی بات قطع کی۔

''کیا مطلب، میں چوڑیاں پہنوں گا؟'' حسب توقع باسط نے بھنا کر کہا۔

''ہاں..... ہاں۔ قسم سے تمہاری ان نازک نازک گوری کلائیوں میں سرخ، سبز کانچ کی چوڑیاں کیا زبردست لگیں گی۔'' صارم خان نے اس کے از حد کمزور جسم کو نشانہ بنایا۔ جواباً باسط منہ پھلا کر بیٹھ گیا۔ پھر اس کے منانے پر دونوں بڑے زور و شور سے باتیں کر رہے تھے۔ جیسے کوئی بات ہوئی نہ ہو۔ فدا حسین چائے دے کر چلا گیا تھا۔

''تمہارے جانے کے بعد سبریز خان کی کال آئی تھی۔'' باسط کو گویا یک دم یاد آ گیا۔

''اچھا..... کوئی میسج ہے؟'' صارم کے چہرے پر اشتیاق اور اشتیاق رقم تھا۔

''ہوں..... وہ کچھ روز میں کراچی آئے گا۔ اپنی شادی کی شاپنگ یہیں سے کرنے کا ارادہ ہے۔''

''سبریز خان کی شادی میں چلو گے نا، بہت لطف آئے گا۔'' صارم نے اپنی ذہانت سے چمکتی نگاہیں اس پر مرکوز کر کے کہا۔ سبریز خان میں گویا اس کی جان تھی۔ اس کے ذکر سے ہی چہرہ کھلا پڑ رہا تھا۔

''نہیں یار، مجھے پہلے شوق تھا شمالی علاقہ جات کی سیاحت کا۔ مگر اب ہرگز نہیں۔'' باسط نے کانوں کو چھوا۔

''تم کیا سمجھتے ہو؟ وہاں ہر وقت آگ و خون کے دریا بہتے رہتے ہیں، ایسا نہیں ہے پیارے! ہم لوگ دشمن کو جتنا یاد رکھتے ہیں دوست و مہمان پر جان بھی نچھاور کرنے سے نہیں چوکتے۔ ہماری روایات میں بڑی روایت مہمان نوازی بھی ہے۔ دیکھنا جا کر خود بھی محسوس کرو گے۔''

''اچھا، وعدہ نہیں کرتا۔ ماموں کی طرف چلیں کافی عرصے سے اس نے یہاں آنا چھوڑ رکھا ہے صرف جامعہ میں ملاقات ہوتی ہے۔'' باسط نے بوریت سے بچنے کے لیے تجویز دی۔

''تم چلے جاؤ۔ مجھے کچھ کام سے کہیں جانا ہے۔'' وہ رسٹ واچ دیکھتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

''کہیں.....؟ صاف کیوں نہیں کہتے شازیہ کو ٹائم دے رکھا ہے۔''

''تم میری جاسوسی کرتے ہو؟'' اس کے ہونٹوں پر دلفریب تبسم ابھرا تھا۔

''سدھر جاؤ۔ شازیہ، پنکی، بجلی، راکھی، یہ لڑکیاں نہیں ہیں محض شوپیس ہیں۔''

''ایک بات ہے قسم سے، میرے یار تم مجھے بابا جانی کی طرح نصیحتیں کرتے کبھی برے نہیں لگے۔''

''تمہیں تو میں جب مانوں گا جب تم ورشا بی بی کو تسخیر کر کے دکھاؤ۔ ورنہ شازیہ جیسی لڑکیاں تو معمولی سی زر کی چمک دیکھ کر پیچھے چلی آتی ہیں۔'' باسط نے خلاف توقع طعنہ مارا تھا جو کسی زہریلے تیر کی طرح سنسناتا ہوا اس کے دل میں پیوست ہوا تھا۔

''باسط! مجھے کسی غلط حرکت کرنے پر مت اکساؤ۔ وہ لڑکی ہے اور یہ صنف موم سا وجود رکھتی ہے۔ فرق صرف اتنا ہوتا ہے کہ کوئی موم پگھلا ہوا ہوتا ہے اور کسی کو وقت لگتا ہے پگھلانے میں۔ وہ لڑکی کوئی پتھر کی نہیں بنی۔ آئندہ مجھے چیلنج نہیں کرنا۔'' وہ دھپ دھپ کرتا اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔ باسط کے لبوں پر معنی خیز مسکراہٹ ابھر آئی۔ وہ اس کے جذبات سے کچھ کچھ واقفیت محسوس کرنے لگا تھا۔ صارم خان جن جذبات سے خود بھی پہلو تہی برت رہا تھا یا جان بوجھ کر نظر انداز کر رہا تھا وہ اتنے ہی آشکار ہو رہے تھے۔ اس کی نگاہوں کا غیر محسوس سا تعاقب...... اس نے بار ہا ورشا خان آفریدی کی ذات کو محسوس کیا تھا۔ ایکسیڈنٹ والی جھڑپ کے بعد سے تو اس نے دانستہ اس کی راہ میں آنا چھوڑ دیا تھا۔ مگر وہ ہوتا وہیں آس پاس تھا۔

☆☆☆

''سبریز خان! تنگ مت کرو۔ ایک بار بول دیا گل سانگہ سے نہیں مل سکتے۔'' شیریں گل نے چولہے پر چائے پکانے کے لیے کیتلی میں پانی بھر کر رکھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

''بھابھو! یہ کیا بات ہوئی؟ شادی میں ابھی مہینہ باقی ہے، میں اتنا عرصہ اسے دیکھے بغیر کیسے گزاروں گا؟ میں شہر جا رہا ہوں۔ اس سے معلوم کروں گا وہ کیا منگوانا چاہتی ہے۔''

''وہ یہی کہے گی، تم واپس آجاؤ میرے لیے تمہاری واپسی ہی سب سے بڑا تحفہ ہے۔'' شیریں گل شیلف میں لٹکے کپ اتارتے ہوئے خاصی شوخ ہو رہی تھی۔ وسیع و عریض نفاست سے سنوارے گئے باورچی خانے میں تازہ چائے کی خوش ذائقہ مہک پھیل گئی تھی۔

''لیکن...... یہ بات اس کی زبان سے سننا چاہتا ہوں۔'' سبریز جز بز ہو کر گویا ہوا۔

''چند دن...... صرف چند دن اور صبر کر لو میرے لالہ، پھر ساری زندگی تمہیں ہی سننا ہے۔''

''بھابھو! مجھے دیر ہو رہی ہے۔ برف باری کبھی بھی ہو سکتی ہے۔ کئی دن بعد تو آج سڑکیں صاف ہوئی ہیں۔ اگر برف گرنے لگی تو مسئلہ ہو جائے گا۔'' اس کے انداز میں عاجزی تھی۔

''ارے تو میں نے کب روکا ہے جاؤ تم۔ ورنہ تمہارے لالہ کو ابھی آواز لگاتی ہوں وہ تمہاری ملاقات بہت اچھی طرح گل سانگہ سے کروائیں گے۔''

''اوہ، لالہ کب آئے؟ جبھی میں سوچ رہا ہوں جس عورت کے بال بھی ملازمائیں سنوارتی ہوں وہ آج خود چائے بنا رہی ہیں، بھید تو اب کھلا۔''

''کیا باتیں ہو رہی ہیں؟'' گل ریز خان وہیں چلے آئے۔ ان کی بارعب و سنجیدہ طبیعت سے وہ خاصا مرعوب رہتا تھا۔ انہیں سامنے دیکھ کر

اس نے سلام کیا۔ انہوں نے بھی بڑی گرم جوشی سے جواب دیتے ہوئے اسے سینے سے لگایا تھا۔

''میں نے کہا تھا چائے جلدی سے کرا آؤ۔''

''سبریز خان کی فرمائش کی وجہ سے دیر ہوگئی۔'' اس نے چائے کو ٹی پاٹ میں پلٹ کر ٹی کوزی سے ڈھانپا۔ کپ و ساسر ٹرالی میں سیٹ کرتے ہوئے سنجیدگی سے گویا ہوئی۔

''سبریز خان! کیا فرمائش ہے بتاؤ۔'' وہ بیوی کی شوخ سنجیدگی کو نہ سمجھ سکے۔

''وہ......وہ؟ کچھ نہیں لالہ!'' وہ از حد نروس ہو گیا تھا۔

''اب شرماؤ نہیں۔ بتادو۔'' شیریں گل نے ٹرالی آگے کھسکاتے ہوئے معصومیت سے کہا۔

''بتاؤ نا یار! شرمانے کی کیا بات ہے؟'' خلاف عادت وہ آج خوب مہربان تھے۔

''میں بتادیتی ہوں۔ یہ شہر جا رہا ہے اور چاہتا ہے کہ......''

''نہیں......کچھ نہیں، میں چلا جاؤں گا۔'' اس نے جلدی سے کہا۔ جانتا تھا ابھی انہیں حقیقت معلوم ہوگی اور پھر انکی ڈانٹ کا وہ متحمل نہیں ہوسکتا۔

''چھوٹی سی خواہش ہے اسے ''ذرینے'' تک خدا حافظ کہہ کر آ جائیں۔''

''ارے بس؟ یہ کیا بات ہوئی۔ ابھی چائے پی کر چلتے ہیں۔ میں تو سمجھا تھا ایسی کیا انوکھی خواہش ہے۔'' گلریز خان نے مدھم مسکراہٹ سے کہا۔ اس نے پیچھے ٹرالی لاتی شیریں گل کو دیکھتے ہوئے لالہ سے آنکھ بچا کر منہ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اشارتاً کہا کہ وہ اس سے بدلہ لیے بغیر نہیں چھوڑے گا۔ وہ شرارت سے مسکرا رہی تھی۔

☆☆☆

آج سردی قدرے کم تھی۔ گزشتہ پورا ہفتہ سخت سردی کی لپیٹ میں گزرا تھا۔ نرم چمکیلی دھوپ کی سنہری کرنیں ڈھیرے ڈھیرے چلتی سرد ہوائیں فرحت بخش لگ رہی تھی۔ آسمان پر بادلوں کے سفید، سفید ٹکڑے ٹولیوں کی صورت میں بکھرے تھے۔ خوش گوار پرکیف موسم سے لطف اندوز ہونے کے لیے طلبا کی زیادہ تعداد لان میں گروپس کی شکلوں میں ادھر ادھر براجمان خوش گپیوں میں مصروف تھی۔ ورشا، فارحہ، سنبل وغیرہ بھی بیٹھی ہوئی باتوں میں مشغول تھیں۔ موضوع گفتگو سنبل ہی کی ذات تھی۔

''فارحہ درست کہتی ہے۔ تم خواہ مخواہ بات بڑھا رہی ہو۔ جب وہ سب کچھ جان چکا ہے نادم ہے اپنی غلطی پر، پھر کیوں تم انا کی قیدی بنی ہوئی ہو؟'' شعوانہ نے ناصحانہ انداز میں سمجھایا۔

''وہ محترمہ ثمرین صاحبہ، مزے سے اپنے بچوں اور ہسبنڈ کے ساتھ لائف انجوائے کر رہی ہیں اور یہاں تم دونوں کو بھگا دیا اور تم اتنی احمق ہو ابھی تک خود کو سزا دے رہی ہو۔'' سفیرہ نے کہا۔

''محبت کی پہلی بنیاد ہی ایک دوسرے پر اعتماد و یقین کی گہرائی ہے۔جس عمارت کی بنیاد ہی کمزور ہوگی اس عمارت کو زمین بوس ہونے میں ٹائم ہی کہاں لگتا ہے۔اعتماد و یقین ایک بار ٹوٹ جائیں تو پھر جوڑنے کے باوجود نشانات ہمیشہ کے لیے اسے بدنما و بدہیت کر ڈالتے ہیں۔اسے یہ معلوم تھا ثمرین اسے پسند کرتی ہے اور نہیں چاہتی کہ وہ مجھ سے ملے۔اس کے باوجود وہ بہت اطمینان سے اس کی سکھائی ہوئی باتوں پر یقین کر بیٹھا۔ایک مرتبہ بھی اس نے زحمت نہیں کی مجھ سے پوچھنے کی کہ آیا جو اس نے بکواس کی ہے وہ کہاں تک درست ہے۔میں اتنی ہی لوز کریکٹر تھی تو اب کیوں میری جستجو ہے اسے؟''سنبل از حد دل گرفتہ و رنجیدہ نظر آ رہی تھی۔

''بھول جاؤ جو کچھ ہوا۔معاف کر دو بے چارے کو۔محبت میں ایسا ہی ہوتا ہے۔پل بھر میں اعتماد مضبوط چٹان بن جاتا ہے تو کبھی لمحے بھر میں موتیوں کی طرح بکھر جاتا ہے۔عورت برداشت و صبر کا وسیع مادہ رکھتی ہے جب کہ مرد عورت کے معاملے میں ہمیشہ ''پوزیسیو'' رہا ہے۔وہ چاہتا ہے اس کی ملکیت صرف اس کی ہو۔کسی دوسرے نام کی پرچھائیں بھی وہ اپنے سے وابستہ عورت پر پڑنا پسند نہیں کرتا۔اسے اپنی کزن کی سازش کا علم ہوا تو اس نے پورے خلوص سے معافی مانگ لی تم سے اور باوجود تمہاری بے گانگی و سرد مہری کے پچھلے دو سال سے تمہارا انتظار کر رہا ہے۔کیا یہ ثبوت نہیں ہیں حمزہ کی تم سے سچی و کھری محبت کے۔''سفیرہ نے اسے قائل کرنے کی ٹھانی تھی۔

''تم لوگ میرے پیچھے کیوں پڑ گئی ہو؟حمزہ واحد انسان نہیں ہے روئے زمین پر اور بھی ہیں۔''سنبل کچھ چڑ کر خاموشی سے ان کی بحث و تکرار سنتی ورشا کے برابر بیٹھ گئی۔

''وقت جتنی تیزی سے گزر رہا ہے اس کا احساس ہم سے زیادہ ہمارے ماں باپ کو ہو رہا ہے۔آج کل سب سے بڑی آفت اور سنگین مسئلہ بے روزگاری و مہنگائی کی ناجائز حدود کو عبور کرتی شرح کا ہے۔جو بہت سرعت سے ہمارے اخلاق،تہذیب و تقدس کو دیمک کی طرح چاٹ رہا ہے اور میرے نزدیک دوسرا بڑا مسئلہ ہے گھر گھر بیٹھی بڑی تعداد میں ان لڑکیوں کے مناسب رشتے نہ ملنا۔بے شمار گھروں میں ان مسئلوں نے ذہنی انتشار پھیلائے ہوئے ہیں۔ماؤں کو رشتے مناسب نہ آنے اور بیٹیوں کی تیزی سے بڑھتی ہوئی عمروں نے بے سکون کر ڈالا ہے۔ایک وقت تھا جب بھائی پہلے بہنوں کو رخصت کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے مگر اب نفسا نفسی،خود غرضی کا یہ عالم ہے کہ وہ ایسی ذرا کتوں سے نگاہیں بچا لیتے ہیں۔بہنوں کے بر آنے کے انتظار میں اپنے ارمانوں کا سودا کوئی منظور نہیں کرتا اب۔میری مانو یہ دقیانوسی ختم کرو،حمزہ ہر لحاظ سے بہتر انسان ہے یعنی لاجواب پرو پوزل ہے اس دور کے حساب سے۔''

''ورشا،تم بھی تو کوئی رائے دو؟''اس کی خاموشی سب نے محسوس کی تھی۔

''میں؟میں کیا کہوں؟میرے خیال میں سفیرہ درست کہہ رہی ہے۔''اس کی نیلگوں آنکھوں میں لمحے بھر کو روشنی چمک کر معدوم ہوئی تھی۔

جب ان کے درمیان اس طرح کی باتیں ہوتیں تو وہ خود کو ان کے درمیان تنہا و لاتعلق سا محسوس کرتی تھی۔وہ سب آپس میں الگ الگ خاندانی بیک گراؤنڈ رکھتی تھیں۔مگران سب کے خاندان میں ایک دستور''روشن خیالی'' کا مشترک تھا کہ لڑکیوں کو آزادی رائے و پسند کا مکمل اختیار تھا۔وہ اپنی پسند سے جیون ساتھی چن سکتی تھی۔خود مختارانہ زندگی گزارنے کا حق انہیں دیا جاتا تھا جس کا تصور بھی ان کی برادری میں نہ تھا۔

''لائبریری چلتے ہیں کچھ نوٹس بنانے ہیں۔کل سنڈے ہے پرابلم ہو جائے گی۔'' ورشا نے رسٹ واچ دیکھتے ہوئے قریب رکھی فائل اور نوٹ بک اٹھا کر کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

''ہائے اتنے حسین و دلکش موسم میں لائبریری کی بخ و خاموش فضا میں جانا غیر رومانٹک ہے۔''

''تم ہر بات میں ''رومانس'' کو کیوں گھسیٹتی ہو؟'' ورشا نے شعوانہ کو گھور کر کہا۔

''اس لیے مائی ڈیئر کہ رومانس کے بغیر زندگی مکمل ہی نہیں ہے۔''

''اگر تمہیں چلنا ہے تو بتاؤ؟ ورنہ میں جا رہی ہوں۔''

''میں چل رہی ہوں۔ یہ آج موسم پر عاشق ہو گئی ہیں اور عاشقی میں محض دیوانگیاں سرزد ہوتی ہیں اور کچھ نہیں۔'' سنبل بھی فائلیں اٹھا کر اس کی طرف بڑھ گئی۔

''ہاں..... ہاں بھئی تجربہ بول رہا ہے۔'' ان تینوں نے زبردست انداز میں ہوٹنگ کی تھی۔

''بعد میں پوچھوں گی تم لوگوں سے۔'' سنبل خفت سے سرخ پڑ گئی۔ ورشا بے ساختہ ہنس پڑی تھی۔

''اف کراچی میں اتنی سردی لگ رہی ہے۔ تمہارے علاقے میں تو شدید برف ہو گی تو وہاں کیا حال ہو رہا ہو گا؟'' سنبل نے سوئیٹر کے بٹن بند کرتے ہوئے اشتیاق سے استفسار کیا۔

''ہمارا علاقہ سارا سال ہی سرد رہتا ہے۔ لوگوں کو ٹھنڈ برداشت کرنے کی عادت ہے۔ ہاں ان دنوں میں وہاں بہت پریشانی ہو جاتی ہے اور بہت سے لوگ موسم گرما یعنی برف پگھلنے تک دوسرے علاقوں کی طرف چلے جاتے ہیں جہاں ان کے مویشیوں کے لیے چارہ اور خود ان کے لیے خوراک کا بندوبست با آسانی ہو جاتا ہے۔ بعد میں واپس وہ لوگ اپنے گھروں کو آ جاتے ہیں۔'' اپنے علاقے اپنے لوگوں کی باتیں کرتے وقت اس کے دلکش چہرے پر ملکوتی روپ بکھرا ہوا تھا۔ نیلگوں آنکھوں میں ستاروں کی چمک تھی۔ گداز لبوں پر کرنوں سی نرم مسکراہٹ تھی۔ وھائٹ اینڈ اسکائی بلیو اینڈ ڈائی سوٹ میں وہ تر و تازہ شگفتہ پھول کی مانند پاکیزہ و پرکشش لگ رہی تھی۔

لائبریری کی سیڑھیوں سے اترتے صارم کی نگاہیں اس کے سراپا میں الجھ کر رہ گئی تھیں۔

''بھائی میاں! کیا ہوا؟ کیوں جم کر رہ گئے؟ سیل ختم ہو گئے کیا؟''

پیچھے آتے باسط اور آفتاب جھک کر شوخیانہ انداز میں استفسار کرنے لگے۔

''ایک غزل یاد آئی ہے بڑی شدت سے اگر اجازت ہو تو سناؤں؟'' وہ سیڑھیوں کے درمیان حسب عادت بیٹھتے ہوئے سنجیدگی سے ان سے پوچھنے لگا۔ ورشا اور سنبل کا رخ ادھر ہی تھا۔

''ارشاد..... ارشاد میری جان! ضرور سناؤ کہ موقع بھی، دستور بھی ہے۔'' ان دونوں نے بھی ورشا اور سنبل کو ادھر آتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ سو بڑے شوق سے سننے کو بے قرار تھے۔

اس کو منانا چاہیے

یار روٹھ جانا چاہیے

''واہ.....واہ! کیا بات کہی ہے۔یار روٹھ جانا چاہیے۔'' آفتاب نے تڑپ کر داد دی تھی۔

پلکیں بہت بھگو چکے

اب مسکرانا چاہیے

دل میں بہت چھپا لیا

کچھ تو بتانا چاہیے

''ہیلو بوائز! ماشاء اللہ، بہت لائق ہو تمہارا اسٹوڈنٹس ہیں۔آفس میں آئیے وہاں داد دیں گے ہم آپ کو۔'' اچانک سامنے پرنسپل صاحب کو دیکھ کر وہ تینوں بوکھلا کر کھڑے ہو گئے تھے۔قبل اس کے کہ وہ کچھ وضاحتیں پیش کرتے، پرنسپل صاحب آفس روم کی سمت جا چکے تھے۔

''مروا دیا! اب لمبا لیکچر سننا پڑے گا۔'' صارم نے آفتاب کے ایک مکا جماتے ہوئے کہا۔

''اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔'' باسط نے مسکراتے ہوئے اسے انگوٹھا دکھایا کیوں کہ ورشا اسے بیٹھے دیکھ کر واپس پلٹ گئی تھی۔وہ اپنے مقصد میں ناکام رہا تھا۔

''اوہ! مجھے سبریز خان کو پک کرنا ہے فلائیٹ آگئی ہوگی۔'' سب بھول کر وہ معا اچھل کر کھڑا ہوا تھا اور ایک ساتھ کئی سیڑھیاں پھلانگتا آگے بڑھ گیا تھا۔

☆☆☆

سبریز بہت گرم جوشی و محبت سے اس سے گلے ملا تھا۔ایسی ہی شدت و اپنائیت صارم کے انداز میں تھی۔کئی لمحے وہ ایک دوسرے سے گلے لگے شاید محسوس کر رہے تھے۔

''پلیز..... پلیز، یقین آ گیا کہ آپ دونوں طویل مدت بعد ملے ہیں۔ذرا جذبات پر قابو پانا سیکھیے اور دوسروں کو بھی موقع دیجیے۔'' آفتاب آگے بڑھ کر سبریز خان سے گلے ملتے ہوئے ناقدانہ لہجے میں بولا۔وہ بے ساختہ ہنس پڑے تھے۔پھر ماموں اور باسط سے ملنے کے بعد وہ کار کی طرف بڑھ گئے تھے۔راستہ باتوں میں جلد اختتام پذیر ہوا تھا۔گھر آ کر کھانے کے بعد چائے کے دوران حال احوال و باتوں کا تسلسل چلا تھا۔ آفتاب اور ماموں کچھ دیر قبل رات گہری ہونے کے سبب اپنے گھروں کی طرف روانہ ہوئے تھے۔باسط سونے کے لیے اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔

فدا حسین، صارم کی خواہش پر کافی بنا کر انہیں دے گیا تھا۔وہ دونوں کافی کے مگ لیے لاؤنج میں چلے آئے اور کارپٹ پر کشنز کے سہارے بیٹھ گئے۔ہیٹر آن ہونے کی وجہ سے ماحول خاصا گرم و خوش گوار تھا۔

''گاؤں میں سب کیسے ہیں؟ بی بی جان! بابا جانی کیسے ہیں؟ باقی کے لوگ بھی خیریت سے ہیں نا؟'' تنہائی ملتے ہی صارم نے بے تابی

سے دریافت کیا۔

''سب اللہ کے فضل سے خیریت سے ہیں، ماسوائے ایک کے، بی بی جان تمہیں بہت یاد کرتی ہیں۔ وہ تمہاری واپسی کی گھڑیاں گن رہی ہیں۔ بابا جانی بھی تم سے ملنے کے لیے آنا چاہ رہے ہیں مگر نائم کہاں ٹل رہا ہے۔ شہروز لالہ اور بھابو بھی تمہیں یاد کر رہی ہیں۔ بی بی جان نے تمہارے لیے پسندیدہ چیزیں بنا کر بھیجی ہیں جن میں بادام کا حلوا خصوصیت کا حامل ہے اور......''

''اسناپ اٹ یار'' صارم نگ بیچ رکھ کر تیزی سے گویا ہوا۔ کیوں کہ سبریز شرارتاً اسے بولنے کا موقع نہ دے رہا تھا۔ ''ماسوائے ایک'' کہہ کر اسے پریشانی میں مبتلا کر دیا تھا۔

''تم نے کس کی بات کی ہے؟ کون خیریت سے نہیں ہے؟'' اپنوں سے جو قلبی تعلق اور ذہنی روابط تھے، ان جذبات و احساسات کی اساس اس کو فوراً ہی بے چین و متفکر کر گئی۔

''زرگون خانم تمہاری یاد میں راتوں کو تارے گنتی ہے۔ دن میں سورج کی کرنوں کو شمار کرنے میں وقت گزارتی ہے اور تم ظالم پردیسی......''

''میں نے کتنی مرتبہ کہا ہے تمہیں! میرا زرگون سے ایسا کوئی تعلق نہیں ہے جو وہ یہ سب خرافات کرے۔'' اس نے برا منہ بناتے ہوئے اس کی بات قطع کی تھی۔

''یہ تمہارا کہنا ہے۔ ہمارے بڑوں کا فیصلہ بس فیصلہ ہوتا ہے جس سے تم بخوبی واقف ہو۔''

''میں ایسے کسی فیصلے کا پابند نہیں ہوں جو میری منشا کے خلاف ہو۔ جبر اور زبردستی کے فیصلے ماضی میں بھی کیے گئے ان سے کیا حاصل ہوا۔ یہ ہمارے بزرگ بھی بخوبی جانتے ہیں۔'' اس نے نگ لبوں سے لگاتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔

''چھوٹے اکا کی مرضی مکمل طور پر تمہیں داماد بنانے کی ہے۔ بہرحال جو بھی قدم اٹھاؤ سوچ سمجھ کر اٹھانا کیوں کہ چھوٹے اکا کا استحقاق متزلزل نہ ہو۔''

''میں نے چھوٹے اکا کو ہمیشہ بابا جانی کے بعد اپنا سب کچھ سمجھا ہے اور مجھے یقین ہے وہ مجھے پرورش کرنے کا خراج اس طرح وصول نہیں کریں گے۔ مرد خاندان کی نسل کا علمبردار ہوتا ہے۔ اپنے باپ کی وراثت کا واحد وارث میں ہوں، مجھے اپنے بابا کی نسل کو زندہ رکھنا ہے اور میں نہیں چاہوں گا اپنے قبیلے کے افراد میں معذور ذہنی مریض افراد کا اضافہ کروں۔ ہمارے خاندان کو اب ایسے مفلوج اذہان کی ضرورت نہیں ہے۔''

''کیا ارادے ہیں؟ خاصی بلندی پر پرواز کر رہے ہو؟'' سبریز معنی خیزی سے بولا۔

''شاہین ہمیشہ آسمانوں پر پرواز کرتے ہیں۔ چٹانوں پر بسیرا ہوتا ہے ہمارا۔ تم سناؤ گل سانگہ کے لیے ''پربت محل'' کہاں بنوا رہے ہو؟'' اس نے کشن کے ڈھیر پر نیم دراز ہو کر اسے دیکھتے ہوئے شوخی سے کہا۔ سبریز خان کے چہرے پر روشنی سی روشنی پھیل گئی تھی۔

''آکاش پر، میرے خیال میں دو پیار بھرے دل زمین پر من پسند طریقے سے نہیں رہ سکتے۔''

''تم سے یہی امید کی جا سکتی ہے۔'' صارم نے مسکراتے ہوئے کہا تو سبریز ہنس پڑا۔

''شادی میں کتنے دن پہلے آؤ گے؟''

''ایک تو تم شادی کے لیے اس قدر بے قرار و بے چین ہو کہ میرے سمسٹرز تک نہیں رک سکتے سارا مزہ کرکرا کر کے رکھ دیا ہے تم نے۔''

''ابھی تم اس جذبے سے نا آشنا ہو میری جان! محض رنگین آنچل کی چھاؤں میں وقت گزاری کر رہے ہو جب یہ دل لگی دل کی لگی بنے گی تبھی پھر معلوم ہوگا کہ.....''

''او کے، دیکھیں گے۔ شمشیر خان سے کبھی پھر تو ٹکراؤ نہیں ہوا۔''

''نہیں..... پھر تو نہیں ہوا لیکن سنا ہے وہ زخمی شیر کی طرح اپنی ناکامی کا زخم چاٹتا پھر رہا ہے۔ بدلے کی آگ میں جنونی ہو رہا ہے۔''

''ہاں..... یاد آیا اس کی ایک بہن یہاں یونیورسٹی میں پڑھنے آئی ہوئی ہے۔'' یک دم ہی جیسے سبریز کو کچھ یاد آیا تو چونک کر بولا۔

☆☆☆

''اچھا..... مگر جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے ولی قبیلے میں جہالت و ذہنی پسماندگی، تنگ نظری کی حامل شخصیات کا دور دورہ ہے۔ عورت کی عزت و تکریم وہ کرنا نہیں جانتے۔ ان کی نگاہوں میں گھر میں موجود عورت اور باہر کھونٹے سے بندھی گائے میں سرمو فرق نہیں ہے۔ پھر بھلا اتنی عظیم تبدیلی کیونکر آئی..... ؟ یہ شاید اس دور کا حیرت انگیز معجزہ ہے! اس قبیلے کی کوئی لڑکی اتنی خوش نصیب، اتنی بخت آور، اتنی معتبر ثابت ہوئی کہ نہ صرف اس نے روایت مسمار کی بلکہ اس حویلی کی اونچی سنگلاخ دیواروں کو پھلانگ کر اس مخلوط تعلیمی ادارے کی چار دیواری میں آ گئی، جہاں کے ماحول کا تصور بھی اس قبیلے کی عورتیں نہیں کر سکتیں۔ بادوری اسٹرینج!'' صارم خان حیرانگی در حیرانگی کے بھنور میں بری طرح چکرا رہا تھا۔

''شہباز خان کی سب سے چھوٹی بیٹی ہے۔ بہت غصے والی، ضدی اور حق کی خاطر جان سے گزر جانے پر بھی تیار رہتی ہے۔ اس کی کسی بات نے شہباز خان جیسے چٹان انسان کو موم بنا ڈالا اور یوں پہلی مرتبہ انہونی ہو گئی۔ کیا تم واقف ہو اس لڑکی سے؟'' سبریز خان کے لبوں پر اس کی حیرانگی محسوس کر کے مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔ وہ اس کے قریب ہی لیٹ گیا تھا۔

''نہیں..... نام کیا ہے اس کا؟ کس ڈپارٹمنٹ میں زیر تعلیم ہے؟'' وہ از حد پر اشتیاق لہجے میں بولا۔

''یہ سب تو مجھے معلوم نہیں ہے یہ معلومات بھی اتفاقاً معلوم ہو گئی تھیں۔ ویسے حیرت انگیز بات یہ ہے کہ تمہیں ایسی کسی لڑکی کے بارے میں معلومات نہیں ہیں جو ایک انفرادی قبیلے سے تعلق رکھتی ہو۔'' سبریز خان کا شوخ انداز اسے چڑانے والا تھا۔

''انفرادی..... میری جان! جامعہ اپنے اندر ایک بڑے شہر کی سی وسعت رکھتی ہے۔ یہ کوئی چھوٹا سا دسکول تو ہے نہیں جو کسی سے متعلق جاننے کے لیے معمولی سا تردد بھی نہ کرنا پڑے اور انفرادیت کی بھی خوب کہی تم نے۔''

''آفریدی'' یہ نام تو لگتا ہے آج کل فیشن کے طور پر استعمال ہونے لگا ہے۔ میرے جان پہچان والوں میں کم از کم سو سے زائد ایسے لوگ ہیں جو اپنے اسم کے ساتھ آفریدی لگاتے ہیں۔ حالانکہ ان کی عادات و شخصیت میں کہیں بھی اس نام سے ملتا جلتا تاثر نہیں ملتا۔ ان میں میل اور فی

میل دوتوں شامل ہیں پھر جامعہ میں تو کوئی شمار ہی نہیں ہے۔'' صارم نے جواباً اسے چھیڑتے ہوئے کہا۔

''یہ تم مجھے اس طرح کیوں سمجھا رہے ہو، جیسے کوئی استاد کسی کند ذہن بچے کو سبق ذہن نشین کروا رہا ہو۔''

''تم کند ذہن بچے سے زیادہ نالائق ہو جبھی پڑھائی چھوڑ کر زمینوں میں لگ گئے ہو۔''

''صبر سے کام لو میرے یار، اتنی مغز ماری کے باوجود بھی جب تم ''زمینوں'' کو سنبھالو گے تو پھر پوچھوں گا۔''

''یہ وقت بتائے گا ماسٹر آف بزنس کی ڈگری میں گلے میں لٹکانے کے لیے نہیں لوں گا۔''

''ڈیئر حضرات اگر ناگوار خاطر نہ ہو تو میرے ہاتھ کی کافی پی کر دیکھیے۔'' باسط ٹرے میں کافی کے بھاپ اڑاتے مگ رکھے اندر داخل ہو کر خوشگوار لہجے میں گویا ہوا۔

''تھینکس باسط، میں تو سمجھا تم سونے جا چکے ہو؟'' صارم نے مگ اٹھاتے ہوئے کہا۔

''گیا تو میں سونے ہی کو تھا مگر نیند نہیں آئی۔ سوچا کافی پی جائے اور یہاں آ کر گپ شپ بھی کی جائے کیونکہ تم دونوں تو ایک دوسرے سے اس طرح محو گفتگو ہو کہ میرا خیال ہی نہیں آ رہا۔''

سبریز اپنے نزدیک اس کی جگہ بناتا ہوا گویا ہوا۔'' ایسی بات نہیں ہے تم بھولنے والی شے نہیں ہو۔ میں بھی یہی سمجھا تھا کہ تم سو گئے ہو۔''

''شکریہ دوستو! پہلے کافی پی لیں پھر رمی کھیلتے ہیں۔'' وہ ان کے قریب بیٹھ کر گویا ہوا۔

☆☆☆

''او..... ہو! آج کچن پر ستم ڈھانے کا ارادہ ہے؟ آج اس بے چارے کی شامت آئی ہے۔'' فارحہ، سنبل اور ورشا کو کچن میں مصروف دیکھ کر خاصی شوخی سے گویا ہوئی۔

''چائے پیو گی؟'' ورشا نے کیتلی میں ابلتے پانی میں پتی ڈالتے ہوئے پوچھا۔

''اونہہ چائے؟ نفرت ہے چائے سے۔ کافی یا کولڈ ڈرنک پلا دو تو کوئی مضائقہ نہیں۔''

''فارحہ! کتنا برا لگتا ہے اس طرح ایک نعمت کے متعلق کہنا۔ اگر تمہیں چائے پسند نہیں ہے تو یوں بھی کہہ سکتی ہو کہ مجھے چائے پسند نہیں ہے یا میں چائے نہیں پیتی۔ نعمتوں کا شکر ادا کیا جاتا ہے۔'' سنبل فنگر چپس فرائی کرتی ہوئی سنجیدگی سے ناصحانہ انداز میں اسے سمجھانے لگی۔

''اوہ..... سوری اللہ میاں جی!'' اس نے دونوں کان پکڑ کر اوپر دیکھتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی۔ ''سوری ڈیئر سنبل اینڈ ڈیئر ورشا!'' وہ چپس کیچ اپ میں لگا کر کھاتے ہوئے بولی۔

''ہاتھ قابو میں رکھو اپنے۔'' سنبل اس کے دوسرے کباب کی طرف بڑھتے ہاتھ کو دور کر کے بولی۔

''نمک چکھ رہی ہوں۔''

''تمہاری طرح پھوہڑ نہیں ہوں۔''

''جلدی کرو میں چائے ٹیبل پر لگا رہی ہوں۔ فٹافٹ آؤ۔'' ورشا نے فضا میں ہنگامے کی بو سونگھ کر تیزی سے چائے کا سامان سمیٹا اور کچن سے نکل آئی۔

شام کا سرمئی آنچل ہر سو لہرانے لگا تھا۔ غروب ہوتے سورج کی دم توڑتی شعاعیں خنک چلتی ہوا میں خوشگوار محسوس ہو رہی تھیں۔ اس نے چائے دانی ٹی کوزی سے ڈھانپ کر سینٹر ٹیبل پر رکھی اور ساتھ ہی دوسرے برتن سیٹ کرنے لگی۔ گلاس وال پر بھاری پردہ اس نے ہٹا کر ایک طرف کیا تو سرسبز خوبصورت پھولوں، پودوں سے مہکتا لان کا نظارہ شام کی اس سکوت زدہ بے کل کر دینے والی خاموشی میں ایک خوش کن تازگی بھرا احساس دینے لگا۔ وہ غیر ارادی طور پر شفاف شیشے سے چہرہ لگا کر سامنے مہکتے سرخ گلابوں اور گیندے کے جھومتے شگوفوں کو یک ٹک دیکھنے لگی اور اس کے اندر جیسے وادی اپنے سرسبز شاداب وجود کی کسک جگانے لگی۔ سرخ پتھروں سے بنی اس کی حویلی بھی پوری سبزے سے ڈھکی ہوئی تھی۔ جس کے گوشے گوشے میں پھولوں اور پھلوں کی بہتات تھی۔ ارد گرد پہاڑوں کی کوکھ سے گرتے جھرنے اور آبشار، کتنا حسن بکھرا ہوا تھا وہاں۔ ہر شے میں حسن و خوبصورتی خالق کے نور کو اجاگر کرتی ہوئی مکمل ہوتی۔ پھول و پھل، آبشار، جھرنے، سبزہ و آسمان کی بلندیوں سے ٹکراتے پہاڑوں میں ہر جگہ اس کی ذات کی خوبصورتی کا لازوال بے مثال حسن بکھرا ہوا تھا۔ اس ''رب'' کی بادشاہی تو ہر جگہ قائم و دائم ہے۔ اللہ کا قانون سب کے لیے ہے۔ وہ سب کو ایک نگاہ سے نوازتا ہے۔ اس کی نظر میں نہ مرد اپنی ذاتی برتری کے باعث معتبر ہے اور نہ عورت کسی پستی کی تہہ میں گری نامعتبر ہے۔ اس کے نزدیک وہی معتبر اور فضیلت والا ہے جو متقی اور عبادت گزار و پرہیزگار ہو۔ یہ اونچ اور نیچ اعلیٰ و ادنیٰ، بہتر و بدتر، غلام و کنیز کے مرتبے تو خود انسان کی خود غرضی و خود پسندی کے احساسات نے مرتب کیے ہیں۔ مرد کی پہلی اولین خواہش، پہلی تمنا، پہلی آرزو عورت کے قرب، اسے پانے، اسے چھونے کی، اسکے

اندر جاگی تھی۔ مرد کی خواہش پر ہی عورت کو تخلیق کیا گیا پھر کیوں عورت مرد کے لیے ہی حقیر و سستی، بے وقعت ہستی بن کر رہ گئی؟ مٹی کے کھلونے سے بھی زیادہ ارزاں اور کمزور۔ وہ جب چاہتا ہے اسے توڑ کر رکھ دیتا ہے۔

''ٹرن...... ٹرن...... ٹرن۔'' فون کی تیز بیل نے اسے وادی کے ظالم رسم و رواج کے خیالات سے بیدار کیا۔ اس نے آگے بڑھ کر قریب ہی اسٹینڈ پر رکھے فون کا ریسیور اٹھا کر ہیلو کہا۔

''ہیلو! میں حمزہ بول رہا ہوں۔'' دوسری طرف سے بے تکلف سی آواز آئی۔

''جی۔ کس سے بات کریں گے؟'' اس نے خاصا سنبھل کر سوال کیا۔

''فی الحال آپ سے ہی کریں گے۔ آپ وزشا بول رہی ہیں نا؟''

''جی، آپ کو میرا نام کیسے معلوم ہے؟'' وہ شدید حیران تھی۔

''نام؟ اگر آپ کہیں تو آپ کا مکمل بائیو ڈیٹا بتا دوں؟''

''آپ علم نجوم جانتے ہیں یا کوئی جنات وغیرہ آپ کے قبضے میں ہیں۔''

''ہا...... ہا...... ہا۔ جنات تو کیا قابو کریں گے۔ ایک عرصے سے انسان کو قبضے میں کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ انسان یعنی سنبل کو قابو کرنے کے لیے آپ کی مدد درکار ہے۔ فارحہ نے آپ کا غائبانہ تعارف کرایا تھا۔ ان کا کہنا ہے کہ سنبل آپ سے بے حد قریب ہے اور آپ با آسانی میرا مقدمہ لڑسکتی ہیں کیونکہ بقول فارحہ کے آپ میں جرات مندی اور حق کو منوانے کی خداداد صلاحیت موجود ہے۔''

''حمزہ بھائی! آپ کے اور سنبل کے درمیان جو کچھ ہوا، اس سے میں سرسری طور پر واقف ہوں مکمل طور پر آگاہی پانے کے لیے میں نے خود کوشش نہیں کی کہ مجھے ایسے لوگوں سے شدید چڑ ہے جو خواہ مخواہ دوسروں کے ذاتی معاملات میں لطف اندازی کے لیے تاک جھانک کرتے ہیں، بن گن رکھتے ہیں۔''

''وہ احمق لڑکی ایسی ہی ہے۔ خود گھٹ گھٹ کر ختم ہو جائے گی مگر اپنی پریشانی کسی سے بھی شیئر نہیں کرے گی۔ آپ ایسا کریں مجھ سے ملاقات کرلیں میں آپ کو مکمل تفصیل بتا دوں گا اور مجھے امید ہے کہ کوئی لائحہ عمل بھی ڈھونڈ نکالیں گے، پھر آپ آ رہی ہیں نا؟ اپنی دوست کی خاطر آپ کو مجھ پر اعتماد کرنا ہوگا۔'' دوسری طرف سے سنجیدگی اور کچھ بے تابی سے استفسار کیا گیا تھا۔

''میرے خیال میں اعتماد کی پہلی سیڑھی انسان کی اپنی ذات ہوتی ہے اور میں اس سیڑھی پر مضبوطی سے قدم جمائے ہوئے ہوں اور سنبل کی خاطر میں یہ خلاف سرشت کام کرنے کو تیار ہوں کیونکہ میں ایسے خاندان (قبیلے) سے تعلق رکھتی ہوں جہاں دشمنی میں جان لینا حق سمجھا جاتا ہے تو دوستی میں جان نچھاور کرنا معمولی سی باتیں ہیں۔''

دوسری طرف سے ہوٹل اور ملاقات کا وقت بتا کر یہ تاکید کی گئی تھی کہ سنبل کو کچھ معلوم نہ ہو۔ البتہ فارحہ کو پہلے سے علم تھا۔

دوسرے دن سنڈے تھا، آنٹی انکل بوتیک چلے گئے۔ چھٹی والے دن انکل ان کے ساتھ بوتیک جایا کرتے تھے۔ فارحہ سنبل کو بہانے

سے سفیرہ کے ہاں لے گئی تھی اور وہ سر درد کا بہانہ کر کے رک گئی تھی۔ ان کے جانے کے بعد وہ بھی تیار ہو کر وقت مقررہ پر گھر سے نکل آئی۔ ٹیکسی نے اسے مطلوبہ ہوٹل کے سامنے اتار دیا تھا۔ اس نے کرایہ ادا کیا اور اندر کی جانب بڑھ گئی۔ حمزہ کو تلاش کرنے میں اسے ذرا بھی تردد نہیں کرنا پڑا وہ اسے پارکنگ لاٹ میں گیٹ سے گھستے ہی نظر آ گیا تھا۔ کار کی بیک سے ٹیک لگائے ریسٹ واچ دیکھ رہا تھا۔ اس کی نگاہیں گیٹ پر ہی تھیں۔ وہ ''تنہا'' آنے والی لڑکیوں کو بہت غور سے دیکھ رہا تھا کیونکہ ورشا کو بھی تنہا آنا تھا۔ وہ اسے پہچانتا نہیں تھا اس لیے زیادہ کنفیوژ نظر آ رہا تھا۔ ورشا کو فارحہ نے اس کی کئی تصاویر البم میں دکھائی تھیں وہ اسے ایک نظر میں ہی پہچان گئی تھی۔

''السلام علیکم حمزہ بھائی!'' اس نے ان کے عقب سے آ کر سلام کیا تو وہ بری طرح چونک اٹھا۔

''آپ عقبی گیٹ سے آئی ہیں۔ میں آدھے گھنٹے سے یہاں آپ کا انتظار کر رہا ہوں۔'' اس نے سلام کا جواب دیتے ہوئے خاصے خجالت آمیز انداز میں کہا اور کار ڈور لاک کرنے لگا۔

''آپ نے جو ٹائم دیا تھا میں اسی ٹائم پر آئی ہوں۔'' ورشا کو لائٹ گرین کوٹ سوٹ میں ملبوس گندمی رنگت و خوبصورت چہرے والا حمزہ سنبل کے جوڑ کا محسوس ہوا تھا۔

''دراصل میں اس لیے جلدی آ گیا تھا کہ مجھے بعد میں احساس ہوا میں نے آپ کو دیکھا نہیں ہے نہ آپ مجھے پہچانتی ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو ہماری ملاقات اسی پہچان کے چکر میں ضائع ہو جائے تو کچھ دیر پہلے یہاں چلا آیا تھا کہ ہو سکتا ہے آپ بھی اسی سلسلے میں ٹائم سے پہلے نہ آ جائیں۔''

''آپ نے خواہ مخواہ اتنی زحمت کی حمزہ بھائی! میں نے آپ کی تصویر دیکھی تھی اور پہچان گئی۔''

''اوہ..... ہو..... محبت واقعی انسان کو عقل و خرد سے بیگانہ کر ڈالتی ہے۔ مجھے یہ پہلے احساس ہی نہ ہوا کہ آپ سے میں واقف نہ سہی مگر آپ مجھ سے واقف بہرحال ہوں گی۔ تصویر کے ذریعے ہی سہی۔'' اس کی بے ساختگی میں ایسی ندامت تھی کہ ورشا بے اختیار مسکرا اٹھی تھی۔

''ثمرین میری کزن ہے۔ ممی کی خواہش اسے میری شریک سفر بنانے کی تھی مگر میں نے کبھی اسے اس انداز میں نہیں دیکھا تھا۔ سنبل ڈیڈی کے دوست کی بیٹی ہے۔ اس سے ملاقات ایک پارٹی میں ہوئی تھی۔ اسے دیکھ کر مجھے احساس ہوا وہ وہی ہے جسے ایک عرصے سے میرا دل میری نگاہیں ڈھونڈ رہی تھیں۔ پھر اتفاقاً ہی ہماری ملاقاتیں ہوتی رہی تھیں اور وہ جو کہتے ہیں دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ شاید سچے جذبے، بے لوث محبت بہت سرعت سے اپنی راہ ہموار کرتی ہے۔ سنبل نے میرے جذبے کی پذیرائی بہت وارفتگی و والہانہ انداز میں کی تھی۔ ہم بہت جلد ایک دوسرے کے جذبوں سے آشنا ہو چکے تھے۔ ہم دونوں کے والدین نے ہماری راہ میں رکاوٹ کی کوئی خلیج حائل نہیں کی۔''

''پھر ثمرین نے کہاں سے اٹیک کیا.....؟'' ورشا نے رسٹ واچ دیکھتے ہوئے اس کی بات قطع کی۔ وہ اس وقت ہال میں کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ ان کی ٹیبل عقبی دیوار سے لگی تھی جہاں ویسٹرن ٹاپ کھڑکی سے سامنے اور اردگرد کی بلند و بالا جگمگاتی عمارتیں نظر آ رہی تھیں۔ نیچے کشادہ سڑک پر رواں دواں ٹریفک کی سرخ پیلی روشنیاں، فٹ پاتھ پر سبز گھاس میں کچھ کچھ فاصلے پر لگے خوش رنگ پھولوں کے پودے، اسٹریٹ لائٹس کی روشنی میں خوبصورت لگ رہے تھے۔ اس کی نگاہیں اندر ہال میں موجود سرگوشیوں میں باتیں کرتے لوگوں پر نہیں پڑ رہی تھیں۔ وہ کھڑکی سے باہر کا منظر

دلچسپی سے گاہے بگاہے دیکھ رہی تھی۔ گرم بھاپ اڑاتی کافی کے مگ دونوں کے ہاتھ میں تھے۔

''شاید آپ بور ہو رہی ہیں......؟'' حمزہ نے مسکراتے ہوئے مگ ہونٹوں سے لگاتے ہوئے کہا۔

''نہیں...... دراصل میرے پاس وقت بہت محدود ہے۔ رات اپنے سیاہ گیسو پھیلا چکی ہے۔'' اس نے نرم لہجے میں وضاحت کی۔

''اوکے۔ پھر ہوا یوں کہ ہم دونوں کی منگنی کا اعلان کر دیا گیا۔ یہ خبر صرف خاص خاص رشتے داروں کو دی گئی تھی۔ اس دوران ہی نہ معلوم کس طرح ثمرین نے غیر محسوس طریقے سے میرے گرد جال پھیلانا شروع کر دیا۔ شروع میں میں نے اس کی باتوں کو کوئی اہمیت نہ دی مگر مجھے اعتراف ہے محبت جہاں جذبوں کو فروغ دیتی ہے۔ اعتماد کو مستحکم کرتی ہے وہیں کچھ خرابیاں بھی پیدا کر دیتی ہے۔ سنبل پر مجھے ازحد یقین و اعتماد تھا۔ مگر مجھے بعد میں محسوس ہوا سنبل کے معاملے میں میں بہت خود غرض و خود پسند ہو گیا تھا۔ اس کے ہر فعل پر میں اپنے پیار کی مہر دیکھنا چاہتا تھا۔ ثمرین نے مجھ سے کہا وہ اپنے کزن میں انٹرسٹیڈ ہے۔ مجھے محض الو بنا رہی ہے۔ مجھے اس کی بات کا یقین نہیں تھا پھر میں نے خود سنبل کو اپنے کزن کے ساتھ کالج آتے جاتے دیکھا۔ تھوڑی میں بری طرح جیلس ہو گیا۔ مرد گناہوں کی دلدل میں اتر جائے تو خود کو فرشتہ سمجھتا ہے اور اپنے سے وابستہ عورت کو بالکل پاکیزہ دیکھنا چاہتا ہے۔ پھر میری زندگی میں آنے والی پہلی اور آخری لڑکی محض وہی ہے پھر میں کس طرح برداشت کر سکتا تھا وہ میرے علاوہ کسی اور کو اپنا ٹائم دے۔ ایک دن وہ مجھے مل گئی تھی میں نے اس سے باز پرس کی تو وہ پہلے تو میری طرف حیرانگی سے اس طرح دیکھنے لگی جیسے پہلی مرتبہ دیکھ رہی ہو۔ پھر بولی۔'' میں ایسے مرد کے ساتھ زندگی نہیں گزار سکتی جس کی نگاہوں میں شکوک کا اندھیرا ہو۔'' اس وقت میں بھی غصے میں تھا۔ میں نے بھی پروا نہیں کی اور خاموشی سے کینیڈا چلا گیا۔ گھر والوں نے بہت چاہا میں واپس آ جاؤں مگر مجھے سنبل کی طرف سے جو بے وفائی کا زخم لگا تھا اس سے فرار میں نے چاہا تھا اور یہ حقیقت مجھے دو سال بعد معلوم ہوئی خود ثمرین نے وہاں اپنے شوہر کے ساتھ آ کر مجھ سے معذرت کی اور بتایا کہ اس نے اپنے ٹھکرائے جانے کا انتقام مجھ سے لیا تھا۔ ورنہ سنبل بہت معصوم اور باکردار لڑکی ہے۔ ثمرین کے ہسبینڈ نے بھی مجھ سے اس کے رویے کی معذرت کی۔ وہ آزاد معاشرے میں پرورش پانے والا روشن دل اور دماغ کا مالک ہے شاید اس کے کہنے پر ثمرین معذرت کرنے آئی تھی۔ وہ اپنے ضمیر کا بوجھ اتار کر چلی گئی اور میں ندامتوں اور جلد باز فطرت کے باعث خود سے بھی نگاہ نہ ملا پایا۔ حالانکہ دل میرا ہمیشہ سرزنش کرتا رہا بار بار سمجھاتا رہا۔ سنبل ایسی نہیں ہو سکتی۔ مگر جب دماغ گھوم جاتا ہے تو دل کی کسی صدا پر توجہ نہیں دیتا میں اس وقت انا کے سمندر میں ڈوب گیا تھا۔ ضد کے صحرا میں بھٹک گیا تھا۔ یہ احساس میرے تمام تر جنون خیز زور آور جذبوں پر حاوی ہو چکا تھا کہ میری غلط فہمی کو سنبل حقیقت بتا کر واضح کر سکتی تھی کہ وہ اس کا کزن تھا کوئی ایسا جذباتی یا دلی تعلق اس سے وابستہ نہیں تھا میرے پوچھنے پر اس نے میرے احساسات کو مجروح کیا۔ میرے جذبوں کی توہین کی۔ دیکھ میرے اعتماد، خلوص محبت کو قابل اعتنا نہ سمجھا اور تمام تعلق توڑ لیے تھے۔ اس وقت مجھ پر بھی انا اور ضد سوار ہو گئی لیکن ثمرین کے جانے کے بعد میں خود پر قابو نہ پا سکا اور پاکستان آ گیا۔ سنبل سے ملنے کی بات کرنے اسے منانے، معذرت کرنے کی بہت کوشش کی مگر...... وہ مجھ سے اس حد تک بدظن و برافروختہ ہے کہ میری آواز تک سننے سے گریزاں ہے۔ پچھلے ایک سال سے میں پریشان ہوں۔ ہم دونوں کے گھر والے راضی ہیں مگر سنبل ہی نہیں مان رہی اور اس کی والدہ کہتی ہیں وہ بیٹی کی مرضی کے خلاف کچھ نہیں کر سکتیں۔ اگر سنبل راضی ہے تو انہیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ وہ رضامند ہوئی تو وہ زبردستی نہیں کریں گی۔''

کافی کے سپ لیتی ہوئی وہ خاموشی سے اس کی داستان عشق سن رہی تھی۔ حمزہ دھیمے لہجے میں اس سے اس بے تکلفی سے محو گفتگو تھا جیسے برسوں سے شناسائی ہو، جیسے دوستی کے گہرے مراسم وہ طے کر چکے ہوں۔ اس کے سنجیدہ چہرے پر اپنی جلد بازی و جذباتیت کی خجالت کے سائے موجود تھے۔ اس کے ایک ایک لفظ سے بے پایاں و پر خلوص سچے و بے کھوٹ محبت کے عکس واضح تھے۔ وہ اپنی کہہ رہا تھا۔ ورشا محویت کے باوجود کسی کی نگاہوں کا حصار اپنے چہرے پر محسوس کر رہی تھی۔ اس نے سرسری طور پر کئی بار اپنے اردگرد دیکھا بھی مگر کوئی بھی اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ اس نے دوبارہ اپنی توجہ حمزہ کی طرف مبذول کر دی مگر کسی کی پر حدت نگاہوں کی گرمی وہ اپنے چہرے پر مسلسل محسوس کر رہی تھی مگر اردگرد کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

''میں نے آپ کو تمام صورتحال گذشتہ سے پیوستہ بلا مبالغہ آرائی سنا ڈالی ہے۔ مجھے امید ہے بلکہ میری استدعا ہے آپ سے، آپ کونسل کو میرے حق میں قائل کرنا ہے۔'' اس نے ساجت بھرے انداز میں اپنا مدعا بیان کیا۔

''انشاءاللہ حمزہ بھائی! میں بھرپور کوشش کروں گی۔ اس بات سے تو آپ بھی واقف ہیں کہ اگر جذبے سچے و بےلوث ہوں تو اپنا آپ منوا لیتے ہیں۔ بہرحال میں جدوجہد میں کسر اٹھا نہ رکھوں گی۔'' اس نے ٹیبل سے بیگ اٹھاتے ہوئے باعزم و نرم لہجے میں کہا۔ ساتھ ہی ویٹر کو بل پے کر کے حمزہ بھی اٹھ گیا تھا۔ اس کے ساتھ وہ آگے بڑھ گئی تھی۔ اسی لمحے گیٹ سے باہر راہداری میں کرسی پر بیٹھے صارم خان پر اس کی نگاہیں بے ساختہ اٹھی تھیں۔ وہ کسی شخص کے ساتھ بیٹھا کافی پی رہا تھا۔ اس کی نیلگوں حیران کن نگاہیں بہت بے یقینی و از حد حیرانگی سے اس کے اوپر مرکوز تھیں۔ اسکی نگاہوں سے کچھ ایسے مفہوم مترشح تھے کہ لمحے بھر کو اسے اپنی ذات نامعتبر لگی۔ دور تک اس کی نگاہوں کی حدت اس نے محسوس کی تھی۔ سیڑھیوں سے نیچے اترتے ہی اس کا چہرہ سرخ سا ہو گیا تھا۔ سامنے ہی سوئمنگ پول تھا جہاں اس وقت بھی ملکی و غیر ملکی دوشیزائیں بڑی تعداد میں ناکافی ملبوسات میں اٹکھیلیاں کر رہی تھیں۔ حیا و شرمندگی سے اس کی جھکی نگاہیں نہ اٹھ سکیں۔ وہ تیز تیز قدموں سے وہاں سے گزرنے لگی۔ صارم خان کا راہداری میں بیٹھنا اب اس کی سمجھ میں آیا تھا کیونکہ اس کی ٹیبل کے سامنے ہی سوئمنگ پول تھا اور اوپر سے ''رنگین'' نظارے وہ با آسانی کر رہا تھا۔ نفرت کی شدید لہر اس کے اندر اٹھی تھی۔ کچھ لمحے قبل اپنے اندر اٹھتے نامعتبری کے احساس سے وہ چھٹکارا پا چکی تھی۔

☆☆☆

سیاہ جیپ سبک خرامی سے پل پر دوڑ رہی تھی۔ اطراف میں سبزہ سے ڈھکے سرسبز میدان تھے جن میں جگہ جگہ جنگلی پھولوں سے لدی جھاڑیاں اور صنوبر اور چنار کے درختوں کی بہتات تھی۔ سامنے بلند پہاڑ سے جھرنا گر رہا تھا جس کے پانی نے اپنی راہ بنا لیا تھا اور وہ بہتا ہوا نہر کی صورت اختیار کر گیا تھا۔ اس وادی کا ہر گوشہ قدرتی حسن کی دولت سے مالا مال تھا۔ شمشیر خان اپنے خاص ملازم، محرم راز سمندر خان کے ہمراہ پچھلی سیٹ پر براجمان تھا۔ سیاہ کلف شدہ کرتے سوٹ میں ملبوس وائٹ چادر شانوں پر مخصوص انداز میں لپیٹے وہ کسی گہری سوچ میں مستغرق تھا۔ سمندر خان اسلحہ سنبھالے مستعدی سے اردگرد پر نظر رکھے ہوئے بیٹھا تھا۔ ڈرائیور جیپ ڈرائیو کر رہا تھا۔ جیپ پل سے اتر کر سڑک پر دوڑنے لگی۔ معاً گھنی قدر آور جھاڑیوں سے مویشیوں کا چھوٹا ریوڑ ان کی راہ میں حائل ہو گیا۔ ڈرائیور نے جیپ روک کر ہارن بجانا شروع کر دیا۔

چند لمحے گزر جانے کے باوجود ان جانوروں پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ یونہی بے فکری و بے نیازی سے گھاس اور چھوٹے چھوٹے پودے کھانے میں معروف تھے۔ سمندر خان اور ڈرائیور صمد خان جیپ سے اتر کر انہیں راستے سے ہٹانے کے لیے آگے بڑھ گئے جانوروں کی ہٹ دھرمی عروج پر تھی۔ ان کے آگے دھکیلنے کے باوجود وہ ٹس سے مس نہیں ہو رہے تھے۔ شمشیر خان کے ہر لحہ بگڑتے تیور اور شعلے اگلتی آنکھیں ان دونوں کو بدحواس کر رہی تھیں۔ سمندر خان نے پیچھے پڑی موٹی سی لکڑی اٹھالی۔ ابھی اس نے مارنے کے لیے ہاتھ بلند ہی کیا تھا کہ چنگھاڑتی ہوئی ایک لڑکی سر پر چھوٹی چھوٹی جمع کی گئی لکڑیوں کا ڈھیر اٹھائے نمودار ہوئی۔

''اے لالہ! اس بے زبان کو کیوں مارتا ہے؟ کیا بگاڑا ہے اس نے تمہارا؟'' وہ لکڑیوں کا گٹھر گھاس پر پٹختی ہوئی شیرنی کی طرح غرائی اور بھیڑ کے چھوٹے سے بچے کو بڑھ کر گود میں اٹھالیا۔

''اس بے زبان نے راستہ روک رکھا ہے ہمارا، راستے سے نہیں ہٹتا ہے۔'' سمندر خان جھلا کر گویا ہوا۔

''یہ راستے سے نہیں ہٹتا تو تم راستہ بدل لو، کیوں اس بے زبان کے ساتھ بحث کرتا ہے۔''

''لڑکی! ہمارے خان کا راستہ یہی ہے۔ تم راستہ چھوڑ دو، ہٹاؤ اپنا مویشی یہاں سے کیوں ٹائم خراب کرتا ہے؟ خان کو جانتا نہیں ہے تم شاید ابھی؟'' صمد خان نے لڑکی کے بگڑے تیور دیکھ کر اسے مطلع کیا۔

''خان؟ گل فشاں بی بی نام ہے ہمارا، ہم کسی سے نہیں ڈرتا سوائے اللہ کے، خان انسان ہے، کوئی خدا نہیں ہے جو تم ہم کو ڈراتا ہے۔ نہیں ڈرتا ہم کسی خان وان سے۔''

اس کی بے نیازی، بے خوفی عروج پر تھی۔ شمشیر نے کچھ چونک کر تعجب سے اس الھڑ، تو خیز و دلربا حسن رکھنے والی پُر شباب لڑکی کو دیکھا اور لمحے بھر میں اس کی آنکھوں سے خشونت اور درشتی کے رنگ تحلیل ہو گئے۔ شکاری کو من پسند شکار دیکھ کر جو خوشی اور سرشاری محسوس ہوتی ہے اس ساعت کے تمام رنگ اس کے چہرے، آنکھوں، ہونٹوں سے مترشح تھے۔

''کس علاقے سے آئی ہو؟'' وہ جیپ سے اتر آیا تھا۔ چادر جھٹکے سے شانے پر ڈالتا ہوا اس کی طرف بڑھتا ہوا بولا۔ اس کے چہرے کا رنگ، آنکھوں کی وحشیانہ چمک، ہونٹوں پر کھیلتی آوارہ سی دھیمی مسکراہٹ نے سمندر خان اور صمد خان کے چہرے پر بھی جوش و معنی خیز تبسم آویزاں کر دیے تھے۔

''تو کون ہوتا ہے پوچھنے والا؟'' اس نے بھیڑوں اور بکرے، بکریوں کو ہنکاتے ہوئے تیزی و طراری سے جواب دیا۔

''اے لڑکی! خان سے بدتمیزی کرتا ہے؟'' سمندر خان نے شانے پر لٹکی گن طیش میں سیدھی کی۔

''رہنے دو سمندر خان! لگتا ہے کسی گرم علاقے سے آئی ہے جبھی گرم دماغ کی لگتی ہے۔'' شمشیر خان کے سرخ و سپید چہرے پر دھیمی سی مسکراہٹ قدرے نامانوس و اجنبی لگ رہی تھی۔

''تیرے گھر میں ماں بہنیں نہیں ہیں؟ جو پرائیوں کو گھور گھور کر دیکھ رہا ہے۔'' نیلی پھولدار لمبی فراک، سرخ سادہ شلوار اور بڑے سادے

دوپٹے کو سر پر ڈالے چاندی کے زیورات میں اس کا چہرہ دلکش و حسین لگ رہا تھا۔ رخصت ہوتی شام کے حصے کی وہ ایک کڑی لگ رہی تھی۔ گل فشاں فطرتاً نڈر اور دلیر لڑکی تھی اور خاصی پُر اعتماد اور حسین، شمشیر خان جیسے لوگوں کو کسی خاطر میں نہیں لاتی تھی۔

"ہاں، تمہیں سب ہیں گھر میں صرف تیری کمی ہے۔ چلتی ہے؟" شمشیر خان نے خباثت سے کہا۔ دوسرا لمحہ اس کے لیے بھاری ثابت ہوا۔ جنگلی گلاب کی مانند نازک اور دلربا نظر آنے والی لڑکی کا دایاں ہاتھ کسی چٹان سے گرتے تودے کی طرح لگ کر اس کے رخسار کو مزید سرخ کر گیا تھا۔

"خنزیر کا بچہ! گل فشاں عزت کی حفاظت کرنا جانتی ہے۔ تمہارے باپ کا مال نہیں ہے۔" وہ زہریلی ناگن کی مانند پھنکاری تھی۔ اسی دم شمشیر خان کی فرعونیت اور درندگی ایکدم عود کر آئی تھی۔ اس نے وحشی درندے کی مانند اس کی کلائی پکڑی تھی اور چیختی چلاتی گل فشاں کو بڑی بے دردی سے جیپ میں ڈالا تھا۔ سمندر خان اور صمد خان ہوا کی مانند جیپ میں بیٹھے تھے۔ سمندر خان نے پھرتی سے اپنے مضبوط ہاتھ خود کو چھڑانے کی جدوجہد کرتی گل فشاں کے ہونٹوں پر جما دیے تھے۔ اس کی گرفت بہت سخت تھی۔ صمد خان نے جیپ شمشیر خان کے خاص ٹھکانے "ڈیرے" کی طرف موڑ دی تھی۔ شمشیر خان کا چہرہ شدید غصے اور توہین کے احساس سے لہو رنگ ہو رہا تھا۔ گل فشاں کی تمام تر مزاحمت سمندر خان کی فولادی گرفت میں دم توڑ گئی تھی۔ اس کی سیاہ بھنور آنکھوں میں خوف، بے بسی، سہم ٹھہر گیا تھا۔ بلند و بالا پہاڑ، پھولوں و پھلوں سے لدے درخت، سبزہ، گل فشاں کی بے بسی پر افسردہ نظر آ رہے تھے۔ ایک کمزور اور غیرت مند لڑکی کی وہ کوئی مدد نہ کر سکتے تھے، مویشیوں نے اپنی آواز میں احتجاج کرتے ہوئے کافی دور تک جیپ کا پیچھا کیا مگر جیپ ہواؤں سے باتیں کرتی آگے بڑھ رہی تھی لمحوں میں وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی اور وہ ادھر ادھر بکھر گئے تھے۔

☆☆☆

"یہ مجھے کیا ہو گیا ہے؟ یہ بے چینی، بے قراری، اضطراب کیوں سوار ہے مجھ پر؟ کل شام سے ایک لمحہ بھی میں سکون و اطمینان کا نہیں گزار پایا ہوں۔ کیوں ہو رہا ہے ایسا......؟ صارم خان! جب حقیقت کا ادراک ہو گیا تم اپنے دل کی سرکشی و بغاوت سے شکست کھا چکے پھر ہتھیار ڈال کیوں نہیں دیتے۔ جو بات محض دل لگی سے شروع ہوئی تھی وہ دل کی لگی بن کر دل کو اسیر کر بیٹھی ہے۔ اعتراف کر لو ورشا تمہارے دل کے ایوان میں اپنی حکومت قائم کر چکی ہے...... تم غیر محسوس انداز میں اس کی چاہت میں ڈوب گئے ہو۔"

"نہیں یہ کس طرح ہو سکتا ہے بھلا۔ کوئی لڑکی ایسی پیدا نہیں ہو سکتی جو صارم خان آفریدی کو تسخیر کر سکے۔" وہ خود سے بری طرح الجھ رہا تھا۔ رات خاصی تاریک ہو چلی تھی۔ ہوا میں خنکی اور نمی تھی جس سے موسم سرد ہو گیا تھا۔ سیاہ آسمان پر آخری دنوں کا چاند روشنی بکھیرتا ہوا ٹھٹھرتا لگ رہا تھا۔ وہ مضطرب سا اپنے بیڈ روم سے ملحقہ بالکونی میں کرسی پر بیٹھا، چاند کو تکتے ہوئے سوچ رہا تھا۔ کل شام اس کی نگاہ بلا ارادہ ہال میں بیٹھی ورشا پر پڑ گئی تھی۔ پہلے تو اسے اپنی بصارت پر دھوکے کا امکان ہوا کہ وہ ورشا نہیں ہو سکتی۔ بلیک اینڈ گرے ڈبل شرٹ خوبصورت کڑھائی والے سوٹ میں اس کی نکھری نکھری سرخ و سپید رنگت بغیر کسی آرائش سے پرکشش لگ رہی تھی۔ کانوں میں بلیک اسٹون کے ٹاپس کی چمک اس کے چہرے کو سحر انگیز بنا رہی تھی۔ جامعہ میں نظر آنے والی ورشا جو بہت محتاط اور سمٹے سمٹے انداز میں رہتی تھی اس وقت وہ بالکل بدلی ہوئی ورشا تھی نڈر، پراعتماد اور دل کو زندگی کی پروانہ کرنے والی اور سب سے زیادہ شاک اسے ایک نوجوان کے ساتھ بیٹھے دیکھ کر ہوا تھا۔ اسی پل اسے اپنے اندر بکھرتے نئے جذبوں، نئے احساسات

سے آشنائی ہوئی تھی جن سے فرار وہ کل سے اب تک نہ پا سکا تھا اور مسلسل اب تک نفی کرتا آیا تھا مگر اپنے اندر کی بدلتی دنیا، بدلتے احساسات مضطرب کیے ہوئے تھے۔

''خیریت تو ہے میرے یار! رات کے اس پہر اتنے سرد موسم میں گرم بستر کے بجائے یہاں سردی میں کیا کر رہے ہو؟'' سبریز خان کے لہجے میں خلوص محبت کی چاشنی تھی۔ اس نے اپنے ہاتھ اس کے شانے پر رکھتے ہوئے تشویش زدہ لہجے میں استفسار کیا۔

''تم سوئے نہیں؟'' سبریز کی اچانک آمد اسے فوراً حواسوں میں گھسیٹ لائی۔

''نہیں۔ میں لیٹ گیا تھا پھر خیال آیا کہ گاؤں خط لکھ کر بھیج دوں خط لکھنے میں خاصا وقت لگ گیا تھا۔ پھر مجھے دوبارہ خیال آیا کہ تم سے اس کے متعلق معلوم کیا جائے جس کی وجہ سے مجھے یقین تھا تم جاگ رہے ہو گے۔'' اس نے ''اس'' پر زیادہ زور دیتے ہوئے معنی خیزی سے کہا۔

''یہ 'اس' کون ہے بھئی؟'' صارم اس کی معنی خیزی پر خاصا متعجب گویا ہوا۔

''وہی۔۔۔ جس کو تم دیکھتے ہوئے بے یقین انداز میں گم صم ہو گئے تھے اور تمہاری نگاہیں وہ ترانہ گنگنا رہی تھیں جو محبت کی سرزمین پر گایا جاتا ہے مگر تمہارے چہرے پر بے یقینی و استعجاب کے رنگ کیوں تھے؟ وہ لڑکی ہے کون؟ یہ راز تم نے مجھ سے بھی راز رکھا؟''

''کون سا راز؟ کس لڑکی کی بات کر رہے ہو.....؟'' وہ حقیقتاً حیران ہوا تھا۔

''بیٹا! استادی استاد سے! ہم وہ ہیں جو لفافہ دیکھ کر خط کا مضمون بھانپ جاتے ہیں اور عشق و محبت کے کھیل کے تو ہم ماسٹر ہیں۔ محبت کے رنگ چہرے پر دیکھ کر ہی عشق کی داستان پڑھ لیا کرتا ہوں۔'' سبریز خان اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے مسکرا کر بول رہا تھا۔

''مجھے معلوم ہے۔ پی ایچ ڈی تم نے عشق پر ہی مکمل کیا ہے مگر مائی لورڈ برادر! مجھ پر تم اپنی 'ماسٹری' کیوں آزما رہے ہو؟'' صارم خان بے ساختہ ہنستے ہوئے گویا ہوا تھا۔

''وہ لڑکی کون ہے؟ جس کو کل شام تم بہت غور سے دیکھ رہے تھے بلکہ تمہارے انداز میں کچھ حسد اور غصے کی آمیزش بھی شامل تھی، اس لڑکی کو اس نوجوان کے ساتھ بیٹھے دیکھ کر اور جس کا تعاقب نیچے کا رنگ تمہاری نگاہوں نے کیا تھا۔ دیکھو! بالکل سچ سچ بتانا۔''

''ایسی کوئی بات نہیں یار، تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔'' صارم نے پھیکے لہجے میں کہا۔

''اوہ..... یعنی اب مجھ سے بھی تم جھوٹ بولو گے؟'' سبریز خان کے لہجے میں ناراضگی و حیرانگی تھی۔

''بخدا نہیں..... یہ تم نے کیسے سمجھ لیا.....؟'' صارم نے فوراً ہی اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

''دراصل میں خود اپنی کیفیت سمجھ نہیں پا رہا ہوں تم تو جانتے ہو حسن میری کمزوری ہے۔ خوبصورتی کا میں دیوانہ ہوں۔ ہر پرکشش اور حسین شے مجھے اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ اسیر ہو جاتا ہوں میں۔ وہ لڑکی ورشا ہے۔ جامعہ میں پڑھتی ہے۔ بہت مغرور، سرد مزاج اور اپنے آگے کسی کو خاطر میں نہ لانے والی لڑکی اس کے انداز واطوار تمام ان لڑکیوں سے منفرد ہیں جو میری نظروں سے گزری ہیں۔ اس کی نگاہوں میں میرے لیے ہمیشہ ہی شدید نفرت و حقارت سی چمکتی رہتی ہے۔ شاید میری گرلز فرینڈ شپ اسے ناگوار گزرتی ہے جس سے وہ مجھے کوئی بہت ہی گرا ہوا لوز کریکٹر انسان سمجھتی ہے۔ اس کا یہی گریز، نفرت، حقارت مجھے اس کی طرف شدت سے متوجہ کر گیا۔ دوستوں نے شرط لگائی جامعہ کی لڑکیوں کو تم نے دیوانہ بنا

رکھا ہے اس لڑکی کے غرور کو توڑ دو تو جانیں۔ بس شرط لگ گئی۔ میں نے ہر کوشش کر ڈالی ورشا کو اپنی طرف راغب کرنے کی اسے اس کے سرد خول سے باہر نکالنے کی مگر میری ہر کوشش ہر تدبیر الٹ ہوگئی۔ سب کوششیں ناکام ہوگئیں اور کل رات معلوم ہوا جسے میں تسخیر کرنے کا عزم لے کر اٹھا تھا وہ تو ایسی ہی تھی پتھر، ناقابل تسخیر مگر اس سے کریئے نے نفرت نے یا حسن و شباب نے مجھے ہی تسخیر کر ڈالا اور سنو میں تسخیر ہونا نہیں چاہتا تھا۔

''محبت میں واردا تیں اسی طرح ہوتی ہیں۔ دوسروں کو اسیر کرنے والے اسی طرح تسخیر ہو جاتے ہیں۔'' میرینے ہنستے ہوئے اسے پورا گھما کر سینے سے بڑی گرم جوشی سے لگایا تھا۔

''جو تسخیر ہونا جانتے ہیں وہ تسخیر کرنا بھی۔ جب تک میں اس کو اپنا نہیں بناؤں گا تب تک ہتھیار نہیں ڈالوں گا۔ محبت کی اس جنگ میں فتح میری ہوگی۔'' صارم خان کے سرخ و سپید چہرے پر نیا عزم اس سرد رات کے ولولہ خیز لمحے میں چاند کی روشن ترین کرن بن کر چمکا تھا۔ اس کی نیلگوں سمندر صفت آنکھوں میں روشنیوں کا نیا جہان آباد ہو گیا تھا۔

''نہیں یار، محبت میں جنگ شکست و فتح کی نہیں ہوتی۔ دل کوئی مقبوضہ علاقہ تھوڑی ہے کہ جس پر فتح کے جھنڈے لہرائے جائیں یا شکست کا سوگ منایا جائے۔ محبت ایک آفاقی جذبہ ہے ایک ایسا چشمہ جو صحراؤں میں پھوٹ نکلتا ہے اور شادابی و زندگی ہر سمت دوڑا دیتا ہے۔ پہلے تم اس لڑکی کے دل میں اپنے لیے جگہ پیدا کرو۔ ورنہ یکطرفہ محبت نہیں حجت ہوتی ہے، فضول بے معنی، اور وقت کا ضیاع اور تم جیسے شخص کی سراسر توہین۔ جو شخص لڑکیوں کو پرفیوم کی طرح بدلتا رہتا ہو ایسے شخص کے لیے کسی لڑکی کا حصول ناممکن نہیں مگر یہ میری باتیں تم ہمیشہ یاد رکھنا کہ

محبت سچی ہو

جذبے بے لوث ہوں

حوصلے پر عزم ہوں

انتظار بے کھوٹ ہو تو انسان کبھی نامراد نہیں رہتا۔ منزل اسے مل جاتی ہے۔ میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔'' میرینے اسے سینے سے لگاتے ہوئے پر خلوص انداز میں کہا۔

☆☆☆

دعا کا ٹوٹا ہوا حرف، سرد آہ میں ہے
تیری جدائی کا منظر ابھی نگاہ میں ہے
تیرے بدلنے کے باوصف تجھ کو چاہا ہے
یہ اعتراف بھی شامل میرے گناہ میں ہے
عذاب دے گا تو مجھ کو خواب بھی دے گا
میں مطمئن ہوں میرا دل تیری پناہ میں ہے

''فارحہ! دیکھو یہ بدتمیزی نہیں کیا کرو یہ انسانیت نہیں ہے۔ وہ میری ڈائری۔'' سنبل بہت محویت سے رسالے سے اشعار اپنی ڈائری میں نوٹ کر رہی تھی۔ معاً فارحہ چیل کی طرح پیچھے سے جھپٹا مار کر ڈائری اٹھا کر جھوم جھوم کر وہ اشعار پڑھنے لگی جو سنبل لکھ رہی تھی۔

''کیا کیا ہے میں نے جو تم مجھے انسانیت و اخلاقیات کے سبق ازبر کرانے لگی ہو۔'' فارحہ ڈائری مسلسل پڑھ رہی تھی۔ کافی انتظار کے بعد وہ اس کی ڈائری دیکھنے میں کامیاب ہوئی تھی۔

''مجھ سے فضول بکواس نہیں کرو ڈائری دو۔ کتنی مرتبہ کہا فضول مذاق مت کیا کرو۔'' سنبل غصے و جھنجلاہٹ سے سرخ ہو رہی تھی۔ فارحہ ان باتوں کو خاطر میں لانے والی نہ تھی۔

ان سے دل بدگماں جو گیا
درد پھر حرز جاں ہو گیا
جانے کیا کچھ بیاں ہو گیا
اب یہ دکھ داستاں ہو گیا

فارحہ ڈائری کی اوراق پلٹ پلٹ کر شعر پڑھ رہی تھی اور ساتھ ساتھ بھاگتی بھی جا رہی تھی۔ ادھر سے ادھر سنبل غصے سے بڑبڑاتی اسے پکڑنے کی ہر ممکن سعی کر رہی تھی۔

آج کیوں دل میں یاد جاگی ہے
شاید تیرے شہر دل میں
کہیں میرے نام کے موسم اترے ہیں

''واہ...... واہ! اس کو کہتے ہیں دل میں کچھ، ہونٹوں پر کچھ۔ ہمارے سامنے مسلسل انکار و بیزاری کا اظہار کیا جاتا ہے اور شعروں میں دل کی بے قراریوں و بے چینیوں کا ذکر ہے۔ یہ منافقانہ طرز حیات تم نے کس سے گزارنا سیکھی؟'' فارحہ اس سے کچھ فاصلے پر رک کر گویا ہوئی۔

''یہ میرے ذاتی اشعار نہیں ہیں۔ اپنے پسندیدہ شعراء کے کلام تحریر کیے ہیں میں نے۔ تم انہیں غلط رنگ دینے کی کوشش نہ کرو تو بہتر ہے۔'' سنبل بری طرح زچ ہو کر چیخی۔

''شاعر اپنی آسودہ اور ناآسودہ خواہشات و آرزوؤں کو اشعار کے پیرا ہن میں ملفوف کر کے اپنی تشنہ تمناؤں کو لفظوں کی صورت میں زندگی دیتے ہیں جو ان کے جذبات سے منسوب ہو جاتے ہیں۔ ان کی شناخت بن جاتے ہیں۔ کہیں ہجر کے نوحے پژمردہ و بے قرار کرتے ہیں تو کہیں وصال یار کی سرخوشی و کیف و سرمستی کے جام چھلکتے نظر آتے ہیں۔ شاعری ذات اس کی شاعری بے نقاب کر ڈالتی ہے۔ یعنی دلوں کے بھید کھولتی ہے۔

شاعری سچ بولتی ہے تو اس طرح اشعار کا انتخاب بھی آپ کے اندر کے محسوسات کو، تعلقات کو، وارفتگیوں اور بدگمانیوں پر پڑے پردے

یکسر اٹھا دیتا ہے۔آپ کے خیالات آئینہ کی طرح شفاف نظر آنے لگتے ہیں۔جس طرح تمہاری ڈائری میں پرسوز شاعری کی بھرمار یہ ظاہر کرتی ہے کہ تم حمزہ بھائی سے محض بدگمان ہو ورنہ تمہارے دل پر ان کی ہی حکمرانی ہے۔'' فارحہ نے بہت سکون سے تجزیہ پیش کیا۔

''ہونہہ...... میں نے کہہ دیا آپ کو آئندہ مجھ سے بکواس کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' ہمیشہ کی طرح اس نے اس کی ہٹ دھرمی کے آگے مزاحمت ختم کرتے ہوئے خفگی سے کہا۔

''قسم سے...... مجھے تمہاری یہ ناراضی والی ادا بڑی پسند ہے۔خاصی تمیزدار ہو جاتی ہو۔'' فارحہ اس کے سرخ ناراض چہرے کو دیکھتے ہوئے ہنس کر کہنے لگی۔

''تم دونوں پھر لڑنے لگی ہو؟'' گرین اینڈ پرپل کڑھائی والے اوپن شرٹ سوٹ میں بالوں میں برش کرتی ہوئی ورشا اندر داخل ہو کر ان سے مخاطب ہوئی۔

''میں کل سے مما کے ساتھ بوتیک جایا کروں گی وہیں پیپرز کی تیاری کروں گی ورنہ یہاں تو ٹائم ضائع کرنے کے علاوہ کچھ نہ ہوگا۔'' سنبل جھٹکے سے اٹھتی ہوئی بولی۔

ہم تم ہوں گے بادل ہوگا
رقص میں سارا جنگل ہوگا

''فارحہ! پلیز کبھی سنجیدگی اختیار کر لیا کرو۔وہ ڈائری دو مجھے'' ورشا جو دوسرے کمرے میں ان کی گفتگو سن رہی تھی سنبل کو روہانسا ہوتے محسوس کر کے کمرے میں چلی آئی تھی۔فارحہ کو ابھی بھی شرارت کے موڈ میں دیکھ کر ڈائری لینے کے لیے آگے بڑھی۔

''مارکیٹ چلتے ہیں۔مجھے کچھ سامان لینا ہے۔'' ورشا نے بالوں میں کلپ لگاتے ہوئے کہا۔ڈائری وہ فارحہ سے چھین کر سنبل کو دے چکی تھی۔

☆☆☆

رات برف باری شدت سے ہوئی تھی۔ سردی بام عروج کو چھو رہی تھی۔ پہاڑ، سبزہ زار، مکانات اور زمین سب برف سے ڈھکے سفیدی میں چھپے تھے۔ ماحول میں ان خطوں کی مخصوص تنہائی خاموشی وادی میں محو رقصاں تھی۔ سخاویہ نے فجر کی نماز پڑھنے کے بعد جائے نماز تہہ کر کے دراز میں رکھی اور گرم کشمیری سیاہ رنگین کڑھائی والی چادر لپیٹی ہوئی پاؤں میں بند جوتے پہن کر کمرے سے ملحقہ راہداری عبور کر کے باورچی خانے میں چلی آئی۔ جہاں بڑی ادے پہلے ہی نماز ادا کرنے کے بعد ملازمہ فضلاں کے ساتھ ناشتا بنانے میں مصروف تھیں۔

''صبح بخیر۔'' اس نے اندر داخل ہوتے ہوئے مسکرا کر صبح کا سلام کیا۔

''جیتی رہو۔'' بڑی ادے کے بعد ملازمہ نے بڑے تپاک سے جواب دیا تھا۔

''بادام کا حلوا، آہا پھر تو مزہ آئے گا سب سے پہلے ادے مجھے گرم گرم قہوہ دیں ورنہ میری رگوں میں برف جم جائے گی۔'' اس نے دونوں ہاتھ آپس میں رگڑتے ہوئے کانپتے لہجے میں کہا۔

''شکر کرو بیٹی! ہمیں سردی سے بچاؤ کے لیے آگ میسر ہے۔ ورنہ کتنے ہی لوگ ایسے ہیں جو اس موسم میں سردی سے ٹھٹھر کر مر جاتے ہیں کچھ بھوک سے دم توڑ دیتے ہیں۔ ہمارے علاقوں میں حسن ہی حسن بکھرا ہوا ہے جو نگاہوں کو خیرہ تو کرتا ہے مگر پیٹ کی آگ نہیں بجھا سکتا۔'' بڑی ادے حسب عادت نرم و شفیق لہجے میں حلوا میں چھلکے اترے بادام ڈالتے ہوئے گویا ہوئیں۔

''آپ سچ بولتی ہیں بڑی بی بی! ہمارے علاقوں میں دیکھنے کو بہت ہے مگر کھانے کو بہت کم۔ ہماری زمین سبزہ بہت اگاتی ہے۔ کھیتوں میں اناج کم پھول زیادہ اگتے ہیں۔ بھلا پھولوں سے، سبزے سے پیٹ بھر سکتا ہے۔ کتنے خاندان تو سرد موسم کے آغاز سے قبل ہی علاقے چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔ موسم بدلنے کے بعد واپس آتے ہیں۔'' فضلاں نے قہوہ پیالی میں نکال کر اسے دیتے ہوئے کہا۔

''تم! اپنے بابا اور چھوٹی ادے کو ناشتا دے آؤ۔ پھر ہم دونوں بھی ناشتا کر لیں گے۔''

بڑی ادے ناشتے کے تمام لوازمات بادام کے حلوے سمیت ٹرالی میں لگا کر سخاویہ سے گویا ہوئیں۔

''صبح بخیر بابا جان!'' سخاویہ ٹرالی لے کر آئی تو بابا جان گرم بستر میں دراز تھے جبکہ چھوٹی ادے سنگھار میز کے سامنے بیٹھیں آنکھوں میں کاجل ڈال رہی تھیں۔ بابا کو بہت محبت سے سخاویہ کے سلام کا جواب دیتے دیکھ کر حسب عادت ان کے چہرے کے تاثرات بگڑ گئے تھے تنگ پیشانی پر ناگواری کی سلوٹیں سرعت سے نمودار ہوئی تھیں۔

''بادام کا حلوا، بہت خوب تمہاری ادے میں یہ عادت کمال کی ہے۔ بغیر کہے دل کی بات سمجھ لیتی ہے۔ آج بادام کے حلوے کو طبیعت بہت چاہ رہی تھی۔'' بابا جان نے خوش ہو کر حلوے کی پلیٹ ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔

''آخ تھو، سارے کڑوے بادام چن چن کر ڈالے ہیں تیری ماں نے؟ اس سے کہو ایک مرتبہ ہی زہر کھلا کر مار ڈالے ہمیں سسکے سسکے کی موت کیوں مارتی ہے۔'' سبے دھیانی میں شہباز خان، گل خانم کی تعریف کر بیٹھے تھے۔ گل جانان کو آگ بگولا ہوتے دیکھ کر انہیں اپنی غلطی کا فوری احساس ہوا۔ مگر اب سوائے اپنی غیر محتاط روی پر افسوس کے علاوہ کیا کر سکتے تھے۔ تیر کمان سے نکل کر نشانے پر لگ چکا تھا۔ وہ بڑی نفرت سے حلوا

تھوک چکی تھیں۔ سخاویہ ان سے بہت خوف زدہ رہتی تھی کیونکہ ان کی زبان ہی نہیں ہاتھ بھی بے دھڑک چلتے تھے۔ شہباز کے اشارے پر وہ ہوا کے جھونکے کی طرح کمرے سے نکلی تھی۔

''نیک بخت! کیوں صبح ہی صبح غصہ کر کے سارا دن خراب کرتی ہو۔ چلو آؤ، ناشتا کرو ٹھنڈا ہو جائے گا۔ اتفاقاً کوئی کڑوا بادام تمہارے منہ میں آ گیا ہے۔'' شہباز خان بستر سے نکل کر ان کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے محبت سے گویا ہوئے۔ انہوں نے انداز میں خاصی گرمجوشی اور وارفتگی پیدا کی تھی کہ ان کی فسادی و حاسدانہ طبیعت سے بخوبی واقف تھے۔ وہ ان سے جولڑ میں وہ الگ اور ساتھ شامت گل خانم و سخاویہ کی بھی آتی۔ وہ اٹھتے بیٹھتے لڑ لڑ کر زندگی اجیرن کر ڈالتیں۔

''مجھے بہکاؤ نہیں خان! میں خوب جانتی ہوں تمہارے دل میں آج بھی اس چڑیل کی محبت ٹھاٹھیں مار رہی ہے۔ میں بیٹے پیدا کر کے بھی دوسرے نمبر پر رہی اور وہ.....''

''لاحول ولاقوۃ جاناں! اس عمر میں ایسی باتیں کہاں زیب دیتی ہیں۔ بہرکیف تم بدگمانیوں کو دل میں جگہ نہ دیا کرو۔ تم کل بھی مجھے عزیز تھیں آج بھی ہو اور جب تک سانس ہے تب تک سب سے عزیز رہو گی۔ چلو آؤ ناشتا کرو۔'' وہ بڑے لاڈ سے انہیں بازو کے سہارے سے میز تک لائے تھے۔ وہ خوشی و فخر سے جھوم اٹھی تھی۔

''کھاؤ اپنے سر کی قسم کہ مجھ سے زیادہ ''وہ'' عزیز نہیں ہے۔'' انہوں نے اٹھلا کر فرمائش کی۔

''قسم تو وہ کھاتے ہیں جو جھوٹ بولتے ہیں ہم بھلا قسم کیوں کھائیں۔'' انہوں نے مسکراتے ہوئے ذہانت سے جواب دیا تھا۔ چند لمحے قبل مکدر ہونے والا ماحول اب خوشگوار تھا۔ وہ موڈ میں تھیں ناشتے کے ساتھ ساتھ باتیں بھی کر رہی تھیں۔ شہباز خان کے دل میں ان کی طرف سے کبیدگی مزید بڑھ گئی تھی کیونکہ گل جاناں نے ناشتے کے دوسرے لوازمات کو برائے نام چکھا تھا۔ بادام کا حلوہ جو انہیں زہر لگا تھا اب اس کی ڈش انہوں نے ہی صاف کی تھی۔ ان کی یہی منافقانہ حرکتیں انہیں ان سے بدظن و متنفر کر دیا کرتی تھیں کہ ان کی جائز تعریف وہ لمحے بھر برداشت نہ کر پاتیں۔ وہ ناشتے سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ ملازمہ فضلاں گھبرائی ہوئی اندر داخل ہوئی۔

''کیا بات ہے بدحواسے، مردار کی صورت بنا کر کیوں آئی ہے۔''

''چھوٹی بی بی! غضب ہو گیا جی! چوکیدار کی بیٹی کل شام کو گھر سے نکلی تھی ابھی تک گھر نہیں پہنچی۔ اس کی بیوی آئی ہے۔'' فضلاں خود بہت بدحواس و پریشان لگ رہی تھی۔

''کون سا چوکیدار مردار کی! ہمارے ہاں ڈھیروں چوکیدار ہیں۔'' وہ تحقیر آمیز لہجے میں چیخ کر گویا ہوئیں۔

''بی بی صاحب! روزی خان جو رات کو حویلی کے پچھواڑے کی چوکیداری کرتا ہے۔''

''اسے بڑے کمرے میں لے کر آؤ ہم وہیں جا رہے ہیں۔'' شہباز خان پر رعب آواز میں اس سے مخاطب ہوئے۔ چند لمحے بعد وہ اپنی مخصوص نشست پر براجمان تھے۔ چہرے پر ایک جہان کا رعب و دبدبہ، جاہ و جلال کے رنگ لیے۔ مغلیہ دور کے شہنشاہوں جیسی رعونت و درشتی ان

کے ہر انداز سے عیاں تھی۔

''بڑے خان! ام لٹ گیا برباد ہو گیا۔ امارا بیٹی کل شام سے گھر نہیں پہنچی ہے۔ ام ہر جگہ اسے تلاش کیا مگر وہ کہیں نہیں ہے۔ پکھ کرو خان ہمارا عزت کا معاملہ ہے۔'' سرمئی قمیص شلوار میں سر پہ پگڑی باندھے روزی خان کے جھریوں بھرے چہرے پر جوان بیٹی کی گمشدگی اور اپنی عزت کے خوف نے آنسوؤں کی برسات کر رکھی تھی۔ وہ ہاتھ جوڑ کر شہباز خان سے رقت آمیز لہجے میں مخاطب ہوا تھا۔

''آپ ہمارے سردار ہو خان! ہماری مدد کرو ورنہ ہم مر جائیں گے۔'' چوکیدار کی بیوی کے لہجے میں تڑپ تھی۔ درد تھا۔ کل سے اب تک کئی قیامتیں اس پر گزر گئی تھیں۔ رو رو کر آنکھیں اس کی سوج گئی تھیں۔ دکھ، اندیشے، وسوسے، فکروں نے اس کے جسم سے گویا خون نچوڑ کر رکھ دیا تھا۔

''خان سردار ہے، کوئی چوکیدار نہیں ہے اس وادی کا۔ ساری رات کیا پہرہ دے رہی تھی جو اب آئی ہے دماغ خراب کرنے۔ یہ بچت کا تم لوگوں نے اچھا دستور بنا لیا ہے۔ پہلے خود ہی بیٹیوں کو ان کے عاشقوں کے ساتھ بھگا دیں گی۔ پھر ڈراما کرتی ہوئی آ جاتی ہیں۔ خوب جانتی ہوں میں تم لوگوں کی چالبازیاں۔ اس طرح شادی کا خرچہ بھی بچتا ہے اور جہیز کا بھی۔ چند دن اس طرح مگرمچھ کے آنسو بہا کر چپ ہو جاتی ہیں۔ پھر وہی بیٹیاں ماں باپ کی دہلیز پر چڑھنے لگتی ہیں۔'' گل جاناں نے حسب عادت اپنے مخصوص طرز میں گفتگو شروع کی تھی۔ ان کے لہجے اور آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔

''خدا کی قسم چھوٹی بی بی ہمارا بیٹی بہت باحیا اور اچھا کردار کا تھا۔ وہ کبھی ایسا نہیں کر سکتا۔ وہ پچھلے سال سے اپنے چاچا کے پاس میرپور خاص میں رہتا تھا۔ چند دنوں قبل ہی اسے بلوایا تھا کل رات کو جلانے کے واسطے لکڑیاں لینے جنگل کی طرف گیا تھا۔ ساتھ مویشی بھی لے گیا تھا۔ رات کو مویشی واپس آ گیا مگر...... ہمارا بیٹی نہیں آیا۔'' گل جاناں کی بیہودہ گفتگو اور تحقیرانہ انداز نے ان کے غیور خون میں آگ سی لگا دی تھی۔ مگر وہ اس وقت جس کرب و اذیت سے گزر رہے تھے یا اپنی غیرت، کم مائیگی و احساس کمتری کے بوجھ سے برداشت کرنے پر مجبور تھے۔ البتہ چوکیدار کی بیوی کی سسکیاں در و دیوار کو لرزانے لگیں وہاں موجود گل خانم کا گداز دل اس کے دکھ پر پانی ہونے لگا۔

''اس طرح مت کہو گل جاناں! ہمارے قبیلے میں اس طرح کی بے غیرتی کی کوئی مثال نہیں ہے۔ اللہ سے دعا کرو صابرہ، وہ تمہاری مشکل حل کرے گا۔ انشاء اللہ تمہاری بیٹی خیریت سے گھر پہنچ جائے گی۔'' گل خانم نے چوکیدار کی بیوی کو تسلی دی۔ گل جاناں کی تیوریوں پر ان گنت بل پڑ چکے تھے۔

''بڑی بی بی! ہم اندھیرا پھیلنے تک اسے ہر جگہ تلاش کرتا رہا۔ وہ کہیں نہیں تھا۔ اوپر سے برف بھی بہت تیزی سے گر رہا تھا۔ ساری رات دعائیں مانگی ہیں۔ صبح سے روزی خان اور ہم ہر طرف ڈھونڈ چکا ہے ہر طرف برف ہی برف ہے اور کچھ نہیں۔''

''ہو سکتا ہے اس کا پاؤں وغیرہ کہیں پھسل گیا ہو، کسی کھائی وائی میں نہ گر گئی ہو برف بھی اتنی شدت سے رات سے گر رہی ہے کہ ہر شے کو اس نے ڈھانپ لیا ہے......''

''دعا کرو بی بی صاحب! ایسا ہی ہوا ہو۔ ہمارا گل فشاں کسی کھائی میں گر گیا ہو۔ اس کا موت ام برداشت کرے گا مگر کوئی ذلت برداشت نہیں ہوگا۔'' روزی خان نے غمگین لہجے میں کہا۔

''کیا ہنگامہ ہے؟ کیسا شور ہے؟ کون رو رہا ہے؟'' باہر صحن سے اندر آتے شمشیر خان کی بلند پاٹ دار آواز اور مضبوط چپل میں مقید قدموں کی دھمک اندر بھی صاف محسوس ہو رہی تھی اور چند لمحے بعد سلام کرتا ہوا وہ کمرے میں داخل ہو گیا تھا۔ اندر ان لوگوں کو دیکھ کر وہ چونک اٹھا۔

''کیا معاملہ ہے؟'' اس نے چادر جھٹکے سے بائیں شانے پر ڈالتے ہوئے خشک و سرد لہجے میں دریافت کیا۔

''چھوٹے خان! ہمارا بیٹی، ہمارا گل فشان کل شام کو جنگل سے لکڑیاں چننے گیا تھا پھر واپس نہیں آیا۔ ہم بڑے خان سے درخواست کرنے آیا ہے کہ وہ ہمارا بیٹی کو ڈھونڈنے کے واسطے اپنا اثر و رسوخ استعمال کرے۔'' صابرہ نے خوفزدہ انداز میں اس سے اپنا مدعا بیان کیا کیونکہ شمشیر کی جلاد صفت فطرت و تند مزاجی سے پورا قبیلہ ڈرتا تھا۔ اس سے بات کرتے وقت اس نے بمشکل اپنی سسکیوں پر قابو پایا تھا۔

''ہم کل تمہاری بیٹی کو ڈھونڈ لیں گے اب تم لوگ جاؤ۔'' شہباز خان نے ان دونوں سے مخاطب ہو کر کہا تو وہ دعائیں دیتے واپس چلے گئے۔ ساتھ ہی انہوں نے گل خانم اور گل جاناں کو بھی واپس جانے کا اشارہ کیا۔ اب دونوں باپ بیٹے کمرے میں تھے۔ شہباز خان اٹھ کر بیٹے کے مقابل آئے۔

''کیا بات ہے بابا جان! اس طرح کیوں دیکھ رہے ہیں؟''

''لڑکی زندہ ہے یا مر چکی ہے؟'' وہ بیٹے کی لہو رنگ آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پراعتماد لہجے میں گویا ہوئے۔

''لڑکی؟.... کون سی لڑکی؟ کس کی بات کر رہے ہیں بابا جان آپ؟'' وہ ان سے زیادہ اعتماد اور اطمینان سے ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''وہ لڑکی جس کا نام سن کر تمہاری آنکھوں میں جو اعتراف و استعجاب کے رنگ چمکے تھے۔ وہ ہمیں لمحے بھر میں صورتحال کا پتا دے گئے تھے اور ہم نے جبھی جان لیا تھا کہ لڑکی تمہارے پاس ہے۔'' ان کے لبوں پر دھیمی مسکراہٹ تھی۔ براؤن آنکھوں میں کچھ ایسی چمک تھی جو بدن میں سنسنی دوڑا دے۔ شمشیر خان احساس جرم محسوس کرنے کے بجائے باپ کے رویے سے تفاخر میں مبتلا ہو گیا۔

''اس بے مول لڑکی نے شمشیر کو انکار کیا.... شمشیر خان کو گالی دی پھر میں اسے چھوڑ سکتا تھا۔''

''یعنی ابھی لڑکی زندہ ہے؟'' شہباز خان سخت لہجے میں بولے۔

''ہاں.... وہ سمندر خان اور صمد خان کے پاس ہے۔''

''اسے مار دو اور لاش ان کی کسی کھائی میں پھینک دو.... ہمارے ہاں اکثر لڑکیاں عورتیں ایسی موت کا شکار ہوتی رہتی ہیں اور ہاں یاد رکھنا.... ایسا ویسا کوئی نشان اس کے چہرے پر نہیں ہونا چاہیے جس سے معلوم ہو کہ....''

''میں اسے اتنی آسان موت مارنا نہیں چاہتا بابا جان! اس نے مجھے گالی دی ہے۔ میری غیرت کو تازیانہ لگایا ہے سسکتے لمحے لمحے کی موت ماروں گا۔ وہ موت مانگے گی اور موت اس کے قریب نہیں آئے گی۔ اتنی آسانی سے نہیں ماروں گا میں اسے۔'' وہ اکھڑ و ضدی لہجے میں بولا۔

''حمق مت بنو خاناں! ضد ہمیشہ کام بگاڑتی ہے۔ غصہ عقل کا دشمن ہے اور تم ہمیشہ ان کے سہارے چلتے ہو۔ کبھی ٹھنڈے دماغ سے بھی سوچا

کروائز کی نہ ملی تو لوگوں میں کھلبلی مچ جائے گی اور لوگ اٹھ کھڑے ہوں گے۔ تبھی اس کے ہماری سرداری پر حرف آئے لڑکی کو مار کر کسی کھائی میں پھینک دو پھر ہم سنبھال لیں گے۔" ان کے پروقار، پرنور، پر رعب چہرے پر مادہ پرستی کے مہیب سیاہ رنگ چھا گئے تھے۔ شمشیر خان نے اثبات میں سر ہلا دیا تھا کہ اس کے لیے وہ لڑکی ویسے بھی اب ایک ذات گزارنے کے بعد بے کشش دبے مصرف ہو گئی تھی۔ وہ عیاش فطرت وبھورا صفت شخص تھا۔ کھلتے پھولوں اور نوخیز کلیوں کا رسیا تھا۔ گھر میں نے جالا ڈو پیار اور از حد اہمیت وجاہت ملنے پر وہ شروع سے ہی حاکمیت پسند اور خود سر ہو چکا تھا۔ اسے بچپن سے یہ باور کروایا گیا تھا کہ وہ مرد ہے۔ ہر شے کا مالک۔ بہت اعلیٰ و برتر، طاقت وزور آوری اس کی سرشت تھی۔ اپنی ذات کی اکڑ اپنے خاندانی افتخار، دولت وثروت کے فخر وغرور نے اسے ذہنی پستی کی جانب دھکیل دیا تھا۔ عورت اس کی نگاہ میں دنیا کی حقیر ترین سب بے وقعت مخلوق تھی۔ اپنی ماں کے علاوہ کسی دوسری عورت کی عزت کرنے کا قائل نہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے مظالم کا زیادہ شکار عورتیں ہوتی تھیں جن سے وہ دل بہلانا بھی جانتا تھا اور مشق ستم بنانا بھی۔

☆☆☆

جب چاندنی بن کر راتوں کو چھاتی ہے

تیری یاد ایسے میں دل کو تڑپاتی ہے

تیری یاد...

''پلیز اپنی بے وقت کی سنگنگ بند کرو نہ جگہ دیکھتی ہو اور نہ ماحول اور شروع ہو جاتی ہو۔'' سنبل نے فارحہ کو گھور کر دیکھتے ہوئے سرزنش کی۔

آج انہوں نے پکنک کا پروگرام بنایا تھا۔ انکل، آنٹی کے ساتھ وہ نکل آئی تھیں سامنے جھاگ اڑاتا سمندر تھا۔ موسم بھی دلکش تھا کیونکہ اتوار کا دن نہیں تھا۔ اس وجہ سے پبلک بھی برائے نام تھی اسی وجہ سے انہوں نے یہ دن پسند کیا تھا۔ انکل، آنٹی ریت پر بچھی چادر پر براجمان چائے کے ساتھ سمندر کے نظاروں سے لطف اندوز ہو رہے تھے اور وہ تینوں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر لہروں کی سمت چلی آئی تھیں کیونکہ وہ لوگ جلد گھر سے نکل آئی تھیں کہ ایسے موقعے کم سے کم ملتے ہیں جس سے وہ زیادہ سے زیادہ لطف اٹھانا چاہ رہی تھیں۔ کھانے کا ٹائم ابھی نہیں ہوا تھا۔ وہ تینوں مینگو جوس کے ڈبے لیے کنارے پر ٹہل رہی تھیں۔ بیٹھے بیٹھے انکل، آنٹی مسلسل ہدایت دے رہے تھے کہ وہ آگے نہ جائیں۔

''ہم یہاں انجوائے کرنے آئے ہیں سنبل! ذہن فریش ہو، دل ودماغ پر بوجھ اور کشمکش سے آزاد ہو تو انجوائے کرنے کے ہزار ہا طریقے ہیں مجھے جو دل چاہے وہ کر کے رہوں۔ میں زندگی صرف اپنی میراث نہیں سمجھتی اگر خود خوش ہو تو سوچوں سب بلاوجہ میرے ساتھ قہقہے لگائیں۔ اگر رنجیدہ ہوں تو کسی کا تیز بولنا بھی مجھے ناگوار گزرے۔ میں لوگوں کو اپنے تابع نہیں بلکہ سب کے ساتھ چلنا... اپنا سمجھنا چاہتی ہوں بلکہ اپنا سمجھتی ہوں۔ اس لیے میرے دکھ صرف میری ذات تک محدود ہوتے ہیں میری شوخیاں، میری شرارتیں، میری مسرتیں سب کے لیے ہوتی ہیں۔''

''کیا مقصد ہے تمہارا؟ میں کسی کو اپنا نہیں سمجھتی؟'' سنبل گویا کند چھری سے ذبح ہوئی۔

''تم.....؟ خود کو نہیں سمجھتیں، کسی اور کو بھلا کیا سمجھو گی؟ پچھلے ماہ سے اپنے ساتھ ہم سب کو بھی تم نے ذہنی اذیت میں مبتلا کر رکھا ہے نہ خود

سمجھتی ہو اور نہ کسی دوسرے کو سمجھانے کا موقع دیتی ہو۔ تمہیں ہم سے پیار نہیں ہے۔ انا، ضد، ہٹ دھرمی تمہیں ہم سے زیادہ پیاری ہے۔"

"بکواس مت کرو فارحہ! خاموش ہو جاؤ۔" وہ چیخ کر بولی۔

"بہت عرصہ سے خاموش ہوں میں مگر اب خاموش نہیں رہوں گی تمہیں فخر ہے نا کہ تم سچ بولتی ہو تو سچ بولنے والوں کو سچ سننے کا حوصلہ بھی رکھنا چاہیے۔" فارحہ از حد سنجیدہ تھی۔

"ابھی خود کہہ رہی تھیں ہم یہاں انجوائے منٹ کے لیے آئے ہیں پھر یہ کیوں؟ خواہ مخواہ موڈ خراب کر رہی ہو۔" درشا نے خالی پیکٹ ریت کی طرف اچھالتے ہوئے اسے رسانیت سے سمجھایا۔

"درشا! تم خود دیکھ رہی ہو کس درجہ خود غرض، خود پسند ہو رہی ہے یہ۔ آج کل مما، ڈیڈی ان کی طرف سے کس قدر فکر مند اور پریشان ہیں یہ سمجھتے ہوئے بھی انجان بن رہی ہے۔ ایسا کبھی ہوتا ہے کیا؟ پیار کرنے والوں کو کرب میں مبتلا کیا جائے؟

ضد سنوارے کام بگاڑ دیتی ہے۔

انا قربتوں کو ابدی جدائی دیتی ہے

ہٹ دھرمی نفس کی تسکین کا ذریعہ ہے

خود پرستی آپ کو بالکل تنہا کر دیتی ہے

تنہائی بدترین عذاب ہے

جو تنہا ہوتے ہیں وہ راستوں میں گم ہو جاتے ہیں

جو راستوں میں گم ہو جاتے ہیں وہ کبھی منزل نہیں پاتے

پھر بے وقعت و بے مایہ راہ گزر کے وہ ارزاں پتھر بن جاتے ہیں جن کا نصیب محض قدموں تلے روندا جانا ہوتا ہے اور قبل اس کے کہ تم اس قدر ارزاں و بے وقعت ہو جاؤ حماقت کے گھوڑے سے دانشمندی کی زمین پر اتر جاؤ تاکہ تمہیں منزل کی طرف جانے والی راہ نظر آ جائے ورنہ..... یاد رکھنا پیچھے رہ جانے والے ہمیشہ کھو جاتے ہیں۔" فارحہ اپنے جذبات پر قابو نہ پا سکی۔ بات مکمل کرتے ہی تیز تیز قدموں سے انکل آنٹی کی طرف بڑھ گئی۔

"دیکھا تم نے؟ مجھ سے ایک سال چھوٹی ہے اور دادی اماں کی طرح نصیحت کرتی ہے۔" سنبل یکدم ہو جانے والی بوجھل فضا کا سکوت توڑتے ہوئے پھیکی سی مسکراہٹ سے گویا ہوئی۔ فارحہ کی کچی کھری باتوں نے اسے اس قنوطیت سے نکال لیا تھا جو حمزہ کی آمد اور پیش قدمی نے اس پر طاری کر دی تھی۔

"بعض اوقات چھوٹے بھی بڑوں کی سی فہم و فراست دکھاتے ہیں۔ وہ باتیں جو آپ کو شعور کی آگہی دیں۔ آپ کی کھوئی ہوئی تاریک راہ میں شعور کی طرح جگمگانے لگیں۔ آپ کو منزل دکھانے لگیں تو پھر ذہن کے دریچے وا کر دینے چاہیے۔ سنبل! اکثر چھوٹے بڑوں سے رہنمائی پاتے ہیں۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے چھوٹے بھی بڑوں کے لیے مشعلِ راہ بن جاتے ہیں اور ایسے لمحے نایاب ہوتے ہیں۔ انہیں بڑھ کر فوراً مٹھی زیست"

میں مقید کر لینا چاہیے۔ جگنوؤں کی طرح جو کبھی آپ کی گرفت سے آزاد نہ ہونے پائیں۔" وہ قریب ہی پتھروں پر بیٹھ گئی تھیں۔ لہریں ان کے قدموں سے لپٹ کر گزر جاتی تھیں۔

"تم جذباتی ہو، جذباتی لوگ ہمیشہ اپنی خیالی دنیا میں مست رہتے ہیں اور وقت کے ساتھ نہیں چلتے صرف جذبات اور احساسات کے محور پر گردش کرتے ہیں۔ ایسے لوگ خبطی، پاگل یا خود غرض کہلاتے ہیں۔ اپنی بنائی گئی خیالوں کی دنیا بے شک بہت حسین و دلربا ہوتی ہے۔ جہاں ہر سو محبت و خلوص کے رنگ بکھرے ہوتے ہیں۔ چاہت و اپنائیت کی پھوار دلوں اور ذہنوں کو نفسا نفسی، مطلب پرستی و بیگانگی کی تمام تر کثافتوں سے پاک کر کے حقیقی رشتوں اور احساسات سے روشناس کرواتی ہے جہاں صرف اور صرف محبت، چاہت، انسیت کی چاندنی جگمگاتی ہے۔ اس کی کشش، اس کی مٹھاس، اس کی فرحت انگیز ٹھنڈک، آپ کو کبھی اس حقیقی دنیا میں آنے نہیں دیتی جہاں ہر طرف خود غرضی، خود پرستی، نفسانفسی و منافقت کی گرم دھوپ آپ کو نہ جینے دیتی ہے اور نہ مرنے۔ مگر سنبل، انسان کبھی بھی وہ نہیں کر سکتا جو وہ کرنا چاہتا ہے کیونکہ خواہشات ہمیشہ لاحاصل رہی ہیں۔ بہتر یہی ہے کہ تم سب کچھ بھول جاؤ۔ جذباتیت چھوڑو، خیالات کی دنیا سے نکل کر اس دنیا کا مقابلہ کرنا سیکھو۔ جس میں تم رہتے ہوئے بھی فرار حاصل کرنا چاہ رہی ہو اور فرار ہمیشہ معاملات کو الجھا دیا کرتا ہے۔"

"تمہیں معلوم ہے کہ حمزہ نے مجھ پر اپنی کزن کے بہکانے پر الزام لگایا تھا۔ جب وہ مجھ سے والہانہ محبت کرتا ہے تو اعتماد کے چند ذرے بھی اس کے پاس میرے لیے نہیں تھے؟" سنبل کا دل گداز ہوا تو اس نے ورشا کے شانے سے چہرہ ٹکا کر روتے ہوئے پہلی بار حمزہ کے بارے میں لب کشائی کی۔

"میں حمزہ سے ملی تھی اور وہ......"

"تم حمزہ سے ملی تھیں؟ مگر کب......؟" وہ از حد حیرانگی سے متحیر زدہ تھی۔

"کل...... جب تمہیں فارحہ اپنے ساتھ لے گئی تھی۔" ورشا شرارتی انداز میں مسکرائی تھی۔

"اور...... تم نے مجھے بتایا بھی نہیں؟" سنبل نے شکایتی انداز میں کہا۔ ورشا نے حمزہ سے ملاقات کا تمام احوال اسے کہہ سنایا۔

"بس اب تم اپنی احمقانہ ضد ختم کرو۔ بندے کے خلوص کو خوش آمدید کہو۔ اتنی کم ظرف اور تنگ دل مت ہو کہ واپسی کے تمام راستے مسدود کر بیٹھو۔"

"آج خالی ہوا سے پیٹ بھرنے کا ارادہ ہے؟ کھانا نہیں کھانا کیا......؟" فارحہ وہاں آ کر خوشگوار موڈ میں بولی۔ اسے بہت سرعت سے اپنا موڈ خوشگوار کیا تھا۔

"کیوں نہیں کھائیں گے۔ ضرور کھائیں گے۔ آنٹی کے ہاتھ کے مزے دار کھانے کبھی کبھی ہی ملتے ہیں۔" ورشا اٹھتے ہوئے اس کے ساتھ چلنے لگی سنبل بھی ہوا سے بے قابو ہوتے دوپٹے کو سنبھال کر چل رہی تھی۔

"مما، پپا کہاں ہیں؟ سامان بھی نظر نہیں آ رہا......؟" سنبل نے سامنے ریت پر دیکھتے ہوئے حیرانگی و بدحواسی سے کہا کیونکہ جہاں وہ

سامان کے ہمراہ بیٹھے تھے وہ جگہ خالی تھی۔

''اتفاقاً پاپا کا کوئی جاننے والا مل گیا۔ اس نے اپنے ہٹ کی چابی دے دی ہے۔ مما پاپا سامان سمیت وہیں ہیں۔ وہ کسی کام سے آیا تھا۔ مما پاپا نے روک لیا ہے اس بھی کھانے پر۔''

''چلو اچھا ہے۔ اس طرح ان کے احسان کا بدلہ بھی اتر جائے گا۔ جو انہوں نے چابی دے کر کیا ہے۔ ورنہ ہٹ کہاں مل رہا تھا۔ چوکیدار نے بتایا تھا صرف سنڈے کو چھٹی والے دن ہٹ کرائے پر دیئے جاتے ہیں۔ باقی دن بک نہیں ہوتے۔'' وہ باتوں کے دوران ہٹ تک پہنچ گئی تھی۔ سرخ و سپید امتزاج سے پینٹ کیا گیا ہٹ بہت خوبصورت اور کشادہ تھا۔ فرخندہ بیگم نے دستر خوان پر کھانا چن دیا تھا۔ کھانے سے اٹھتی اشتہا انگیز خوشبوئیں وہاں پھیلی ہوئی تھیں۔ وہ تینوں اندر داخل ہوئیں تو رخشندہ بیگم اور صاحب کے برابر میں بیٹھے حمزہ کو دیکھ کر چونک اٹھی تھیں جبکہ سنبل بیک وقت استعجاب، بے یقینی تحیر سے گو مگو حالت میں کھڑی کی کھڑی رہ گئی تھی۔ حمزہ انہیں دیکھ کر فوراً ہی سلام کرتا ہوا کھڑا ہوا تو وہ چونک کر بیٹھی تھی۔ فارحہ نے شرارتاً آہستگی سے ہنکارا ابھرا تھا۔ اس نے گھور کر دیکھا تو مسکراتی ہوئی بیٹھ گئی۔

''کھانے سے فارغ ہو جائیں تو پھر آگے چلیں گے۔'' حمزہ کی آواز پر انکل آنٹی نے اثبات میں سر ہلائے تھے۔

☆☆☆

''آج پہلی بار..... آج پہلی بار

ایک لڑکی میرا ہاتھ پکڑ کر بولی

ہاں رے آں.....آں.....

آج پہلی بار.....ایک لڑکی میرا ہاتھ پکڑ کر بولی۔''

''کیسے ہو..... بھائی جان؟'' باسط شرارت سے بے ساختہ بولا تو وہ تینوں بلند قہقہے لگانے لگے تھے جبکہ آفتاب نے غصے سے اسے گھورا تھا کہ وہ بہت ترنگ میں گنگنا رہا تھا۔

''کیوں مجھے کوئی آئی لو یو نہیں بول سکتی؟'' وہ بہت تپے ہوئے لہجے میں بولا۔

''تم جیسے ہاتھی سے کوئی چھچھوندی آئی.....لو..... یو کہہ سکتی ہے۔''

''بہت نازک ہے تھے اپنے ان ہڈیوں کے پنجر جیسے جسم پر ہو۔ سوٹ پہن کر باہر نکلتا ہے تو ایسا لگتا ہے جیسے بانس پر کپڑے سوکھ رہے ہوں۔'' آفتاب کی بات شاہ سے ان کے دل پر لگی تھی۔ اسے منہ بناتے دیکھ کر وہ ہنس پڑے تھے۔ آفتاب کا قہقہہ فلک شگاف تھا۔

''باسط! میں آفتاب کی بات کی تائید کرتا ہوں۔ مرد کی ہڈیوں پر کچھ گوشت ہونا چاہیے۔''

''تبریز آپ بھی دشمن سے مل گئے؟'' تبریز کو مسکراتے دیکھ کر باسط نے احتجاج کیا۔

''مرد کی شان یہ ہے کہ وہ حق بات منہ پر بولتا ہے۔'' آفتاب نے انگڑائی لیتے ہوئے کہا۔

''باسط درست کہہ رہا ہے۔ کوئی لڑکی شادی نہیں کرے گی اس تھنکر سے۔ لڑکیاں اسمارٹ، ہینڈسم، اٹریکٹو پرسنالٹی والے لڑکوں کو لائف پارٹنر بنانا چاہتی ہیں۔'' صارم ریت پر گھروندہ بناتے ہوئے اسے چڑانے والے انداز میں گویا ہوا، حسب توقع آفتاب بری طرح تپ اٹھا تھا۔

''مجھے معلوم ہے۔ تم مجھ کو کچھ سمجھتے ہی نہیں ہو۔ کیوں کرتے مجھ سے محبت تب ہی اتنی آسانی سے اپنی شرارت کی خاطر مجھے سر دہ بنا دیا تھا۔ ہر جگہ تم لوگ میرا استعمال فراخدلی سے کرتے ہو۔ میں بیوقوف پھر بھی تمہارے سنگ چلا آتا ہوں، ہر بات بھلا کر، ہر مذاق......''

''بس......بس میری جان! مذاق...... مذاق ہوتا ہے اور مذاق بھی اس سے کیا جاتا ہے، جس سے محبت کی جاتی ہے۔ تم اتنے تنگ دل کیوں ہو گئے؟ مذاق کو بھی سیریس لینے لگے۔'' صارم نے آگے بڑھ کر بڑے خلوص سے اسے گلے لگایا تھا۔ وہ تینوں بھی اس سے بری طرح لپٹ گئے۔

''تمہیں شاید یہ فکر ہو گئی ہے کہ تمہیں کوئی لڑکی نہیں ملے گی؟ ایسا نہیں ہے یار! تم کسی کی طرف اشارہ تو کرو پھر دیکھنا اپنے یار کی محبت، قدموں میں لا کر پھینک دوں گا۔'' باسط کی محبت نے یکلخت جوش مارا تو وہ سینہ تان کر کہنے لگا۔

''اچھا! تم میری محبت میں لڑکیاں اٹھا لاؤ گے؟'' آفتاب ان تینوں کی طرف دیکھتے آنکھ دبا کر باسط سے گویا ہوا کیونکہ اکثر دونوں ایک دوسرے سے بحث بھی کرتے تھے اور محبت بھی از حد کرتے تھے ایک دوسرے سے۔ اسے رنجیدہ دیکھ کر ہی باسط جذباتی ہو کر اٹھ گیا تھا۔

''تو اشارہ تو کر۔ آج تو نے محبت کو آزمایا ہے۔ توہین کی ہے محبت کی۔''

''رانی! مجھے رانی چاہیے...... لا دو گے نا......؟''

''رانی؟...... یعنی میری والی رانی!'' باسط نے کچھ حیرانگی سے اس کی جانب دیکھا کیونکہ وہ اس وقت بے حد سنجیدہ تھا ان کی شرارت محسوس نہ کر سکا تھا۔

''ذلیل، کمینے، بے حیا اپنی ہونے والی بھابھی کے اوپر نظر رکھتا ہے میں تجھے چھوڑوں گا نہیں۔'' اسے اثبات میں گردن ہلاتے دیکھ کر وہ تیزی سے چیختا ہوا اس کی طرف بڑھا تھا۔ فضا ان کے قہقہوں سے گونج رہی تھی اور آفتاب کے پیچھے باسط دوڑ رہا تھا۔

''خوب اپنی والی کا نام سن کر کیسا غصہ آیا۔ دوسری لڑکیاں بھی کسی نہ کسی کی چھٹکی ہوں گی۔''

''دل چھوٹا مت کرو۔ ایسا کرو صارم سے رجوع کر لو۔ اس کے پاس لڑکیاں تھوک کے بھاؤ سے رہتی ہیں۔ یہاں تمہیں مایوسی نہیں ہو گی۔'' مامون نے شوخی سے صارم کی طرف اشارہ کیا۔

''شوق سے مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے اگر کوئی تمہیں پسند کرے تو۔''

''اپنی وہ رنگ برنگی تتلیاں اپنے پاس ہی رکھو۔ مجھے شوق نہیں ہے۔ تتلیوں کو چھو کر اپنے ہاتھ خراب کرنے کا۔ مجھے بیوی چاہیے جو میرا گھر بنائے۔ سنوارے۔ میری ماں کا خیال رکھے میرے باپ کو عزت دے اور......''

''اور تمہارا گھر بچوں سے بھر دے۔ کیسے لگو گے تم؟ ایک بچے کو فیڈر دیتے ہوئے، دوسرے کی پپی چینج کرتے ہوئے، تیسرے کی ناک پونچھتے ہوئے جوتے کو......''

''اوبھائی بس کر، کیا میرے گھر میں بچوں کا جمعہ بازار لگوائے گا۔'' آفتاب نے گھبرا کر کان پکڑے تو وہ قہقہے لگانے لگے تھے۔

''فدا حسین سے کچھ سبق لو۔ تم خواہ مخواہ گھبرا رہے ہو۔'' سبریز کی فرمائش پر وہ آج سمندر پر پکنک منانے آئے تھے۔ پانی میں انہوں نے خوب سوئمنگ کی تھی پھر دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد کچھ دیر آرام کرنے وہیں اونچی نیچی چٹانوں پر لیٹ گئے تھے پھر حسب معمول ان میں نوک جھونک شروع ہوگئی تھی۔

''فدا حسین! کتنے بچے ہیں تمہارے؟'' چائے سرو کرتے فدا حسین سے آفتاب مخاطب ہوا تھا۔

''گیارہ بچے ہیں صاب، بالوے (بارہویں) کی آمد آمد ہے۔'' وہ انہیں چائے سرو کرنے کے بعد اپنا مگ لے کر ان کے قریب بیٹھ کر اطمینان سے گویا ہوا تھا۔

''کیوں بھائی؟ خاندانی منصوبہ بندی والوں سے تمہاری کوئی دشمنی چل رہی ہے۔'' بہروز تعجب سے بولا۔

''کیوں صاب! اپنا وریب (غریب) تا کسی پر اختیار نہیں ہے؟'' کافی رنجیدگی سے دریافت کیا گیا۔

''اختیار ہے لیکن تم سوچو یہ تم غربت سے انتقام لے رہے ہو یا اپنے دشمن خود بن رہے ہو۔ آبادی تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ ایک وقت ایسا آئے گا کہ نہ زمین پر گھاس رہے گی اور نہ درخت پر پتے۔'' ماموں از حد فکر مند ہو گیا تھا اس کے بچوں کی تعداد سن کر۔

''تو کیا درختوں پر پتوں کی جگہ انسان لٹکا کریں گے؟ اور زمین پر گھاس کی جگہ...'' بہروز نے اس کی بات قطع کر کے کہا۔

''ہر وقت ایک ہی موڈ میں نہ رہا کرو۔ بات سمجھا کرو۔'' وہ جھنجلا کر بولا۔ وہ یوں ہی بحث میں الجھ گئے تھے۔ صارم، سبریز کے ساتھ ساحل پر آ گیا تھا۔

دوپہر ڈھلنے کو تھی ہوا میں خنکی بیدار ہونے لگی تھی کیونکہ موسم میں ابھی سردی کا عنصر باقی تھا۔ سو ماحول بھی اس کے زیر اثر تھا۔ عموماً سمندر پر موسم گرما میں بہت گہما گہمی نظر آتی ہے۔ لاتعداد خاندان گرمی کی تمازت سے اکتا کر ساحلوں کا رخ کرتے ہیں۔ جہاں کئی گھنٹے وہ خوش و خرم سمندر کی موجوں سے کھیلتے گزار دیتے ہیں۔ موسم سرما کے اس سرد موسم میں بھی کراچی کے منچلے اور سر پھرے زندہ دل لوگ کافی تعداد میں موجود تھے۔ آتی جاتی لہروں سے خرمستیاں کرنے میں ایسے مگن تھے جیسے سرد پانی وہ محسوس نہ کر رہے ہوں۔

''تو پرسوں تم چلے جاؤ گے؟''

''ہاں... گاؤں میں سب پریشان ہو جائیں گے اگر اب بھی نہ گیا۔'' سبریز نے جواب دیا۔

''سب کی نہیں تمہیں صرف 'ایک' کی فکر ہے۔'' صارم نے جیکٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر شرارت سے کہا۔

''تم! جو بھی سمجھو میں مائنڈ نہیں کروں گا۔'' سبریز نے ایک پتھر اٹھا کر دور پانی میں اچھال دیا۔

''میں ایگزیم کے فوراً بعد آؤں گا۔ اتنا انتظار تو کر سکتے ہو؟''

''تمہاری وجہ سے میں نے شادی کی ڈیٹ بڑھوائی ہے۔ یہ تو ممکن ہی نہیں ہے کہ تمہارے بغیر کچھ کر سکوں پھر شادی تو بہت بڑی بات

ہے، بہت گمبھیر معاملہ ہے۔" سبریز اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر محبت سے لبریز لہجے میں کہنے لگا۔

"دیکھتے ہیں بیٹا! شادی کے بعد تم مجھے کس طرح دستیاب ہوتے ہو۔" صارم نے مصنوعی آہ بھری تھی۔

"تم مجھے جب بھی ایسا ہی پاؤ گے جیسا اب ہوں۔ تم اپنا بتاؤ تمہارے معاملے کا کیا ہوگا؟ میں نے تم سے بات کرنے کے بعد ساری رات تمہارے بارے میں ہی سوچا ہے اور میں حقیقتاً پریشان ہوگیا ہوں۔"

"کیوں؟ پریشانی کی کیا وجہ ہے؟" صارم نے شانے اچکاتے ہوئے استفسار کیا۔ "بابا جان نے تمہیں ہمیشہ ہر معاملے میں چھوٹ دی ہے۔ تمہارے مزاج تمہاری پسند، تمہاری خواہشات کو اولیت دی ہے۔ محض اس لیے نہیں کہ تمہیں وہ محرومیوں سے دور رکھنا چاہتے تھے تاکہ تمہیں اپنے والدین کی ابدی جدائی اور تنہائی کا احساس نہ ہو بلکہ وہ تمہیں بے حد چاہتے ہیں۔ تمہیں تمہاری خواہشات کے پیش نظر انہوں نے تعلیم کے حصول کے لیے بھی نہیں روکا لیکن تم بزنس نہیں سنبھال سکتے تمہیں بہر کیف سرداری کرنی ہے۔ بڑے آکا کا منصب سنبھالنا ہے اور دوسری اہم بات یہ کہ تم برادری سے باہر شادی نہیں کرسکتے ایک کرو یا چار لڑکیاں تمہیں برداری سے ہی منتخب کرنا ہوں گی۔ یہ اپنا اصول رہا ہے۔ لڑکیاں کبھی غیر برادری سے نہیں آتیں۔"

"سبریز! میں نے پہلے بھی کہا تھا۔ میں فرسودہ رسم ورواج کا قائل نہیں ہوں۔ مجھے اپنے باپ کی نسل چلانے کے لیے صحت مند خون کی ضرورت ہے اور میں ہرگز نہیں چاہوں گا کہ موروثی بیماریوں سے معذور و لاغر وجود میرے ہاں جنم لیں۔" وہ از حد سنجیدہ تھا۔

"ضروری تو نہیں ہر لڑکی معذور یا خبط الحواس بچوں کو جنم دے؟"

"نہیں..... ضروری تو نہیں یہ بھی ہوسکتا ہے وہ بچوں کو جنم ہی نہ دے۔"

"خدا کی قسم! واقعی بابا جان درست ہی کہتے ہیں تم حد درجہ بے باک و منہ پھٹ ہوگئے ہو۔" سبریز اسے ڈھٹائی سے ہنستا دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولا۔

"بابا جان مردوں میں بھی عورتوں والی صفات دیکھنا چاہتے ہیں۔ آپس کی بات ہے اب یہ 'صفات' عورتوں میں بھی مفقود ہوگئی ہیں۔ اس دور کی لڑکیاں اتنی بے باک وجذباتی طور پر اس قدر بے لگام ہوچکی ہیں کہ بعض اوقات مردوں کو بھی پیچھے چھوڑ دیتی ہیں۔" وہ اپنے مخصوص شوخ وشنگ و کھلنڈرے انداز میں بول رہا تھا۔ وہ باتیں کرتے ہوئے دور تک نکل آئے تھے۔ رخصت ہونے کی تیاری کرتے سورج کی زرد روشنی شعاعوں کی صورت میں جھلملا رہی تھی۔ سامنے سمندر کی وسعت میں آسمان کا کنارہ مدغم ہوتا ہوا لگ رہا تھا۔ پیراڈائیز کا یہ گوشہ بہت پرسکون تھا۔ لوگوں کی آمد ورفت یہاں بالکل نہیں تھی۔ صرف ان دونوں کے علاوہ۔

"صارم خان!" سبریز نے کسی اچانک وارد ہونے والے خیال کے تحت اسے پکارا۔

"ہوں۔" اس نے اپنی نیلگوں آنکھیں حیرانگی سے اس کی سمت کیں۔

"اس لڑکی کے متعلق کیا سوچا ہے تم نے.....؟"

"کل کی رات میں نے بھی سوچ کر گزاری ہے اور فیصلہ کیا ہے....."

''کہ اس لڑکی کا پیچھا چھوڑ دو گے؟'' وہ اس کی بات قطع کر کے چھیڑتے ہوئے بولا۔

''ہو سکتا مگر شاید ممکن نہیں۔ میرے اندر کی دنیا جو بدلی ہے اس تبدیلی کو میں ابھی برداشت نہیں کر پا رہا ہوں۔ میں نے ہمیشہ سے جو چاہا وہ مجھے مل گیا۔ بچپن کی اس عادت نے مجھے بہت ضدی و کہل پسند بنا دیا ہے لیکن یار! میں محسوس کر رہا ہوں ایک لڑکی میں اور کھلونے، پرفیوم، کتاب وغیرہ میں نمایاں فرق ہے۔ اس لڑکی کو میں اپنی محبت کی شدتوں سے آگاہ کر دوں گا۔ اسے میرے جذبوں کا احترام کرنا ہوگا۔ عورت کسی رشتے کسی چھانسے کے جال میں نہیں پھنستی۔ اسے اسیر کرنے والا اپنے سے مانوس کرنے والا، اپنے کو منوانے والا صرف ایک لفظ ہوتا ہے اور وہ ''محبت'' ہے۔ اس لفظ کی خاطر عورت اپنا آپ نچھاور کر ڈالتی ہے۔ اسی چاہ آرزو میں زندگی گزارتی ہے۔''

''تم فراڈ کرو گے اس سے.....؟''

''نہیں۔ اگر مجھے یہ کرنا ہوتا تو بہت آسانی سے میں اس کا غرور توڑ سکتا تھا۔ باہر سے نظر آنے والی کٹھور و سخت گیر لڑکیاں دل بہت نرم و ملائم رکھتی ہیں۔ کالج سے یونیورسٹی تک اتنی لڑکیوں سے دوستی رہی ہے کہ ان کی رگ رگ سے واقف ہو گیا ہوں۔'' اس نے دھیمے سے ہنستے جواب دیا تھا۔

''دیکھیں گے تم کہاں تک کامیاب ہوتے ہو۔ فی الحال تو چلنے کی کرو۔ سورج غروب ہونے والا ہے۔'' سبریز نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

قیامت تک محبت کا یہ افسانہ نہ بدلے گا
جو دیوانہ تمہارا ہے وہ دیوانہ نہ بدلے گا
جلا کر خود کو دم لے گا یہ اس کا مشغلہ ٹھہرا
تمہارے شمع گل کرنے سے پروانہ نہ بدلے گا

''بے شک میرے یار! پروانہ نہ بدلے گا مگر شمع بدلتی رہے گی۔'' سبریز نے اس کے شعر پڑھنے کے جواب میں قہقہہ لگاتے ہوئے جواب دیا۔

''اگر بدگمان رہنا چاہتے ہو تو رہو۔'' اس نے سبریز کے شانے پر مکا مارتے ہوئے کہا۔ اسی لمحے اس کی نگاہیں اوپر چٹان کی طرف اٹھی تھیں جہاں سے ایک لڑکی گرین سوٹ میں ملبوس تیزی سے لڑھکتی ہوئی آ رہی تھی اس کے منہ سے نکلنے والی چیخوں سے زیادہ اوپر کھڑی لڑکی کی چیخوں سے خاموش فضا یکلخت گونج اٹھی تھی۔ وہ دونوں سرپٹ اس طرف دوڑے تھے اور صارم نے آگے بڑھ کر گرتے وجود کو اپنے دونوں بازوؤں کے سہارے سے روکا تھا۔ وہ لڑکی بے ہوش ہو چکی تھی۔ چہرہ اس کا لہولہان ہو رہا تھا اور دونوں نے اسے خشک ریت پر لٹا دیا تھا۔ اس دوران اوپر سے سنبھل کر اترتے ہوئے کچھ لوگ گھبرائے ہوئے پریشان سے نیچے اترے۔ ان میں ناردہ، سنبل کو دیکھ کر وہ چونک اٹھا تھا۔

''ورشا..... ورشا!'' وہ بدحواس سی بیہوش وجود کی طرف بڑھی تھیں۔ سبریز نے چونک کر صارم کو دیکھا تھا۔

☆☆☆

''یار..... کیا میرے سینگ نکل آئے ہیں؟ جو بار بار مجھے مشکوک نگاہوں سے دیکھ رہے ہو۔'' صارم، سبریز خان کی نگاہوں کے اشارے کا تحیر بخوبی سمجھ رہا تھا۔ مگر شرارتاً انجان بن کر بولا۔ شاید وہ اس طرح سے اپنے احساسات پر چھائی اس بدحواسی و بے چینی سے فرار چاہتا تھا جو ورشا کو تکلیف

میں دیکھ کر اس پر قابض ہوئی تھیں۔ سنبل اور فارحہ کو دیکھ کر، ان کے منہ سے ورشا کا نام سن کر اس کا دل جس انداز میں لمحے بھر کو دھڑکا تھا۔ اس ایک لمحے نے صدیوں کے فاصلوں کو ایک جست میں ہی عبور کر لیا تھا۔ اپنے اندر کی بغاوت کا ادراک اسے مزید بوکھلا گیا تھا۔ پھر اسے کچھ یاد نہ رہا۔ نہ اپنے اردگرد کا ہوش، نہ سبریز کی حیران و پریشان نگاہوں کی زبان، نہ آفتاب و باسط وغیرہ کا خیال اور نہ ہی سنبل کی فیملی کا دھیان۔

بہت پھرتی و تیز رفتاری سے وہ ان لوگوں کے ساتھ ورشا کو راستے میں پڑنے والے پرائیویٹ اسپتال لے آیا تھا جہاں ڈاکٹرز نے فوراً اس کا چیک اپ کیا۔ کیوں کہ اس کو گہری چوٹیں نہیں آئی تھیں اس لیے اس کے سر میں لگے زخموں کی ڈریسنگ کرنے اور طاقت و سکون کا انجکشن لگانے کے بعد ڈاکٹر نے اسے فارغ کر دیا تھا۔ اس دوران وہ مسلسل بے ہوش رہی تھی اور ڈاکٹر نے کوشش بھی نہیں کی اسے ہوش میں لانے کی۔ ڈاکٹر کا کہنا تھا وہ نقاہت کے سبب بے ہوش ہوئی تھی۔ پتھروں پر لڑھکنے کی وجہ سے اس کے جسم پر خاصی خراشیں آئی تھیں جن میں شدید تکلیف تھی۔ درد کے باعث اسے سکون و نیند کا انجکشن لگایا گیا تھا۔ کل وہ خود ہی ہوش میں آجائے گی۔ ڈاکٹرز کی تسلیوں و اطمینان دلانے کے بعد سنبل اور فارحہ کے آنسو تھمے تھے۔ رخشندہ بیگم اور ارسلان صاحب کے متفکر چہروں پر بھی اطمینان سا چھایا تھا۔ وہ ان دونوں کا بے حد شکریہ ادا کر کے انہیں گھر ملنے آنے کی تاکید کر کے بلکہ وعدہ لے کر روانہ ہوئے تھے۔ صارم اور سبریز کی وجہ سے ورشا بروقت اسپتال پہنچ سکی تھی ورنہ ان کے لیے بہت مشکل ہو جاتی۔ وہ سبریز کے ساتھ گھر آ گیا تھا مگر اس کی کیفیت الجھی الجھی سی تھی۔ کوشش کے باوجود وہ ورشا کا خون آلودہ چہرہ بھلا نہ پا رہا تھا۔ اس کے ہر زخم، ہر خراش کا درد وہ اپنے جسم میں محسوس کر رہا تھا۔ سبریز خان جو بہت کچھ جان لینا چاہتا تھا اسے یوں سوچوں میں گم ہوئے دیکھ کر بری طرح گھورنے لگا تھا۔

''مجھے معلوم ہے تم جیسوں کے سر پر سینگ نہیں ہوتے۔'' سبریز نے خاصے جلے کٹے لہجے میں کہا۔

''اوہ..... یعنی مجھے گدھا بنا رہے ہو......؟''

''میری یہ مجال کہاں۔ یہ تو ''اوپر'' والے کا کام ہے۔ وہ الو بنائے یا گدھا۔''

''سوچ لو۔ ہماری ذات ایک ہی ہے۔'' صارم جیکٹ صوفے پر پھینکتا ہوا مسکرا کر گویا ہوا۔

''اچھا، زیادہ پھیلنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ورشا وہی لڑکی ہے نا؟ جس کے لیے تم خاصے پریشان سے رہتے ہو۔ آج کل.....'' سبریز خان اس کی نگاہوں میں جھانکتے ہوئے استفسار کرنے لگا۔

''آج.....کل! مجھے محسوس ہوتا ہے جیسے صدیوں سے مجھے اس کی جستجو ہے۔''

''خدا کی قسم تمہارے منہ سے ایسے ڈائیلاگ سن کر لگتا ہے کوئی مزاحیہ ڈرامے میں ایکٹ کر رہا ہے۔'' سبریز خان نے استہزائیہ قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

''تم، میری سمجھ نہیں آتا کیوں یقین نہیں کر رہے......؟''

''جو تمہارے تمام معاشقوں و محبوباؤں سے واقف رہا ہو وہ بھلا کسی طرح یقین کر سکتا ہے؟''

''اس دفعہ وہ بات نہیں ہے۔ میں سیریس ہوں۔'' صارم نے سنجیدگی سے کہا۔

"یہ بالکل آخری معاملہ ہے۔" سبریز خان کو صارم نے نفی میں گردن ہلاتے دیکھ کر پھر دہرایا۔

سمٹ سکا نہ کبھی زندگی کا پھیلاؤ
کہیں بھی ختم غم عاشقی نہیں ہوتا
نکل ہی آتی ہے کوئی نہ کوئی گنجائش
کسی کا پیار، کبھی آخری نہیں ہوتا

سبریز نے حسب توقع شعر پڑھا تھا۔ جواباً صارم نے کشنز کی اس پر برسات کر دی تھی۔

☆☆☆

وادی حسب معمول سفید برف کے لباس میں ملبوس کسی نوخیز بیوہ کی طرح ویران و خاموش لگ رہی تھی۔ پہاڑ، درخت، جھرنے سب گم صم وساکت تھے۔ ہوا کی سرسراہٹ تک منجمد ہو کر رہ گئی تھی۔ سخاویہ نے آتش دان میں سلگتی سرخ لکڑیوں پر نگاہ ڈالتے ہوئے افسردگی سے سر تکیے پر رکھ دیا تھا۔ آج صبح چوکی دار کی بیٹی گل فشاں کی لاش شہباز خان کے ملازموں نے ایک کھائی سے دریافت کر لی تھی۔ روزی خان کے گھر میں جوان بیٹی کی اندوہناک موت پر کہرام مچ گیا تھا۔ گل فشاں اس کی اکلوتی اولاد تھی جو بہت منتوں، مرادوں کے بعد پیدا ہوئی تھی، شادی کے کئی سال بعد۔ روزی خان کی بیوی صابرہ بی بی اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھی تھی۔ مردہ بیٹی کی بے نور کھلی آنکھوں میں اسے ایسی کوئی تحریر نظر آئی تھی جس کی تڑپ نے اس کے حواس چھین لیے تھے۔ گل خانم اور بڑے لالہ کی بیوی صبح سے وہاں گئی ہوئی تھیں۔ ان کی واپسی جنازہ اٹھ جانے کے بعد ہونی تھی۔ گل جاناں حسب عادت نہیں گئی تھیں۔ وہ ایسے گھروں میں جانے سے ہمیشہ کتراتی رہتی تھیں۔ ان کا خیال تھا، میت کے گھروں میں جانے سے ان کی طبیعت بگڑ جاتی ہے۔ ایسی جگہوں پر گل خانم جاتی تھیں۔ کیوں کہ انہوں نے دل بہت گداز و خدا ترس پایا تھا۔ دوسرے شہباز خان کی سرداری کے باعث، ان کی بیوی ہونے کی حیثیت سے لوگوں کے دکھوں، سکھوں میں شریک ہونا ان پر عائد تھا۔ اس سے قطع نظر وہ اپنی طبیعت کے باعث لوگوں سے ملتی تھیں اور بعض اوقات میت کو غسل بھی دے دیا کرتی تھیں کیوں کہ شہباز خان کو یہ کام گراں گزرتا تھا اس لیے انہوں نے کبھی اپنی عادت یا کام کا پرچار نہیں کیا تھا۔ اپنی نیکی و ثواب کا زیاں انہیں گوارا نہ تھا۔

سخاویہ ظہر کی نماز سے فارغ ہو کر لیٹی تھی۔ آتش دان میں سلگتی لکڑیوں کے باعث کمرا گرم تھا۔ گل فشاں کی جوان و حادثاتی موت کا اسے بھی بے حد دکھ تھا۔ حالانکہ وہ اس سے کبھی ملی نہیں، کبھی اسے دیکھا نہیں، مگر پھر بھی انسانیت کے رشتے سے جو تعلق استوار ہوتا ہے، اسی احساس نے اسے مضطرب و افسردہ کر دیا تھا۔ اپنے گھر کے در و دیوار بھی اس دکھ میں نوحہ کناں لگ رہے تھے۔

"لیٹی رہو۔" دروازہ کھول کر اندر آنے والی بڑے لالہ کی بیوی کو دیکھ کر وہ احتراماً اٹھی تو وہ قریب آ کر اپنے ملائم و سادہ سے لہجے میں اس سے مخاطب ہوئیں۔

"ادے نہیں آئیں بھابھی!"

''نہیں۔'' وہ اس کے قریب ہی بیٹھ گئی تھیں۔

''کیوں.....؟ کیا جنازہ ابھی گھر میں ہی ہے؟'' اس نے کمبل اس پر ڈالتے ہوئے استفسار کیا۔

''نہیں۔ ظہر میں ہی میت اٹھ گئی تھی، بلکہ آدمی قبرستان سے واپس بھی آچکے ہیں۔ صابرہ کی حالت بہت خراب ہے۔ اسے سکتہ ہوگیا ہے۔ ٹکٹکی باندھ کر وہ آسمان کی طرف دیکھ رہی ہے۔ نہ کچھ کہہ رہی ہے اور نہ ہی رو رہی ہے۔ صدمے اور غم نے اسے پتھر بنا دیا ہے۔ ایسی حالت خطرناک ہوتی ہے۔ ادے اس کے پاس ہیں۔ جب تک اس کی حالت درست نہیں ہوگی۔'' وہ آہستگی سے بتا رہی تھیں۔ ان کے چہرے پر بھی سوز و افسردگی کے رنگ تھے۔

''آہ..... کیسی بے بسی و بے چارگی ہوتی ہے۔ ایسی بیٹیوں کے والدین کے نصیب میں..... کل تک بیٹی کا معلوم کرنے کے لیے اس نے کس قدر چکر لگائے تھے بابا جان کے پاس۔ ہر بار ان کی زبان پر یہی لفظ تھے کہ گل فشاں کی لاش کسی کھائی، کسی کنویں سے دریافت ہو جائے، انہیں قرار مل جائے گا۔ اور آج لاش ملی تو بھی وہ از حد بے سکون و بے قرار ہو گئے۔ پہلے اپنی ناموس کی فکر انہیں ضربیں لگا رہی تھی۔ اب بیٹی کی محبت، اس کی جدائی پتھر بنا گئی ہے۔''

''ہاں سجادیہ! ہمارے ہاں بیٹیاں خسارے میں ہی رہتی ہیں۔'' انہوں نے سرد سی آہ بھری تھی۔

''ہمارے یہ علاقے جنت نظیر کہلاتے ہیں۔ یہاں کا قدرتی حسن و خوب صورتی دوسرے علاقوں کے لوگوں کے لیے سحر انگیز و ماورائی دلکش خوابوں کی سی حیثیت رکھتی ہے۔ مگر بہت کم لوگ جانتے ہیں یہاں پر رہنے والے لوگ، کس کس طرح کی پریشانیاں و مصیبتیں جھیل کر یہاں رہنے کا حق ادا کرتے ہیں۔ کس طرح چھوٹے چھوٹے بچوں کو روزی کمانے کے لیے، غربت و افلاس مٹانے کے لیے، اپنے گوشہ عافیت سے دور جانا پڑتا ہے۔ ماں باپ کی نرم گرم چھاؤں سے دور ہونا پڑتا ہے۔ بہن بھائیوں کی سندر و سندر مٹھاس بھری قربت اس عمر میں جدا ہو جاتی ہے جب ذہن جدائی کے معنی سے بھی واقف نہیں ہوتا۔ ایک بار کی جدائی پھر بار بار غالب آنے لگتی ہے اور عمر بھر یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ ان علاقوں میں ہمارے بابا جیسے لوگ رہنے کی استطاعت رکھ سکتے ہیں۔ جن کے بزرگ ان کے لیے جدی، پشتی جائیدادیں و دولت چھوڑ کر ابدی سفر پر روانہ ہو گئے ہوں۔''

''کیا بات ہے بھابھی.....؟ بہت خاموش ہیں۔ کوئی پریشانی ہے؟'' سجادیہ نے بھابھی کو گہری سوچ میں گم دیکھا تو فکر مندی سے گویا ہوئی۔

''نہیں تو..... بس، میں سوچ رہی ہوں۔ ادے کو نہ معلوم کتنا وقت لگے، تم جانتی ہو چھوٹی ادے بہت جلد برداشت کا دامن چھوڑ بیٹھتی ہیں۔ خواہ مخواہ گھر میں فضا مکدر ہوگی۔''

''ادے بھی اپنے دکھوں سے مجبور ہیں۔ کسی کو دکھ میں دیکھ کر اپنا زخم بھی تازہ ہو جاتا ہے اور بیٹیوں کا دکھ تو مشترک ہوتا ہے نا بھابی۔''

''ہاں..... اتنے سال گزر جانے کے باوجود ان دکھوں سے آزاد نہ ہو پائی ہیں۔ شاید اولاد کا دکھ جونک کی طرح چمٹ جانے والا ہوتا ہے۔ اولاد ہو کر جدا ہو جائے تو شاید زندگی، زندگی نہیں محسوس ہوتی اور جو اس نعمت سے محروم ہو۔ خواہش و علاج کے باوجود تو زندگی دھوپ میں جلتے صحرا کی تپتی ریت کی مانند ہو جاتی ہے۔ جہاں نہ صرف پاؤں بلکہ پورا وجود ہی آبلہ پائی کا شکار ہو کر رہ جاتا ہے اور زندگی سسک سسک کر گزرتی ہے۔''

سات سال کا عرصہ ان کی شادی کو گزر چکا تھا۔ وہ اولاد کی نعمت سے محروم تھیں۔ اس عرصے میں ان کا ہر ممکن علاج کروایا گیا تھا۔ درگاہوں پر منتیں مانی گئی تھیں۔ پیروں، فقیروں سے دعائیں منگوائی گئی تھیں مگر اب تک وہ اولاد کی محرومی کا شکار تھیں۔ اس دکھ نے انہیں اندر ہی اندر تباہ کر ڈالا تھا۔ چھوٹی ادے ظالمانہ و جاہلانہ طرز سوچ کے باعث اس محرومی کا ذمہ دار انہیں ٹھہراتی تھیں۔ ان کی زبان کی چیرہ زنی نے انہیں زخم زخم کر رکھا تھا۔ وہ ان سے کبھی سیدھے منہ بات کرنے کی روادار نہ تھیں۔ ہمیشہ ان کی زبان سے ان کے لیے زخم لگاتا ''لقب'' وارد ہوتا تھا۔ فطرتاً وہ سادہ طبیعت، سعادت مند اور بڑوں کا احترام کرنے والی تھیں، کبھی پلٹ کر انہوں نے ان کے کسی طعنے و بدکلامی پر جواب نہ دیا تھا۔ نہ کبھی شوہر سے، ساس کے تحت ظالمانہ رویئے کی شکایت کی تھی۔ وہ خود کو مجرم سمجھتی تھیں کہ اس گھر کو کوئی وارث نہ دے سکی تھیں۔ اس لیے ساس کی ہر زیادتی انہیں حق بجانب لگتی تھی۔ شوہر کی تمام محبتوں و چاہتوں کی واحد مالک تھیں۔ ان وجہ سے معاملہ نازک ہونے کے باوجود اتنے عرصے سے گھر میں ٹکی ہوئی تھیں۔ ورنہ چھوٹی ادے کا تو ایک دن بھی انہیں گھر میں رکھنے کا ارادہ نہیں تھا۔ وہ بیٹے کی ضد سے مجبور تھیں۔ جس نے ان کے دوسری شادی کر لینے کے پرزور اصرار پر خبردار کر دیا تھا کہ اولاد اگر ان کے نصیب میں ہے تو وہ نرمل کے بطن سے جنم لے گی ورنہ وہ اولاد سے محرومی کی زندگی گزار سکتے ہیں، مگر نرمل سے جدائی انہیں گوارا نہیں تھی۔ اس کے باوجود وہ نہیں مانی تو انہوں نے گھر چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس طرح بیٹے کے عزائم کے سامنے انہیں اس خیال و خواہش سے دستبردار ہونا پڑا تھا۔ مگر اس طرح نرمل کے لیے زندگی کا دائرہ تنگ کر دیا تھا پھر وہ غیر محسوس انداز میں بڑی ادے ''سوتیلی ساس'' کی نرم و مشفقانہ طبیعت کی گرویدہ ہوتی چلی گئیں۔ ان سے چھپ کر اپنا زیادہ وقت ان کے قریب گزارنے لگیں۔

''آپ ایسے نہ سوچا کریں بھابھی! اللہ کے ہر کام میں مصلحت ہوتی ہے۔ ہماری اور آپ کی دعاؤں کے لیے کبھی تو آسمان اپنے دروا کرے گا۔ دیکھے گا، انشاء اللہ شمشیر لالہ جیسا بیٹا اللہ آپ کو دے گا۔'' سخاویہ نے ان کے ہاتھ محبت سے پکڑتے ہوئے کہا۔

''اللہ نہ کرے، سخاویہ! مجھے ایسی بددعا نہ دو۔ میں بے اولاد بہتر ہوں۔'' انہوں نے ہذیانی انداز میں بے ساختہ اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کر کہا تھا۔

''بھا...... بی! یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ ......؟ شمشیر لالہ میں کیا برائی ہے؟ صرف غصے کے تیز اور سخت مزاج ہیں، ہمارے ہاں مرد عموماً اسی مزاج کے ہوتے ہیں۔ یہ کوئی عیب نہیں ہے۔ وہ اتنے وجیہہ و خوبرو ہیں۔ ان کے مزاج سے قطع نظر میں نے سراپا کی بات کی تھی۔'' نرمل کا لہجہ سخاویہ کو سخت ناگوار گزرا تھا۔ شمشیر کے مزاج و عادات کے برعکس وہ اسے چاہتی تھی۔ سگی و حقیقی جاں نثار بہن کی طرح اس سے محبت کرتی تھی۔ اس کا غصہ، اس کی ڈانٹ پھٹکار اسے کبھی بری نہیں لگتی تھی۔

''تم برا مت مانو سخاویہ! تم بہن ہو۔ اس لیے اس کی سرگرمیاں تمہاری نگاہوں سے اوجھل رہتی ہیں۔ تمہاری ہی نہیں بلکہ سب کی نگاہوں سے اوجھل ہیں۔ یا جانتے بوجھتے کوئی اسے سرزنش نہیں کرتا، لیکن چشم پوشی و طرف داری کا غیر متوازن ہونا سب کچھ غرق کر ڈالتا ہے۔''

☆☆☆

''ورشا! کیسا محسوس کر رہی ہو؟'' سنبل اس کے قریب بیٹھتے ہوئے خوش گوار لہجے میں دریافت کرنے لگی۔

''بالکل درست۔'' اس نے تکیوں کے سہارے نیم دراز مسکرا کر جواب دیا۔

''تھینکس گاڈ! ورنہ میں تو ڈر ہی گئی تھی کہ کہیں تمہاری، یادداشت ہی نہ ڈراپ ہو جائے۔''

''ایسے معمولی سے حادثات میں ایسا کچھ نہیں ہوتا اور مجھے کم از کم بڑے سے حادثے میں بھی ایسا کچھ نہیں ہو سکتا۔ خاصی سخت جان ہوں جسے تم ڈھیٹ پن سے بھی تشبیہ دے سکتی ہو۔''

''ہونہہ! سخت جان ہوں..... جبھی بے ہوش ہو گئی تھیں۔'' فارحہ اندر داخل ہوتی ہوئی اس کے نقل اتار کر گویا ہوئی.....

''اگر صارم بھائی اور ان کے دوست اتفاقاً وہاں نہ مل جاتے تو نہ معلوم کیا ہوتا؟ ممی، پپا تو اس قدر پریشان ہو گئے تھے کہ جس کی کوئی حد نہیں۔'' فارحہ اس کے دوسری طرف آ کر بیٹھ گئی تھی۔

''وہ..... وہاں کس طرح پہنچ گئے؟'' اس کی فراخ پیشانی پر ناگواری و ناپسندیدگی کے کئی رنگ شکنوں کے انداز میں ابھر آئے تھے۔ ان دونوں کی زبانی تمام سرگزشت سن کر پیشانی کی شکنوں میں نمایاں اضافہ ہوا تھا۔ غصے سے اس نے آنکھیں سختی سے بند کر لی تھیں۔

''کیا ہوا؟ تمہیں غصہ آ رہا ہے؟'' وہ دونوں از حد حیرانگی سے چیخ اٹھی تھیں۔

''اس سے مدد لینے سے بہتر تھا مجھے وہیں مر جانے دیتے تم لوگ۔''

''وہاٹ.....؟ دماغ خراب ہو گیا ہے؟ انہوں نے مدد کی ہے کوئی گناہ نہیں کیا ہے۔''

''وہ فراڈی، مکار، دھوکے باز شخص جس کے نام سے بھی نفرت کرتی ہوں۔ تم نے کیوں اسے مجھے ہاتھ لگانے دیا۔ کراہت آ رہی ہے مجھے اپنے وجود سے۔'' ان کی زبانی سن کر وہ آگ بگولہ ہو گئی کہ صارم نے اسے بازوؤں میں اٹھا کر کار میں ڈالا تھا۔ پھر کلینک اور کلینک سے گھر تک وہ اس کے بازوؤں کے ذریعے منتقل ہوئی تھی۔ اس احساس نے گویا اس کے انگ انگ میں شرارے دوڑا دیئے تھے۔ وہ نقاہت اور زخموں کی پروا کیے بغیر اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

''یہ.... یہ کیا کر رہی ہو؟ تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ تمہارے سر میں زخموں پر ٹانکے لگے ہوئے ہیں۔ وہ کھل جائیں گے۔'' اسے جنونی انداز میں ادھر ادھر سر مارتے دیکھ کر دونوں کی خوف سے چیخیں نکل گئی تھیں۔ وہ دونوں کے قابو میں نہیں آ رہی تھی۔

''تم نے اس کی حسرت پوری کروا دی، وہ یہی چاہتا تھا۔ اس آوارہ، عیاش شخص کے یہی مشغلے ہیں۔ وہ ویسے اپنے منصوبے میں ناکام رہا تھا تم نے اس طرح اس کی مراد پوری کروا دی۔''

''ہوش کرو ورشا، تم نہ معلوم کیا سمجھ رہی ہو۔ تم غلط فہمی کا شکار ہو گئی ہو۔ خون تیزی سے تمہارے سر سے بہہ رہا تھا۔ ہمیں تمہاری زندگی کی فکر تھی۔ اگر اس وقت ہمیں اپنی زندگیاں بھی تم پر نچھاور کرنی پڑتیں تو ہم دریغ نہ کرتے کیونکہ تم ہماری مہمان ہو۔ امانت ہو ہمارے پاس تمہاری زندگی، ہماری زندگیوں سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے ہمارے لیے۔'' سنبل روہانسی ہو گئی تھی۔

''صارم بھائی، بظاہر اچھی شہرت کے مالک نہیں ہیں مگر کسی انسان کی اصل فطرت، اس کی اچھی، بری نیک و بد طبیعت سے ہم اسی وقت واقف ہو سکتے ہیں جب اسے کسی جذباتی و پریشان کن مرحلے پر پرکھ نہ لیں اور کل جس قیامت کے منظر سے ہم گزرے تھے اس منظر میں ہمیں صارم بھائی کی خوش اخلاق، نیک فطرت و ہمدرد و ذمے دار طبیعت کی پہچان ہوگئی ہے۔ بظاہر وہ جیسے بھی ہیں مگر ان کا باطن بہت روشن، مضبوط، باایمان ہے اور کل جس قدر پریشان و فکر مند وہ تھے ہم نے کبھی انہیں پہلے اس طرح نہیں دیکھا اور ساتھ ساتھ ہمیں بھی تسلیاں دیتے رہے تھے۔'' فارحہ نے اس کے دل پر چھائی بدگمانی و نفرت کی گرد جھاڑنے کی بھرپور کوشش کی۔

''ہونہہ..... ایکٹنگ کرنے میں اس کا کوئی ثانی نہیں۔ جانتی نہیں ہو وہ کس طرح ایکٹنگ کرتا ہے۔ کاش.....! اس کے چھونے سے قبل میں مرجاتی۔'' وہ زار و قطار رونے لگی۔

''ہاں۔ تم مرجاتیں..... اور تمہارا وہ جلاد صفت بھائی آکر ہمیں بھی اٹھائیں..... اٹھائیں گولیاں مار کر موت کی نیند سلا دیتا۔ یہی چاہتی تھیں تم؟'' فارحہ رنج سے گویا ہوئی۔

''پلیز ورشا! جو کچھ بھی ہوا نادانستگی میں ہوا۔ تمہاری زندگی بچانے کی تگ و دو میں ہوا۔ تمہاری انا کو ٹھیس پہنچی یا تمہارا وقار مجروح ہوا ہے اس کے لیے میں سب کی طرف سے تم سے معافی مانگتی ہوں۔ پلیز معاف کردو اور بیڈ پر لیٹ جاؤ۔ ممی پپا آتے ہوں گے انہیں کچھ معلوم نہ ہو ورنہ انہیں بہت افسوس ہوگا۔'' فارحہ آہستگی سے زنجیدہ لہجے میں کہہ رہی تھی۔

''اب تم مجھے یہ باور کروانے کی کوشش کررہی ہو کہ میں خود غرض و انا پرست ہوں۔ ایسا نہیں ہے۔ اپنوں کی بے لوث چاہتوں و محبتوں کے آگے انا و غرض کی کوئی وقعت نہیں ہے۔ افسوس مجھے اس بات کا ہے کہ ایک مرتبہ اس نے لائبریری روم میں اپنے دوستوں سے شرط لگائی تھی کہ وہ مجھے کسی نہ کسی طریقے سے چھوئے گا۔ شرط لگاتے وقت وہ اس بات سے بے خبر تھا کہ سیکنڈ روم میں، میں بھی بیٹھی نوٹس بنارہی تھی۔ اپنی پھوہڑ صفت طبیعت کے باعث وہ مجھے کبھی نہیں بھایا اور پھر میں نے اس راہ سے گزرنے کا ارادہ ہی ترک کردیا جس پر وہ موجود ہوتا تھا لیکن میری تمام احتیاطیں خاک آلود ہوگئیں۔''

☆☆☆

''شکر کرو، میری جان، سبریز نے ہمیں حقائق سے آگاہ کر دیا ہے ورنہ ہم نے تو پلان بنا لیا تھا تمہیں انغوا کیسے وہاں سے آنے کا۔'' آفتاب، صارم خان سے مخاطب ہوا تھا۔

''سوری یار! اس دن موبائل یہیں بھول گیا تھا۔ ورنہ تم لوگوں کو اتنا پریشان نہ ہونا پڑتا۔''

یہ سوں ورشا کو اسپتال لے جانے کی تگ و دو میں وہ ان تمام لوگوں کو اطلاع دینا بھول گیا تھا۔ وہ لوگ لنچ اور سبریز کو ڈھونڈ کر نہ ملنے پر پریشان گھر پہنچے تھے۔ جہاں سبریز کی زبانی انہیں سب کچھ معلوم ہوا۔ صارم خان گھر میں نہ تھا۔ دو دن بعد آج ملا تھا۔

''ویسے بائی دا وے، ڈیئر فرینڈ صارم خان! تمہیں کیسے معلوم ہوا؟''

''کیا....؟'' صارم نے سینڈوچ پلیٹ سے اٹھاتے ہوئے مامون کو حیرانگی سے دیکھا۔

''کہ محترمہ ورشا خان! آفریدی، پہاڑ سے سلپ ہونے والی ہیں جو تم وہاں پہنچ گئے۔''

''سمجھا کر، موٹی عقل کے بندے! دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔'' سبریز دانش مندانہ لہجے میں بولا۔ عرصے بعد وہ ان کے ہاتھ لگا تھا۔ سب اسے گھیرے بیٹھے تھے۔ فدا حسین گرم سینڈوچ کچن سے لا کر انہیں سرو کر رہا تھا۔ چائے اور سینڈوچ کے ساتھ وہ باتوں سے بھی لطف اندوز ہو رہے تھے۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ، آنکھوں میں شرارت چمک رہی تھی ان کی۔ سبریز خاصا محظوظ ہو رہا تھا۔

''دیکھو، فضول بکواس مت کرو، بس اتفاقاً ہوا تھا۔ ہو جاتا ہے کبھی کبھی ایسا بھی۔''

''ہمارے ساتھ ایسا کبھی نہیں ہوا۔ تمہارے ساتھ ہی ایسا کیوں ہوتا ہے؟''

''تو اپنی چونچ بند کر یار، کوئی بات وات ہوئی کہ نہیں؟ اب تو لائن کلیئر ہو گئی۔ وہ تو تیری احسان مند ہو گئی ہو گی۔ کوئی موقع دیکھ کر حال دل کہہ دینا۔'' باسط نے مامون کو جھڑکتے ہوئے صارم سے کہا۔

''وہ تو خفا لگتی ہیں، بکل مزاج پرسی کو گئے تھے موصوف۔ مگر وہ تو پردے میں تھی ملی ہی نہیں۔'' سبریز خان مسکراتے ہوئے گویا ہوا۔ صارم خاموش بیٹھا چائے کے سپ لے رہا تھا۔

''تو انہیں یوں کہنا تھا کہ۔

یہ پردہ ہٹا دو ذرا مکھڑا دکھا دو

ہم پیار کرنے والے ہیں کوئی غیر نہیں

آفتاب نے میز بجا کر خوب لہک لہک کر گایا۔ کمرا بلند قہقہوں سے گونج اٹھا۔

''وہ لو پروف گرل ہیں...... نہ پردہ ہٹائیں گی، نہ احسان مانیں گی۔'' باسط گویا ہوا۔

اب دوبارہ جاؤ تو کچھ اس طرح سے حال دل سنانا کہ......

مان میرا احسان ارے نادان کہ میں نے تجھ سے کیا ہے پیار

میں نے تجھ سے کیا ہے پیار

ماہوں کی گنگناہٹ پر قہقہے بکھر گئے تھے۔ صارم بھی زیادہ دیر سنجیدہ نہ رہ سکا تھا۔

''جہاں تک میرا خیال ہے''یہاں'' صارم کی دال گلنے والی نہیں ہے۔ اسے صبر سے بیٹھ جانا چاہیے۔'' تبریز نے خاصی سنجیدگی سے رائے دی تھی۔

''ہم نے پہلے بھی اسے وارننگ دی تھی، چلو میری جان! اپنے دل کو کچھ اس طرح تسلی دے دو۔

اے دل میرے سنبھل جا
اے دل میرے سنبھل جا
نہ ہو بے قرار ہمت نہ ہار
کیا تو نے پیار ہمت نہ ہار
اے دل میرے سنبھل جا

باسط ہاتھ لہرا لہرا کر گا رہا تھا۔ سب خوب ہنس رہے تھے۔ صارم کے ہونٹوں پر بھی دھیمی مسکراہٹ تھی۔ وہ دوستوں کی دل آزاری کے خیال سے مجبوراً بیٹھا تھا۔ ورنہ اسے یہ سب اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ خصوصاً ورشا کا یوں موضوع گفتگو بننا اسے ناگوار لگ رہا تھا۔ ایسا پہلی بار ہو رہا تھا۔ اس سے قبل اس کی زندگی میں جتنی لڑکیاں آئی تھیں ان سے ملاقات سے گزرنے والے وقت کے لمحے لمحے کی بات وہ ان کو بتاتا تھا۔ ان کے ساتھ مل کر انہیں بیوقوف بنانے پر قہقہے لگاتا تھا۔ ان لڑکیوں کے خلاف ان کے کوئی ریمارکس اسے کبھی برے نہیں لگے۔ مگر آج ورشا کا نام بھی ان کی زبان سے نکلتا ہوا اسے اشتعال دلا رہا تھا۔ حالاں کہ وہ اس کا ذکر بہت احترام سے کر رہے تھے مگر وہ خود پر قابو پانے میں مشکل محسوس کر رہا تھا۔

☆☆☆

صمد خان مودبانہ انداز میں ہاتھ باندھے، سر کو قدرے خم کیے شہباز خان کے سامنے کھڑا تھا۔ ان کے بلانے پر وہ حاضر ہوا تھا کیوں کہ وہ شمشیر خان کا ڈرائیور تھا۔ شمشیر خان کے ذاتی ملازم ان کے مخصوص ڈیرے ''اڈے'' پر رہتے تھے۔ انہیں بلا اجازت حویلی آنے کی اجازت نہ تھی۔ گزشتہ دو دن سے شمشیر خان گھر نہیں آیا تھا۔ گھر والوں کو مطلع کر کے جانا اس کی سرشت میں شامل ہرگز نہ تھا۔ وہ اپنی مرضی پر صرف اپنی اجارہ داری رکھتا تھا۔

''صمد خان!'' انہوں نے مسہری پر نیم دراز ہو کر اسے پکارا۔

''حکم خان!'' وہ کچھ آگے بڑھ کر مودب انداز میں گویا ہوا۔

''شمشیر خان کہاں ہے؟''

''خان! یہ نہ معلوم کریں۔'' اس کا انداز مودب، لہجہ سپاٹ تھا۔

''میرے سامنے نہیں کا مطلب جانتا ہے؟ کھال میں بھس بھروا کر چوک پر لٹکوا دوں گا۔''

''غلام حاضر ہے خان! کھال میں بھس بھروائیں یا ہڈیوں کی مالا بنا کر گلے میں لٹکوائیں غلام اف نہیں کرے گا مگر خان کے متعلق زبان نہیں کھول سکتا۔'' صمد خان کا لہجہ مضبوط تھا۔

''صمد خان! کہنے اور سہنے میں آسمان وزمین کا فرق ہوتا ہے۔''

''ہم چھوٹے خان کا وفادار ہے بڑے خان! اس کی خاطر سب کچھ سہے گا، مگر زبان نہیں کھولے گا۔ یہ ہمارا خان سے قول ہے اور صمد خان جان دے سکتا ہے مگر قول نہیں توڑ سکتا خان۔''

''جاؤ'' انہوں نے رسانیت سے اسے جانے کی اجازت دی تھی، وہ سلام کر کے چلا گیا تھا۔ ان کی آنکھوں میں آسودگی کے رنگ جھلملانے لگے۔ چہرے پر طمانیت وتقویت کی روشنی سی پھیل گئی تھی۔ بیٹے کے ملازم وفادار بہادر تھے۔ انہیں اطمینان ہو گیا تھا کہ شمشیر خان کا راز کبھی افشا نہیں ہو سکتا۔ صمد خان کو انہوں نے محض آزمایا تھا ورنہ شمشیر خان کہاں ہے اس کے ٹھکانے سے وہ واقف تھا۔ شہر میں کسی ہوٹل میں رقاصاؤں کی پارٹی آئی ہوئی تھی وہ دو دن سے وہیں تھا۔

''خان! آرام میں مخل تو نہیں ہوئی؟'' بھاری پردہ ہٹا کر گل خانم اندر داخل ہوئیں۔

''نہیں۔ آؤ بیٹھو گل۔'' وہ بہت خوش دلی سے مخاطب ہوئے تھے۔

''میں بیٹھنے نہیں آئی خان۔'' وہ سپاٹ وخشک انداز میں گویا ہوئیں۔

''گھبراؤ نہیں گل، جاناں کل تک کے لیے اپنے گاؤں گئی ہوئی ہے۔ تم اطمینان سے بیٹھ سکتی ہو۔'' اپنی دانست میں انہوں نے ان کے تکلف واجتناب کا حل پیش کیا تھا۔ مگر ان کی اس پیش کش نے انہیں اذیت سے دوچار کر دیا تھا۔ اپنی کم مائیگی اور اس کی برتری محسوس کر کے، اس کی غیر موجودگی میں شہباز خان کو ان کی ذات کا احساس ہوا تھا۔ اس کی موجودگی میں وہ اوجھل رہتی تھیں۔

''اس کی موجودگی وغیر موجودگی میرے لیے کوئی حیثیت نہیں رکھتی..... میں یہ پوچھنے آئی ہوں شمشیر خان کہاں ہیں؟'' کچھ توقف کے بعد وہ گویا ہوئیں۔

''کیوں؟ کوئی کام ہے کیا؟'' ان کے لہجے میں کچھ تاثر ایسا تھا جو انہیں چونکا گیا تھا مگر اپنی تہہ در تہہ طبیعت وسخت مزاجی کے باعث لہجے کو مطمئن وعام رکھا تھا۔

''ہاں..... یہ پچاس برس کا تعویذ ہے۔'' انہوں نے مٹھی میں بند کالی ڈوری میں پرویا ہوا سونے کا چھوٹا سا تعویذ ان کی پھیلی ہوئی کشادہ شفاف ہتھیلی پر رکھتے ہوئے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

''یہ..... یہ تعویذ تو شمشیر خان کا ہے جو پیر سائیں سے بنوا کر اس کے گلے میں ڈالا تھا۔ بچپن میں اکثر اس کے سرخ وسپید رنگ کے باعث نظر لگ جاتی تھی۔ جس سے وہ بے حد روتا تھا، پریشان کرتا تھا۔ تم خود ہی پیر سائیں سے تعویذ بنوا کر لائی تھیں اور اپنے ہاتھ سے اس کے گلے میں ڈالا تھا۔ پیر سائیں نے تاکید کی تھی تعویذ کبھی اس کے گلے سے نہیں اتارنا۔ بچپن سے آج تک وہی تعویذ اس کے گلے میں موجود رہتا ہے پھر کس طرح یہ

تعویذ اس کے گلے سے گر گیا؟ تمہیں کہاں سے ملا.....؟'' انہوں نے ہاتھ میں رکھے تعویذ کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ تعویذ درست تھا صرف اس کی ڈوری کا ذرا سا حصہ اس میں موجود تھا۔ ''گل! کہاں سے ملا یہ.....؟'' وہ انہیں خاموش وگم صم کھڑا دیکھ کر دوبارہ بولے۔

''کیا آپ کو یقین ہے خان، جہاں یہ تعویذ ہوگا، وہاں شمشیر خان کی موجودگی لازمی ہوگی؟'' وہ بغور ان کا رنگ بدلتا چہرہ دیکھتے ہوئے استفسار کرنے لگیں۔

''یہ کیسے بچگانہ سوال ہیں؟ ظاہر ہے جہاں یہ ہوگا وہاں شمشیر خان کی موجودگی لازمی ہے کیوں کہ یہ اس کے گلے میں موجود ہوتا ہے۔''

''آپ کو معلوم ہے نا خان، دو دن پہلے روزی خان کی بیٹی مری تھی؟''

''ہاں..... ہاں ہمیں معلوم ہے بلکہ ہمارے ملازموں نے ہی اس لڑکی کی لاش کھائی سے نکالی تھی۔ وہ اس میں گر کر ہلاک ہوگئی تھی۔ یہ اس لڑکی کی خوش قسمتی تھی یا اس کے ماں باپ کی جو وہ کم گہری کھائی میں گری تھی ورنہ یہاں تو ایسی ایسی کھائیاں ہیں جو بیک وقت کئی انسانوں کو گاڑیوں سمیت نگل لیتی ہیں اور نام و نشان نہیں چھوڑتیں۔ اس لڑکی کو قبر تو نصیب ہوگئی ورنہ تاحیات وہ دونوں بیٹی کو تلاش کرتے رہتے۔''

''میں آپ کو یہی بتانے آئی ہوں۔ روزی خان کی بیٹی مری نہیں بلکہ اسے مار کر کھائی میں پھینکا گیا تھا۔'' گل خانم کا لہجہ دھیما تھا جبکہ شہباز خان اس طرح چونکے تھے گویا بم بلاسٹ ہوا ہو۔

''یہ کس طرح ممکن ہے؟ دماغ درست ہے تمہارا.....؟''

''اسے جسمانی اذیتیں دینے کے بعد گلا دبا کر مارا گیا ہے۔''

''بکواس..... جھوٹ..... سب جھوٹ ہے یہ..... وہ کھائی میں گر کر مری ہے۔ اسے کون قتل کرسکتا ہے؟ عورت سے کسی مرد کی دشمنی نہیں ہوتی اس طرح۔ تم پاگل ہوگئی ہو۔''

خلاف عادت وہ بری طرح اشتعال میں آگئے تھے۔ ان کی نگاہیں گل خانم کو بری طرح گھور رہی تھیں۔

''نہ میں جھوٹ بول رہی ہوں نہ ہی بکواس کررہی ہوں۔ سچ بول رہی ہوں۔''

''کس بنیاد پر بول رہی ہو؟ کیا ثبوت ہے تمہارے پاس؟''

''اسے غسل میں نے دیا تھا۔'' وہ آہستگی سے بولیں۔ ''اور.....''

''تمہیں میں نے کتنی بار منع کیا ہے کہ ایسے کمیوں والے کام نہیں کیا کرو لیکن تمہاری سمجھ میں نہیں آتا اپنے ساتھ میری عزت بھی خاک میں ملاتی ہو۔ بند کردوں گا میں تمہارا گھر سے نکلنا۔''

جس راز کو چھپانے کے لیے انہوں نے پروگرام بنایا تھا وہ اسی طرح کھل رہا تھا۔ غصے وصدمے سے وہ بھول گئے تھے اپنا منصب، اپنا وقار، جاہل عام مردوں کی طرح چیخنے چلانے لگے تھے۔

''میری اس عادت نے آپ کی سرداری کی، آپ کے خاندان کی، آپ کے بیٹے کی لاج رکھ لی ہے۔ یہ تعویذ گل فشاں کی بند مٹھی سے نکلا ہے۔''

''جھوٹ۔ یہ کس طرح ممکن ہے؟ نہیں جھوٹ بول رہی ہو تم!'' وہ گویا انگاروں پر دوڑنے لگے۔

''خان! میں یہاں بحث کرنے نہیں آئی۔ شمشیر خان کو بلائیں۔ اس سے معلوم کریں اصل حقیقت کیا ہے۔ وہ لڑکی صرف روزی خان کی ہی نہیں، پوری وادی کی بیٹی تھی۔''

''شمشیر خان زمینوں کے کام سے دوسرے شہر گیا ہوا ہے۔ وہ آئے گا جب بات ہو گی۔ تب تک تم اپنی زبان بند رکھو گی۔ یہ بات صرف ہم دونوں تک محدود ہے۔ اگر..... کسی تیسرے کو معلوم ہوئی تو..... سوچ لینا گل! وہ تمہاری زندگی کا آخری دن ہو گا۔''

☆☆☆

''بیگم صاحبہ! مہمان آئے ہیں۔ انہیں میں نے ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا ہے۔'' رخشندہ بیگم ورشا کے پاس بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔ ملازمہ نے آ کر اطلاع دی۔

''اچھا۔ تم جا کر چائے کی تیاری کرو، ساتھ کچھ اسنیکس بھی بنا لینا۔ سنبل آپ جا کر اس کی کچن میں ہیلپ کریں میں مہمانوں کے پاس بیٹھتی ہوں۔ ورشا! آپ بھی آ جاؤ کمرے میں رہتے رہتے بور ہو گئی ہوں گی۔'' انہوں نے ہاتھ پکڑ کر اس سے محبت سے کہا۔

''چلیں آنٹی!'' وہ سفید و سیاہ شیشوں کی کڑھائی والے ٹائی اینڈ ڈائی سوٹ میں نکھری نکھری شگفتہ لگ رہی تھی۔ سر کے زخم ٹھیک ہو گئے تھے حالت اس کی اب بہتر تھی۔

''کہاں جا رہی ہو؟ جانتی ہو گی کے مہمان کون ہیں؟'' فارحہ سنجیدگی سے بولی۔

''کوئی غیر نہیں ہیں۔ ورشا بیٹا! آپ جانتی ہوں گی صارم خان کو.....؟ وہ تو آپ کے محسن ہیں۔ میں تو بار بار اللہ کا شکر ادا کرتے نہیں تھکتی کہ اس نے انہیں رحمت کا فرشتہ بنا کر بھیجا تھا ورنہ..... اس سے آگے کا تصور بھی محال ہے۔'' رخشندہ بیگم اس کا ہاتھ پکڑ کر بڑی محبت و اپنائیت سے آگے بڑھ رہی تھیں۔ وہ کشمکش و پیچ میں مبتلا تھا۔ کس طرح آنٹی سے ہاتھ چھڑا کر وہاں نہ جانے کا بہانہ کرے کیوں کہ یہ تو اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ آنٹی کا مہمان وہ شخص ہو گا جس کی پرچھائیں سے بھی وہ متنفر تھی۔ پچھلے ہفتے وہ ان کی غیر موجودگی میں آیا تھا۔ فارحہ نے کتنا اصرار کیا کہ وہ اس سے ملاقات کرے۔ وہ اس کی عیادت کی خاطر آیا ہے مگر اس نے سنی ان سنی کر دی تھی۔ فارحہ نے غصے میں جا کر سچ سچ بتا دیا تھا کہ وہ ان سے ملنا نہیں چاہتی۔ آج پھر وہ وارد ہوا تھا۔ کتنا بے حیثیت وڈھیٹ شخص تھا۔ آنٹی کی محبت کے آگے وہ کوئی مزاحمت نہ کر سکی۔ ڈرائنگ روم میں چلی آئی۔

''السلام علیکم۔'' انہیں دیکھتے ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ تہذیب و شائستگی سے سلام کیا تھا۔ رخشندہ بیگم نے سلام کا جواب بہت تپاک سے دیا۔

''کیسے ہیں بیٹا آپ؟'' وہ صوفے پر براجمان ہوتی ہوئی اس سے مخاطب ہوئیں۔

''دعائیں ہیں آنٹی آپ کی۔ یہاں سے گزر رہا تھا سوچا آپ سے ملتا ہوا جاؤں۔''

''کیوں نہیں! آپ کا اپنا گھر ہے۔ ہر وقت اس گھر کے دروازے آپ کے لیے کھلے ہیں۔''

''شکریہ آنٹی! آپ کیسی ہیں مس ورشا؟'' اس کی پُرشوق نگاہوں نے فوراً ہی مگر احتیاط سے اسے اپنے حصار میں لے لیا تھا۔

''اللہ کے بعد آپ کی مہربانی سے بیٹا ورشا کی اللہ نے جان بچائی ہے۔ آپ کے انکل بھی آپ کو یاد کرتے ہیں اور کہتے ہیں اس دن آپ مدد نہ کرتے تو نہ معلوم کیا ہوتا؟'' ورشا کے بجائے رخشندہ بیگم بولنے لگی تھیں۔ ان کی یہ حرکت بے اختیاری تھی۔ مگر ورشا کو اس دم ان کا بولنا بہت بھایا۔ اس کی نگاہوں کی تپش وہ نگاہیں جھکانے کے باوجود محسوس کر رہی تھی اور اندر ہی اندر کھول رہی تھی۔ آنٹی اس کی کیفیت سے بے خبر باتوں میں مشغول تھیں۔

''فارحہ چائے لے کر نہیں آئی ابھی تک؟ میں دیکھ کر آتی ہوں۔'' رخشندہ بیگم رسٹ واچ دیکھتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئیں۔

''میں دیکھتی ہوں آنٹی!'' وہ سرعت سے اٹھ کھڑی ہوئی اور ہوا کی طرح کمرے سے نکلی تھی۔

''بہت پیاری بچی ہے۔'' وہ مسکرا کر بیٹھ گئی تھیں۔ صارم خان کی نگاہوں سے شوخ جھلملاتے رنگ یکلخت غائب ہو گئے تھے۔ اس نے پہلی بار ورشا کے توہین آمیز رویے سے اپنی ہتک محسوس کی تھی۔ اس کی خاطر وہ اپنا وقار و مرتبہ بھول بیٹھا تھا۔ خلاف سرشت اس کی خوب صورتی کے سحر میں گم ہو کر انا و خودداری بھول چکا تھا۔ اس ساعت اس کی مردانگی وحمیت پر زبردست تازیانہ لگا تھا۔ اس کا دل چاہا، اس مغرور و بے احساس لڑکی کے وجود پر چھائی تفاخر و تنفر کی گرد کو لمحے بھر میں جھاڑ کر رکھ دے۔ اس کے اندر لاوا سا کھولنے لگا تھا۔

☆☆☆

بابو جی دھیرے چلنا پیاں (پیار) میں ذرا سنبھلنا

بلے دھوکے ہیں، بلے دھوکے ہیں اس راہ میں

صارم! نے خشمگیں نگاہوں سے حسب عادت گنگناتے ہوئے فدا حسین کو دیکھا جو فرنیچر کی ڈسٹنگ کرتے ہوئے مگن تھا۔

یہ محبت ہے او بولے بالے کرنا دل کو گموں (غموں) کے حوالے

جام الفت کا نازک بہت ہے آ کر ہونٹوں پہ ٹوٹیں گے پیالے

بلے دھوکے ہیں اس راہ میں......

''شٹ اپ فدا حسین! کبھی خاموشی سے بھی کام کر لیا کرو۔'' پہلی بار صارم کو اس پر غصہ آیا تھا۔ اس نے سختی سے اسے سرزنش کی تھی۔

''کیا ہوا صاحب! کیا گانا پسند نہیں آیا؟'' فدا حسین نے حیرانگی سے دریافت کیا۔

''کبھی حمد یا نعت بھی پڑھ لیا کرو۔ ہر وقت شیطان بنے رہتے ہو۔'' خلاف معمول آج صارم کے مزاج کی گرمی عروج پر پہنچی ہوئی تھی۔ فدا حسین نے بغور اس کی طرف دیکھا۔ اس کے بگڑتے ہوئے تیور، کھنچے ہوئے ابرو دیکھ کر وہ خاموشی سے وہاں سے کھسک گیا۔

''کسی کا غصہ بے چارے فدا حسین پر کیوں نکال رہے تھے؟'' تولیے سے بال رگڑتا ہوا سریہ باتھ روم سے برآمد ہوا تھا اور خاصی معنی خیزی سے اس سے مخاطب ہوا۔

''یہ 'کسی' سے کیا مراد ہے تمہاری......؟ کتنی مرتبہ کہا ہے مجھ سے واضح بات کیا کرو۔''

''وہی جس کی بے رخی و بے اعتنائی نے تم جیسے خوش مزاج بندے کو سخت مزاج بنا دیا ہے۔''

''سبریز! میں کسی کا نام سننا پسند نہیں کروں گا۔ بہتر ہے خاموش رہو۔''

چپ رہے گی زبان خنجر جو
لہو پکارے گا آستین کا

سبریز نے شرارتاً شعر پڑھا۔

''میں نے کسی کا خون نہیں کیا۔ تم بھی پہلے اپنی آستین تلاش کرو۔'' جواباً صارم نے اس پر لطیف سا طنز کیا تھا۔

''ویری نائس! اچھا جوک ہے۔'' سبریز بے ساختہ قہقہہ لگا بیٹھا تھا۔

''کل بھی دیدارِ یار میں ناکام لوٹے ہو؟ جو چہرے پر حزن و ملال کے رنگ جم کر رہ گئے ہیں۔''

''پلیز سبریز! میں بہت ڈسٹرب ہوں۔'' وہ اس کی بات قطع کر کے سنجیدگی سے گویا ہوا۔

''کیوں......؟ یہی معلوم کرنا چاہتا ہوں۔''

''تم شاپنگ کرنے نہیں چلو گے......؟'' صارم نے موضوع تبدیل کرتے ہوئے دریافت کیا۔

''ابھی نہیں۔ کچھ دیر آرام کرنا چاہتا ہوں۔'' سبریز نے اسے موضوع بدلتے دیکھ کر خاصے ناراضگی بھرے انداز میں کہا۔

''یار......ناراض ہو گئے؟'' صارم نے مسکراتے ہوئے جھک کر اس کے چہرے کو دیکھا۔

''ناراضگی......؟ ہونہہ......تمہیں کیا پروا......؟''

''مجھے ہی تو پروا ہے ساری۔'' اس نے سبریز کے گلے میں بازو حائل کر کے محبت سے کہا۔

''ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا کہ......تم نے مجھ سے اپنی کوئی پرابلم شیئر نہ کی ہو۔ پھر اب کیا ہوا......؟ کل شام سے الجھے الجھے سے پریشان لگ رہے ہو۔ پوچھنے کے باوجود نہیں بتا رہے کہ......مسئلہ کیا ہے آخر؟'' سبریز اس کے قریب بیٹھ کر گویا ہوا۔

''کیا بتاؤں برادر! میں خود ابھی تک سمجھ نہیں سکا ہوں۔ بلکہ لگ رہا ہے پہلے میں اپنے آپ سے بھی ناواقف تھا۔''

''اب واقف ہو گئے ہو......؟''

''نہیں......پرابلم تو یہی ہے۔''

''سنو! میری جان، تم جس راہ پر گامزن ہو ایسے مسافروں کو کبھی منزل نہیں ملتی۔ محبت کوئی بازار میں بکنے والی چیز نہیں ہے اور نہ کوئی ایسی شے ہے جو زبردستی چھین لی جائے۔ یہ تو وہ چشمہ ہے جو دل کی زمین سے پھوٹتا ہے۔ بنجر جذبوں و خشک احساسات کو سیراب کرڈالتا ہے۔ یکطرفہ محبت ہمیشہ لاحاصل ہوتی ہے۔ کیوں خود کو روگ لگانا چاہتے ہو۔ میری مانو، جتنا بھی سفر طے کر چکے ہو لاحاصل منزل کی سمت جانے کا، واپس لوٹ آؤ۔ تمہارے آگے پوری کائنات پڑی ہے اسے تسخیر کرو، ابھی سے کہاں تھک کر بیٹھ رہے ہو۔ راستے میں ایسے ''شجر'' نہ معلوم ابھی کتنے آئیں گے؟ تمہیں

مسلسل سفر کرتا ہے۔'' سبریز خان کل سے اس کی پژمردگی و مرجھائی کیفیت دیکھ رہا تھا اور سمجھ گیا تھا ورشا کو دیکھنے گیا ہوگا۔ اس نے حسب عادت ملنے سے انکار کر دیا ہوگا۔ واپسی میں اس کی یہی کیفیت ہوتی تھی۔

''حسن کہیں بھی، کسی بھی روپ میں ہو میں اس کا شیدائی ہوں۔ خوب صورتی مجھے اس طرح اپنی طرف کھینچتی ہے جیسے لوہے کو مقناطیس۔ اس کے سحر طراز حسن اور اپنے حسن بے مثال نے بے پروائی و بے اعتنائی کی ادائیں مجھے بے قرار کر گئی تھیں مگر اب ایسا نہیں ہوگا سچائی اس دور میں کسی کو راس نہیں آتی جن سے میں جھوٹ بولتا تھا، جھوٹی محبت، مصنوعی عشق کے پیمان باندھا کرتا تھا وہ حقیقت سمجھتے تھے اور اب سچ بول رہا ہوں تو پذیرائی کی بجائے بے عزتی، تذلیل مل رہی ہے۔''

''یہ دستور دنیا ہے جسے ہم چاہتے ہیں وہ ہمیں نہیں ملتا جسے ہم کھونا چاہتے ہیں وہ قدم قدم پر ہماری راہ میں حائل ہوتے ہیں۔''

''نہیں سبریز! اگر مجھ جیسا بندہ کچھ حاصل کرنا چاہے، کبھی ناکام نہیں ہوسکتا مگر یہاں بات جذبوں کی صداقت اور دل کی بغاوت کی ہے جو مجھے کمزور بنا گئی ہے جس کے باعث میں اپنی فطرت کے برعکس چل رہا ہوں۔ لیکن یار...... !کل ورشا کی ایک نظر نے مجھے میری نگاہوں میں گرا دیا ہے۔ اس نے زبان سے کچھ نہ کہا۔ مگر اس کی ایک نظر میں کیا کچھ نہ تھا۔ حقارت، نفرت، تذلیل و تحقیر کے چھینٹے چلاتے ایسے رنگ تھے کہ میں لمحے بھر میں زخم زخم ہو گیا۔''

''ضارم خان! اپنے وقار، مردانگی، انا کو کیوں مجروح کرتے ہو؟ اس لڑکی پر دنیا ختم تھوڑی ہوگئی۔ حسن جگہ جگہ بکھرا پڑا ہے۔ سمیٹ سمیٹ کر تھک جاؤ گے۔ مت برباد کرو خود کو......'' سبریز خان مشفقانہ انداز میں اسے سمجھا رہا تھا۔ وہ ضارم کی رگ رگ سے واقف تھا۔ وہ ضدی و جنونی شخص تھا۔ اس کی فطرت کے یہ نمایاں پہلو اس کے ہر عمل میں سرگرم عمل رہتے تھے۔ اسے اس کی ورشا کو چاہنے کی جذباتیت میں صداقت دیکھی تھی۔ اگر وہ اسے نہ ملی تو وہ اس کی چاہ میں جوگ بھی لے سکتا تھا کیوں کہ اس کی طبیعت میں ہی انتہا پسندی و خود کو منوانے کی زور آوری شامل تھی۔

''ہا...... ہا...... ہا...... تم! کیا سمجھتے ہو؟ وہ مجھے نہ ملی، میں کوئی بنجارہ بن جاؤں گا یا صحراؤں میں لیلیٰ...... اور سوری ورشا...... ورشا پکارتا پھروں گا؟ نہیں ہرگز نہیں۔ میں ایسا کچھ نہیں کروں گا وہ اگر بے اعتنائی، بے گانگی و بے رخی میں حد سے گزر سکتی ہے تو میں بھی ہٹ دھرمی، ضد و انا پرستی کے جھنڈے کو بلند ہی رکھوں گا۔'' وہ اپنے سابقہ ہشاش بشاش موڈ میں آ گیا تھا۔

''یعنی پھر بھی نہیں چھوڑو گے......؟'' سبریز منہ بنا کر بولا

''مجھے اس کو حاصل کرنا ہے۔ یہ میری ضد ہے اب...... چاہے مجھے اس کے لئے کچھ بھی قربان کرنا پڑے۔'' وہ پر عزم لہجے میں بولا۔ اس کی نیلی آنکھوں میں کچھ سرخی چھا گئی تھی۔ سبریز نے طویل سانس لیا تھا۔ اس کی طبیعت سے اسے ہمیشہ اختلاف رہتا تھا۔

☆☆☆

شہباز خان بے قراری سے اپنے خاص کمرے میں ٹہل رہے تھے۔ ان کے چہرے پر گہری سوچ کی پرچھائیاں تھیں۔ بے اختیاری انداز میں ان کی نگاہیں دروازے کی سمت اٹھ رہی تھیں۔ براؤن عمدہ لکڑی کا منقش و بھاری دروازہ ہنوز بند تھا اور ان کی برہمی میں مسلسل اضافہ کر رہا تھا۔

جب سے گل خانم انہیں شمشیر خان کا تعویذ دے کر گئی تھیں اور ساتھ ہی جتا کر گئی تھیں کہ انہیں یقین ہے، روزی خان کی بیٹی گل فشاں ہلاک نہیں ہوئی اسے گلا دبا کر مارنے کے بعد کھائی میں پھینکا گیا ہے اور اس کی مٹھی سے ملنے والا شمشیر خان کا تعویذ ثبوت پیش کرتا ہے۔ شمشیر اس جرم میں شامل ہے۔ ان کی بات حقیقت تھی۔ شمشیر کی فطرت سے واقف ہونے کی وجہ سے انہوں نے یہ جانتے ہوئے بھی بالکل درست سچائی بیان کی تھی جو وہ کس طرح مان سکتے تھے۔ اپنے بیٹے پر انگشت نمائی وہ کبھی گوارا نہیں کر سکتے تھے۔ گل خانم کو ڈرا دھمکا کر انہوں نے وقتی طور پر خاموش کر وا دیا تھا اب وہ جلد از جلد شمشیر خان سے ملنا چاہتے تھے تاکہ اس کی بے وقوفی کا اسے احساس دلا کر تعویذ کے بارے میں کوئی بہانہ بنا کر گل خانم کے سامنے پیش کر سکیں تاکہ یہ معاملہ ہمیشہ کے لیے دب جائے۔ صمد خان کو انہوں نے فوراً شمشیر کو بلانے کا حکم دیا تھا اور کچھ اس انداز میں دیا تھا کہ صمد خان فوراً اسے بلانے روانہ ہو گیا تھا۔ کئی گھنٹے گزر جانے کے باوجود شمشیر کی واپسی نہ ہوئی تھی۔ قبل اس کے کہ وہ برداشت کی حدیں عبور کر کے اس کے پاس جانے کے لیے نکل کھڑے ہوتے۔ دروازہ کھلا اور وہ سلام کرتا ہوا اندر داخل ہوا۔

''کہاں اتنے مصروف رہنے لگے ہو خانان! باپ کو بھی انتظار کی سولی پر لٹکنا پڑتا ہے باپ میں اور بازاری عورت میں کچھ تو فرق رکھ......''

''آپ کو ایسا کیا کام پڑ گیا بابا جان! جو آپ نے میرے لیے کنوئیں میں بانس ڈلوا دیے۔'' دبیز قالین پر بھی اس کے قدموں کی دھمک گونج اٹھی تھی۔ لہجہ اس کا خاصا ناخوش گوار تھا۔

''کہاں گئے تھے؟'' انہوں نے اس کی لہورنگ آنکھوں میں دیکھتے ہوئے گمبھیر لہجے میں پوچھا۔

بلیک کاٹن کے کلف شدہ سوٹ پر واسکٹ و آف وائٹ گرم چادر اپنے مخصوص انداز میں لپیٹے، پاؤں میں بلیک لیدر کی مضبوط و بھاری چپل پہنے، وہ کسی مضبوط و بلند چٹان کی طرح ان کے سامنے ایستادہ تھا۔ اس کے چہرے کے ہر نقش سے بے قراری جھنجلاہٹ عیاں تھی۔

''کسی کام سے گیا تھا؟ گاؤں سے باہر۔'' وہ اعتماد سے گویا ہوا۔

''بچے! جوانی ہماری بھی اسی 'کام' میں گزری ہے مگر ہم نے کبھی اپنی ذات پر اس کا ٹھپہ نہیں لگنے دیا۔ اتنی نفاست سے اپنے کام لوگوں سے چھپائے ہیں۔''

''میں نے کیا کر دیا......؟'' اس نے بازکین شانے پر جھٹکے سے چادر ڈالتے ہوئے استفسار کیا۔

''تمہارے گلے کا تعویذ کہاں ہے؟'' شہباز خان طنزاً گویا ہوئے۔

''وہ...... گر گیا ہوگا کہیں......'' اس نے پہلے گلے میں تعویذ دیکھا پھر اس کی غیر موجودگی محسوس کر کے بے پروائی سے کہنے لگا۔

''کہیں...... ہم شمشیر خان...... بار بار تمہیں سمجھا چکا ہوں۔ غافل مت رہا کرو اس قدر، غفلت بسا اوقات ہلاکت کا باعث بھی بن جایا کرتی ہے۔'' وہ پر طیش انداز میں گرجے تھے۔

''بابا جان! آپ سے میں بھی بار بار کہہ چکا ہوں میری سمجھ میں 'باریک' باتیں نہیں آتیں۔ مجھ سے سیدھی بات کیا کریں۔'' جواباً وہ بھی کڑوے انداز میں گویا ہوا۔

''عقل کو استعمال کرو تو سمجھ میں آ گئیں۔ یہ رہا تمہارا تعویذ۔'' وہ غصے سے بولتے ہوئے ہاتھ میں پکڑا تعویذ اسے دکھاتے ہوئے بولے۔

''ارے یہ تو میرا ہی تعویذ ہے۔ آپ کو کہاں سے ملا؟'' وہ اسے دیکھتے ہوئے قدرے حیرانگی سے استفسار کرنے لگا۔

''شکر ہے۔ کوئی تو سوال تم نے عقل مندی کا کیا۔ جاننا چاہتے ہو تمہارا تعویذ کہاں سے ملا؟'' شہباز خان اس کی نگاہوں میں دیکھتے ہوئے سرد طنزیہ لہجے میں گویا ہوئے۔

''کہاں سے ملا؟ بابا جان!'' وہ ذی فہم و دانش مند تھا۔ بھلا کس طرح باپ کے بگڑے ہوئے تیور اور لبوں سے نکلتے انگارے نما لفظوں کی تپش نہ محسوس کرتا۔

''روزی خان کی بیٹی.... گل فشاں کی مزدہ مٹھی سے....''

''کس کو....؟ بابا جان!'' شمشیر خان چونک کر بولا یہ تو اس کے گمان میں بھی نہ تھا کہ تعویذ گل فشاں کی مٹھی سے برآمد ہو سکتا ہے۔

''گل خانم کو.... وہ اس راز سے واقف ہو گئی ہے اور ایسی باتیں عورتوں کو معلوم نہیں ہونی چاہئیں۔ تم اس کو کوئی بھی بہانہ کر دینا۔ ورنہ....''

''کیا کر سکتی ہیں ادے؟ مجھے بزدلی کا سبق نہیں پڑھایا کریں بابا جان!''

''پھر تم نے ضد کی، بات کو سمجھا کرو خانان؟''

''کہہ دیجیے میرے گلے سے گر گیا۔ مجھے کیا معلوم؟ اس کے پاس کس طرح پہنچا۔''

وہ مسئلہ حل کر کے جا چکا تھا۔ شہباز خان کے چہرے پر اطمینان کے تاثرات چھا گئے۔ گل خانم کے سامنے بات وہ بھی بنا سکتے تھے مگر شمشیر خان کی غیر موجودگی میں انہیں خطرہ تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو وہ کچھ کہیں اور شمشیر خان کچھ اور بتائے۔ اب بات ایک ہو گئی تھی، دولت، عزت و طاقت کی بہتات نے ان کے تمام نیک و اچھے احساسات کو مردہ کر ڈالا تھا۔ وہ دو چہرے رکھنے والے منافقانہ ذہنیت کے مالک تھے۔ لوگوں کے لیے بظاہر بہت نیک، ہمدرد و مشفق لیکن دل ان کا سیاہ کاریوں سے آلودہ تھا۔

☆☆☆

''سنبل! حمزہ بھائی سے اس دن کیا بات ہوئی تھی؟ ورشا کے چکر میں پڑ کر میں تو بھول ہی گئی تھی۔ بتاؤ نا'' فارحہ کتاب ایک طرف رکھ کر سنبل سے مخاطب ہوئی جو ورشا کے ساتھ بیٹھی نوٹس مکمل کر رہی تھی۔

''کچھ نہیں۔'' سنبل کے چہرے پر شفق کے رو پہلے رنگ یکدم ہی اتر آئے تھے۔

''کچھ تو.... بات ہوئی ہے۔ جبھی آج کل بڑی کھلی کھلی نظر آ رہی ہو۔'' فارحہ ورشا کی بات قطع کر کے ایک ادا سے بولی۔ تینوں کا مشترکہ قہقہہ کمرے میں گونج اٹھا تھا۔

''پلیز سنبل بتاؤ نا؟ کس طرح حمزہ بھائی نے معافی مانگی۔ کیا کیا کہا اور کس انداز میں کہا کہ تم نے انہیں معاف کر دیا۔'' فارحہ بضد تھی۔

''نوٹس بنانے دو۔ بکواس مت کرو۔'' سنبل نے مسکراہٹ دبا کر کہا۔

''چھوڑو۔۔۔ فاری! کیوں اس کے سیکرٹ معلوم کرنا چاہتی ہو۔''

''ارے واہ! ایسے ہی چھوڑ دوں؟ وہ جو حمزہ بھائی نے کال کر کر کے ہمارا دماغ خراب کر دیا تھا اور ان محترمہ نے جو فضول کی ٹینشن گھر میں پھیلا رکھی تھی وہ بھی تو سیکرٹ رکھنا چاہیے تھا۔'' فارحہ چٹک کر بولی۔

''دکھ اگر اپنوں سے نہیں کہے جائیں گے تو غیروں سے بیان کیے جائیں گے؟'' سنبل، ورشا کو آنکھ سے اشارہ کر کے فارحہ سے بولی۔

''اوہو۔۔۔۔ اپنے کیا فالتو ہوتے ہیں؟ صرف دکھ و تکلیف محسوس کرنے کے لیے؟''

''فالتو تو نہیں۔۔۔ اپنے ہوتے ہیں۔'' سنبل شوخی سے گویا ہوئی۔

''سنبل! اب تم زیادتی کر رہی ہو۔ فارحہ نے تمہاری جتنی ہیلپ کی ہے اس سے میں متاثر ہوئی ہوں۔ تمہیں اب اسے بھی بتا دینا چاہیے۔''

''مجھے فخر ہے ورشا، فارحہ مجھ سے اتنی محبت کرتی ہے دراصل فاری، میرے اور حمزہ کے درمیان جو مس انڈراسٹینڈنگ ہوگئی تھی اس کے باعث ہی ہم دونوں میں دوری آئی تھی۔ حمزہ نے اصل وجوہات بتادی ہیں ہم دونوں ہی خواہ مخواہ بے وقوف بن گئے تھے اتنا وقت برباد کر ڈالا۔''

''اگر تمہیں اتنی آسانی سے راضی ہوجانا تھا تو کیوں ہمیں بے وقوف بنایا؟''

''تمہیں خوشی نہیں ہورہی؟ یہ معاملہ تو سلجھا۔'' ورشا نے حیرانگی سے کہا۔

''ہم تو بے وقوف بنائے گئے ہیں اور بے وقوف بن کر کون خوش ہوسکتا ہے۔''

''کیا کہہ رہی ہو؟ تم دونوں کی ہی تو خواہش تھی میں انا پرست نہ بنو۔ اب میں نے ایسا ہی کیا تو تم تب بھی ناراض ہو۔''

''آنے دو ذرا حمزہ بھائی کو۔ ان سے پوچھوں گی۔ پہلے تو ہم یاد آرہے تھے اور دوستی کرتے وقت پوچھا بھی نہیں بلکہ ہم سے پہلے ہی وہاں سے چلے آئے تھے۔''

''انہیں دفتر میں کوئی ضروری کام تھا۔'' سنبل مسکرا کر بولی۔

''بس خاموش رہو۔ زیادہ حمایتی نہ بنو وہ جب تک ہمیں زبردست قسم کی ٹریٹ نہ دیں گے، تب تک ہم انہیں معاف نہیں کریں گے۔ کیوں ورشا!''

''لیس۔۔۔۔ یو آر رائٹ۔'' ورشا ہنستی ہوئی اثبات میں گردن ہلانے لگی۔

''اوکے، یہ تمہارا معاملہ ہے۔ میں اس میں دخل نہیں دوں گی۔ فی الوقت پارٹی میں چلنے کی تیاری کرو۔ ممی وہاں پپا کے ساتھ بوتیک سے پہنچ جائیں گی۔'' سنبل، پین ہولڈر میں رکھ کر کتابیں فائلیں ریک میں رکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

''میری طرف سے آنٹی انکل سے سوری کر لینا ڈیئر!''

''تم کیوں نہیں چل رہی ہو؟ ممی پاپا نے بہت اصرار کیا تھا تمہیں ساتھ لانے پر۔ تمہیں ضرور چلنا ہے۔'' فارحہ فیصلہ کن لہجے میں بولی۔

''تمہیں معلوم ہے، گاؤں سے آدمی آیا ہے۔ وہ کل واپس چلا جائے گا۔ میں چاہتی ہوں گھر والوں کے لیے کچھ گفٹس بھیج دوں۔ سجادیہ نے کچھ کتابوں کی فرمائش بھی لکھی ہے۔ وہ بھی لینی ہیں۔''

''سجادیہ نے کتنی کلاسیں پڑھی ہیں؟ آئی مین وہ اسکول کالج وغیرہ گئی ہے؟''

''نہیں۔ مجھ سے پہلے قبیلے کی لڑکیوں کا خواب رہا تھا اسکول وکالج۔ بلکہ کچھ تو ان ناموں سے بھی قطعی نابلد تھیں۔ میری دونوں بہنیں جو بڑی تھیں وہ بھی علم سے نابلد تھیں اور اپنی اس لاعلمی ومحرومی کے باعث جاہلیت کی بھینٹ چڑھ گئیں۔''

''کیا..... مطلب؟'' ایسے سنجیدہ وماضی کی گم گشتہ راہوں میں بھٹکتے دیکھ کر وہ حیرانگی سے گویا ہوئی تھیں۔

''اوہ..... کچھ نہیں۔ سجادیہ مجھ سے سات سال بڑی ہے۔ شہروز لالہ کو دیکھ کر اسے کتابوں وقلم سے آشنائی پیدا ہوئی۔ اس نے چھپ کر لالہ کی کتابیں وقلم استعمال کرنا شروع کیے۔ ایک دن لالہ نے اس کی چوری پکڑ لی۔ اس کی محنت وجذبہ دیکھتے ہوئے انہوں نے اسے پڑھانا شروع کر دیا۔ گھر والوں سے چھپ کر۔ یوں لالہ کی محنت ومہربانی کے باعث وہ تعلیم یافتہ تو ہوگئی مگر اسکول یا کالج کا کوئی سرٹیفکیٹ حاصل نہ کرسکی۔''

''میرے خیال میں ذہانت ولیاقت سرٹیفکیٹ کی محتاج ہوتی بھی نہیں ہے۔ شہروز لالہ شمشیر خان، لالہ سے بہت مختلف نظر آرہے ہیں؟'' سنبل نے کھڑے ہوتے ہوئے پوچھا۔

''بہت..... بہت زیادہ۔ ان کی وجہ ہی سے میں یہاں نظر آرہی ہوں۔ ادے نے سامان بھیجا ہے۔ کل دکھاؤں گی۔ تم تیاری کرو، میں مارکیٹ کا چکر لگا آؤں۔''

''او کے کل یونی ورسٹی بھی چلنا ہے۔ آج آخری چھٹی تھی۔ سنبل اور فارحہ تیاری میں لگ گئی تھیں۔ اس نے سجادیہ کی بھیجی ہوئی لسٹ پرس میں رکھی اور انہیں خدا حافظ کہتی ہوئی باہر نکل آئی۔ جہاں ڈرائیور اس کا منتظر تھا۔

☆☆☆

آقا تا سب ہے تو رب! یا

داتا تا سب مالک تا سب

''ارے بھئی! یہ چینل کیوں بدل گیا؟ جب سے آیا ہوں حمد اور نعتیں سنائی دے رہی ہیں۔ کیا ماجرا ہے بھیا؟'' آفتاب نے حیرانگی سے باسط سے دریافت کیا۔

پیدا تو انسان کیا نے تو

پیدا تو حیوان کیا نے تو

''او بھائی! تجھے بھی اس نے پیدا کیا ہے لیکن بتا تو سہی آخر ہوا کیا ہے جس نے تجھے مسلمان ہونے کا احساس دیا؟'' آفتاب کھلکھلا کر گویا ہوا۔

''ایسی بات نہیں بولو آفتاب صاب! ہم مسلمان ہیں۔ اس بات تا ہمیں پہلے تے پتا ہے۔''

''پھر اب کیوں مسلمان...... مسلمان سا لگ رہا ہے میری جان!''

''اب......؟ اتھا مذاق کر لیتے ہو آپ ساب!'' وہ ناراضگی سے گویا ہوا۔

''ہیلو ٹنکی! کیا ہو رہا ہے؟'' صارم ان کے نزدیک بیٹھتا ہوا بولا۔

''دیکھو...... میں کتنی مرتبہ کہہ چکا ہوں اس واہیات نام سے نہ پکارا کرو۔'' آفتاب اسے گھور کر منہ پھلا کر بولا۔

''بیچارے! سچ سے کبھی نہیں بھاگنا چاہیے۔'' باسط ہنستا ہوا بولا۔

''او ہوئے! ایک پسلی کے مالک، میرے سے ٹکر مت لیا کر۔''

''تجھ سے تو بہتر ہوں۔ گوشت کے پہاڑ سے۔'' باسط نے اکڑ کر کہا۔

''اتنامت اکڑ...... ورنہ یہ جو پونی پسلی ہے اس سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے گا۔''

''اوہ...... گاڈ! آپ لوگ بالکل بچوں کی طرح لڑتے ہیں۔'' سبریز ان کے درمیان بیٹھتا ہوا مسکرا کر گویا ہوا۔ فدا حسین انہیں کافی سرو کر رہا تھا۔

''سنا ہے۔ آپ جلد گاؤں جانے والے ہیں۔ کچھ دن اور ٹھہر جاتے۔'' آفتاب کافی سپ کرتا ہوا سبریز سے مخاطب ہوا۔

''رک تو میں مزید کچھ دن اور جاتا مگر گاؤں سے بار بار بابا جانی کی کالز آ رہی ہیں۔ وہاں زمینوں پر بابا کو پریشانی ہو رہی ہے۔ میرا جانا ضروری ہے۔''

''کب تک جانے کا ارادہ ہے؟'' باسط نے پوچھا۔

''پرسوں یعنی منڈے کو۔ آپ لوگ آئیں گے نا؟'' سبریز پرخلوص انداز میں گویا ہوا۔

''آنے کو تو بہت دل کرتا ہے مگر سنا ہے وہاں اسلحے کا آزادانہ استعمال ہوتا ہے؟''

''آپ اسلحے سے خوف زدہ مت ہوں باسط! یہ چیزیں تو اس قدر عام ہو چکی ہیں کہ آپ کو ہر جگہ مل جائیں گی۔ کیا کراچی میں اسلحے کا استعمال نہیں ہوتا؟''

''ہوتا ہے۔ لیکن اس جگہ جہاں ہم نہیں ہوتے۔'' آفتاب نے بے ہنگم قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

''شاپنگ کرنے نہیں چلنا ہے؟'' صارم نے رسٹ واچ دیکھتے ہوئے سبریز سے مخاطب ہو کر کہا۔

''چلتے ہیں پھر ٹائم نہیں ملے گا۔'' سبریز فوراً کھڑا ہوا تھا۔

''آپ دونوں نہیں چلیں گے؟'' باسط اور آفتاب کو وہیں براجمان دیکھ کر سبریز نے پوچھا۔

''نہیں یار! ہم یہیں انتظار کریں گے آپ دونوں کا۔'' آفتاب لیٹتے ہوئے بولا۔

☆☆☆

بازار کی گہما گہمی اور رونق عروج پر تھی۔ اس نے بے تحاشا چیزیں سخاویہ اور ادے کے لیے خرید ڈالی تھیں۔ پرفیومز، جیولری، کاسمیٹکس، چوڑیاں اور کئی سوٹ سخاویہ کے لیے ریڈی میڈ لیے تھے۔ ادے کے لیے شالز اور چکن کے دو سوٹ کا کپڑا خریدا تھا۔ سخاویہ کے لیے گولڈن و میرون اور بلیک کھسے بھی خرید لیے تھے۔ پہلی بار وہ ان کے لیے شاپنگ کر رہی تھی۔ بے پناہ مسرت، شوق و انبساط کے جذبات نے اسے بہت پرجوش کر دیا تھا۔ جو چیز بھی اسے پسند آتی وہ فوراً خرید رہی تھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا پوری مارکیٹ ہی خرید کر ان کو پہنچا دیں۔ ڈرائیور ساتھ تھا، وہ پیکٹ اٹھا اٹھا کر کار میں رکھ کر آرہا تھا۔ وہ جب سے حصول تعلیم کے لیے کراچی آئی تھی شمشیر خان نے اس کا گھر سے اور گھر والوں کا اس سے رابطہ بالکل منقطع کر رکھا تھا۔ اس معاملے میں بابا جان نے بھی خاموشی اختیار کر رکھی تھی۔ اس کے اکاؤنٹ میں پیسہ پابندی سے جمع ہو رہا تھا اور اسے خرچ کرنے پر کوئی پابندی نہ تھی۔ وہ صرف اپنوں کی محبت، اپنوں کے قرب کو ترسا دی گئی تھی۔ اتنے عرصے بعد سخاویہ کا چھوٹا سا محبت نامہ اسے سرشار کر گیا تھا۔ وہ پھر سے جی اٹھی تھی۔ حالاں کہ سخاویہ نے بار بار سختی سے منع کیا تھا کہ وہ چند کتابوں کے علاوہ اور کچھ نہ بھیجے مگر وہ جیسے دیوانی ہو گئی تھی۔

''بی بی جی! کچھ باقی رہ گیا ہے کیا.....؟'' ڈرائیور جو کار سے دکانوں کے چکر لگا لگا کر تھک گیا تھا۔ بظاہر ادب سے بولا تھا مگر اس کے لہجے میں پنہاں تھکن و اکتاہٹ ورشا نے محسوس کر لی تھی۔ اس نے لال نوٹ اس کی طرف بڑھایا کہ وہ چائے پی کر آجائے۔ اتنے میں وہ کچھ سوٹ اور لے لے۔ نوٹ پکڑ کر ڈرائیور کی باچھیں کھل اٹھی تھیں۔ تمام تھکاوٹ دور ہو گئی تھی۔

وہ سامنے نظر آتے بوتیک میں داخل ہو گئی۔ وہاں سے اس نے فارحہ، سنبل، سخاویہ اور اپنے لیے خوب صورت ڈریسز پسند کیے اور ساتھ ہی جیولری اور شوز لیے، میچنگ کے اور کاؤنٹر پر پیک کرنے کا آرڈر دے کر پیسے نکالنے لگی۔

''کچھ خریدنا بھی ہے یا یوں ہی نگاہوں کو سیراب کرنے کا ارادہ ہے۔'' سبریز خان نے صارم کو کہنی مارتے ہوئے کہا۔ جو اردگرد سے گزرتے رنگین چہروں کو کھوجنے میں مصروف تھا۔

''کیا حرج ہے اگر ایک ٹکٹ میں دو شو ہو جائیں تو؟'' اس نے شرارتاً کہا۔

''درست کہا ہے بزرگوں نے۔ کتے کی دم سو سال بھی نلکی میں رکھ کر نکالو تو ٹیڑھی ہی نکلے گی۔ وہی حال تمہارا ہے۔ پچھلے دو گھنٹے سے گھومتا پھر رہا ہے۔''

''تو تم شاپنگ کرو۔ میں تو ونڈو شاپنگ کرنے آیا ہوں۔'' صارم مسکراہٹ دبا کر بولا۔

''بکواس بند کرو۔ مجھے مشورہ دو گل کے لیے کیا خریدوں؟''

''صرف ایک عدد چشمہ۔''

''چشمہ؟ کون سا وہ جو زمین میں سے پھوٹتا ہے۔ پانی والا؟''

''نہیں آنکھوں والا۔''

''آنکھوں والا؟ مگر کیوں.....؟ گل کی آنکھیں کمزور نہیں ہیں۔''

''کمزور ہیں..... جبھی تو اس نے تم کو پسند کیا ہے۔''

''صارم! میں لوگوں کا خیال کر رہا ہوں۔'' صارم کو ہنستے دیکھ کر سبریز سچ مچ تپ اٹھا تھا۔ صارم اسے لے کر جیولری شاپ میں چلا آیا۔

''وہ، بہت زبردست دکان ہے۔'' سبریز خان نے جگر جگر کرتی شاپ کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ اندر آتے ہی صارم خان سنجیدہ نظر آنے لگا۔ سلک کے گولڈن کرتے ہو وائٹ شلوار میں ملبوس اسکی پرسنالٹی غضب کی لگ رہی تھی۔ مستزاد اس کے وجیہہ چہرے پر چھائی متانت و سنجیدگی نے اس کو باوقار و پر رعب جلا بخشی تھی۔ کچھ دیر قبل نظر آنے والے، نظر باز، کھلنڈرے و شوخ صارم خان میں اور اب نظر آنے والے صارم میں دن و رات جیسا فرق تھا۔

''جی سر! یہاں تشریف لائیے سر!'' آف وائٹ شیروانی، وہائٹ تنگ پاجامہ زیب تن کیے، سر پر چند نے والی ٹوپی اوڑھے، پان سے بھرا سرخ منہ لیے درمیانی عمر کے بڑے میاں کے ساتھ ایک نوجوان ان کی طرف بڑھا تھا اور بہت عزت و احترام سے انہیں شنیل کے سرخ صوفے پر بٹھایا گیا تھا۔

''یہ تم نے کیوں گرگٹ کی طرح رنگ بدل لیا ہے؟''

''سنجیدہ ہونے کی پریکٹس کر رہا ہوں سنا ہے سنجیدہ لڑکوں کو لڑکیاں زیادہ پسند کرتی ہیں۔''

''ایڈیٹ، تمہاری زندگی اسی فضول مشغلے میں گزرے گی۔''

''اجی قبلہ! آپ کیا پسند فرمائیے گا؟'' بڑے میاں نے ان کے قریب بیٹھ کر خاصے شیریں لہجے میں پوچھا۔

''جی۔ جیولری دکھائیں۔''

''کیا دیکھنا چاہ رہے ہیں آپ؟ انگوٹھی، لاکٹ، چوڑیاں، کڑے، جھومر، ٹیکہ، گلوبند، پازیب، بندے، ٹاپس.....''

''پورا سیٹ دکھا دیجیے۔'' صارم ان کی زبان کے بریک فیل دیکھ کر جلدی سے بولا۔

''پورا سیٹ.....؟ یعنی کہ پورا سیٹ..... برخوردارو! ایک بات پوچھیں، اگر آپ برا نہیں مانیں تو..... سوال خاصا ذاتی ہے مگر آپ کی اجازت اگر ہو؟''

''آپ بزرگ ہیں۔ پوچھیے اجازت ہے آپ کو.....'' سبریز نے کہا۔

''آپ زیور دیں گے کس کو؟ مقصد تقریب کیا ہے؟''

''بہت اہم تقریب ہے یعنی موصوف کی شادی ہے اور جیولری اپنی بیگم کو رونمائی میں دینا چاہتے ہیں۔'' سبریز کو جھینپتے دیکھ کر صارم نے چھیڑتے ہوئے کہا۔

''اچھا..... اچھا..... پہلی پہلی شادی ہے۔ جب ہی اتنا شرما رہے ہیں برخوردار رونمائی کے لیے میں ایسا سیٹ بنوا کر دوں گا جو بھی دیکھے گا، عش عش کرے گا۔ ایک ماہ بعد دوں گا۔ خیر سے شادی میں دن کتنے ہیں برخوردار؟'' بڑے میاں نے جیولری بکس میں سے ایک ڈائمنڈ لیکلس سیٹ

پسند کروایا تھا۔ سبریز کو وہ سیٹ بہت پسند آیا تھا۔ انہیں ایڈوانس رقم دے کر وہ آ گئے تھے۔ جیولری کا ایک ماہ کا ٹائم دیا تھا۔ صارم نے کہا کہ وہ جب گاؤں آئے گا لیتا آئے گا۔ وہاں سے نکل کر اس نے فرداً فرداً سب گھر والوں کے لیے خریداری کی۔ کئی تحائف اپنی طرف سے سبریز کو دلوائے اس کے نہ..... نہ کرنے کے باوجود۔ کچھ شاپنگ اپنے لیے کی۔ واش روم کے لیے چھوٹا موٹا سامان لیا۔

''صارم! مجھے چائے کی شدید طلب ہو رہی ہے۔ پلیز کسی کیفے میں چلو۔'' سبریز خان تھکن سے چور لہجے میں بولا۔

''شکر ہے۔ چائے کی طلب ہوئی ہے۔ اگر ''چاہ'' کی طلب ہوتی تو کہاں سے پوری کرتا؟''

''نہ معلوم تم کب سدھرو گے۔'' سبریز کے ساتھ ہنستا ہوا گویا ہوا۔

''ہم مستقل مزاج بندے ہیں۔'' صارم اس کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا کہہ رہا تھا۔ شاپنگ سینٹر کے وسط میں ہی ٹی شاپ تھی۔ اس کی طرف بڑھتے ہوئے معاً اس کی نگاہ سامنے شیشوں کے پار کاؤنٹر کے قریب کھڑی پریشان دشمنِ سارِی ورشا پر پڑی۔ عنابی و سیاہ جارجٹ کے کڑھائی والے شلوار سوٹ میں اس کی رعنائی و دلربائی نوخیز حسن کا بانکپن کرنوں کی طرح دھک رہا تھا۔ وہ اپنی تمام تر احتیاط خود پر لگائے تازیانوں کو یکسر بھول کر اس کی طرف ایسے دیکھنے لگا جیسے کوئی ساحر سحر پھونک کر پتھر کا بنا دے۔

''صارم! کہاں کھو گئے.....؟'' ''خیریت تو ہے؟'' سبریز نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔

''ہاں..... آں..... کچھ نہیں ہے۔'' وہ چونک کر اس کی طرف گھوما۔

''کوئی نظر آ گیا ہے؟'' سبریز نے معنی خیزی سے دریافت کیا۔

''نہیں۔ تم اندر جاؤ۔ میں آ رہا ہوں۔'' وہ اسے ٹی شاپ کی طرف اشارہ کر کے آگے بڑھ گیا اور لوگوں کے ہجوم میں سبریز کی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ وہ تیزی سے اس بوتیک کی طرف بڑھ رہا تھا جہاں اس نے ورشا کو دیکھا تھا۔ وہ کئی شاپرز رکھے کاؤنٹر پر موجود سیلز منیجر سے کچھ کہہ رہی تھی اور وہ بار بار سر کو نفی میں ہلا رہا تھا۔ صورت حال اس کی سمجھ میں کچھ کچھ آ چکی تھی۔

''میں کہہ رہا ہوں نا میڈم آپ سنیے۔ آپ مکمل پے منٹ کر دیں اور سامان لے جائیں دوسری صورت میں آپ سامان لے کر نہیں جا سکتیں۔ پیکنگ کے چارجز دینے ہوں گے آپ کو۔'' منیجر خاصی بد اخلاقی و بدتمیزی سے کہہ رہا تھا۔

''میں آپ سے کہہ رہی ہوں گھر میں کوئی نہیں ہے۔ آپ یہ کارڈ رکھ لیں۔ کچھ دیر بعد میں آپ کو..... آپ کی پوری پے منٹ ڈرائیور کے ہاتھ بھجوا دوں گی۔'' ورشا کی آواز مارے شرمندگی و ندامت کے پست تھی۔ وہ بنا سوچے سمجھے خریداری کرتی گئی تھی۔ یہاں اس کے سامان کے چارجز تیرہ ہزار سات سو سینتیس تھے۔ اس نے پرس کھولا تو وہاں تین ہزار روپے تھے۔ اس نے منیجر سے کہا کہ اس کے پاس روپے کم ہیں وہ گھر جا کر پوری رقم بھجوا دے گی۔ وہ کارڈ رکھ لے اور ساتھ سامان بھی۔ مگر وہ کچھ الٹے دماغ کا آدمی تھا۔ اس کا کہنا تھا بغیر پیسوں کے وہ سامان نہیں دے گا۔ کارڈ بھی نہیں رکھے گا اور سامان کی جو پیکنگ ہوئی ہے اس کی رقم لیے بغیر اسے جانے بھی نہ دے گا۔ رقم پانچ سو کے لگ بھگ بن رہی تھی وہ کم لینے پر بھی راضی نہیں تھا۔ پریشان ہو کر اس نے گھر فون ملایا تھا۔ مگر وہاں مسلسل بیل بج رہی تھی۔ اسے یقین تھا سنبل وغیرہ رات کو آئیں گی۔ عجیب مصیبت میں

پھنس گئی تھی۔ منیجر بالکل خبطی و عقل سے پیدا آدمی تھا۔

''دیکھیے پلیز! آپ بات سمجھنے کی کوشش کریں۔'' وہ روہانسی ہو کر رہ گئی۔ کوئی بھی تو شناسا نہ تھا جو اس کی جان اس نیم پاگل سے چھڑاتا۔

''میں ابھی پولیس کو فون کرتا ہوں جی۔ تم جیسی فراڈی لڑکیوں کو وہی سمجھائے گی۔''

''شٹ اپ یو!'' یکلخت طوفان کی طرح وہ کاؤنٹر پر جھکا تھا۔ دوسرے لمحے چیختا ہوا منیجر فرش پر پڑا تھا۔ ورشا نے آنے والے کو چونک کر دیکھا۔

☆☆☆

''بالکل غیر متوقع طور پر وہ صارم کے جارحانہ خطرناک و تند مزاج تیور دیکھ کر لمحے بھر کو خفت و بدحواسی کا شکار ہوئی تھی مگر فوراً ہی اسے اردگرد حیران و پریشان سے لوگوں کا احساس ہوا تو اس نے خود کو سنبھالا۔ جب کہ فرش سے اٹھتا ہوا منیجر کینہ توز اور قہر آلود نگاہوں سے صارم کو دیکھ رہا تھا۔ جسے بوتیک کا مالک اور دوسرے ورکرز عاجزی سے سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ساتھ ہی معافیاں بھی مانگ رہے تھے۔ منیجر کی بدتمیزی کا انہیں احساس نہ ہو سکا تھا کیونکہ وہ لوگ کسٹمرز سے ڈیلنگ میں مصروف تھے۔ صارم جو شیشوں کے پار سے منیجر کی ہٹ دھرمی اور ورشا کی پریشان و گھبرائی صورت دیکھ رہا تھا ایک دم ہی طوفان کی رفتار سے آیا تھا اور ٹیلی فون کی طرف بڑھتے منیجر کو غصے میں گریبان سے پکڑ کر فرش پر اچھال دیا تھا اور منیجر کے حلق سے برآمد ہونے والی چیخ نے لوگوں کو متوجہ کیا تھا اور انہوں نے غصے سے بھرے صارم کو بمشکل پکڑ کر منیجر سے دور کیا تھا۔

''سر! پلیز آپ ناراضگی ختم کر دیں۔ یہ پہلی اور آخری غلطی ہوگئی ہے۔ آئندہ ایسی کوئی شکایت آپ کو نہیں ملے گی۔ سر پلیز!'' بوتیک کا مالک دست بستہ اس سے بار بار معافی مانگ رہا تھا۔ وہاں جمع ہونے والا ہجوم چھٹ گیا تھا۔ مالک کو انکساری و عاجزی کرتے دیکھ کر منیجر شاید احتجاج کے طور پر وہاں سے چلا گیا تھا۔ مالک نے اس کی پروا نہیں کی تھی۔ اس کا چہرہ متغیر تھا کہ ایسے واقعے بزنس اور سیلز پر بہت غلط اثر ڈالتے ہیں خصوصاً ایسے کاروبار کے ورکرز یا مالک، جب تک خوش اخلاق، خوش گفتار و خوش مزاج نہیں ہوتے تو ایسے لوگوں کے کاروبار پر منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

''ورکرز کے انتخاب سے قبل اخلاق و مزاج کی جانچ پڑتال ضرور کر لیا کریں۔'' صارم جیب سے والٹ نکالتا ہوا تند لہجے میں غرایا۔

''جی بالکل سر!... آئندہ احتیاط کی جائے گی۔'' بوتیک کے مالک نے سعادت مندی سے کہا۔

''یہ لیں اور سامان ملازم سے کار میں رکھوا دیں۔'' اس نے والٹ سے کئی بڑے نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے باوقار انداز میں کہا۔

''وہ لیکن.....؟'' ورشا جو خاموش کھڑی تھی، اس نے آگے بڑھ کر اسے منع کرنا چاہا مگر اس کے تمتماتے، سرخ چہرے پر غصے کے آثار دیکھ کر خاموش رہی۔ جانے کیسا تاثر؟ کیسی تپش تھی، ان آنکھوں میں، وہ نگاہ جھکا کر رہ گئی۔ اس وقت وہ یونی ورسٹی میں شوخیاں و شرارتیں کرنے والے صارم سے بالکل مختلف و منفرد لگ رہا تھا۔

یہ وقار.....

پر رعب......

جاہ و جلال کے گھوڑے پر سوار، اپنی راہ میں آنے والی ہر شے کو روند کر گزر جانے والا شخص۔

''سر! یہ بل سے زیادہ ہیں۔'' مالک نے کچھ نوٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''ان سے اپنے ورکرز کو شاندار ہوٹل سے ڈنر کروا دیجیے گا ہماری طرف سے......'' وہ شاہانہ انداز میں بولا اور بوتیک سے باہر نکل آیا۔

ورشا ملازم کے ہمراہ جا چکی تھی۔

☆☆☆

''ورشا! حد ہوتی ہے تنگ دلی اور بے مروتی کی، ایک شخص نے تمہیں لوگوں سے شرمسار و بے عزت ہونے سے بچایا، تمہاری مدد کی، وہ بھی کچھ کہے بغیر...... پھر تم اتنی بے حس و خود غرض کیوں بن رہی ہو؟''

رات پارٹی سے واپسی پر ورشا نے سنبل اور فارحہ کو بتایا کہ صارم کے بروقت وہاں پہنچ جانے اور پیسوں کی ادائیگی کر دینے کے باعث وہ تذلیل سے بچ گئی تھی۔

حسب عادت دونوں بہنوں نے اسے خوب سراہا تھا۔ اس کی پہلے ہی وہ تعریف کرتے نہ تھکتی تھیں۔ اس عمل نے اس کی توقیر اور بڑھا دی تھی۔ وہ از خود اس کی گرویدہ ہو گئی تھیں۔ ان کا خیال تھا اس بار ورشا کا دل بھی اس سے صاف ہو گیا ہو گا مگر ان کا خیال، خیال ہی ثابت ہوا۔

جب دوسرے دن یونی ورسٹی میں فری پیریڈ کے دوران اس نے سنبل اور فارحہ کو روپے دے کر صارم کے پاس بھیجنا چاہا تو انہوں نے اصرار کیا کہ وہ خود اسے رقم لوٹائے اور ساتھ ہی شکریہ بھی ادا کرے اس کا مگر اس نے بڑی بے رخی سے انکار کر دیا تھا اور اس کا یہ بے گانہ، خود سر انداز سنبل و فارحہ کو قطعی پسند نہیں آیا تھا۔

''میں نے اس سے درخواست نہیں کی تھی کہ وہ میری مدد کرے......'' وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔

''اوکے...... تم نے درخواست نہیں کی لیکن اعلیٰ ظرفی دیکھو تمہاری درخواست کے بغیر ہی انہوں نے تمہاری مدد کی، اب یہ تمہارا اخلاقی فرض ہے کہ تم ان کی رقم لوٹاتے وقت ان کا شکریہ ادا کرو۔'' سنبل نے ملائمت سے اسے سمجھانا چاہا۔

''تم اتنی بچی کیوں ہو رہی ہو؟ جو میرا فرض ہے وہ میں ادا کر رہی ہوں۔''

''کوئی ہماری مدد کرے، تو یہ ہمارا اخلاقی و دینی فریضہ ہے کہ ہم اپنے محسن کا شکریہ ادا کریں، یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ تم کیوں بعض اوقات اس قدر ہٹ دھرم و ضدی بن جاتی ہو۔'' فارحہ اسے اپنی ضد پر قائم دیکھ کر شانے اچکا کر گویا ہوئی۔

''تو سو، نیچر پلیز......'' وہ ٹیبل سے بیگ اٹھا کر تیکھے انداز سے بولی۔

''کہاں جا رہی ہو؟'' وہ دونوں اسے کینٹین سے باہر جاتے دیکھ کر پیچھے لپکیں۔

''تم لوگوں سے سر پھوڑنے سے بہتر ہے، کوئی دوسرا ذریعہ تلاش کر دوں۔'' وہ رکی نہیں۔

''ورشا...... ورشا! پلیز، بات سمجھنے کی کوشش تو کرو۔ اچھا...... صارم بھائی، کی جگہ خود کو رکھ کر سوچو، اگر تم کسی کی اس طرح مدد کرتیں اور جواب میں کوئی شکریہ کا مختصر لفظ کہنے کی بجائے اس طرح ناشکری کرتا تو تمہارا ردعمل کیا ہوتا......؟ تم یہی سوچتی ناکہ کتنا بدتمیز اور بد اخلاق شخص ہے۔''

''نہیں، میرے خیال میں تم خواہ مخواہ قیاس آرائی کر رہی ہو۔ میں ایسا ہرگز نہیں سوچتی کیوں کہ میں جانتی ہوں، کسی کی مدد کرنا، نیکی ہے اور فوراً ہی اپنی نیکی کے بدلے شکریہ کا خراج مانگنا، نیکی کو برباد کرتا ہے، جو مجھے نہیں چاہیے۔''

''اگر تم نہیں جاتیں تو تمہاری مرضی، لیکن بتا دوں یہ سراسر بد اخلاقی و بدتمیزی کی حرکت ہے۔'' فارحہ نے اس کے ہاتھ سے رقم لیتے ہوئے آہستگی سے کہا۔

''تھینکس، مائی سویٹ فرینڈز!'' اس نے مسکراتے ہوئے شوخی سے اس کا ہاتھ دبایا۔

''اگر یہی لفظ تم ان سے کہہ دو تو تمہاری ''ناک'' پر کوئی بوجھ نہیں پڑے گا۔'' فارحہ نے ملامت آمیز لہجے میں کہا مگر وہ ان سنی کر گئی۔

فارحہ نے صارم کو ہر اس جگہ ڈھونڈا جہاں اس کے ملنے کا امکان ہو سکتا تھا۔ مگر وہ کہیں سے بازیاب نہیں ہوا تھا۔ وہ مایوس ہو کر لوٹ ہی رہی تھی کہ باسط کو گیٹ کی سمت جاتے دیکھ کر اسے آواز دی تو وہ اس کی طرف آ گیا۔

''جی فرمایئے؟'' وہ قریب آ کر حیرانگی سے گویا ہوا، اس سے قبل اس نے آج تک اسے مخاطب نہیں کیا تھا۔

''زحمت کی معافی چاہتی ہوں، دراصل صارم بھائی کا پوچھنا تھا۔ وہ آئے نہیں کیا آج؟''

''وہ آیا تھا مگر جلد چلا گیا ہے۔ کوئی کام ہے؟'' باسط نے اخلاقاً پوچھا۔

''جی...... وہ دراصل......'' اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کس طرح اسے رقم دے کہ وہ صارم تک پہنچا دے۔ کیوں کہ ورشا آج ہی رقم پہنچانے پر مصر تھی۔ وہ اسے تفصیل بتانے سے گریزاں تھی۔

''کوئی پیغام ہے؟'' باسط دھیرے سے مسکرا کر استفسار کرنے لگا۔

''نہیں...... یہ رقم ہے...... ذرا ان تک پہنچا دیں آپ، بہت مہربانی ہوگی۔'' وہ رقم اس کی سمت بڑھاتے ہوئے ہچکچاہٹ بھرے انداز میں گویا ہوئی۔

''آپ شرمندہ کر رہی ہیں۔ مہربانی کی کوئی بات نہیں۔ میں اس کے پاس ہی رہتا ہوں۔ رقم پہنچا دوں گا مگر کیا کہوں؟'' وہ رقم جیب میں منتقل کرتا ہوا استفسار کرنے لگا۔

''سمجھ جائیں گے وہ، گر وہ نہ سمجھیں تو ان سے کہیے گا کہ فون کر لیں۔''

باسط کے جانے کے بعد وہ تیز تیز قدموں سے کلاس روم کی طرف بڑھ گئی۔

☆☆☆

سنہری سنہری نرم و گرم دھوپ کی کرنیں خشک و سرد موسم میں روح کو شادمانی کرنے والا سرور بخش رہی تھیں گو کہ موسم بدل رہا تھا، تخت ٹھٹھرا دینے والی سردی قدرے کم ہو گئی تھی۔ برفانی ہوائیں بھی اعتدال پر تھیں اور سورج بھی جلوہ افروز ہونے لگا تھا مگر دوسرے شہروں کے مقابل یہاں

ابھی بھی سردی تھی جو علاقے کے لوگ تو برداشت کر سکتے تھے مگر غیر علاقے کے لوگوں کی برداشت سے باہر تھا۔

''ادے! کیا آج کھانا نہیں کھانا؟ ورشا کے بھیجے ہوئے خط کو پڑھ پڑھ کر پیٹ بھرتی رہیں گی۔'' سخاویہ نے نرم مسکراہٹ سے ماں کی طرف دیکھ کر کہا۔ صبح شمروز لالہ سامان دے گئے تھے، انکا بھیجا ہوا آدمی کراچی سے لایا تھا جو ورشا نے بھیجا تھا۔ ڈھیروں سامان کے اندر اس کے ہاتھ کے لکھے دو خط بھی تھے جو ادے اور سخاویہ کے نام تھے۔'' سخاویہ کئی بار اس خط کو پڑھ چکی تھی۔ آنکھوں سے لگا کر ہونٹوں سے چوما تھا۔ ورشا کا لمس اس کی خوشبو اسکے حرف حرف سے پھوٹ رہی تھی۔ ایک مدت کے بعد یہ لمس حاصل ہوا تو وہ خوشی و طمانیت کے احساس سے سرشار ہو گئی تھی۔ جب کہ ادے کو گویا نئی زندگی کا سندیسہ مل گیا تھا۔ کئی بار وہ اسے پڑھ چکی تھیں اور ان کی آنکھیں بھرے بادلوں کی طرح بار بار برس پڑتیں۔ اپنے جذبات و احساسات پر چھائی برف انہیں پگھلتی محسوس ہو رہی تھی۔

اس کی جدائی۔

اس کا وجود۔

اس کا لمس۔

اس کی محبت کے اثر سے وہ دل پر جبر کر کے وقتی طور پر خود کو بہلا پائی تھی۔

مگر دو سال کی طویل مدت کے بعد آج اسکی دوری کے احساس اور یاد نے کچھ اس طرح غلبہ پایا تھا کہ وہ خود کو بہلا بھی نہ پا رہی تھیں۔ اس کاغذ کے بظاہر بے جان ٹکڑے کو انہوں نے اس طرح سینے سے لگا رکھا تھا جیسے وہ کاغذ نہیں ورشا کا وجود سمٹ کر ان کے سینے سے آلگا ہو اور ایک مدت سے ان کی پیاسی ممتا ڈھیرے ڈھیرے سیراب ہو رہی ہو..... اور وہ سکون و آسودگی کے بحرِ بے کراں میں تہہ در تہہ اترتی جا رہی ہوں۔

''ادے! کیا ہوا؟'' وہ ماں کی طرف سے کوئی آواز نہ پا کر پریشان سی ہو کر بولی۔

''کچھ نہیں بچے! اتنا سامان اس نے کیوں بھیجا؟ کتنی پریشانی ہوئی ہو گی اسے منگوانے میں.....'' وہ سامان کو دیکھ کر پریشانی سے گویا ہوئیں۔

''پریشانی کیوں ہوئی ہو گی اسے.....؟ بابا کے دوست کا جو ملازم ہے اس سے منگوایا ہے سب۔'' سخاویہ نے ان کا ذہن بٹانے کے لیے بہانہ گھڑا۔ اسے معلوم تھا بلکہ ورشا نے اس کے خط میں لکھا تھا کہ اس نے بہت محبت سے ان کے لیے شاپنگ کی ہے مگر وہ یہ بات ان کو بتلا کر کسی شدید پریشانی میں مبتلا نہیں کر سکتی تھی کیوں کہ قبیلے میں عورت کا گھر سے تنہا نکلنا یا خریداری کرنے کا رواج قطعی نہ تھا۔ یہاں تمام خریداری مرد حضرات ہی کرتے تھے جس میں گھریلو اور زنانہ خریداری دونوں شامل تھیں۔ ان کے یہاں تمام کام ملازم کرتے تھے۔ تہواروں پر عورتیں کپڑا، چوڑیاں، گجرے وغیرہ گھر پر ہی منگا لیتیں اور پسند کرا کر سی کے بھی دے جاتیں۔ ان میں سے کسی نے بھی بازار کی شکل نہ دیکھی تھی۔ ایسے میں وہ حقیقت بتاتی تو ادے کا خوف کے مارے نہ معلوم کیا حال ہوتا۔ انہیں پہلے شمشیر خان کا خیال ہی آتا کہ اسے معلوم ہو گیا تو.....

''بہت اچھے لوگ ہیں وہ۔ اللہ انہیں دونوں جہانوں کی خوشیاں دے۔ جنہوں نے میری بچی کو اپنی اولاد کی طرح رکھا ہوا ہے۔'' ان کی آنکھوں سے ایک بار پھر جھڑی لگ گئی۔

''ادے.....ادے! اب اس کے آنے میں دن ہی کتنے رہ گئے ہیں۔ جہاں اتنا عرصہ دل کو تھامے رکھا اب چند ہفتوں کو بھی برداشت کر لیجیے۔'' وہ ان سے پہلو سے لگی انہیں تسلیاں دیتی ہوئی خود بھی آبدیدہ ہوگئی۔

☆☆☆

''ہیلو۔۔۔'' فون کی بیل مسلسل بج رہی تھی۔ ورشا نے لاؤنج میں دیکھا کوئی نہ تھا۔ اس نے ریسیور اٹھا کر دھیرے سے کہا۔

''ورشا! آپ ہیں؟'' دوسری طرف سے سنجیدہ گمبھیر آواز ابھری۔

''رانگ نمبر۔'' اس نے آواز پہچانتے ہی ریسور رکھنا چاہا۔

''مجھے معلوم ہے۔ آپ مجھے پہچان گئی ہیں۔ ریسیور رکھنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔'' دوسری طرف سے جلدی سے کہا گیا تھا۔ اس نے مجبوراً ریسیور نہیں رکھا۔

''کس سے بات کرنی ہے؟ فرمایئے، فالتو وقت نہیں ہے میرے پاس۔'' وہ بے زاری سے گویا ہوئی۔

''جی.....تمام دنیا کے بکھیڑے آپ کے ناتواں شانوں پر بکھرے ہوئے ہیں۔'' وہ بھی اس وقت غصے میں تھا۔ سو خاصے کاٹ دار لہجے میں بولا تھا۔

''میں نے کہا نا فضول وقت نہیں میرے پاس۔''

''آپ نے میری بے عزتی کیوں کی؟''

''میں.....نے.....کب؟'' اس کے خوں خوار انداز پر وہ بے ساختہ استعجاب سے گویا ہوئی۔

''رقم بھیج کر آپ نے میری بے عزتی کی ہے۔ میری خلوص نیت کا مذاق اڑایا ہے۔''

''جی نہیں۔۔۔ قرض واپس کرنا میرا فرض تھا۔ اس میں آپ کی بے عزتی کہاں ہوئی؟''

''میں نے آپ سے کہا بھی نہیں تھا کہ آپ کو رقم دے دی۔ ہم میں دوستی نہ سہی مگر شناسائی تو ہے۔ کیا اس حوالے سے.....''

''میں آپ کی عنایتوں کی متحمل نہیں ہو سکتی اور نہ ہی کسی غیر کا احساس لینا مجھے گوارہ ہے۔'' اس نے سرد مہری سے کہتے ہوئے ریسور رکھ دیا اور قریبی صوفے پر بیٹھ کر خود پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگی۔ اسے جس بات کا خدشہ تھا وہی ہوا تھا۔ اسے یقین تھا وہ اب اپنی اس احسان مندی کو ایشو بنا کر راہ و رسم بڑھانے کی سعی کرنے لگا۔ اور ایسا ہی ہوا تھا ایسے رقم اسے فوری اس لیے پہنچائی تھی کہ وہ مخاطب نہ ہو۔ وہ اپنے اس مقصد میں کامیاب بھی رہی تھی اور اسے اب بھی صاف صاف باتیں سنا کر اس کے دل میں اطمینان سا اتر رہا تھا۔ مردوں سے نفرت کی تپش ان کی رگ رگ میں خون کی مانند گردش کرنے لگی تھی جس کے باعث وہ احساس کمتری کا شکار ہوتی جا رہی تھی۔

☆☆☆

''خان! ایک خوب صورت خبر ملی ہے اگر حکم ہو تو سناؤں؟'' سمندر خان اس وقت اپنے مخصوص ڈیرے پر بیٹھا گھر جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ وہ گزشتہ تین روز سے یہیں مقیم تھا۔ رقاصاؤں کی آئی ہوئی پارٹی سے ایک رقاصہ اپنے حسن اور شوخ اداؤں کے باعث اس کے دل کو بھا گئی تھی۔ پھر اپنی عادت کے مطابق وہ اسے ساتھ لے آیا تھا۔ تین دن اس کی سنگت میں رقص و سرور میں گزار کے بے حد انعام و اکرام سے اسے نواز کر آج روانہ کیا تھا۔ صمد خان اسے اسٹیشن تک چھوڑنے گیا ہوا تھا۔

''ہوں..... بتاؤ.....'' اس نے چادر بائیں شانے پر ڈالتے ہوئے اجازت دی۔

''خان جی! ندی کے پاس جو حکیم صاحب کا جھونپڑی تھا وہاں اب پکا گھر بن گیا ہے۔''

''یہ خوش خبری ہے؟ بے وقوف، خوش ایسا ہو رہا ہے جیسے تیرے باپ کا گھر بن گیا ہے۔ پاگل کی اولاد۔'' شمشیر خان حسب عادت جلد ہی چراغ پا ہو کر دہاڑا۔

''خان جی! آپ سنو تو سہی، پورا بات ابھی کہاں ہوا ہے۔'' سمندر خان جلدی سے ملتجی لہجے میں گویا ہوا۔

''سیدھی بات کیا کر۔'' وہ گھور کر اس کی ذات پر احسان کرنے کے انداز میں بولا۔

''وہاں ایک ڈاکٹرنی آئی ہے۔ کل دیکھا تھا اسے میں نے۔ آہ..... کیا لڑکی تھی؟ قسم اس شملے کی میں نگاہ نیچی کرنا بھول گیا۔'' وہ جھوم کر بولا۔

''دنئی بات نہیں ہے۔ زنانیوں کو دیکھ کر تو ہمیشہ نگاہیں جھکانا بھول جاتا ہے لیکن ڈاکٹرنی کب آئی یہاں پر؟ اور حکیم صاحب سے کیا رشتہ ہے اس کا؟ حکیم صاحب تنہا رہتے ہیں، بیوی پہلے مر گئی تھی کوئی اولاد بھی نہیں ہے۔'' وہ اپنے ذہن پر زور ڈالتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''چند مہینے پہلے حکیم صاحب کے بھائی کی بیٹی شہر سے آئی ہے۔ اس نے ہی یہاں آکر مطب کھولا ہے۔ زنانیوں کے ساتھ ساتھ وہ مردوں کا بھی علاج کرتی ہے۔ میں نے کل ہی سب معلومات لے لی تھیں۔'' سمندر خان بدستور دست بستہ اس سے مخاطب تھا اور تمام معلومات بہم پہنچا رہا تھا۔

''ہمارے علاقے میں، ہماری اجازت کے بغیر کس نے اتنی جرات کی؟'' اسے یک دم اپنی حاکمیت و ملکیت کا خیال آیا تھا۔

''میں نے پوچھا تھا خان! حکیم صاحب سے کہ کس کی اجازت سے مطب کھولا ہے؟ تو اس نے بتایا بڑے خان سے اجازت لے کر وہ اپنے بھائی کی بیٹی کو گاؤں لایا ہے۔''

''بابا جان تو بھی ہر ایک پر ترس کھانے بیٹھ جاتے ہیں۔ جا کر باہر دیکھ، صمد خان آیا کہ نہیں اس کے ساتھ دفع ہو گیا ہے۔'' نیند و تھکن اس پر شدت سے غالب آ رہی تھی۔ سمندر خان کو اس نے غصے سے کہا تھا۔ سمندر خان فوراً ہی حکم کی تعمیل کے لیے باہر آ گیا تھا۔ سامنے بل کھاتے سبزے کے درمیان صمد خان جیپ چلا کر آتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ وہ گرم چادر درست کرتا ہوا گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔ شمشیر خان کے اکتائے و بے زار لہجے سے اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ اب سیدھا گھر ہی جائے گا۔ اس نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے پھر کبھی پر ڈاکٹرنی کے دیدار کو ٹال دیا تھا۔ صمد خان گیٹ کے اندر جیپ لے کر آ گیا تھا۔

''کیا بات ہے؟ یار! مزاج میں سورج کیوں طلوع ہو رہا ہے؟'' صمد خان اس کی سمت آتا ہوا متحیر خیز لہجے سے استفسار کرنے لگا۔

''خان کا مزاج کی فکر کرو ہمارا بات چھوڑو۔ وہ کب سے انتظار کرتا ہے۔'' سمند ربدستور برہمی و جھلاہٹ کا شکار تھا۔

''راستے میں ٹائر خراب ہو گیا تھا۔ اس لیے دیر ہو گیا۔ ویسے تم اتنا خفا خفا کیوں نظر آ رہا ہے یارا؟ خان نے اس بار ''خیال'' کہیں کیا اس لیے؟''

''چھوڑو یار! خان تو اپنی مرضی کا مالک ہے۔ یہ ہمارا نصیب ہے جاگتا نہیں نا۔''

''اچھا..... اندر چلو۔ کہیں خان ہم کو ہمیشہ کی نیند نہ سلا دے۔''

☆☆☆

''بابا جان کو میری طرف سے سلام کہنا۔ ان سے کہنا میری طرف سے فکر مند نہ ہوں میں جلد ہی گاؤں آؤں گا۔ بی بی کو تسلی دینا وہ بہت آزردہ رہتی ہیں۔ امتحان ختم ہوتے ہی میں یہاں نہیں ٹھہروں گا۔'' صارم خان ایئر پورٹ لاؤنج میں سبریز سے مخاطب تھا۔ خلاف مزاج اس کا موڈ بہت سنجیدہ تھا اور وہ خاصا اداس و رنجیدہ دکھائی دے رہا تھا۔ یہی حال سبریز خان کا تھا۔ وہ گاؤں جانے کے لیے پر مسرت بھی دکھائی دے رہا تھا اور صارم سے بچھڑنے کا ملال بھی اس کی آنکھوں میں نمی بن کر چمک رہا تھا۔ سب دوستوں کی ہمراہی میں وہ ایئر پورٹ آیا تھا۔ وہ سب بھی اداس ہو رہے تھے۔ فلائٹ پرواز کے لیے تیار تھی۔ بار بار اناؤنس ہو رہا تھا۔ صارم خان اسے بازوؤں کے گھیرے میں لیے ہوئے تھا۔ اس کی نیلگوں آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

''او کے میں کہہ دوں گا۔ تم نے لیٹر بھی تو لکھا ہے۔ وہ بابا جان اور بی بی جان پڑھ لیں گی، باقی سب کے لیٹرز اور تحفے میں دے دوں گا۔ تم بے فکر رہو۔ ہاں اگر کسی ''خاص فرد'' کے لیے کوئی پیغام ہو تو.....'' سبریز خان اداس و سوگوار ماحول کو تبدیل کرنے کی خاطر شوخی سے گویا ہوا تو جواباً صارم نے اس کے ایک مکا جڑ دیا۔

''جا کر تمہیں ''ایک'' کے علاوہ کسی دوسری طرف کا دھیان رہے تو پھر بات کرو گے نا؟''

''تمہاری خاطر میں دھیان پلٹا سکتا ہوں۔'' صارم کے جواب پر وہ مسکرا کر گویا ہوا۔

''نہیں، معاف کرو مجھے۔'' صارم کے بعد وہ فرداً فرداً اس سے گلے ملے۔

''دیس پرائے جانے والے وعدہ کر کے جانا
ہمیں خط لکھو گے روزانہ.....

''روزانہ خط انہوں نے ان کو نہیں لکھا جن کو لکھنا چاہیے تھا۔ تم کس گنتی میں شمار ہو۔'' آفتاب کے گنگنانے پر باسط نے کہا تو ان کے ساتھ سبریز بھی ہنس پڑا۔

''او کے..... پھر ملیں گے دوستو، کہا سنا معاف، میں آپ لوگوں کا منتظر رہوں گا۔ تم فوراً آ پہنچنا۔ ایگزامز سے فری ہونے کے بعد..... تمہیں معلوم ہے میری نگاہیں ان راستوں پر پلکیں بچھائے محو انتظار رہیں گی جن پر چل کر تم مجھ تک پہنچو گے۔'' سبریز ان لوگوں سے ملنے کے

بعد صارم کے قریب آ کر دھیمے لہجے میں بولا تھا۔ اس کا چہرہ جذبات سے سرخ تھا۔ آنکھوں میں نمی کی چمک مزید بڑھ گئی تھی۔ وہ اس سے تیسری بار گلے ملا تھا اور ہر بار ایک عجیب سی شدت تھی جو دونوں محسوس کر رہے تھے مگر کچھ کہہ نہ پا رہے تھے۔ دونوں جب بچھڑتے تو یہ کیفیت ہوتی تھی۔ مگر آج کچھ ایسی عجیب اور نہ سمجھ آنے والی کیفیت تھی دونوں کی کہ گزشتہ رات دونوں نے جاگ کر گزاری تھی۔ باتوں کا ایک لامتناہی سلسلہ تھا۔ جو ابھی تک کنٹرول نہیں ہوا تھا۔ بقول باسط کے کہ دونوں نے باتیں کرنے میں عورتوں کو بھی پیچھے چھوڑ دیا تھا۔

''تم فکر مت کرو، جان صارم، میں ایگزامز کے فوراً بعد چلا آؤں گا۔'' صارم اس سے جوش و خروش سے ہاتھ ملاتے ہوئے تسلی آمیز لہجے میں کہنے لگا۔ وہ خدا حافظ کہتا ہوا اندر کی جانب غائب ہو گیا۔ صارم اسے نظروں سے اوجھل ہونے تک دیکھتا ہوا ہاتھ ہلاتا رہا۔ جہاز فضائی ہوا تو وہ ان لوگوں کے ساتھ باہر آ گیا۔

''کیا بات ہے؟ بہت افسردہ و مضمحل دکھائی دے رہے ہو؟'' باسط نے اس کی غیر معمولی سنجیدگی و خاموشی محسوس کرتے ہوئے اس کی طرف دیکھ کر استفسار کیا۔

''یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ سبریز کی آمد پر یہ جتنا خوش ہوتا ہے اسکی واپسی پر اتنا ہی رنجیدہ و اداس ہو جاتا ہے اور کئی دن تک اس کا اداس چہرہ دیکھ دیکھ کر ہماری زندگی دکھوں و پریشانیوں کی نذر ہو جاتی ہے۔'' بہروز شاکی لہجے میں بولا۔

''اب تم اپنا موڈ درست کر و یار، چند ہفتوں کی تو بات ہے پھر تمہیں تو گاؤں چلے جانا ہے۔ وہاں آرام سے رہنا سبریز کے ساتھ...... ساتھ تو ہمارا چھوڑ دو گے تم...... یہ چند ہفتے ہی تو بچے ہیں ہمارے پاس پھر ہم کہاں...... تم کہاں؟'' باسط کے لہجے میں افسردگی کی گہری چھاپ ابھر آئی تھی۔ کار میں موجود ان چاروں کے چہروں پر بھی جدائی کے خیال سے حزن و ملال کے رنگ اتر آئے تھے۔

''میں بھی اکثر سوچتا ہوں، ابھی جو ہم ایک دوسرے کے بغیر نہیں رہتے...... ہمیں ایک دوسرے کے بغیر سکون نہیں ملتا، چین نہیں آتا بھلا ایک دوسرے کے بغیر پھر کیسے رہیں گے؟''

''اسی طرح رہیں گے، جس طرح تمہارے ابا اپنے بھائیوں کے بغیر رہتے ہیں۔''

''کیا مقصد...... ؟ دیکھو ٹنکی! ابا تک پہنچنے کی کوشش نہ کرنا۔'' باسط فرنٹ سیٹ پر بیٹھے آفتاب کو گھور کر گویا ہوا۔ صارم کار ڈرائیو کر رہا تھا۔ سورج کی زرد روشنی ماحول کو اپنی گرفت میں لیے آگے کی جانب محو سفر تھی۔ سڑک پر خاصا رش تھا۔ صارم محتاط انداز میں کار ڈرائیو کر رہا تھا۔

''ایسے ہی کیوں...... ؟ تیرے ابا میرے بھی تو انکل لگتے ہیں۔'' آفتاب نے اسی انداز میں کہا۔

''ابا کا حوالہ کیوں دیا تم نے؟''

''تمہارے ابا پہلے اپنے اماں ابا اور بہنوں، بھائیوں کے ہمراہ رہتے تھے پھر بہنیں اپنے سسرال چلی گئیں۔ بھائیوں کی شادیاں ہو گئیں تمہارے ابا سمیت پھر بھائیوں کو جدا کس نے کروایا؟'' آفتاب اس کی طرف دیکھ کر سوالیہ لہجے میں گویا ہوا۔

''مجھے نہیں معلوم تیرے پاس ایسی ہی بکواس ہوتی ہے۔''

''جنرل نالج میں تو ہمیشہ ہی فیل ہوتا ہے۔ آدمیوں میں فساد ڈلوانے والی، بھائیوں کو آپس میں جدا کرنے والی عورت ہی تو ہوتی ہے۔ ہم بھی اسی مخلوق کی گرفت میں آ جائیں گے تو اپنے آپ کو بھول جائیں گے۔ کیا رشتے، ناتے یاد رہتے ہیں؟''

''یہ زیادتی ہے آفتاب! دنیا میں ہر عورت ایسی نہیں ہوتی۔ اگر ایسا ہوتا تو یہ دنیا کب کی تباہ ہو چکی ہوتی۔ مرد کو اللہ تعالیٰ مضبوط و بہادر، جرات مند و نڈر پیدا کیا ہے۔ جو مرد ان صفات کو کھو دیتا ہے اس کی عقل پہ عورت قابض ہوتی ہے ورنہ عورت کا مقام بہت بلند ہے۔ وہ ہر رتبے میں معتبر و باعزت ہے۔ چاہے وہ ماں کا نورانی پیکر ہو۔ بہن کی پاکیزہ محبتوں کا حصار ہو۔ بیٹی کی پرخلوص ولازوال چاہتوں کے رشتوں کا ہجوم ہو۔''

''تم بھی کس کی باتوں کو دل سے لگا کر بیٹھ گئے؟ یہ ٹنکی جو ہے ناعقل سے پیدل ہے۔ یہ خود دن بدن جتنا موٹا ہوتا جا رہا ہے اس کی عقل اتنی باریک ہوتی جا رہی ہے۔'' باسط نے بہروز کو دلاسا دیتے ہوئے جملہ کسا۔

''صارم..... صارم! سنبھالے اس مچھر کو..... تو بہت حمایت لیتا ہے اس کی۔ اگر میں نے ایک ہاتھ لگا دیا تو سانس نہیں آئے گا اس کا۔'' حسب عادت آفتاب تلملا کر رہ گیا تھا۔

''تمہیں کتنی بار سمجھایا ہے اتنا غصہ مت کیا کرو۔ خدانخواستہ پھٹ پھٹا گئے پھر.....'' صارم نے دھیمی مسکراہٹ سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا تو باسط اور بہروز نے زوردار قہقہہ لگایا تھا جب کہ آفتاب غصے سے منہ پھلا کر بیٹھ گیا تھا۔

☆☆☆

بدلتے موسم نے وادی کو سرسبز و شاداب نوخیز کلیوں اور مہکتے پھولوں سے دل فریب حسن عطا کیا تھا۔ موسم دل کش و دل آویز تھا۔ سرمئی پہاڑی کے دامن میں ایک قدرتی جھیل تھی جس کے اطراف میں پھیلے سبزے میں بہ کثرت کھلتے سرخ گلاب نگاہوں کو خیرہ کر رہے تھے۔ جھیل کے نیلگوں پانی کی سطح آئینے کی طرح شفاف و ستھری تھی اور اس موتی کی طرح چمکتے پانی میں سبزے و سرخ گلابوں کا عکس دل کش منظر پیش کر رہا تھا۔ سریز خان کو ایک ہفتہ ہو گیا تھا گاؤں آئے ہوئے آج بڑی منت، سماجت کے بعد چھوٹی بھابی راضی ہوئی تھیں اس کی ملاقات گل سانگہ سے کروانے پر کیوں کہ ان کی شادی کی تاریخ دے دی گئی تھی اور قبیلے کی رسم و روایت کے مطابق وہ شادی سے قبل مل نہیں سکتے تھے۔ بھابی بڑی مشکل سے اسے اس سے ملوانے کے لیے لائی تھیں، بہت محدود وقت کے لیے۔ گل سانگہ بڑے سرمئی پتھر کی اوٹ میں بیٹھی تھی۔ اس سے کچھ فاصلے پر سریز بیٹھا تھا۔ کئی لمحے گزر جانے کے باوجود ان میں کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ وہ اپنی کیفیت پر قابو پانے کے لیے اپنی جامنی بھاری چادر کا پلو مروڑ رہی تھی۔ جھیل کے گرد کھلے سرخ گلابوں کا تمام رنگ اس کے رخساروں پر جیسے جم گیا تھا۔

''گل! اتنی خاموش کیوں ہو؟ کوئی بات نہیں کرو گی، یہ نہیں پوچھو گی کہ اتنے ہفتے کراچی میں کیسے گزار کر آ گیا؟'' اس نے خاموشی کو توڑتے ہوئے پہل کی۔

''یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ صارم لالہ کے پاس جانے کے بعد تم ہمیشہ دو ہفتے کا کہہ کر جاتے ہو اور دس ہفتے بعد آتے ہو۔'' گل سانگہ مسکراتی ہوئی گویا ہوئی۔

''درست کہہ رہی ہو۔ اس کا مجھ سے کچھ ایسا ہی تعلق ہے۔ جتنے عرصے میں رہا ہم ساتھ ساتھ رہے۔ بہت اچھا لگا۔ کراچی کی زندگی یہاں کے مقابلے میں بھاگتی دوڑتی زندگی ہے۔ دن یوں نکلتا ہے اور یوں ختم ہو جاتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہاں وقت کے پر لگے ہوئے ہیں جو تیز رفتاری سے اڑتا رہتا ہے۔''

''ضارم لالہ کیسے ہیں؟ وہ کب تک آئیں گے، بابا جان اور بی بی جان تو لمحہ لمحہ ان کی واپسی کے انتظار میں گزار رہی ہیں۔ آکا جان بھی بہت یاد کر رہے ہیں انہیں۔''

''اور کوئی یاد نہیں کر رہا اسے؟'' سبریز معنی خیزی سے دریافت کرنے لگا۔

''زرگون خانم بھی پاگل ہے بس، کتنا سمجھا چکی ہوں کہ وہ ان کے متعلق نہیں سوچا کرے مگر شاید وہ جذبے تو ان پھولوں کی طرح پیار کی چمک سے زرخیز زمین دیکھ کر خود بخود ہی جنم لے لیتے ہیں جن کو نوچ پھینکنا خود انسان کے اختیار میں کب ہوتا ہے۔''

''بابا جانی کا میں بے حد شکر گزار ہوں جنہوں نے اپنی لڑکیوں کو تعلیم کی روشنی سے نوازا ہے ورنہ جاہل جٹ بیوی کے ساتھ میں گزارہ نہیں کر سکتا تھا۔'' سبریز خان گھاس دھیرے دھیرے نوچتا ہوا فخریہ لہجے میں گویا ہوا۔

''مجھے کیوں بلایا تھا؟ بہت ڈرتی ڈرتی آئی ہوں اگر گھر میں مورے کو یا بابا کو معلوم ہو گیا تو کتنی شرمندگی ہو گی۔'' اسی لمحے سامنے وادی میں بگولے اٹھے اور تیز تیز ہوا چلنے لگی۔ سامنے جھیل میں ہوا کی زد سے جھومتے کئی گلاب شاخوں سے ٹوٹ کر شفاف نیلگوں پانی کی سطح پر گر کر تیرنے لگے۔ گل آہستگی سے گویا ہوئی۔

''تمہیں دیکھنے کو، تم سے ملنے کو دل بہت چاہ رہا تھا۔ خود کو ہر طرح سے تسلی دی، بہلایا کہ اب تو دوری کے موسم بدلنے والے ہیں۔ مگر کل، نہ معلوم اندر ایک نہ سمجھ میں آنے والی خاموشی دبے مغنی سی کیفیت چھانے لگی ہے۔ جب بھی میں اس سہانے لمحوں کے بارے میں سوچتا ہوں تاریکی و سناٹوں کے علاوہ وہ کچھ سنائی نہیں دیتا پھر میں الجھ کر رہ جاتا ہوں۔''

سبریز خان کے وجیہہ چہرے پر الجھن کی ناقابل فہم پرچھائیں پھیل رہی تھیں۔ اس لمحے وہ جیسے سامنے بیٹھی گل اور تمام آس پاس کے مناظر سے یکسر بے نیاز و بے گانہ تھا۔ اس کی اداس نگاہیں دور فلک پر کسی نادیدہ نافہم اسرار کو کھوج رہی تھیں۔

''ایسی باتیں کیوں کرتے ہو؟ مجھے انجانی سی وحشت گھیر رہی ہے۔ کیا مجھے ڈرانے کے لیے تم نے یہاں اتنے اصرار سے بلوایا تھا؟'' گل سانگہ یک دم گھبرا کر کھڑی ہوتی ہوئی بولی۔ سبریز کے لہجے میں جھلکتی یاسیت چہرے پر یکلخت چھائی سردگی نے اسے ہلا کر رکھ دیا تھا۔

''اوہ، تم ڈر گئیں۔ حیرت ہے میں تم سے اپنے دل کی بات کر رہا تھا۔ خیر ایک اچھی خبر سناتا ہوں تاکہ تم خوش ہو جاؤ۔ میں تمہارے لیے جیولری سیٹ کا آرڈر دے کر آیا ہوں تمہیں بہت پسند ہیں نا زیور۔'' اس نے مسکراتے ہوئے موضوع بدلا تھا۔ جذبوں سے شوخ نگاہوں سے اس کی جانب دیکھ کر کہا۔

''سچ کہہ رہے ہو؟ کیسا سیٹ ہے؟ کب آئے گا؟''

''کیسا سیٹ ہے؟ یہ تو دیکھ کر ہی بتانا۔ جھوٹ میں کبھی بولتا نہیں یہ تمہیں معلوم ہے۔ صارم امتحانات سے فارغ ہو کر آئے گا تو ساتھ لے کر آئے گا۔''

''ملاقات کا وقت ختم ہو گیا بچہ لوگ، چلو شاباش اپنے اپنے گھر کی راہ لو۔'' سامنے سے رانی گل (چھوٹی بھابی) آتی ہوئی کہہ رہی تھی۔

''آہ...... ہائے...... برا وقت کتنی جلدی آ جاتا ہے۔'' وہ آہستہ سے بڑبڑایا تھا۔ ٹھنڈی سانس بھر کر گل نے بمشکل اپنی مسکراہٹ ضبط کی تھی۔

''تم نے مجھ کو خراب وقت کہا؟ مطلب پرست انسان...... کچھ دیر پہلے کیسے خوشامدیں کر رہے تھے؟ اب مطلب بر آنے پر آنکھیں بدل رہے ہو۔'' چھوٹی بھابی اس کے بال مٹھی میں جکڑ کر مصنوعی غصے سے گویا ہوئی۔

''بھابو! خدارا! میرے بال نہ بگاڑا کریں۔'' وہ ان سے بال چھڑوا کر درست کرتا ہوا کراہا۔

''چلیں بھابو! بہت دیر ہو گئی ہے۔'' گل سانگہ اس کے نزدیک آ کر آہستگی سے گویا ہوئی۔

''تم بھی گھر کو آ رہا نا!''

''میں کھیتوں میں جا رہا ہوں۔ وہاں سے واپسی میں دیر ہو جائے گی۔'' سبریز نے اطلاع دی۔

''کھیتوں پر بابا جانی کا جانے کا ارادہ ہے تم سیدھے گھر آؤ۔''

''بابا جانی کو شاید یقین نہیں آیا میری بات کا...... لیکن یہ بات درست ہے ہمارا پانی کاٹا جا رہا ہے۔ میری غیر موجودگی سے فائدہ اٹھا کر ایسا کیا گیا ہے مگر میں اب ایسا نہیں ہونے دوں گا۔''

''احمق مت بنو سبریز خاناں، تمہاری شادی میں دن بہت تھوڑے رہ گئے ہیں۔ ایسے میں تمہارا کسی سے الجھنا درست نہیں ہے۔ بابا جانی خود سنبھال لیں گے۔'' رانی گل نے اسے شدید طیش میں دیکھ کر سمجھاتے ہوئے کہا۔

''شادی ہونے والی ہے تو چوڑیاں پہن کر بیٹھ جاؤں، اور دشمنوں کو کرنے دوں من مانی؟ ہونہہ...... میرے مرنے کے بعد ایسا ہو سکتا ہے لیکن میری زندگی......''

''اللہ کرے، اچھی بات منہ سے نکالا کرو لالہ، ایسی منحوس باتیں کیوں کرتے ہو۔''

رانی گل نے دہل کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ اس کے غصے و طیش میں سر مو فرق نہیں آیا تھا۔

وہ دونوں چلی گئیں تھیں۔ وہ بائیں رکھی گن اٹھا کر کھیتوں کی سمت چلنے لگا جو سرسبز پہاڑوں کے بالمقابل تھے۔ ابھی وہ چند قدم چلا تھا کہ اچانک خاموش فضا فائرنگ کی تڑ تڑ کی آوازوں سے گونج اٹھی۔

☆☆☆

''پیپر شروع ہونے میں ٹائم ہے ابھی، کیوں نہ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر چائے اور گرما گرم سموسوں کی زیارت کی جائے۔'' فارحہ نے رسٹ واچ دیکھتے ہوئے تجویز دی۔

"تمہیں ہر وقت کھانے کی سوجھتی رہتی ہے۔ یہاں جان پر بنی ہوئی ہے۔ آخری پیپر ہے خدا کرے یہ بھی اچھا جائے۔" سنبل نے حسب عادت اسے جھڑکا تھا۔

"محنت کبھی رائیگاں نہیں جاتی ڈیئر سسٹر، اللہ پر بھروسا رکھو۔" فارحہ اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر مسکرا کر گویا ہوئی اور ان دونوں کو کیفے ٹیریا میں لا کر ہی چھوڑا۔

"ورشا! تم بہت خاموش و گم صم رہنے لگی ہو جب سے ایگزامز شروع ہوئے ہیں۔" سنبل میز کی سطح پر انگلیاں پھیرتی خاموش و اداس ورشا سے مخاطب ہوئی۔

"شاید..... تمہیں ہم سے بچھڑنے کا دکھ ہے اور جامعہ چھوڑنے کا بھی۔"

"ہاں..... جب میں گاؤں سے یہاں آنے کی تیاری کر رہی تھی، وہاں سے یہاں آنے تک میرے تصور میں تم لوگوں کا امیج بہت خراب تھا۔ میں سوچ رہی تھی بابا جان کے دوست کی فیملی بھی ایسی ہی دقیانوسی اور زنگ آلود ذہنیت کے جاہل لوگوں سے پر ہوگی، جیسے بابا جان کے ملنے جلنے والے لوگوں کے خاندان ہوتے ہیں مگر یہاں آ کر میں نے تم لوگوں کے نئے اور خوب صورت روپ دیکھے۔ تم لوگوں سے مل کر مجھے محسوس ہوا عورت محکوم پیدا نہیں ہوئی، وہ بھی مرد کے برابر حقوق و عزت رکھتی ہے۔ وہ بہت مقدس و معتبر درجہ رکھتی ہے۔ کچھ تنگ ذہن مردوں نے اسے تیسرے درجے پر لا کر ذلت و رسوائی سے اس کے پاک و نورانی آنچل پر غلاظت کے چھینٹے ڈال دیئے ہیں۔ میں نے بچپن سے شعور کی آگہی تک عورت کو اپنے مقام سے پست دیکھا ہے۔ صبح سے رات تک بے زبان جانور کی طرح گھر کا کام کرنے کے علاوہ باہر بھی مردوں کے ساتھ شانہ بشانہ کام کرتی ہیں، علاوہ اس کے سسرال کی خدمت کرنا، بچوں کی نگہداشت کرنا اور شوہر کے لیے تو وہ ہوتی ہی بے دام کی غلام ہے جو اس کی خدمت بھی کرتی ہے، اس کے گھر، بچوں، ماں باپ کو بھی سنبھالتی ہے اور پھر بھی دھتکاری جاتی ہے۔ مار اور تحقیر و تضحیک سے ہمہ وقت نوازی جاتی ہے اور اکثر اپنے باپ، بھائیوں کے کردہ گناہوں کے تاوان میں بھیڑ بکریوں کی طرح دی بھی جاتی ہے اور زبان سے حرف شکایت نہیں ادا کرتی۔"

"کیا تمہارے قبیلے میں بھی ایسی روایات ہیں؟" سنبل اسے آزردہ و ملول دیکھ کر استفسار کر بیٹھی کہ آج اتنے عرصے میں پہلی بار اس نے اپنے احساسات بیان کیے تھے۔

"ہمارا قبیلہ ان روایات میں سب سے آگے ہے سنبل، وہاں عورت کی کوئی وقعت نہیں ہے۔ جانوروں سے محبت کی جاتی ہے مگر عورت ایسے رشتے سے نابلد ہے۔"

"اوہ..... تم اب کیا کرو گی، وہاں جا کر۔ میرا مطلب ہے اتنے گھٹے ہوئے ماحول میں تم کس طرح رہ سکو گی؟" فارحہ پریشانی سے گویا ہوئی۔

"جس طرح پہلے رہتی تھی بس تم لوگوں سے بچھڑنے کا ملال بہت زیادہ ہو رہا ہے۔ کچھ حاصل کرنے کے لیے کچھ کھونا پڑتا ہے۔ یہاں گزرا ہوا وقت سنہری یادوں کی مانند مجھے اکثر یاد آیا کرے گا۔" باوجود ضبط کے اس کی آواز رندھ گئی تھی۔

"تم ہم سے ملنے نہیں آیا کرو گی؟ یہ کس طرح ممکن ہے تم نہ آئیں تو ہم تمہیں لینے پہنچ جایا کریں گے۔" سنبل نے جذباتی لہجے میں کہتے ہوئے اپنے آنسو رومال سے صاف کیے۔

''معلوم نہیں، میں اپنے مستقبل سے پرامید نہیں ہوں۔'' وہ از حد دل گرفتہ تھی۔

''ہم ملیں گے انشاءاللہ! چلو یہ چائے اور سموسے ہمارے منتظر ہیں۔'' فارحہ نے تیزی سے اپنے مچلتے آنسوؤں کو بمشکل رومال میں جذب کیا اور ان دونوں کو ٹیبل پر رکھی چائے اور سموسوں کی طرف متوجہ کر کے دھیان بٹانا چاہا۔ ورشا کو امتحان کے بعد گاؤں واپس چلے جانا تھا اور آج آخری پیپر تھا۔ انہیں معلوم تھا اس کا بلاوا آنے والا تھا اور پھر وہ ان سے جدا ہو جائے گی۔ پھر نہ معلوم وہ کب ملے نہ ملے کیوں کہ وہ جان چکی تھیں ورشا کے بابا اور بھائی بہت شقی القلب اور تنگ ذہنیت کے حامل افراد تھے۔ اس عرصے میں وہ اپنی صلح جو، پرخلوص اور کچھ ضدی و اکھڑی طبیعت کے باعث انہیں سب سے عزیز ہو گئی تھی۔ سب سے بہترین اس کی عادت جو انہیں اپنا گرویدہ بنا گئی تھی وہ طبیعت کی از حد سادگی و خوش مزاجی تھی۔ وہ کروڑ پتی سردار کی بیٹی تھی مگر اس کے مزاج و انداز میں تکبر و تفاخر کی رمق نہ ملتی تھی۔ وہ ان میں گھل مل کر رہتی تھی اور اس کی یہی خوبی سب خوبیوں پر بھاری تھی۔

☆☆☆

محبت روگ ہوتی ہے کہا بھی تھا
رلا کر خود بھی روتی ہے کہا بھی تھا
کنارے کے قریب لے جا کر
یہ کشتی کو ڈبوتی ہے کہا بھی تھا
اسے تم دل کی دھرتی کا پتا مت دو
یہ اس میں درد بوتی ہے کہا بھی تھا
محبت میں خوشی کے بعد غم کی رت
بہت نزدیک ہوتی ہے کہا بھی تھا
لٹا کر دل کو رونے سے بھی کیا حاصل
بہت نایاب موتی ہے کہا بھی تھا
ازل سے اس کی فطرت ہے زمانے کو
جگا کر خود سوتی ہے کہا بھی تھا
سر سے پاؤں تک بس راکھ کر دے گی
بہت بے درد ہوتی ہے کہا بھی تھا

''تم شاعری میں وقت گزار رہے ہو یار! امتحان سر پر آ گئے ہیں اور تمہیں کوئی فکر ہی نہیں ہے کیا پیپر زمیں بھی شعر لکھ کر بھیجو گے۔'' باسط اسے اردگرد سے بے نیاز غزل ڈائری میں نوٹ کرتے دیکھ کر جھنجلا کر بولا تھا۔

''میری فکر مت کرو، میرے لیے کتابوں پر ایک نگاہ ڈالنا بہت ہوتا ہے۔''

''اوہ! میں یہ بھول گیا تھا کہ میں ایک 'ذہین وفطین' شخص سے مخاطب ہوں۔ عقل وفراست کے تمام دریا، سمندر تمہارے دماغ میں بہتے ہیں۔'' باسط بہت جلد تپ اٹھا تھا۔

''کوئی شک ہے تمہیں؟'' صارم ڈائری بند کرکے اٹھ گیا۔

''نہیں..... میری یہ مجال کہ میں تم پر شک کروں۔''

''ہاہاہا..... ایک تو تم مذاق بھی نہیں سمجھتے فوراً لیڈیز کی طرح خفا ہونے لگتے ہو۔'' صارم ہنستا ہوا اس کے گلے میں بازو ڈال کر گویا ہوا۔

''تم مذاق بھی بہت سنجیدگی سے کرتے ہو۔ آفتاب اور بہروز نہیں آئے ابھی تک۔ کہہ رہے تھے ساتھ اسٹڈی کریں گے۔'' باسط نے سامنے لگے وال کلاک پر نگاہیں ڈالتے ہوئے کہا۔

''آجائیں گے..... ارے بھئی فدا حسین صاحب! کہاں غائب ہیں آپ؟ چائے کے دیدار کو ترس رہے ہیں ہم، آپ کب تک جلوہ افروز ہوں گے؟'' اس نے بلند آواز میں کہا۔

''تمہاری ان ہی حرکتوں کے باعث وہ خود کو ملازم نہیں، مالک سمجھتا ہے۔ لیکن تم اپنی ان حرکتوں سے باز نہیں رہ سکتے۔ اسے اپنے ملازم ہونے کا احساس دلاؤ۔''

''آپ میرے صاب کو بہتانے کی کوشش نہیں کریں باسط صاب! ان جیسا صاب تو تسی تسی کو ملتا ہے قسمت سے۔'' فدا حسین اسی دم لوازمات سے پُر ٹرالی چائے سمیت اندر لاتا ہوا تفاخر یہ لہجے میں باسط سے مخاطب ہوا۔

''کمبخت! ذرا سی برائی بھی تو کرنے نہیں دیتا اپنی۔''

''آخاہ..... بہت اچھے وقت پر پہنچے ہیں ہم۔ واہ بھئی واہ، فدا حسین! تمہیں ہمارا کتنا خیال ہے۔ آنے سے قبل ہی لوازمات سجا کر بیٹھے ہو۔'' اندر آتے ہی آفتاب اور بہروز نعرے مارتے ہوئے صوفے کی طرف بڑھے جہاں ٹرالی سے پلیٹوں میں لوازمات نکالنے میں فدا حسین مگن تھا۔

''کھانے پینے کی خوشبو کتنی جلد پہنچ جاتی ہے ٹنکی کے پاس۔'' باسط اسے گھور کر گویا ہوا۔

''ٹنکی نہیں..... ٹینک کہیے صاب! ٹنکی نے ٹینک کی صورت اختیار کرلی ہے۔'' فدا حسین، آفتاب کے پیٹ کی طرف دیکھ کر سنجیدگی سے بولا تھا۔ ان تینوں کے بلند قہقہے کمرے میں گونج اٹھے۔

''او شٹ اپ! بندے کی صورت اچھی نہ ہو تو وہ بات تو اچھی کرے۔ تمہیں عزت راس ہی نہیں آتی ہے۔'' آفتاب دھم سے صوفے پر بیٹھتا ہوا بڑبڑایا۔

''سچ بات! برداشت کرنا بہت مشکل ہے پیارے۔'' باسط کھلکھلاتا ہوا گویا ہوا۔

☆☆☆

"گل باز خان! صبر سے بچے اتنا غصہ ایسے جذبات کبھی راہیں آسان نہیں کرتے۔ ایسے معاملات ریشم کے الجھے دھاگوں کی مانند ہوتے ہیں جنہیں نرمی، احتیاط و دانش مندی سے سلجھانا پڑتا ہے۔ اگر ذرا سختی ہاتھ میں آجائے تو نقصان اور پریشانی کی علاوہ کچھ ہاتھ نہیں آتا۔" سفید براق قمیض شلوار میں ملبوس بلند شملے میں ان کی نورانی و پر جلال شخصیت اس عمر میں بھی خاصی پر رعب و وقار تھی۔

"بابا جانی! یہاں معاملہ ریشم کا نہیں طاقت کے گھمنڈ اور ہٹ دھرمی کا ہے۔ شہباز ولی خان اور اس کے بیٹے کیا سمجھتے ہیں۔ وہ جو بدمعاشی کرنا چاہیں گے تو انہیں کوئی روکنے والا نہیں ہوگا۔ کل اس نے ہمارے آدمیوں کو بلاوجہ زمین پر کام کرنے کے دوران فائرنگ کر کے ہلاک کر دیا اور آپ نے جوابا فائرنگ کرنے سے روک دیا۔ ورنہ ان میں سے کوئی بھی زندہ واپس نہیں جا سکتا تھا۔"

گل باز خان کی آواز باپ کے احترام میں دھیمی و پست تھی مگر غصے و افسوس کی بلند چنگاریاں ان کے چہرے اور لہجے سے عیاں تھیں اور ان کے دائیں بائیں بیٹھے سبز خان اور گل ریز خان کے تیور بگڑے بگڑے سے تھے۔ بابا جانی کی عزت و احترام انہیں اپنے جذبات پر قابو رکھنے پر مجبور کر رہی تھی۔

"گل باز خان! میں نہیں چاہتا کہ زمین کے پیچھے انسانوں کا خون بہایا جائے۔"

"ہمارے بندے جو مارے گئے ہیں وہ انسان نہیں تھے؟" گل ریز اٹھ کر گہری سنجیدگی سے گویا ہوا۔

"تھے..... اور ہم نے بہت بہتر لوگ تھے وہ۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ دو مسلمان اگر ایک دوسرے کو قتل کرنے کے ارادے سے آپس میں لڑیں تو جہنمی ہیں۔" اگر ان میں سے کچھ قتل کرنے کا خیال رکھتے ہوں اور کچھ محض اپنے بچاؤ کا تو ایسے لوگ جنت کے حق دار ٹھہرائے جائیں گے۔ ہمارے لوگ اچھی جگہ پر پہنچ گئے۔ ہم نے ان لوگوں کے گھروں کا ذمہ اٹھا لیا ہے۔ انہیں ہر قسم کی سہولت دی جائے گی۔ ہمارے بچوں میں اور ان کے بچوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔"

"اللہ نے بدلہ لینے کا اختیار بھی تو دیا ہے بندوں کو، آنکھ کے بدلے آنکھ، کان کے بدلے کان اور جان کے بدلے جان لینے کا اختیار ہمیں حاصل ہے۔"

"یہ مت بھولو! اللہ فساد کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ بدلہ لینے سے بدلہ نہ لینے والا، معاف کر دینے والا افضل ہے اور اللہ اسے بہت عزیز رکھتا ہے۔ اس کی رضا میں راضی رہنا ہمارے لیے بہتر ہے میرے بچو۔"

وہ ان کے اندر پلتے انتقام و بدلے کے جوش کو محسوس کر رہے تھے اور جانتے تھے یہ وہ شعلے ہیں جو ایک بار بھڑک گئے تو کئی نسلوں کو بھسم کر کے بھی نہیں بجھیں گے۔ انسانی خون سے رنگین ہونے والی زمین اپنی کوکھ میں ان گنت جسموں کو سمیٹے اور جسموں کی منتظر تھی اور وہ اب ایسا نہیں چاہتے تھے کہ ان کی اولادوں کی اولاد بھی عمر سے قبل ہی مٹی کی آغوش میں پہنچ جائے۔

"بابا جانی! ظالم کے ظلم سہنا بذات خود ظلم کا ساتھ دینے کے مترادف ہے۔ شہباز ولی خان اور شمشیر ولی خان کے ظلم کی آپ پردہ پوشی کر رہے ہیں۔ پہلے بھی اس نے مجھ پر حملہ کیا تھا جو آپ کی بدولت دب گیا تھا۔ میں نے بھی اسے خاموشی سے آپ کی خاطر درگزر کر دیا تھا۔ اب پھر ان

کی پے در پے زیادتیوں کے باوجود آپ کہہ رہے ہیں ہم انہیں معاف کر دیں؟ بھول جائیں سب؟ در گزر سے کام لیں تاکہ وہ سمجھیں ہم ان سے ڈر گئے ہیں۔ چوڑیاں پہن لی ہیں ہم نے۔ نہیں بابا جانی! اب طاقت کا جواب طاقت سے ہی دیا جائے گا تاکہ اسے اپنی اوقات یاد رہے۔ شیر کی کھال پہن لینے سے گیدڑ شیر نہیں بن جاتا گیدڑ ہی رہتا ہے۔ اور اس گیدڑ کے لیے صرف ایک جواب کافی ہوگا۔ پھر کبھی وہ خواب میں بھی ایسی جرات نہیں کرے گا۔"
سبریز خان کو اپنے مخلص وباوفا ملازموں کی موت کا از حد ملال تھا۔ وہ کل سے بے قرار ہو رہا تھا۔ شمشیر خان اور اس کے ساتھیوں کو اپنی بندوق کی گولیوں کا نشانہ بنانے کے لیے۔

"غصہ حرام ہوتا ہے بچے، اس لیے ہر مسلمان کو اس سے بچنا چاہیے۔ جاؤ جا کر آرام کرو۔ اگر پھر بھی دل کو چین نہ آئے تو نماز پڑھنے کھڑے ہو جانا۔ نماز پریشانی رفع کرنے، سکون بخشنے کا بہترین اور خوب صورت ذریعہ ہے۔"

"کیا سوچتے ہو خان؟ زمین ایک عرصے بعد پھر لرزتی ہوئی لگ رہی ہے۔ خوشیوں سے پہلے واہمے اور خدشات کیوں گھیر لیتے ہیں؟"
ان تینوں کے جاتے ہی بی بی جان اندر کمرے سے نمودار ہوئیں۔ ان کے سرخ و سپید جھریوں زدہ چہرے پر تفکرات کی پرچھائیاں ثبت تھیں۔ چہرے کی ہر جھری سے ایک المناک داستاں عبارت نظر آتی تھی۔

"ایسی بات نہیں کرو گل زریں، ہم اب زمین کو اپنے قدموں سے نہیں نکلنے دیں گے۔ میں کل ہی شہباز والی خان کے پاس دوستی کا پیغام لے کر جاؤں گا۔" وہ پرعزم لہجے میں گویا ہوئے۔

"ایسا مت کرنا خان! وہ بہت کٹھور اور سنگ دل آدمی ہے۔ نہیں مانے گا۔ اس طرح ہمارے بچے بھی نہیں مانیں گے۔ کہیں بات مزید نہ بگڑ جائے؟ کچھ دنوں بعد گھر میں سبریز کی شادی کی خوشیاں شروع ہونے والی ہیں۔ ایک مدت بعد اس حویلی کی دیواریں خوشیوں اور رنگوں سے جگمگائیں گی۔ تم چاہتے ہو یہاں پھر صف ماتم بچھ جائے؟" وہ لرزتی آواز میں بولیں۔

"میں اس حویلی کی روٹھی ہوئی خوشیوں کی خاطر ہی تو پہل کرنا چاہتا ہوں گل زریں! بچے ہوشیار ہو گئے ہیں اور میں نہیں چاہتا گزرا ہوا وقت پھر دوبارہ لوٹ آئے اور ہم پھر تہی دست، تہی داماں ہو جائیں۔" ان کے لہجے میں گزرے وقت کی پرچھائیاں تھیں۔

"صارم خان آ جائے تو اس کے نام کی انگوٹھی زرگون کی انگلی میں پہنا کر اسے پابند کر لیں۔ خوب سجے گی دونوں کی جوڑی۔" ان کو پریشان و غم زدہ دیکھ کر انہوں نے خوب صورتی سے موضوع بدلا تھا۔

"گل باز خان سے بات کی تھی تم نے؟" صارم کے ذکر پر ان کے چہرے پر محبتوں کے چراغ جل اٹھے تھے۔

"ہاں۔ میں نے کہا تھا، اس نے کہا کہ ابھی یہ بات اپنے تک ہی محدود رکھوں۔ اس نے بچوں سے بھی ذکر کرنے کو منع کیا تھا۔ اس کا کہنا ہے صارم خان تعلیم پوری کر کے آ جائے۔ اپنے باپ کا منصب سنبھال لے۔ پھر اس کی منشاء کے مطابق فیصلہ ہوگا۔ اگر وہ چاہے گا کہ زرگون خانم سے شادی کرے تو وہ حامی بھرے گا ورنہ زبردستی نہیں ہوگی۔"

"بہت دانش مندانہ فیصلہ ہے گل باز خان کا۔ مجھے امید ہے صارم اسے مایوس نہیں کرے گا۔ زرگون خانم ہماری برادری کی سب سے پیاری بچی ہے۔"

☆☆☆

ایک بات کہوں گر سنتے ہو
تم مجھ کو اچھے لگتے ہو
کچھ چنچل سے کچھ چپ چپ سے
کچھ پاگل پاگل لگتے ہو

''بند کرو یہ تمہارا فضول مشغلہ مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ ابھی امتحان سے فارغ ہوئے دو دن گزرے ہیں۔ قلم و کاغذ کو دیکھنے کی طبیعت گوارہ نہیں کر رہی۔ یہاں بور کام ہو رہا ہے۔'' سنبل نے اندر داخل ہو کر فارحہ کے ہاتھ سے میگزین چھینا تھا۔

''تم تو ہو ہی بدذوق۔'' فارحہ نے پین اور ڈائری احتیاط سے بند کر کے ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا۔

''شعروشاعری مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتی، اب بدذوق کہو یا بدنصیب۔''

''اچھا..... میرا دماغ کیوں کھانے آئی ہو؟''

''یعنی دنیا میں تمام اچھی اچھی چیزیں کھانے کی ناپید ہوگئی ہیں۔ جو میں تمہارے دماغ میں بھرا ''بھوسا'' کھاؤں گی۔'' سنبل آرام سے بیٹھ کر اسے چڑاتے ہوئے بولی۔

''بھوسا بھرا ہوگا تمہارے دماغ میں۔ میرا دماغ تو.....''

''بھوسے سے بھی محروم ہے۔'' اس نے اگلی بات قطع کر کے جلدی سے کہا تو وہ بے ساختہ اس کے ساتھ ہنس پڑی۔

''اول نمبر کمینی ہو تم۔'' فارحہ ہنستی ہوئی گویا ہوئی۔

''نوازش، کرم، شکریہ، مہربانی۔'' اس نے فدویانہ انداز میں کہا۔

''ورشا سو کر نہیں اٹھی ابھی؟''

''اٹھ گئی ہے۔ باتھ لے کر آ رہی ہے۔''

''سنبل! ورشا چلی جائے گی، ہم کتنا مس کریں گے اسے۔''

''یہ بات میں بھی سوچتی ہوں تو مجھے گھبراہٹ ہونے لگتی ہے۔ بلکہ ہر آہٹ پر مجھے محسوس ہوتا ہے اس کے بابا آ گئے ہیں۔''

''تم لوگ مجھ سے ملنے گاؤں آنا۔ میں تمہیں وہاں کی سیر کراؤں گی۔ تم دونوں بہت خوش ہو گی وہاں کے حسین دلربا مناظر دیکھ کر۔'' ہلکے سادے سوٹ پر لیدر کی واسکٹ پہنے اپنے فریش چہرے پر دھیمی مسکراہٹ سجائے سیاہ گھنے بال پشت پر بکھیرے، بلکوں سحر انگیز آنکھوں سے روشنیاں چھلکاتی وہ ان کے درمیان کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔

''ورشا! تمہارے قبیلے میں بہت چھوٹی عمر میں منگنی کر دیتے ہیں۔ کیا تم بھی کہیں انگیج ہو؟'' سنبل نے اس کے دمکتے چہرے پر نگاہ ڈالتے ہوئے پوچھا۔

''میں......؟ہاں ہوئی تھی منگنی۔لیکن صرف تین ماہ تک۔''

''کیا مقصد؟اتنی جلدی منگنی ٹوٹ گئی؟''

''نہیں منگنی نہیں ٹوٹی تھی۔منگنی کرنے والا ٹوٹ گیا تھا۔''وہ مسکائی

''پلیز ورشا!وزیبت بتاؤ نا کیا ہوا؟''دونوں کا تجسس عروج پر تھا۔

''جس سے میری منگنی ہوئی تھی وہ میرے چچا دلبر خان کا تین ماہ کا بیٹا تھا۔''

''وہاٹ؟تم مذاق کر رہی ہو؟''وہ دونوں حیرانگی سے اچھل پڑیں۔

''میں سیریس ہوں۔۔۔ مذاق تو ہم جیسی لڑکیوں کے ساتھ تقدیریں کرتی ہیں۔تم لوگوں کے لیے یہ یقیناً ناقابلِ یقین بات ہوگی مگر ہمارے ہاں اکثر ایسے بے جوڑ رشتے قائم کیے جاتے ہیں کبھی چھ سالہ بچی ساٹھ سالہ بوڑھے کی بیوی بنادی جاتی ہے۔تو کبھی بیس سالہ لڑکی نومولود بچے سے منسوب کر دی جاتی ہے اور بعض اوقات لڑکیاں بر پیدا ہونے کے انتظار میں بوڑھی ہوکر قبروں میں پہنچ جاتی ہیں۔''اس کے دھیمے لہجے میں محرومیوں اور بے وقعتی کا درد رچا ہوا تھا۔چہرے پر ایک درد ایک سوز بکھرنے لگا تھا۔

''پھر کیا ہوا تھا اسے؟کیا تم اس کے ساتھ زندگی گزارتیں؟''

''اسے اپنے ہاتھوں سے پرورش کرتی۔اس کی خدمت کرتی اور جب وہ جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتا میں بڑھاپے کی سرحد تک پہنچ چکی تھی۔ پھر وہی ہوتا جو ہوتا آیا ہے۔وہ میرے وجود کو راہ میں پڑے پتھر کی طرح ایک ٹھوکر سے دور پھینک کر اپنا راستہ صاف کرتا۔پھر میں تاحیات اس کی دوسری بیوی اور بچوں کی خادمہ بن کر گزارتی لیکن جو عزائم بلند اور نیک رکھتے ہیں ان کا اللہ ساتھ ضرور دیتا ہے۔میرے بھرپور احتجاج وانکار کے باوجود میری ایک نہ چلی تھی اور زبردستی مجھے چند روزہ بہرام خان سے منسوب کر دیا گیا تھا کیوں کہ میرے جوڑ کا کوئی لڑکا برادری میں نہ تھا اور ایک عرصے بعد لڑکے کی پیدائش ہوئی تھی۔بہرام تین ماہ کا تھا کہ ایک دن سانپ نے اسے ڈس لیا اور وہ فوراً ہلاک ہوگیا تھا۔یوں میری جان اس سے آزاد ہوئی تھی اور میری ضد پر بابا نے مجھے پڑھنے بھیجنے کی اجازت دی تھی۔''اس نے کہہ کر کرسی کی بیک سے سر ٹکا کر آنکھیں موندلی تھیں۔

''کیا وہ زندہ رہتا تو تم اس سے رشتہ نبھاتیں؟''سنبل حیران بھی تھی اور دکھی بھی۔

''مائی فٹ،جان سے نہیں مار دیتی میں اسے۔''وہ دانت بھینچ کر سرد مہری سے بولی۔

''لیکن تمہارے ہاں ایسے بے جوڑ رشتے کیوں کیے جاتے ہیں؟''

''تاکہ گھر کی دولت گھر میں رہے۔زر،زمین کی محبت بیٹیوں سے بڑھ کر ہے۔''

''کیا اب بھی تم کو کوئی ایسا ہی پرپوزل ملے گا؟''ان دونوں کو حقیقتاً اس پر ترس آرہا تھا۔اتنی حسین خوب صورت اور نوخیز حسن کی وہ مالک تھی اور نصیب کتنا سیاہ بدصورت تھا۔

''پرپوزل؟ہمارے ہاں جو ایک بار کسی سے منسوب ہوگیا تو آخری سانس تک اس سے ہی منسوب رہتا ہے۔بہرام خان مر گیا میرا بخت

بھی اس کے ساتھ دفن ہو گیا.....اب ساری زندگی مجھے اسی کے نام پر گزارنی پڑے گی اور مجھے یہ رسم و قانون اپنی برادری کا دل و جان سے پسند ہے۔ میں خوشی سے اپنی زندگی اس کے نام کے ساتھ گزار دوں گی۔ جو اس رشتے کے مفہوم سے بھی نا آشنا تھا۔" اس کا لہجہ بے حد پرسکون و مضبوط تھا۔ فارحہ اور سنبل سناٹے میں رہ گئی تھیں۔

☆☆☆

سورج خاصا بلند ہو چکا تھا۔ سبزے پر اس کی سنہری شعاعوں کا عکس بہت سندر اور دیدہ زیب لگ رہا تھا۔ اخروٹ کے گھیرے دار درختوں کی شاخوں پر پرندے خوب شور کر رہے تھے۔ پرسکون ماحول میں ان کی چہچہاہٹوں نے زندگی دوڑا دی تھی۔ سردار افضل خان نے جیپ سے اتر کر ملازموں کو وہیں رکنے کا حکم دیا۔

"سردار! دشمن سے کبھی بھی بے پروائی نہیں برتنی چاہیے۔ شہباز خان بزدلوں کی طرح پیچھے سے وار کرنا اپنی بہادری سمجھتا ہے۔ آپ کا اس طرح تنہا اور بغیر اسلحہ کے جانا مناسب نہیں ہے۔ سردار! میں آپ کے ساتھ چلوں گا۔" ان کے وفادار و جاں نثار ملازم کا بیٹا ان کے سامنے مودبانہ کھڑے ہو کر گویا ہوا۔

"نہیں طور خان! ہم برائی کی نیت سے اس کی حویلی کی سمت نہیں جا رہے۔ ہمارا ارادہ دوستی کرنے کا ہے۔ اسلحہ ہماری راہ کی دیوار بن جائے گا اور تم کو یہیں رک کر ہمارا انتظار کرنا ہے۔" ان کے فیصلہ کن لہجے اور متانت قدمی نے طور خان کو آگے بڑھنے سے روک دیا۔ سردار افضل خان پر وقار چال چلتے ہوئے سرخ پتھر سے بنی سبزے و پھولوں سے ڈھکی پرشکوہ حویلی کی سمت چل رہے تھے۔ حویلی کے بلند و بالا گیٹ پر متعین پہرے داروں نے انہیں اندر جانے سے روک دیا تھا۔ مگر ان کے پرجلال و بارعب سراپا ان کی آنکھوں پر چھائے نرمی و شفقت کے رنگوں کی تاثیر تھی کہ انہوں نے بے چون و چرا ان کے لیے گیٹ وا کر دیا تھا۔ اندر داخل ہو کر انہوں نے ملازم سے اپنے آنے کی اطلاع بھجوائی تھی۔ چند لمحے بعد غیض و غضب سے چیختے ہوئے شہباز خان اندر سے برآمد ہوئے تھے۔ ان کے پیچھے شہروز خان تھا۔

"کہاں مر گئے سب؟ کس نے ہمارے دشمن کے لیے دروازہ کھولا تھا؟" وہ افضل خان کو خون خوار نظروں سے گھورتے ہوئے اپنے ملازموں پر گرج رہے تھے۔

"شہباز خان! میں دشمن بن کر نہیں، دوست بن کر اس گھر کی دہلیز عبور کر کے آیا ہوں۔ ہم نے اپنی عمر اپنے مرتبے کی پروا کیے بغیر پہل کی ہے.....تم بھی ہماری دوستی کو قبول کر لو۔" وہ ملامت و شفقت سے ان سے مخاطب ہوئے۔

"شہباز خان کو تمہاری دوستی کی ضرورت نہیں ہے شاہ صاحب! جن قدموں سے تم نے اس گھر کی دہلیز کو پار کیا ہے، ان ہی قدموں سے واپس لوٹ جاؤ.....اگر ہماری برادری میں گھر آئے دشمن کو مردہ واپس بھیجنے کی روایت ہوتی تو خدا کی قسم آج تم زندہ واپس نہیں جا سکتے تھے۔ ہم اپنے بزرگوں کی غیرت کی خاطر تم کو زندہ جانے کا حکم دے رہے ہیں۔" شہباز خان ہتک آمیز لہجے میں دھاڑ رہے تھے۔

"شہباز خان! اس عمر میں جذبات سے نہیں عقل سے کام لیا جاتا ہے۔ کب تک ہم انا و انتقام کی آگ میں اپنی نسلوں کی قربانیاں دیتے

رہیں گے؟ کب تک بھلا؟ ہمارے گھر ویران اور قبرستان آباد ہوتے رہیں گے؟ اگر اس آگ کو نہیں روکا گیا تو سوچ لو ایک دن ہماری شناخت مٹ جائے گی۔ ہمارے قبیلوں کا نام و نشان مٹ کر رہ جائے گا۔"

"ہاں ایسا ہوگا..... اور ضرور ہوگا، میرے قبیلے کا نہیں تمہارے قبیلے کا نام و نشان مٹا دوں گا میں..... ختم کر دوں گا تمہاری شناخت۔" وہ تکبر بھرے لہجے میں بولے۔

"بابا جان! ہمارے گھر آنے والا دشمن بھی ہمارے دوستوں کی طرح عزیز ہوتا ہے۔ پھر شاہ صاحب ہمارے بزرگ ہیں۔ خیر سگالی کا پیغام لے کر آئے ہیں۔ ان کو عزت دینا ہمارا فرض ہے۔ شاہ صاحب کو اندر لے کر چلیے۔" شہروز جو خاموش کھڑا سب کچھ سن رہا تھا۔ باپ کا ناروا سلوک و غیر تہذیب لہجہ دیکھ کر آہستگی سے بولا۔

"ابھی تم بچے ہو شہروز خان! اس بوڑھے کی مکاریوں اور چال بازیوں کو نہیں سمجھو گے۔ یہ تلوار سے نہیں پیار کی دھار سے انسانوں کو قتل کرتے ہیں۔ شاہ صاحب! پہلی اور آخری دفعہ معاف کر رہا ہوں۔ آئندہ اس طرح میرے گھر کی طرف اٹھنے والے قدموں کی واپسی چار کاندھوں پر ہوگی۔ شہباز خان اپنے دشمنوں سے صرف دشمنی نبھانا پسند کرتا ہے اور بس۔"

"شہباز خان! دل کو وسعت دو۔ دماغ کو روشن رکھو۔ دشمنی صرف موت دیتی ہے اور دوستی سے زندگیاں جنم لیتی ہیں۔ ٹھنڈے دل سے غور کرو میری باتوں پر۔ اس وقت غصے میں ہو اس لیے پھولوں بھری راہ، تمہیں کانٹوں سے اٹی نظر آ رہی ہے..... تم سوچ لو۔ ہم پھر بات کریں گے۔" ان کی از حد بدتمیزی و گستاخی کے باوجود ان کے چہرے پر ناگواری کا احساس تک نہ ابھرا تھا۔ وہ ایسے ہی پر وقار پرسکون انداز میں ہاتھ میں پکڑی چھڑی کے سہارے کھڑے تھے۔ جب کہ شہروز باپ کے رویے و انداز گفتگو پر نادم شرمسار ہو رہا تھا۔

"میں نے کہا نا میں دوستی نہیں کروں گا۔ میں بزدل نہیں ہوں۔ جو ڈر کر دوستی کا ہاتھ بڑھا دوں۔ بہادر اور شیر بیٹوں کا باپ ہوں۔" وہ اکڑ کر تفاخر سے بولے۔ اس اثناء میں شمشیر خان بھی اندر سے آ گیا تھا۔ اس کی کینہ توز نگاہیں افضل خان کو گھور رہی تھیں۔ اس نے آ کر اکھڑ لہجے میں باپ سے ان کی آمد کے بارے میں دریافت کیا تھا۔ اس کے بگڑے تیور، اکڑا ہوا وجود اس امر کی گواہی تھے کہ اسے بھی افضل خان کا وہاں آنا نہیں بھایا تھا اور شہباز خان نے تمسخرانہ انداز میں ان کے آنے کی وجہ بتائی تو وہ بھی فخر و غرور، طاقت و بڑائی کے زعم میں قہقہے لگانے لگا تھا۔

"دیکھا بابا جان! آپ مجھے منع کر رہے تھے کہ میں نے بلاوجہ ان کے بندوں کو ہلاک کیوں کیا۔ دیکھ لیں آج کے دور میں طاقت ور سے سب کس طرح ڈرتے ہیں۔ یہ بہادروں کی طرح بدلہ لینے کی بجائے دوستی کا ہاتھ بڑھانے چلے آئے ہیں۔ ہا..... ہا..... بزدلوں کی، کمزوروں کی یہی نشانی ہوتی ہے۔ وہ اپنے سے طاقت وروں کو دوستی کی زنجیر پہنا کر قید کر لیا کرتے ہیں لیکن شمشیر خان ایسے لوگوں پر تھوکنا بھی پسند نہیں کرتا۔" اس نے حقارت آمیز لہجے میں کہا۔

"شمشیر خان! حد ادب کو پار نہ کرو۔ شاہ صاحب ہمارے بزرگ ہیں۔" شہروز غصے سے اسے سرزنش کرتا ہوا بولا۔

"بزرگ ہوگا یہ اپنے گھر کا..... ہمارا صرف دشمن ہے۔" جواباً وہ بھی پھنکار کر گویا ہوا تھا۔

''بہت خوب شہباز خان، لاجواب تربیت کی ہے تم نے۔ میں برا نہیں مانوں گا۔ قصور اس بچے کا نہیں بلکہ پرورش کرنے، تربیت دینے والے ہاتھوں کا ہے۔'' وہ تاسف وافسردگی سے گویا ہوئے۔ ''ہم جا رہے ہیں۔۔۔۔ مگر ہماری پیش کش برقرار ہے۔''

''دوستی ہو سکتی ہے۔ مگر چھوٹی سی شرط ہوگی اس کے لیے۔'' شمشیر خان یکلخت پراسرار لہجے میں گویا ہوا۔

''دماغ درست ہے؟ کیسی بات کرتے ہو خاناں!'' شہباز خان غرا کر پلٹے تھے۔

''صبر سے بابا جان صبر سے۔ مجھے جواب تو سننے دیں۔ امن کے پیامبر صاحب کا۔''

''کہو بچے، اگر میرے اختیار میں ہوئی تو ضرور پوری کروں گا۔''

''آپ کر سکتے ہیں۔ آپ کے ہی اختیار میں ہے۔ سرمئی پہاڑیوں والا علاقہ میرے نام کر دیں۔ ہماری دشمنیاں دوستی میں بدل جائیں گی۔'' شمشیر خان، مسکرا کر معنی خیز لہجے میں بولا۔

''یہ ممکن نہیں ہے۔ وہ زمین میری نہیں۔۔۔۔ میرے بچوں صارم اور سبریز کی ہے۔ وہ ہم ان کے علاوہ کسی دوسرے کو نہیں دے سکتے۔ امانت میں خیانت ہمارا شیوہ نہیں ہے۔'' وہ اٹل و بے لچک انداز اور سخت لہجے میں گویا ہوئے۔

''پھر دشمن کو زندہ چھوڑ دینا میرا شیوہ نہیں ہے۔''

شمشیر خان نے غضب ناک ہو کر کاندھے سے لٹکی رائفل یک دم سیدھی کر کے ان کا نشانہ لے کر ٹریگر دبا دیا تھا۔ دھماکے کے ساتھ بلند چیخ فضاؤں میں بکھر کر رہ گئی۔

☆☆☆

فائر کی آواز اور چیخ فضا میں گونج اٹھی تھی۔ شہروز خان جو شمشیر خان کی جلد باز اور بے سوچے سمجھے جذباتی فیصلے کرنے والی طبیعت سے واقف تھا۔ وہ مسلسل اس کے چہرے اور تاثرات کا جائزہ لے رہا تھا۔ شاہ بہرام کے انکار کے جواب میں اس نے اس کے چہرے پر یکلخت در آنے والی سفاکی وجھنجلاہٹ، غصے کی یلغار کے رنگ، فوراً پہچان کر لمحہ بھر میں، سرعت سے آگے بڑھ کر شاہ بہرام کی سمت اٹھنے والی رائفل کا رخ، عین اسی لمحے اپنے ہاتھوں سے، شمشیر خان کے ہاتھ پر زبردستی کر کے، اوپر کی سمت کر دیا تھا۔ جب وہ فائر کرنے ہی والا تھا۔ رائفل سے نکلی ہوئی گولی کھلی فضا کی وسعتوں میں گم ہو چکی تھی۔ اس نے شمشیر خان سے رائفل چھینتے ہوئے تعجب آمیز نگاہوں سے سامنے کھڑی زاروقطار روتی ہوئی خانم گل کو دیکھا تھا۔ شمشیر خان کو فائر کرتے دیکھ کر وہ بے اختیار اندر کھڑکی سے سب دیکھتی ہوئی چیختی ہوئی وہاں آئی تھیں۔

''گل خانم۔۔۔ تمہیں جرأت کیسے ہوئی؟ اس طرف قدم رکھنے کی۔ جانتی ہو اس کا انجام؟'' شہباز خان کی آنکھوں میں لہو اتر آیا تھا۔ انہیں اس جگہ موجود دیکھ کر شاہ بہرام خان کی ضعیف نگاہیں ایک ٹک گل خانم کو دیکھ رہی تھیں۔ جن کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔ ان کی سبز آنکھوں میں ایک چہرہ، ایک سراپا، ایک تصویر گویا دوبارہ زندہ ہو گئی تھی۔

''خان، شاہ بابا کو جانے دو۔۔۔۔ خدا کے لیے میں ہر سزا بھگتنے کو تیار ہوں۔'' گل خانم گڑگڑاتے ہوئے ان کے قدموں میں جھک گئی تھیں۔

''دفع ہو جاؤ بے حیا عورت!'' انہوں نے پرجلال انداز میں ایک ٹھوکر مار کر انہیں دور پھینکا تھا۔ شہروز نے بڑھ کر گرتی ہوئی گل خانم کو سنبھالا تھا۔

''شہباز خان! جو عورت کی عزت کرنا نہیں جانتا وہ مرد نہیں جانور ہوتا ہے۔'' گل خانم کی ذلت و بے عزتی شاہ افضل خان برداشت نہ کر پائے۔ آہستگی سے گویا ہوئے۔ ان کے لہجے میں تاسف و افسردگی تھی۔ آنکھوں میں موتیوں کی جگمگاہٹ پھیلنے لگی تھی۔

''اپنی راہ پر واپس لوٹ جاؤ، شاہ، مجھے سبق پڑھانے کی ضرورت نہیں ہے۔'' شہباز خان گرج کر گویا ہوئے تھے۔

''تمہاری مرضی ہے شہباز خاناں میں دوستی کا جذبہ لے کر آیا تھا کہ تم خوش آمدید کہو گے کیونکہ میں نہیں چاہتا کہ ہماری نسلیں دشمنی کی آگ میں جلتی رہیں۔'' شاہ افضل خان پرامید نگاہوں سے ابھی بھی ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ شمشیر خان کی گستاخی و بدتمیزی کو انہوں نے حوصلے اور ظرف سے نظر انداز کر ڈالا تھا۔ یہ ان جیسے استقامت پسند، اعلیٰ ظرف، صلح جو اور دوست نواز طبیعت کا اعجاز تھا ورنہ وہ بھی اگر شہباز خان اور شمشیر خان کی طرح بدتہذیب و طاقت کے گھمنڈ میں بداخلاق گھٹیا ذہنیت کے مالک ہوتے تو پھر ایک نئی جنگ اسی آنگن میں چھڑ چکی ہوتی جس کا خمیازہ آنے والی کئی نسلیں تک بھگتتی رہتیں۔

''ہم آفریدی ہیں شاہ افضل خان، ہم گیدڑ نہیں ہیں جو خوفزدہ ہو کر تمہاری دوستی قبول کر لیں۔ ہماری نسلیں پیدا ہی بدلہ لینے کے لیے ہوتی ہیں۔ ہم جب تک سرمئی پہاڑیوں والا علاقہ حاصل نہیں کر لیں گے سکون سے نہیں بیٹھیں گے جاؤ چلے جاؤ۔''

''تم بہت بزدل اور کم ظرف ہو شہباز خان! ہمارے قبیلے میں گھر آئے دشمن کے کتوں کی بھی مہمان نوازی کی جاتی ہے۔ کیا ہم جانور سے بھی کم تر ہیں کہ تم دو گھڑی ہمیں اپنے گھر میں بٹھا کر بات نہ کر سکتے تھے۔''

''اپنی اوقات تم اچھی طرح پہچانتے ہو شاہ افضل خان۔'' وہ استہزائیہ انداز میں قہقہہ لگاتے ہوئے گویا ہوئے۔ شاہ بہرام خان کا چہرہ لمحے بھر کو سرخ ہوا آنکھوں میں غیض و غضب کی بجلیاں کوندیں تھیں مگر پھر فوراً ہی انہوں نے خود پر قابو پالیا اور چند لمحے ڈبڈبائی آنکھوں سے بے آواز روتی ہوئی خانم گل کو دیکھتے رہے۔ پھر ان کے بوجھل قدم گیٹ کی طرف اٹھنے لگے۔ ان کے چہرے پر دکھ کی گہری پرچھائیں تھیں، تکلیف و رنج ان کی شکست خوردہ قدموں سے اور دھواں دھواں چہرے سے مترشح تھا۔

''شہروز لالہ! آج آخری بار میں نے تمہیں معاف کر دیا ہے کہ میں نہیں چاہتا تھا کہ دشمن ہمارا تماشہ دیکھے، آئندہ میری راہ میں آنے کی کوشش مت کرنا۔ غصے میں میں سب مروت و لحاظ بھول بیٹھتا ہوں پھر شکایت مت کرنا۔'' شاہ افضل خان کے جانے کے بعد وہ شمشیر خان جو خاموش کھڑا اپنے غصے و اشتعال پر قابو پا رہا تھا ایک دم شہروز خان سے مخاطب ہوا۔

''مروت و لحاظ کیا بھولو گے تم، انسانیت و اخلاقیات بھول بیٹھے ہو۔''

''بس... بس میں فضول بات سننا پسند نہیں کرتا۔ میں نے تمہیں سمجھا دیا ہے۔'' وہ دھپ دھپ کرتا اسے قہر آلود نگاہوں سے گھورتا ہوا اندر کی سمت بڑھ گیا۔

''بابا جان! مجھے آپ سے بھی یہ امید نہیں تھی۔ گھر آئے مہمان کی اتنی ذلت و ہتک ہمارے ہاں کی جا سکتی ہے؟ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔'' وہ تاسف بھرے لہجے میں ان سے مخاطب ہوا۔

''شہروز خان! تم نہیں سمجھو گے بچے، ان باتوں کو یہ سیاسی باتیں ہوتی ہیں۔ اپنا پلڑا بھاری کرنے کے لیے یہ چالیں چلی جاتی ہیں۔ ہم ایسی باتوں کو خوب سمجھتے ہیں۔''

☆☆☆

''ورشا! حمزہ بھائی کا فون آیا تھا۔ ان کی طرف سے آج ہم انوائیٹ ہیں ڈنر پر۔'' فارحہ نے باتھ روم سے برآمد ہونے والی ورشا کو مسرت سے لبریز لہجے میں اطلاع بہم پہنچائی۔

''کہاں.....؟'' اس نے بالوں سے تولیہ ہٹاتے ہوئے استفسار کیا۔

''سی ویو.....''

''میں نہیں جاؤں گی پچھلی مرتبہ انکل، آنٹی کے ساتھ گئی تھی سمندر اتنا خوف ناک و سیاہ لگ رہا تھا کہ میں تمام وقت اس سے نگاہیں چرا رہی تھی۔'' ورشا نے بالوں میں برش کرتے ہوئے انکار کیا۔

''آج کل چاندنی راتیں ہیں اور ایسے میں سمندر کا حسن خوب نکھرتا ہے۔ بہت سحر انگیز پرسکون فضا ہوتی ہے۔ تم دیکھو گی تو مبہوت رہ جاؤ گی چلنا ضرور میرے کہنے پر ہی حمزہ بھائی نے پروگرام بنایا ہے۔''

''سنبل کیا کر رہی ہے؟''

''پورا وارڈ روب پھیلائے بیٹھی ہے۔ اسے کوئی سوٹ پسند ہی نہیں آ رہا۔''

''اچھا..... کپڑوں کی تو اس کے پاس کوئی کمی نہیں ہے۔''

''جب دماغ میں خلل واقع ہو جائے تو ایسا ہی ہوتا..... وہ اپنی اور حمزہ بھائی کی چوائس مشترکہ طور پر پوری کرنا چاہ رہی ہے۔ فی الحال تم اپنی فکر کرو ٹھہرو میں تمہارے لیے سوٹ منتخب کرتی ہوں۔ تم بہترین ڈریسنگ کرنا ہم وہاں تصویریں بھی بنوائیں گے تاکہ تمہارے ساتھ گزرے ان آخری لمحوں کی یادگاریں ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو جائیں اور جب تمہاری یاد ستائے تو آنکھوں کی پیاس تمہاری دید سے سیراب کر سکیں۔'' یکدم ہی آنکھوں میں در آنے والی نمی کو پوشیدہ کرنے کیلئے وہ وارڈ روب کی سمت بڑھ گئی۔ ورشا نے بھی بمشکل اپنی کیفیت پر قابو پایا تھا۔

امتحانات سے فراغت کے بعد وہ ہر لمحہ ایک دوسرے کی قربت میں زیادہ سے زیادہ گزارنے کی سعی کرتی تھیں۔ گزرتے ماہ و سال میں وہ محسوس ہی نہ کر سکیں کہ وہ آپس میں محبت کے گہرے بندھن میں بندھ چکی تھیں جن کی نزاکت کا احساس انہیں اب ہوا تھا۔ رخشندہ بیگم اور ذیشان صاحب بھی اسے بہت وقت دینے لگے تھے کہ وہ بھی جانتے تھے ورشا چلی گئی تو کوئی معجزہ ہی اسے دوبارہ یہاں لا سکتا ہے۔ ایسے میں حمزہ بھی اپنی مصروفیات ترک کر کے ان کے ساتھ آملتا تو وہ مسرت و شادمانی کے احساس سے خود کو خوش نصیب سمجھنے لگتی کہ اتنی ڈھیروں بے لوث و بے غرض

محبتوں، چاہتوں، شفقتوں کو پانے والا خوش نصیب ہی ہو سکتا ہے۔

''چاند لاتعداد ستاروں کے جھرمٹ میں اپنی شفاف، شیتل چاندنی پوری طرح نچھاور کر رہا تھا۔ رات کے اس پہر میں جب کہ ایک عالم محو خواب تھا۔ سمندر کے کنارے بے فکرے منچلے و زندہ دل لوگوں کی خاصی تعداد موجود اس خوابناک و رومانٹک ماحول کے لمحے لمحے سے مسرتیں کشید کر رہی تھی۔ جن کے مسرتوں و جذبوں سے تمتماتے چہروں سے ظاہر ہو رہا تھا گویا دکھ و رنج پریشانی و فکروں سے کبھی واسطہ ہی نہ پڑا ہو۔

''ورشا کہاں گم ہو؟ آؤ پانی میں چلتے ہیں۔''

''پانی میں؟...... نہ بابا، میں اس وقت قطعی نہیں جاؤں گی۔ نہ معلوم کون کون سے آبی جانور اس وقت پانی میں موجود ہوں گے۔'' اس نے خوف سے جھرجھری لے کر کہا۔

''مائی گاڈ، ایک تو تم خوفزدہ بہت رہتی ہو کچھ نہیں ہوگا، آؤ تو سہی۔ دیکھو اور بھی تو لوگ ہیں پانی میں کچھ نہیں ہوگا۔'' فارحہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے تسلی دی۔

''ہاں...... ہاں ورشا، چلو بھی انجوائے کرو گی۔'' کار سے نکلتے حمزہ نے اصرار کیا۔

''نہیں حمزہ بھائی پلیز میں آپ لوگوں کی ناراضگی کے خیال سے آ گئی ہوں لیکن اس وقت پانی میں بالکل نہیں جاؤں گی۔ دن کے وقت بھی میں بے فکری سے پانی میں نہیں جا سکتی کہ کوئی سانپ، کیکڑا وغیرہ نہ آ جائے، اس وقت تو میں ایک قدم نہیں چل سکتی۔'' اس کے سادہ معذرتی انداز میں کچھ ایسی بے ساختہ معصومیت و خوفزدگی تھی کہ وہ مزید اصرار نہ کر سکے۔

''فارحہ! تم بھی ورشا کے پاس بیٹھ جاؤ، یہ اکیلی بور ہو گی میں اور حمزہ ایک راؤنڈ لگا کر آتے ہیں۔'' سنبل، فارحہ سے مخاطب ہوئی جو سینڈل اتار کر ان کے ساتھ جانے کی تیاری کر رہی تھی۔ پینٹ سے پائنچے فولڈ کرتے ہوئے حمزہ نے فارحہ کے بگڑتے تیور دیکھ کر بمشکل مسکراہٹ ہونٹوں تلے دبائی تھی۔

''کیوں...... میں کیوں رک جاؤں؟ تم کیوں نہیں رک جاتیں؟'' وہ کمر پر ہاتھ رکھ کر خاصے لڑاکا ٹائپ انداز میں بولی۔

''سمجھا کرو نا؟ کیا اب میں ہڈی بن کر اچھی لگو گی؟'' وہ سرگوشی میں گویا ہوئی۔

''ہاں...... میں دیکھنا چاہتی ہوں ہڈی والا کباب کیسا ہوتا ہے۔''

''فارحہ! بحث کیوں کرتی ہو اس قدر کیا ہو جائے گا اگر تم ساتھ نہ جاؤ گی۔'' ورشا نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

''تم بیٹھی رہو، نہ خود آگے بڑھنا نہ دوسروں کو بڑھنے دینا، میں ان کے ساتھ جاؤں گی اور ضرور جاؤں گی کتنا ارمان ہے مجھے چاندنی رات میں سمندر کے کنارے بہتی لہروں پر ننگے پاؤں چہل قدمی کرنے کا۔ آج پہلی بار موقع ملا ہے تو اسے کیوں گنواؤں۔''

''چلو ڈیئر سسٹر! کون منع کر رہا ہے۔ یہ پروگرام ارینج ہی تمہاری خواہش پر کیا گیا ہے۔'' حمزہ پرخلوص مسکراہٹ سے گویا ہوا تو فارحہ نے سنبل کا منہ چڑایا۔ حالانکہ سنبل اسے محض چڑانے کی خاطر چھیڑ رہی تھی۔ اس نے ایک مرتبہ پھر ورشا کو چلنے کو کہا تھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے انکار کر دیا۔

وہ پتھروں سے آہستگی سے اترتے ہوئے نیچے ریت پر اتر گئے تھے۔ ورشا وہائٹ سلک کے چادر نما دوپٹے کو سنبھالتی ہوئی ایک بڑے پتھر پر بیٹھ کر ان کی طرف دیکھنے لگی۔ چاندنی کا غبار ہر سو پھیلا ہوا سحر انگیز طلسماتی دنیا کا کوئی تماشا سا ابھر اور محسوس ہو رہا تھا۔ چاندنی کی مانند چمکتی کرنیں سمندر کی آتی جاتی لہروں پر اپنا حسن لٹا رہی تھیں۔ ان پر اپنی مضبوط گرفت قائم کیے ہوئے تھیں۔ تمام رنج و افکار کے صحراؤں سے وقتی پیچھا چھڑائے لوگ بہت فریش تھے۔ کنول، فارحہ اور حمزہ سامنے لہروں سے کھیلتے ہوئے اس کی طرف دیکھتے ہوئے ہاتھ ہلا دیتے تھے۔ فارحہ وقتے وقتے سے تصویریں بھی اتار رہی تھی۔ ان کے علاوہ بھی کئی کپلز ہاتھوں میں ہاتھ دیئے ارد گرد سے بے نیاز ایک دوسرے سے سرگوشیوں میں مصروف تھے۔

تیرے حسن کی ہے جو دلکشی

تیرے لب کے گلاب ہیں

میرے خواب ہیں

میرے خواب ہیں میری زندگی

میری زندگی میں سراب ہیں

میرے ساتھ ہیں جو بپا ہے

کئی واسطے ہیں عذاب ہیں

میں جو آرزو کے سفر میں ہوں

نہ نظر میں ہوں نہ خبر میں ہوں

کٹے کس طرح یہ سفر میرا

میں ہوں منزلوں سے پرے کہیں

کی دشت میں کسی دور تک

''اسلام علیکم۔'' نسوانی اور بھاری آواز قریب سے ہی ابھری تھی۔ وہ پلٹ کر کھڑی ہو گئی۔

''ہم میں دوستی نہ سہی، شناسائی تو بہر حال ہے اور سلام کا جواب تو اجنبی کو بھی دے دیا کرتے ہیں۔'' وہ اس کی اچانک اور بالکل غیر متوقع آمد سے لمحے بھر کو بوکھلائی تھی مگر پھر خود پر قابو پانے میں اس نے اک لمحہ ضائع نہیں کیا تھا۔ حسب عادت اس کی طرف سے رخ موڑ کر کھڑی ہو گئی تھی۔

''ضروری نہیں..... سلام کا جواب با آواز بلند ہی دیا جائے۔'' وہ رکھائی و سرد مہری سے گویا ہوئی۔

''ضروری نہیں..... ورنہ بندہ مجھ جیسا ہو تو وہ اسی غلط فہمی میں مبتلا ہو کر بار بار سلام دہراتا ہے کہ مقابل نے سنا نہیں۔'' صارم مسکراتے ہوئے گویا ہوا مگر اس بار اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور آگے جھک کر ان تینوں کو دیکھنے لگی جو فاصلے سے آگے چلے گئے تھے۔

''آپ اس قدر کھردرے پن کا مظاہرہ میرے ساتھ کیوں کرتی ہیں؟ حالانکہ میں اپنے رویے کی معافی مانگ چکا ہوں۔ باوجود کوئی خطا نہ

ہوتے ہوئے بھی۔ شوخی وشرارتیں بے فکر و آزاد زندگی کا خاصہ ہوتی ہیں اور نعمتیں کب چھن جائیں کسی کو معلوم نہیں تو کیوں نہ ان کی موجودگی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ہم خود بھی خوش رہیں اور لوگوں میں بھی خوشیاں بانٹیں۔''

وہ، وہائٹ سلک کے ہینڈ ورک سوٹ میں ملبوس چاندنی کا ایک حصہ محسوس ہو رہی تھی۔ سلور جیولری اور شفاف تر و تازہ گلاب کی مانند چہرے پر سادگی میں بھی عجیب دلکشی و ملکوتی حسن تھا۔ بہتی چاندنی و لہروں کے مدھم شور نے ایک طلسم کدے کا روپ دھارا ہوا تھا اور وہ اس سے اسے مغرور اپنے حسن و جمال پر نازاں کوئی ساحرہ لگ رہی تھی جو اپنے حسن کے جلووں سے دیکھنے والوں کو پتھر کا بنا دے اور خود پھر بھی بے خبر و نازاں رہے۔ صارم خان تو حسن کا دیوانہ تھا خود کو بے اختیار سا محسوس کر رہا تھا۔ یہ عجیب بات تھی اس کی موجودگی میں وہ ہر عہد، ہر گریز و ضبط چھوڑ بیٹھتا تھا..... اس بار تو معاملہ ہی دوسرا تھا، وہ اگلے ہفتے گاؤں جا رہا تھا۔ ایگزامز سے فارغ ہوئے چند روز ہوئے تھے۔ بابا جانی اور سبرینہ کئی بار کال کر چکی تھیں کہ وہ آ جائے وہاں شادی کی تیاریں ہو چکی تھیں۔ وہ اپنے کچھ ادھورے کام نمٹانا چاہ رہا تھا جن سے فارغ ہونے کے بعد سبرینہ کی شادی والے دن اسے وہاں پہنچ جانا تھا۔ جانے سے پہلے وہ اس کوشش میں تھا کہ ایک بار ورشا سے ملاقات ہو جائے اور آج وہ اتفاقاً ہی ادھر آ نکلا تھا تو اس کا گوہر مقصود اس کے سامنے تھا، اپنی مخصوص بے رخی، بے پروائی، کٹھور پن و بیگانگی سے پُرانداز کے ساتھ۔

''جائیے، جا کر لوگوں میں خوشیاں بانٹیے، یہاں کیا کر رہے ہیں؟''

''یہاں ہو جو لوگ بھی تو خوشیوں پر حق رکھتے ہیں۔'' وہ اس پتھر پر بیٹھتے ہوئے گویا ہوا جس پر کچھ دیر قبل وہ بیٹھی ہوئی تھی۔

''جائیے آپ یہاں سے۔ میرے پیچھے کیوں پڑ گئے ہیں آپ؟ وہ زچ ہو کر چیخی۔

''آپ کا بے معنی گریز، بے گانگی مجھے مجبور کرتی ہے ورشا، آپ کو معلوم ہے؟ چاند ہمارے لیے اتنا پرکشش اور متاثر کن کیوں ہے؟ کیوں کہ ہم اسے پا لینے کی جستجو و جنون میں مبتلا رہتے ہیں؟..... دراصل ہر وہ شے جو ہماری دسترس سے دور ہو جسے ہم صرف دیکھ سکتے ہوں تو اسے پا لینے کی تمنا اولین بن جاتی ہے حالانکہ یہ ہمیں بخوبی معلوم ہے کہ چاند جو اپنی دلکشی و دلربائی کے باعث نگاہوں کو خیرہ کر دیتا ہے تو دراصل اس کی خوبصورتی ظاہری ہے ورنہ یہ پتھروں کا وجود رکھتا ہے۔''

اس نے چند ساعتیں اس سحر انگیز فسوں خیز چاندنی کے غبار میں نظر آتے اس کے حسین سراپا کو دیکھا گلابوں کی سی رنگت والا چہرہ۔ تیکھے نقوش، ستواں ناک، بھرے ہونٹ، جو کاپر کلر کی لپ اسٹک سے رنگین پرکشش لگ رہے تھے۔ نیلگوں سمندر کا رنگ چرائے آنکھوں میں سمندر کی سی گہرائی تھی ایسے لگا جیسے چاندنی تمام جگمگاہٹ، ستاروں کی چمک اس کی آنکھوں میں مکین ہو گئی ہو..... چاندنی کی ساری دلکشی حسن اس کے چہرے پر سمٹ کر رہ گیا ہو۔

وہ جو حسن کا شیدائی تھا۔

خوبصورتی کا دیوانہ۔

رعنائی و دلکشی کا اسیر۔

اس کے جذبے گویا سمندر کی لہروں کی طرح اس کے اندر تلاطم برپا کرنے لگے۔

وہ خاموش ہو گیا تھا۔ جذبوں کی زبان نہیں ہوتی۔ یہ محسوس کیے جاتے ہیں۔ دل آویز خوش کن مہکار کی طرح جو آپ کے دل میں مسرور کن کیفیت پیدا کر دیں۔

''ورشا! آپ کیوں اسقدر بدگمان و متنفر رہتی ہیں مجھ سے؟'' اس کی مسلسل خاموشی و بیگانگی اسے سوچوں کے بھنور سے پھر کھینچ لائی۔

''میں نے آپ سے کتنی بار کہا ہے آپ میرا نام مت لیا کریں۔ مجھے پسند نہیں ہے کسی غیر کے منہ سے اپنا نام سننا۔'' وہ اس کی طرف رخ کر کے نفرت سے لبریز انداز میں گویا ہوئی..... اس کے انداز پر لمحے بھر کو صارم کی پیشانی شکن آلود ہوئی تھی۔

''میں اسی ''غیریت'' کو دور کرنا چاہتا ہوں۔''

''کیا مقصد ہے آپ کا۔''

''میں..... آپ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ آپ مجھے اپنے گھر کا ایڈریس دیں تاکہ میں اپنے بزرگ، آپ کے گھر بھیجوں۔''

''وہاٹ؟'' نیلگوں جھیلوں میں گویا یکلخت آگ دہک اٹھی تھی۔

''میں نے سلیس اردو استعمال کی ہے آپ اتنا حیرانگی کا اظہار کیوں کر رہی ہیں؟'' وہ اس کی کیفیت سمجھنے کے باوجود مسکراتا ہوا گویا ہوا۔

''آپ کو جرات کیسے ہوئی مجھ سے ایسی بات کرنے کی؟'' وہ بھری آواز میں بولی۔

''میں نے کوئی معیوب یا اخلاق سے گری ہوئی بات نہیں کی ہے اور نہ ہی آپ کوئی سات پردوں میں مخفی رہنے والی کوئی ایسی ہستی ہیں جن سے ایسی بات نہیں کی جا سکتی۔ آزاد اور مخلوط تعلیمی ادارے میں تعلیم حاصل کرنے والی لڑکی کو اتنا متعجب ہونا زیب نہیں دیتا۔'' وہ جو بہت دیر سے خود پر قابو رکھے ہوئے تھا ورشا کا تضحیک و تنفر سے بھرپور انداز اس کے اندر سوئے آفریدی کو جگا گیا تھا۔ جواباً وہ بھی بگڑے تیوروں سے بولا تھا۔

''مائی فٹ! ایک عیاش اور بدقماش شخص کا میں نام بھی لینا گوارا نہیں کرتی۔ اپنی پیشکش کسی اپنی جیسی ہی لڑکی سے کرنا۔ بدکردار مردوں کے ساتھ بدکردار عورتیں ہی زیب دیتی ہیں مسٹر! میں نے مخلوط تعلیمی ادارے میں تعلیم حاصل ضرور کی ہے اور اس تعلیم نے اپنا آپ، اپنا ضمیر اپنا دامن روشن کیا ہے۔ میرے کردار کی چادر بے داغ ہے اور مجھے فخر ہے۔''

''میں عیاش ہوں؟..... بدکردار ہوں؟..... بدقماش ہوں..... بتاؤ تم نے مجھے کب دیکھا ہے یہ سب کرتے ہوئے؟'' وہ گویا انگاروں سے دہکتے صندوق میں مقفل کر دیا گیا تھا۔

''بلاوجہ مجھ سے نہیں جا کر اپنی ان گرلز فرینڈز سے پوچھو اور اب چلے جاؤ یہاں سے۔''

اس وقت وہ ایک سفاک و بے خوف لڑکی لگ رہی تھی۔ اس کے چہرے سے آنکھوں سے، انداز سے معمولی سا بھی ڈر نہیں جھلک رہا تھا..... اپنے مقابل کھڑے قدآور و مضبوط جسم کے مالک صارم کے آگے وہ نازک سی کرسٹل کی حسین ترین گڑیا لگ رہی تھی جسے وہ چاہتا تو لمحے بھر میں چکنا چور کر کے پھینک دیتا۔

''کاش ..... کاش! میں اپنے آپ پر دسترس رکھ سکتا تمہارے معاملے میں تو درشا خان! تم یوں میری توہین کر کے میرے جذبوں کی بے عزتی کر کے سالم تو واپس نہیں جا سکتیں تھیں۔'' اس کے لہجے میں خونخوار شیروں جیسی غراہٹیں پنہاں تھیں۔ ساعت بھر کو درشا کے چہرے کا رنگ پھیکا ہوا تھا لیکن وہ گھوڑوں سے اترتے ان تینوں کو دیکھ کر نارمل ہو گئی تھی۔

''کسی خوش فہمی میں مبتلا نہ ہوں مسٹر! تم میری پرچھائیں پر بھی دسترس نہیں پا سکتے۔''

''چیلنج؟ او کے تو اب بات انا کی جیت کی ہے تو آپ سمجھ لیں آپ کی پرچھائیں ہی نہیں بلکہ آپ پر مکمل دسترس پا کر بات کریں گے۔ صارم خان آفریدی کبھی چیلنج ہارا نہیں کرتا۔ اپنی زندگی سے زیادہ انا کی سرخروئی عزیز رکھتا ہے۔'' وہ ایک نظر ڈال کر اس پر چلا گیا تھا۔ ہٹ دھرمی، ثابت قدمی، ضد و اکھڑ پن اس نے پہلی مرتبہ اس کے اندر محسوس کیا تھا اور وہ شاک نے اچکا کر رہ گئی تھی۔

سبزے کے درمیان آتشی، سفید اور نرغ اور سرخ پھولوں کی بیلوں سے ڈھکے ہٹ نما پختہ مکان کے آگے جیپ آ کر رکی تھی۔ سمندر خان نے پھرتی سے اتر کر جیپ کا گیٹ کھولا۔ لائٹ اسکائی کاٹن کے کڑھائی والے سوٹ پر ہم رنگ کڑھی ہوئی واسکٹ میں ملبوس آف وہائٹ چادر اپنے مخصوص انداز میں شانوں پر ڈالے ہوئے لیدر کی سیاہ بھاری مردانہ سینڈل میں مقید اس کے پاؤں کی دھمک سے ساتھ زمین پر رکھے گئے تھے۔ وہ لہو رنگ آنکھوں سے اس مکان کو گھورتا ہوا جیپ سے برآمد ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر اس وقت خشونت و سفاکی کے تمام رنگ موجود تھے۔

''آیئے خان! ابھی ہے وہ شہر سے آئی حکیم صاحب کی بھتیجی کا مطب۔'' سمندر اپنے خوشامدی و چاپلوسانہ انداز میں فوراً گویا ہوا۔

''خان! سنا ہے یہ ڈاکٹرانی ہماری عورتوں کو بھی بہکا رہی ہے کہ صرف دو بچے پیدا کریں۔'' صمد خان جیپ بند کر کے آ کر اس سے راز دارانہ انداز میں گویا ہوا۔

''خدا غارت کرے، کیسی بے حیا و بے غیرت عورت ہے لو بھلا خدا کے کام میں بھی کوئی مداخلت کر سکتا ہے؟'' سمندر خان زور دار انداز میں اپنے دونوں گال پیٹتا ہوا توبہ توبہ کرنے لگا۔ حسب توقع ان کے ساتھ چلتے ہوئے شمشیر خان کے چہرے کے عضلات سکڑتے جا رہے تھے جو اس کے وحشیانہ پن و اشتعال انگیزی کا اظہار تھے۔

''خان! یہ صاف صاف ہمارا نسل کشی کا پروگرام ہے۔''

''تم فکر مت کرو یار! ایسا کوئی پیدا نہیں ہوا جو ہماری نسل کشی کر سکے۔ ہم نے خان کی طرف سے پہلے ہی پیغام گاؤں کے مردوں کو دے دیا تھا کہ کوئی بھی عورت یا مرد مطب (کلینک) گیا تو شمشیر خان زمین میں دفن کروا دے گا۔ اسی دن سے کوئی بھی اس طرف نہیں آتا۔'' سمندر خان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

وہ مکان کے گیٹ تک پہنچ چکے تھے۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ صمد خان نے دروازہ کھٹکھٹانے کے بجائے بوٹ کی بھرپور ٹھوکر ماری تھی۔ دروازہ بھاری اور قدیم لکڑی کا تھا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا صرف احتجاجاً تھوڑا شور ہوا تھا جس کی صدا اندر مکینوں تک پہنچ چکی تھی۔

''یہاں کے لوگ بھی بڑے جاہل ہیں۔ دروازہ بھی ایسے کھٹکھٹاتے ہیں جیسے توڑ رہے ہوں۔'' اندر سے ایک ادھیڑ عورت نے خاصے جھنجلاتے ہوئے دروازہ کھولا تھا۔ دروازہ کھولتے ہی اس کی نگاہ صمد خان اور سمندر خان کے درمیان میں کھڑے شمشیر خان پر پڑی تھی۔ اس کی شعلہ بار نگاہوں اور چہرے کی کرختگی نے اسے بوکھلا ڈالا تھا۔ پھر اس کی سراسیمہ خوفزدہ نگاہیں ان دونوں پر ان کے بازوؤں پر لٹکتی رائفلز پر پڑیں تو اس نے پہلے ایک زوردار چیخ ماری پھر ''ڈاکو آ گئے ڈاکو آ گئے'' کا شور کرتی ہوئی اندر پردے کے پیچھے غائب ہو گئی۔

''یہ؟..... حسین و سحر طراز ڈاکٹر ہے؟ جس کے تم گزشتہ ہفتوں سے تذکرے کر کر کے میرا دماغ چاٹ رہے تھے۔'' شمشیر نے ایک زوردار وھپ سمندر خان کے شانے پر رسید کرتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا۔ چالیس پینتالیس سالہ بھدے نقوش و سیاہ رنگت کی ڈاکٹر کا اس نے تصور بھی نہ کیا تھا۔ غصے و جھنجلاہٹ سے اس کا برا حال تھا۔ مستزاد اس پر اسی عورت کا انہیں ڈاکو بنا ڈالنا تھا۔ وہ لمحے بھر میں اس مکان کی اینٹ سے اینٹ بجا دینا چاہتا تھا۔

''السلام علیکم، میں ڈاکٹر کائنات دلاور ہوں۔ غالباً رفعت کو آپ لوگوں کو دیکھ کر غلط فہمی ہوئی ہے جس کے لیے آپ صاحبان سے معذرت کی خواستگار ہوں۔''

دھیمی وشہد آگیں آواز پر شمشیر خان نے بلا ارادہ نگاہ اٹھا کر دیکھا تھا۔ سامنے سبز و سرخ باڈر والی ساڑھی میں ملبوس دھیمی مسکان ہونٹوں پر بکھیرے وہ سامنے کھڑی تھی۔ اس کی گندمی رنگت میں گندم کے سنہرے خوشوں کی چمک تھی۔ عارضوں پر سرخ سیبوں کی سرخی تھی۔ سیاہ رات کی تمام سیاہی اس کی آنکھوں کے دائروں میں سمٹ کر رہ گئی تھی۔ خاصی زندگی سے بھرپور چمکدار آنکھیں تھیں۔ سرخ لپ اسٹک سے ہونٹوں پر گلاب سے کھل رہے تھے۔ بالوں کا اس نے سادہ سا جوڑا بنایا تھا۔ کانوں میں سرخ نگینوں کے چھوٹے آویزے تھے۔ گلے میں سرخ نگینوں کا لاکٹ تھا۔ اس کا سانولہ سلونا روپ کچھ ایسا ہی پرکشش اور اپنے اندر انوکھا پن رکھتا تھا کہ شمشیر خان کے تنے ہوئے عضلات نارمل ہونے لگے تھے۔ اسے ایسا ہی محسوس ہوا گویا تپتی دھوپ سے سیاہ چنچل و شوخ بدلیوں کے سائے میں آ گیا ہو۔

''آپ لوگ بیٹھیے نا؟ کہاں سے آئے ہیں آپ؟ وہ دیواروں کے سہارے رکھی گئی کرسیوں کی طرف اشارہ کر کے ملائم لہجے میں پوچھنے لگی۔

''ہم۔ حویلی سے آئے ہیں.....'' سمندر جو شمشیر خان کے بدلتے رنگ بخوبی پہچانتا تھا ڈاکٹر کائنات کو ہوس ناک نظروں سے دیکھتا ہوا فاخرانہ انداز میں بولا۔

''حویلی سے..... اچھا..... اچھا آپ شہباز خان کے بیٹے ہوں گے۔ شہباز خان کا بہت احسان ہے مجھ پر۔ دراصل انکل حیات مجھے یہاں کلینک کھولنے نہیں دے رہے تھے۔ ان کا خیال تھا شہباز خان صاحب یہ پسند نہیں کریں گے اور ایسا ہی ہوا تھا پہلے تو انہوں نے اجازت نہیں دی پھر میں ان کے پاس گئی انہیں بتایا، سمجھایا کہ اس علاقے کے لوگوں کو کتنی اشد ضرورت ہے۔ یہاں میڈیکل فیسلیٹیز قطعی نہیں ہیں۔ لوگ اب تک قدیم نسخوں پر زندگی گزار رہے ہیں جن کے بارے میں درست معلومات نہ رکھنے کے باعث وہ بے شمار بیماریوں اور تکالیف کا شکار ہوتے ہیں۔ شکر ہے خدا کا، ان کی سمجھ میں میری باتیں آ گئی تھیں۔ پھر میں نے کلینک اسٹارٹ کر لیا۔ ایکسکیوزمی میں ابھی حاضر ہوتی ہوں۔'' وہ خاصی باتیں کرنے کی شوقین تھی جس طرح آئی تھی ایسے ہی سبک خرامی سے پردے کے پیچھے غائب ہو گئی۔

''اف! عورت ہے یا بولنے کی مشین؟ پڑپڑ اپنے آگے کسی دوسرے کو بولنے کا موقع ہی نہیں دیتی۔'' صمد خان برا سا منہ بنا کر بولا۔

''خان! اب کیا کہتے ہو؟ ہے نا نمک کی کان، میں نے غلط تو نہیں کہا تھا۔'' سمندر خان، صمد خان کو نظر انداز کر کے داد لینے کے انداز میں اس سے مخاطب ہوا۔

''دلاور خان نے غیر برادری میں شادی کی تھی؟'' شمشیر خان چونک کا استفسار کرنے لگا۔ اس نے سمندر خان کی بے قراری یکسر نظر انداز کر دی تھی۔

''جی خان! حیات خان کا بڑا بھائی دلاور خان تھا۔ وہاں سے شہر پڑھنے کے واسطے گیا تھا۔ شہر میں ہی اس نے اپنی پسند کی شادی کر لی تھی۔ اس نے برادری سے باہر غیر برادری کی عورت سے شادی کر کے رسوم و رواج کے خلاف کام کیا تھا۔ جس کی سزا اسے ''برادری بدر'' یعنی برادری سے اس

کا ہر تعلق ہر رشتہ توڑ کر جرگے نے دی تھی۔ وہ کسی سے بھی نہیں مل سکتا تھا۔ جو اس سے ملتا وہ جرگے کے قوانین کے مطابق برادری سے بے دخل کر دیا جاتا اور اس کی زمین و جائیداد سب چھین لی جاتی تھی۔ بلکہ ابھی بھی یہ قانون ایسے ہی موجود ہیں پھر یہ ہوا کہ ماں باپ دلاور کی برادری کی بے دخلی کے کچھ دنوں بعد آگے پیچھے انتقال کر گئے۔ حیات خان کی شادی ہو گئی وہ بھی بھائی سے نہیں ملتا تھا۔ اب کچھ عرصے پہلے گاؤں یہ لڑکی خود آئی تھی کہ دلاور خان اور اس کی بیوی کا انتقال ہو گیا تھا۔ وہ تنہا لڑکی تھی اور بڑے خان نے اسے یہاں رہنے کی اجازت دے دی تھی۔'' سمندر خان اسے تفصیل بتا رہا تھا۔

''رفعت آپا! بالکل بچکانہ حرکتیں ہیں آپ کی وہ بڑے خان کے بیٹے ہیں اور آپ نے انہیں ڈاکو بنا دیا اور اب بھی خوامخواہ خوفزدہ ہو رہی ہیں۔ چائے لے کر چلیں۔''

''نہیں بی بی! آپ جو بری بھلی کہنا چاہیں میں سن لوں گی لیکن ان کے سامنے نہیں جاؤں گی۔ اتنی اتنی بڑی مونچھیں اور یہ لمبی لمبی بندوقیں ہیں ان کے پاس۔ اگر بندوق چل گئی تو...... اف میرا تو بندوق دیکھ کر ہی دم نکل جائے گا۔'' رفعت آپا مارے خوف کے ابھی بھی کانپ رہی تھیں۔ وہ حقیقتاً بہت خوفزدہ تھیں۔

''چھوڑیں آپا! ایسے بھی کوئی ڈرتا ہے اور بندوق خود بخود تھوڑی چل جائے گی۔'' کائنات مسکراتی ہوئی چائے دانی پر ٹی کوزی سیٹ پر رکھتے ہوئے مسکرا کر گویا ہوئی۔

''آج کل انہونی کا وقت ہے بی بی! کبھی بھی کچھ ہو سکتا ہے اور بڑے خان کا بیٹا مجھے اچھا نہیں لگا۔''

''کیسی بات کرتی ہیں آپ بھی۔ اتنا ہینڈسم دبا اور قد پر ستائش کا مالک ہے وہ۔'' کائنات پائن ایپل کیک ٹرالی میں رکھتی ہوئی ستائشی انداز میں گویا ہوئی۔

''یہ بھی خوب تعریف کی آپ نے! سچ پوچھیں تو مجھے اس کی سرخ آنکھیں دیکھ کر اس آدم خور شیر کی آنکھیں یاد آ رہی ہیں جنہوں نے کئی سو انسانوں کو چیر پھاڑ کھایا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بھی ایسی ہی درندگی و سفاکی تھی میں یوں ہی تو خوفزدہ نہیں ہوں۔''

''وہ فلم تھی آپا! آپ بھی بعض اوقات کمال ہی کر جاتی ہیں۔'' وہ ٹرالی لے کر آگے بڑھ گئی۔ رفعت آپا نے کچھ دعائیں پڑھ کر کائنات پر پھونکی تھیں۔ وہ عمر رسیدہ، جہاندیدہ خاتون تھیں۔ وقت کی گرد آلود بے رحم گردش نے انہیں حساس دل و زیرک نگاہ عطا کی تھی۔ شمشیر خان پر ان کی ایک نگاہ پڑی تھی اور جو دل کا الجھن ہوا تھا وہ ڈاکٹر کائنات سے کہہ بیٹھی تھیں۔ اس کے اپنی لاابالی و بے پروا طبیعت کے باعث توجہ نہ دی تھی مگر وہ ایک انجانے خوف میں مبتلا ہو گئی تھیں۔

''نہ معلوم آپ کو چائے پسند آئے گی یا نہیں؟ کیونکہ یہاں تو زیادہ تر قہوہ چلتا ہے لیکن مجھے ابھی تک قہوہ بنانا نہیں آیا۔ کبھی پتی مقدار سے زیادہ ہو جاتی ہے تو کبھی الائچی ویسے بھی ہم کو چائے کی عادت ہے۔ کراچی میں چائے بہت پسند کی جاتی ہے یا پھر سوفٹ ڈرنک۔''

کائنات اسے پلیٹ میں سینڈوچ اور کیک کے بعد چائے سرو کرتی ہوئی بولی۔

''بہتر ہے۔'' وہ چائے کا سپ لے کر دھیمی گونج دار آواز میں گویا ہوا۔ اسکے حکم پر سمندر خان اور صمد خان باہر جیپ میں جا کر بیٹھ گئے تھے۔

''تھینکس، اچھا ہوا آپ آگئے میں آج حویلی آنے کا سوچ رہی تھی۔ آپ کے بھائی کی شکایت لے کر..... اس نے میرے تمام مریض روک دیے ہیں۔''

''بھائی!..... کون؟'' وہ قدرے چونک کر گویا ہوا۔

''شمشیر خان نام ہے اس کا..... خاصا اسٹوپڈ اینڈ چیپ ہے وہ۔'' وہ غصیلے انداز میں کہہ رہی تھی..... اس کے سنہری چہرے پر برہمی کے تاثرات تھے۔

''کیا..... کیا ہے اس نے؟'' وہ اپنی سرخ نگاہیں اس کے چہرے پر جماتا ہوا گمبھیر لہجے میں بولا۔

''وہ.....؟ اس نے تمام لوگوں کو میرے پاس آنے سے روک دیا ہے..... مجھے لگتا ہے وہ ظالم اور سفاک شخص ہے جو انسانوں سے محبت نہیں کرنا جانتا۔''

شمشیر خان کی نگاہوں میں کچھ ایسے ہی تاثرات تھے کہ وہ چند لمحے اس کی نگاہوں کی انجانی تپش سے بوکھلا اٹھی تھی لیکن جلد ہی شمشیر خان نے خود کو سنبھال لیا تھا۔

''آپ کو یقیناً بیڈ فیل ہو رہا ہوگا کہ میں آپ کے بھائی کو اس طرح کہہ رہی ہوں لیکن آپ خود بتائیں ان کو اس طرح کرنا زیب دیتا ہے؟ وہ حکمران ہیں یہاں کے، انہیں اپنی ذمہ داریاں بھی سمجھنی چاہئیں نا..... اچھا حکمران وہی ہوتا ہے جو اپنی رعایا کی صحت و زندگی کا خاص خیال رکھے یا حکمرانی و دولت کے نشے میں خود کو فرعون بنا ڈالے..... ایسے لوگ اللہ کو بھی پسند نہیں ہوتے اور نہ لوگوں کو..... میں نے کتنی بار کوشش کی۔ شمشیر خان صاحب سے ملنے کی لیکن ہر بار چچا جان نے مجھے روک دیا۔ ان کا خیال ہے شمشیر خان صاحب کا کردار کمزور ہے۔ میرے خیال میں آپ کے بھائی میں وہ تمام صفات موجود ہیں جو بگڑے ہوئے رئیس زادوں میں ہوتی ہیں خیر وہ ان کا ذاتی معاملہ ہے جس میں ہمیں انٹرفیئر کی ضرورت نہیں ہے۔''

''حکیم صاحب کہاں ہیں؟'' وہ ایک دم کھڑا ہو کر استفسار کرنے لگا۔

''وہ شہر گئے ہیں نرسوں کو چھوڑنے رات تک آجائیں گے۔'' وہ بھی کھڑی ہو کر گویا ہوئی۔

''نرسوں کو چھوڑنے۔'' اس نے جھٹکے سے چادر کا پلو بائیں شانے پر ڈال کر استفسار کیا۔

''جی..... ایک ماہ سے یہاں کوئی مریض نہیں آرہا تو نرسیں کب تک خالی بیٹھ سکتی ہیں؟ وہ ملازمت کے لیے گھر سے دور ہوئی تھیں۔ ایک ماہ کی تنخواہ تو میں نے اپنے اکاؤنٹ سے انہیں دے دی لیکن ہر ماہ میں اس طرح نہیں کر سکتی اس لیے وہ چلی گئی ہیں۔ اگر شمشیر خان صاحب نے اپنی فضول ضد اور ہٹ دھرمی نہ چھوڑی تو مجھے بھی مجبوراً واپس کراچی جانا ہوگا۔ کراچی میں میرا کلینک ہے جو میں ساتھی ڈاکٹر کو دے آئی تھی کہ اس کے کرائے سے میں یہاں کلینک چلاتی رہوں گی کیونکہ شہروں میں ڈاکٹرز کی بہتات ہے۔ ایسے علاقوں میں ڈاکٹر کی ضرورت ہے ان جیسے معصوم و سادہ مجبور لوگوں کی خدمت کر کے روحانی سکون و مسرت حاصل ہوتی ہے۔ آپ سمجھائیں نا شمشیر خان صاحب کو.....؟'' وہ باہر گیٹ تک اس کے ساتھ

آئی تھی۔ اس کی خاموشی نے اس کے حوصلوں کو خاصی تقویت بخشی تھی۔ اس لیے شاید وہ بے تکان بول رہی تھی۔ شمشیر خان کا چہرہ سپاٹ تھا جس سے وہ کوئی بھید نہ پاسکی تھی کہ وہ اس کی شکایات اس سے ہی کر رہی تھی۔ جس کے آگے لوگ نگاہ اٹھا کر بات کرنے کی ہمت نہیں رکھتے۔"

"کان سے پکڑ کر سمجھایئے گا۔ جب ہی کچھ میں آئے گا ان کی۔" وہ شمشیر خان کو اثبات میں گردن ہلاتے دیکھ کر شوخی سے بولی۔ سمندر خان نے ٹرے اس نئے کے ہاتھ میں پکڑائی تھی۔ جس میں چائے کے خالی برتن موجود تھے۔ شمشیر خان ڈارک گلاسیز آنکھوں پر لگا تا جیپ میں بیٹھ گیا۔

"ارے، آپ نے اپنا تعارف تو کروایا ہی نہیں۔" جیپ اسٹارٹ ہوتے دیکھ کر اسے فوراً اپنی حماقت کا احساس ہوا تو وہ تیزی سے بولی تھی۔

"ہمارا خان لا بڑے خان کا چھوٹا بیٹا شمشیر خان ہے۔" سمندر نے فخریہ انداز میں کہا۔

"شم....شیر....خا....ن" اس کے منہ سے اٹک اٹک کر لفظ نکلے اور ہاتھ میں پکڑی ٹرے برتن سمیت زمین بوس ہو چکی تھی۔ اس کی پھٹی پھٹی نگاہیں لحہ بہ لحہ دور ہوتی جیپ پر مرکوز تھیں..... کانچ کے برتن کرچی کرچی ہو کر دور تک بکھر چکے تھے۔

☆☆☆

"باسط! باہر تمہارے سسر صاحب کھڑے ہیں۔ تم سے ملنے آئے ہیں۔" آفتاب جو ابھی باہر سے اندر آ رہا تھا۔ باسط سے مخاطب ہوا جو صوفے پر دراز میگزین پڑھنے میں مصروف تھا۔

"انکل آئے ہیں؟ احمق آدمی انہیں ساتھ اندر لاتا تھا۔ خود منہ اٹھائے اندر چلے آئے ہو؟" باسط میگزین ٹیبل پر رکھ کر ایک جست میں کھڑا ہو کے اس پر بگڑا تھا۔

"بھائی! ان کی رشتے داری صرف تم سے ہے اور وہ غیر متعلق لوگوں سے بات کرنا بھی گوارہ نہیں کرتے..... اس لیے میں انہیں لان میں ہی چھوڑ آیا ہوں۔" آفتاب دھم سے صوفے پر بیٹھ کر بولا۔

"تم اپنا بلڈ پریشر ہائی مت کرو..... چلو ہم بھی تمہارے ساتھ چلتے ہیں۔" صارم، ہامون، بہروز، باسط کے ساتھ گیٹ کھول کر باہر آ گئے۔ کوریڈور عبور کرنے کے بعد وہ لان میں پہنچے تو لان کے درمیان ایک خاصے تندرست گدھے کو گھاس سے شوق فرماتے دیکھ کر ان تینوں کے قہقہے آسمان کو چھونے لگے تھے جبکہ باسط کی حالت دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ جھنجلاہٹ، کھسیاہٹ اور شدید غصے سے اس کا جسم کانپنے لگا تھا اور اس حالت میں شدت اس وقت عروج پر پہنچی جب اس نے لان سے ملحقہ گلاس وال کے پار آفتاب کو ہنستے ہوئے دیکھا..... وہ گدھے کی طرف اشارہ کر کے پوچھ رہا تھا کہ "اپنے سسر سے ملاقات کر لی۔" اس کے چہرے پر شرارت ہی شرارت رقصاں تھی۔

"اوہ..... اوکا! میں اس ٹنکی کو نہیں چھوڑوں گا۔ جان سے ماردوں گا اسے جان سے ماردوں گا۔" وہ جنونی انداز میں اندر کی سمت دوڑنے لگا۔ وہ تینوں بھی اس کے پیچھے اندر بڑھے تھے..... آفتاب اس کے تیور بھانپ کر اندر اسٹور روم میں چھپ گیا تھا اور اندر سے دروازہ لاک کر لیا۔

"ٹنکی! دروازہ کھول دے۔ دیکھ میں کہہ رہا ہوں دروازہ کھول دے۔ ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔" وہ دروازے پر لاتیں رسید کرتا ہوا غرا رہا تھا۔

''معلوم ہے مجھے تجھ سے برا کوئی نہیں ہے اس جہان میں۔'' آفتاب اوپر دیوار میں نصب گرل سے جھانکتا ہوا دانت نکال کر گویا ہوا۔

''چھوڑو یار، کیوں اپنی انرجی ضائع کر رہے ہو؟ تمہیں معلوم ہے یہ شکی! تمہیں ستا کر، جلا کر مزے لیتا ہے اور تم جان بوجھ کر اس کے داؤ میں پھنس جاتے ہو۔'' بہروز نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر سمجھاتے ہوئے کہا۔

''آج میرے صبر کا پیمانہ ٹوٹ کر چور چور ہو گیا ہے۔ میں اسے جان سے مارے بغیر نہیں چھوڑوں گا۔''

''ابے پونے دو پسلی کے بندے! تو مجھے نہیں مار سکتا۔ مجھے کیا مارے گا۔'' آفتاب حسب عادت اسے چڑا کر چھیڑ کر لطف اندوز ہو رہا تھا۔

''ہاتھی کی جب شامت آتی ہے وہ اسٹور روم کا رخ کرتا ہے باسط! میری جان تم غصہ تھوک دو۔ ابھی دیکھنا ہم کیسا اس سے انتقام لیتے ہیں۔'' صارم نے باسط کی کمر کے گرد ہاتھ ڈال کر آفتاب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''صارم! دیکھ تو دوستی میں غداری نہ کیا کر اگر تو نے اس کا ساتھ دیا تو اچھا نہیں ہوگا۔''

''باسط جیسے معصوم اور کمزور بندے کے ساتھ مذاق کر کے تم نے اچھا نہیں کیا۔''

''ڈیئر فرینڈز! ابھی تو چند دن ہیں ہم انجوائے کر رہے ہیں، ایگزامز سے فارغ ہو چکے ہیں۔ اگلے ہفتے صارم گاؤں جا رہا ہے باسط میر پور کے لیے صارم کے بعد روانہ ہو جائے گا۔ ہم اپنے اپنے گھروں کی طرف چل پڑیں گے۔ زندگی کے قافلے اپنی اپنی ڈگر پر گامزن ہو جائیں گے۔ بے فکری و غیر ذمے داری کے دن ہم سے اب رخصت چاہتے ہیں۔ زندگی کے نشیب و فراز پھر کہاں یہ دن ہمیں لوٹا سکتے ہیں۔ پھر نہ معلوم ہم کب ملیں؟ تو کیوں نہ ان دوڑتے بھاگتے پھولوں کی طرح مہکتے، چاندنی کی طرح روشنی بکھیرتے، جگنوؤں کی طرح اڑتے لمحوں کو تتلیوں کی طرح اپنے دامن میں اسیر کر لیں تاکہ ان کے خوبصورت و حسین رنگ یادوں کو منور کرتے رہیں۔'' مامون نے دل گرفتگی و سنجیدگی سے کہا تو ان کے چہروں پر اداسی بکھرنے لگی۔

''صاب! تھانا لدا دیا ہے...'' اسی دم فدا حسین نے اندر آ کر اطلاع دی۔

''ارے! اتنی سنجیدگی؟ اتنی خاموشی اور اداسی تمہارے چہرے پر کیوں ہے؟'' بہروز، فدا حسین کو دیکھ کر حیرانگی سے گویا ہوا کیونکہ حسب عادت وہ گنگنا نہیں رہا تھا اور ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ فدا حسین گنگنائے نہیں۔

''اے صاب! ہماری تو دل کی دنیا ہی تاریک ہو رہی ہے۔'' وہ ٹھنڈی سانس بھر کر بولا۔

''کیوں؟... کیا بیگم سے کوئی جھگڑا ہو گیا ہے؟''

''اے، اس تھالی کی کے پلوا ہے۔ ہمارے صاب جا رہے ہیں۔ اسی خیال سے ہی راتوں کی نیند دن کا سکون لٹ گیا ہے۔'' اس کے توتلے لہجے میں بلا کی رنجیدگی و ملال تھا۔

''فدا حسین! تم فکر کیوں کر رہے ہو یار؟ میں تمہیں ملازمت سے برخاست تھوڑی کروں گا میری غیر موجودگی میں یہ لوگ یہاں آتے رہیں گے۔ تم یہیں رہنا میں بھی چکر لگاتا رہوں گا۔ تمہیں تمہاری تنخواہ پابندی سے ملتی رہے گی۔ تم اپنے بچوں اور بیوی کو یہیں بلوا لو آرام سے رہنا۔''

صارم نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر پرخلوص انداز میں کہا۔اس کی نرم طبیعت، محبت اور اپنائیت کا ہی احساس تھا کہ وہ بے اختیار اس کی جدائی کے خیال سے بچوں کی طرح رو پڑا تھا۔

''اوہ! یہ کیا فدا حسین! یار میں آیا کروں گا۔'' صارم اسے تھپتھپاتے ہوئے گویا ہوا۔ جذبات سے اس کی آواز بھاری ہو رہی تھی۔ وہ گردن ہلاتا ہوا کچن کی طرف چلا گیا۔ کچھ دیر قبل گونجتے قہقہوں کی بازگشت معدوم ہو گئی تھی۔ وہ جو ایک دوسرے سے اپنے جذبات چھپائے جدائی کے احساسات مخفی رکھے بظاہر ہنسنے مسکرانے میں مگن رہے تھے۔فدا حسین نے ان کے جذبات واحساسات کی ترجمانی کر دی تھی۔ ماحول میں ایک خاموش سوگواریت چھا گئی تھی۔ وہ ایک دوسرے سے نگاہیں چرائے ڈائننگ روم کی طرف بڑھ گئے تھے۔ آفتاب اسٹور روم سے نکل کر باسط سے لپٹ گیا تھا۔ باسط نے اسے ایسے گلے سے لگایا تھا جیسے ابھی کچھ دیر پہلے وہ اسے جان سے مار دینے کے در پے نہ تھا۔

''آئی ایم سوری باسط! میں نے ایسے ہی مذاق کیا تھا۔تم برا مان گئے۔'' وہ اسے لپٹاتے ہوئے بول رہا تھا۔

''نہیں یار! شرمندہ تو میں ہوں۔ خوامخواہ تمہاری عادت جاننے کے باوجود بگڑ اٹھتا ہوں۔''

''ان دونوں کے درمیان میں بولنے والا بے وقوف ہوتا ہے۔ یہ لڑتے بھی ہیں اور مل بھی جاتے ہیں۔'' بہروز نے مسکراتے ہوئے اظہار کیا۔

''ہاتھی اور چیونٹا کیسے گلے ملتے ہیں آج دیکھ ہی لیا یہ منظر بھی۔'' صارم کے بے ساختہ کہنے پر فضا قہقہوں سے گونج اٹھی۔

☆☆☆

''ارے! ورشا کے یہاں آنے کے دن جتنے نزدیک آ رہے ہیں۔ گھر کی فضا پھر تیزی سے حبس زدہ نا خوشگوار ہوتی جا رہی ہے۔ جو اسے پسند نہ تھی۔'' سجاویہ نے خاموش و گم صم گل خانم سے پریشان لہجے میں کہا۔ کیونکہ اس دن سے جب وہ شاہ بہرام خان کی موجودگی میں باہر نکل آئی تھیں۔ اسی دن سے شہباز خان ان سے سخت بدظن و کبیدہ ہو گئے تھے۔ ان کی ناراضگی و کبیدگی اس حد تک بڑھ چلی تھی کہ وہ ان کی صورت دیکھنے کے روادار نہ تھے ان کی بے رحم فطرت کو گل جاناں کی جھڑ کانے والی باتوں نے مزید ہوا دے کر شعلوں کو دہکا ڈالا تھا۔

''جو اس کے نصیب میں ہے بچے، وہ اسے مل کر ہی رہے گا۔ کسی کے رنج و خفگی کے خیال سے تقدیریں پلٹا نہیں کرتیں۔ وہ بھی اپنے نصیب سے کب تک لڑسکتی ہے۔'' وہ بے تاثر انداز میں آہستگی سے گویا ہوئیں۔ ''نصیب'' ہونہہ نصیب تو اس کا اسی دن سیاہ ہو چکا تھا جب اس کے بخت کو نومولود بچے سے منسوب کر دیا گیا تھا۔''

''شکوے و شکایات کرنا اچھے بندوں پر سجتا نہیں ہے سجاویہ! تقدیریں تو وہ مالک برحق بناتا ہے اور اس کی ہر بات میں بندوں کے لیے ضرور بھلائی ہوتی ہے۔ ایسی باتیں نہیں سوچتے۔'' وہ دھیمے دھیمے لہجے میں اسے سمجھانے لگیں۔

''بابا جان آج کل اتنے خفا کیوں رہتے ہیں؟ چھوٹی ادے بھی ہر وقت انگارے چباتی رہتی ہیں۔ انہیں معلوم ہے ورشا آنے والی ہے اسی لیے انہوں نے اس کے آنے سے قبل ہی محاذ تیار کر لیا ہے اور نہ معلوم وہاں جا کر اس کے مزاج میں تبدیلی آئی ہے کہ نہیں؟ ابھی بھی وہ اینٹ کا جواب پتھر سے دینا جانتی ہے۔'' سجاویہ جہاں بہن کی آمد کے خیال سے از حد مسرور و خوش تھی وہیں گھر کی ایک دم بدلنے والی فضا سے بھی پریشان ہو گئی تھی۔

''تم خوامخواہ کے اندیشوں اور واہموں میں مت الجھا کرو۔ فارغ وقت میں کوئی کام ڈھونڈ لیا کرو۔ اللہ تعالیٰ سب اچھا کرے گا۔''

''میری بھی یہی دعا ہے۔'' وہ صدق دل سے گویا ہوئی۔

☆☆☆

حکیم حیات خان بے حد پریشان و فکرمند سے کمرے میں ٹہل رہے تھے۔ ان کے سفید باریش چہرے پر خوف و دہشت سے زردی چھا گئی تھی وہ رات کو گھر آئے تو رفعت آپا نے فوراً ہی آج کی کارروائی ان کے گوش گزار کر دی۔ ایک تو وہ خود بھی خوفزدہ تھیں اور جب سے معلوم ہوا کہ وہی شمشیر خان تھا جس کی بلا مبالغہ برائیاں وہ بیان کر چکی تھیں اسی سے تب سے کائنات بھی از خود فکرمند دہشت زدہ ہو گئی تھی۔ مستزاد چچا جان کی حالت دیکھ کر اس کے رہے سہے اوسان بھی خطا ہو گئے تھے کہ وہ رات سے ایک پل نہ سوئے تھے۔ باہر سے معمولی سی آواز بھی اگر ابھرتی تو وہ چونک اٹھتے تھے۔ دروازے، کھڑکیاں سب انہوں نے مضبوطی سے بند کر لیے تھے اب رات سے صبح ہو کر دوپہر کا وقت ہو چکا تھا۔ وہ اسی طرح وحشت زدہ کبھی بیٹھ جاتے کبھی اٹھ کر ٹہلنے لگتے۔ ان کے چہرے پر سراسیمگی اور تذبذب کے تاثرات تھے۔ جیسے وہ کوئی فیصلہ کرنا چاہ رہے ہوں پھر اس پر عمل درآمد کی جرأت بھی نہ کر پا رہے ہوں۔

''چچا جان! جو ہوگا دیکھا جائے گا آپ اتنے فکرمند اور پریشان مت ہوں خدا کے لیے کچھ تو کھا لیں۔ رات سے یہ وقت آ گیا ہے۔ آپ نے ایک گھونٹ پانی تک نہیں پیا ہے۔'' کائنات ان کے نزدیک آ کر دھیمے لہجے میں گویا ہوئی۔

''کیسی بھوک؟ کیسی پیاس؟ یہ چیزیں زندگی کی بقا کے لیے جاری رکھنی پڑتی ہیں۔ اب بقا فنا کی سمت گامزن ہو چکی ہے۔ نہ معلوم کس لمحے کس آن زندگی کی ڈور توڑ دی جائے۔ مجھے ان لمحوں کا ہی انتظار ہے۔'' وہ دل گرفتگی اور مایوسی سے بولے۔

''چچا جان! کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ۔ زندگی اور موت دینے اور لینے کا اختیار صرف اور صرف اللہ کو حاصل ہے اور یہ میرا مشاہدہ ہی نہیں بلکہ ایمان ہے کہ اس رب کے حکم کے بغیر پتے کو بھی جرأت نہیں کہ وہ معمولی سی جنبش کر جائے پھر بھلا ہماری موت اور زندگی کا تعین کرنے کا اختیار کسی شخص کو کس طرح مل سکتا ہے؟''

''بلا سوچے سمجھے بولنے والے ہمیشہ گھاٹے کے سودے کرتے ہیں بچے، اس لیے ہمارے مذہب نے ہمارے لیے ہر عمل میں اعتدال پسندی کی راہ دکھائی ہے۔ کم کھانا، کم سونا اور کم بولنے میں انسان کی عافیت ہوتی ہے۔ بہترین انسان وہی ہوتا ہے جو اپنی زبان کی طنابوں کو اپنے قابو میں رکھتا ہے اور ہمیشہ خیر و عافیت میں رہتا ہے۔ زبان سے زیادہ بڑا نہ کوئی دشمن ہے اور نہ ہی کوئی دوست، یہ چاہے تو دشمنوں کو مضبوط دوستی کی گانٹھ سے ہمیشہ کے لیے باندھ دے۔ اگر تم بھی عقلمندی کا مظاہرہ کرتیں تو آج یوں ہم اس ناگہانی مصیبت کا شکار ہو کر رات و دن کا چین برباد کیے بیٹھے نہ ہوتے۔ بے شک اللہ کے حکم کے بغیر کوئی شے حرکت نہیں کر سکتی مگر بعض اوقات اپنے لیے پریشانی ہم خود مول لیتے ہیں۔'' وہ کرسی پر بیٹھ کر گویا ہوئے۔

''مجھے افسوس ہے بلکہ بہت شرمندہ ہو رہی ہوں کہ میری جذباتیت اور بے وقوفی کے باعث یہ سب کچھ ہوا ہے۔ نہ میں بے سوچے سمجھے بولتی اور نہ اتنی پریشانی اٹھانی پڑتی۔''

''تم پریشان مت ہو بچے! اب جو ہو گیا سو ہو گیا۔ اس کو شاید اسی طرح ہونا تھا۔''

''میرے تو خیال میں حیات بھائی! اس نے برا نہیں مانا۔ اگر وہ برا محسوس کرتا تو اس طرح نہیں جاتا جبکہ گھر میں آپ بھی نہیں تھے اور پھر کائنات بیٹی نے کوئی اسے جھوٹ بات تو کہی نہیں تھی۔ سب سچ کہا تھا۔ شاید پہلے کبھی کسی نے اسے اس طرح آئینہ نہیں دکھایا ہوگا۔ وہ شرمندگی کی وجہ سے چلا گیا اور جبھی پلٹ کر نہیں آیا۔''

رفعت آپا جو خوفزدہ بیٹھی تھیں اس نئے خیال سے چونک کر بول اٹھیں۔

☆☆☆

شاہ افضل خان اپنے علاقے کی ہر دلعزیز شخصیت تھے۔ وہ اپنے مذہب سے بے حد لگاؤ اور عقیدت رکھتے تھے۔ ان کی زندگی کا بیشتر وقت عبادت الٰہی میں صرف ہوتا تھا۔ غریبوں اور حاجت مندوں کی امداد وہ دور پردہ بھی کیا کرتے تھے کہ کسی کی غیور طبیعت پر تازیانہ نہ لگے اور ضرورت مندوں کی ضرورتیں وہ ظاہری طور پر بھی پوری کرتے کہ اس طرح دوسروں کی ضروریات کا خیال رکھنے کے جذبوں کو فروغ حاصل ہوگا۔ وہ فطرتاً نیک و خدا ترس تھے۔ معاف کرنے کا جذبہ امن و خیر، دوستی و راستی کے پیغام کو پھیلانے کا جذبہ اپنے اندر رکھتے تھے اور عملاً بھی صدق دل سے اس کا پرچار کرتے تھے۔ اسی جذبے کو لے کر وہ شہباز ولی خان کی طرف گئے تھے۔ وہ مرتبے میں ان سے بہت بلند و معتبر تھے۔ عمر کے لحاظ سے بھی اور خاندانی وقار، دولت و ثروت کے معیار پر بھی شہباز ولی خان ان سے کمتر تھے اور انہوں نے اپنی خاندانی ذلالت و کم ظرفی کا بھرپور مظاہرہ کر ڈالا تھا۔ زندگیوں

اور خونی رشتوں پر وہ زر، زمین و جائیداد پر جان دینے کے عادی تھے۔ ان کے اس مفاد پرست اور حریصانہ طبیعت کے تمام رنگ وہ شمشیر خان میں دیکھ چکے تھے اور ان کو از حد افسوس و ملال ہوا تھا۔ وہ بہت خاموشی سے وہاں سے گئے تھے اور اس بات کا تذکرہ انہوں نے زریں گل سے بھی نہ کیا تھا کہ وہ افسردہ رنجیدہ ہوں گی اور نوجوان پارٹی سے تذکرہ کرنا گویا دبی راکھ کو ہوا دینے کے مترادف تھا کیونکہ وہ تو پہلے ہی ان کے خلاف غصہ و نفرت دل میں تخفی کیے بیٹھے تھے۔ وہ مصلحت کے تحت سب کچھ اپنے تک محدود کیے بیٹھے تھے۔ حویلی میں سبریز کی شادی کے ہنگامے شروع ہو چکے تھے۔ رشتے داروں اور دوست و احباب سے حویلی کے زنان خانے و مردان خانے بھر گئے تھے۔ در و دیوار سے مسرتوں کی روشنیاں پھوٹ رہی تھیں۔ لڑکیاں و عورتیں قالین پر بیٹھی شادی کے گیت گانے میں مصروف تھیں۔ ڈھول کی آواز کے ساتھ ان کی آوازیں ان کے کمرے تک پہنچ رہی تھیں۔

''کیا سوچ رہے ہو بڑے خان؟'' اندر داخل ہوتی زریں گل انہیں گم صم بیٹھا دیکھ کر فکر مندی سے گویا ہوئیں۔

''آؤ، زریں گل! تھک گیا تھا میں، سوچا آرام کر لوں۔'' وہ نرم آرام دہ بیڈ پر نیم دراز ہوتے ہوئے مسکراتے ہوئے گویا ہوئے۔

''آپ کام بھی تو اس عمر میں بھی تمام اپنے کندھوں پر سوار کر لیتے ہیں۔ کہا بھی تھا کہ آپ صرف دیکھ بھال کریں یعنی جائزہ لے لیں بچوں کو سمجھائیں مگر آپ کہاں کسی کی سنتے ہیں۔ بچوں کے منع کرنے کے باوجود آپ نہیں مانے۔'' وہ ملازمہ کو قہوہ لانے کا حکم دینے کے بعد چوکی پر بیٹھتے ہوئے گویا ہوئیں۔

''ہم نہیں چاہتے گل، سبریز کو یہ احساس ہو کہ وہ بے ماں، باپ کا بچہ ہے اور اگر ہم سے کوئی کوتاہی سرزد انجانے میں ہی ہو گئی تو اپنے بیٹے اور بہو کو ہم محشر والے دن کیا جواب دیں گے؟'' ان کے مضبوط لہجے میں، دل کی گہرائیوں میں پنہاں دکھوں و حسرتوں کے ساگر میں رنج و جدائی کی لہروں کی نمی ان کی یادائی آنکھوں میں نمودار ہونے لگی تھی۔

''ایسا نہیں ہو گا بڑے خان، ان بچوں کو ہم نے کبھی یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ وہ بے ماں باپ کی اولادیں ہیں۔ اپنے سگے بیٹوں سے بڑھ کر انہیں محبت و شفقت دی ہے۔ ان کی خاطر تو ہم نے کبھی کھل کر اپنے جوان بیٹوں و بہوؤں کی موت کا سوگ بھی نہیں منایا۔ آج تک راکھ میں چھپی چنگاریوں کی طرح ان کا دکھ ان کا غم ہمارے اندر سلگتا رہتا ہے۔ عمر ہماری تھی چلے وہ گئے بلکہ ظالموں نے وقت سے پہلے انہیں قبروں میں پہنچا دیا۔'' زریں گل جو خوشی کے اس اہم موقع پر بیٹوں اور بہوؤں کو یاد کر کے اندر ہی اندر رو رہی تھیں کہ مسرتوں کے ان خوش رنگ لمحات میں وہ لوگ خود بخود ہی ذہن کے جھروکوں سے جھانکنے لگتے ہیں جو آپ سے بچھڑ کر آخرت کی راہ پر گامزن ہو چکے ہیں اور جن کی کمی، جن کا احساس جن کی جدائی، احساسات کے دریا میں ایک طوفان سو جزن رکھتی ہے۔

''آہستہ بولو زریں گل! ایسے لفظ استعمال کر کے ہمارے صبر و استقامت کو مٹی میں نہیں ملاؤ۔ وقت سے پہلے نہ کوئی دنیا میں آنے پر قادر ہے اور نہ ہی قبل از وقت دنیا سے جانے پر۔ یہ رب ذوالجلال کی حکمت ہوتی ہے۔ اس طرح گناہ ہوتا ہے کہنا۔ یہ راز تو وہ عالم الغیب ہی جانتا ہے کب کس کا وقت مکمل ہوتا ہے اور کس کا شروع؟''

''بڑے خان! خود کو یہ دلائل دے کے آپ حقیقت سے نگاہ چراتے رہیں مگر میں کبھی اپنے بچوں صارم اور سبریز کو یتیم کرنے والوں کو

معاف نہیں کروں گی۔" بی بی جان جذبات سے دامن نہ چھڑا سکیں اور بے اختیار رونے لگیں۔

"زریں گل! یہ کیا بدشگونی ہے، اتنے اچھے موقعے پر ایسے کرتے ہیں کیا؟" افضل خان بیوی کے درد و احساسات کو بخوبی سمجھ رہے تھے۔ وہ بھی اس موقع پر بیٹوں اور بہوؤں کی جدائی اسی طرح محسوس کر رہے تھے مگر مجبور تھے کہ وہ بی بی جان پر اپنے دل کا درد عیاں نہیں کر سکتے تھے کہ وہ اس عمارت کی پہلی اینٹ تھے اگر وہی ڈھے جاتے تو کیا ہوتا۔

"بابا جانی! آپ یہاں بیٹھے ہیں کیا تھک گئے ہیں؟" دروازہ ناک کرتا ہوا سبریز اندر آ کر گویا ہوا۔ بی بی جان نے پھرتی سے آنسو صاف کیے تھے وہ ان کے قریب ہی بیٹھا تھا۔

"آپ جو گانے بجانے کی محفل جمے گی اس میں ہمارا کیا کام بچے! ہم نے سوچا اس موقع سے فائدہ اٹھا کر آرام ہی کر لیا جائے۔ پھر کل اور پرسوں کے دن تو بے حد مصروفیت میں گزریں گے۔" وہ دھیمے سے مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھ کر مخاطب ہوئے۔ براؤن اینڈ آف وہائٹ کھدر کے شلوار سوٹ میں سفید مضبوط پاؤں میں براؤن پشاوری چپل پہنے نکھرا نکھرا خوشبوؤں میں بسا وہ بے حد پرمسرت و پر بہار لگ رہا تھا۔ سچی خوشیوں کا عکس چاہت پا لینے کی سرخوشی، خواہش پا لینے بامراد ہونے کی آسودگی و طمانیت نے اس کی وجیہہ چہرے کو مزید شوخ و پرکشش رنگوں و روشنیوں سے منور کر ڈالا تھا۔ اسے آسودہ و خوش دیکھ کر ان کے چہرے پر بھی آسودگی و اطمینان چھا گیا تھا۔

"بابا جانی! آپ کے بغیر محفل بے رونق رہتی ہے آپ ضرور شریک ہوں گے۔"

"سبریز خاناں! میں عمر کے تقاضوں کو مدنظر رکھ کر کام کرنے کا عادی ہوں بچے میں نے زندگی میں کبھی کسی گانے بجانے کی محفل میں شرکت نہیں کی۔ مجھے کچھ بچپن سے ہی ان محفلوں سے لگاؤ نہیں تھا۔ عمر کے اس حصے میں، میں کس طرح شرکت کر سکتا ہوں۔" وہ نرمی و شفقت سے محو گفتگو تھے۔ بی بی جان خاموشی سے ان کی گفتگو سن رہی تھیں۔

"آپ کو پسند نہیں ہیں بابا جانی، پھر آپ ہمیں کیوں اجازت دیتے ہیں۔"

"میں جبر کا قائل نہیں ہوں بچے، پابندی ہمیشہ بغاوت کو ابھارتی ہے اور میں نہیں چاہتا میرے بچے خوشی کے اس موقع پر بددل ہوں۔ گناہ کرنا بندہ کسی کے خوف سے نہیں چھوڑتا کہ پابندی لگانے پر وہ ظاہری طور پر نہیں تو پوشیدہ طریقے سے کرے گا۔ برائیوں سے وہ تائب جب ہی ہو گا جب برائی کو برائی، گناہ کو گناہ خود سمجھے گا۔"

"بڑے جان! آپ بھی موقع نہیں دیکھتے اور وعظ کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ چھوڑیں اب، یہ بتاؤ سبریز، صارم کب آئے گا؟ دو دن رہ گئے ہیں شادی میں اور اس کا نام و نشان نہیں ہے۔ کیا وجہ ہے؟ کیوں نہیں آیا ابھی تک وہ؟"

"میں خود ایک ہفتے سے اسٹاپ تک جا رہا ہوں اس نے کہا تھا ایک ہفتہ قبل آئے گا۔ ایک ہفتے سے زیادہ دن گزر چکے ہیں۔ میں تو کہتا ہوں وہ آئے تو آپ ہی اس کے کان کھینچے گا میں اس سے ناراض ہوں، مجھے اب اس سے کبھی بات نہیں کرنی ہے۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔" اس کے چہرے پر یک دم افسردگی حزن و ملال پھیلتا چلا گیا۔

''ایسی باتیں نہیں کرو بچے، اپنے کبھی ساتھ نہیں چھوڑتے وہ آنے والا ہے۔''

''نہیں بابا جانی! اس مرتبہ میں پوری سنجیدگی سے ناراض ہوں اس سے، مجھے اس سے نہ بات کرنی ہے اور نہ اسے دیکھنا ہے۔ بہت مضبوطی سے آنکھیں بند کرلوں گا۔'' وہ اثر عد سنجیدہ و پر یقین لہجے میں بول رہا تھا۔

''اتنی شدید ناراضگی ہے تو اسے اسٹاپ پر دیکھنے کیوں جاتے ہو؟'' اس کے بچوں جیسے انداز پر دونوں مسکرا اٹھے تھے۔

''یہاں میں دل کے ہاتھوں مجبور ہوں مگر میرا عہد اب کبھی ٹوٹ نہیں سکتا۔'' وہ ٹائم دیکھتا ہوا ان سے اجازت لے کر اٹھ گیا۔ کیونکہ گاؤں آنے والی آخری گاڑی کا وقت ہو گیا تھا۔ اسے معلوم تھا صارم خان اچانک آئے گا اسی خیال سے وہ روزانہ اسی وقت لاری اڈے پر پہنچ جاتا تھا اور کوچ سے اترنے والے پہلے سے آخری مسافر کے باہر آنے تک وہ انتظار کی تصویر بنا کھڑا رہتا کہ جیسے ابھی صارم اتر کر اس سے لپٹ جائے گا۔ اس کا انتظار اب اشتعال و غصے میں بدل گیا تھا۔ اسے امید نہ تھی کہ اس کی اس اہم مسرت کے موقع پر اتنی بیگانگی، اجنبیت و بے پروائی کا مظاہرہ کرے گا۔ ورنہ وہ اس کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں کو بہت عزیز رکھتا تھا اور اس سے زیادہ خوشیاں مناتا تھا۔

اس کی کار تیزی سے فراٹے بھرتی سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ اس نے دل میں تہیہ کر لیا تھا کہ وہ اس بار صارم سے سنجیدگی سے ناراض ہوگا تا کہ اسے احساس ہو کہ دوست، وہ بھی جو عزیز از جان ہو اگر بے رخی بیگانگی و سنگدلی کا مظاہرہ کرلے تو کیسا محسوس ہوتا ہے۔ وہ اپنے احساسات سے اسے روشناس کرانا چاہ رہا تھا۔ وہ اپنی سوچوں میں غلطاں و پیچاں کار ڈرائیو کر رہا تھا۔ اچانک ایک نازک موڑ سے سرخ چمچماتی لینڈ کروزر نکل کر اس کی راہ میں حائل ہوئی تھی۔ اس نے مہارت سے بریک لگائے تھے وگرنہ وہ کار سمیت دائیں طرف ہزاروں فٹ گہری کھائیوں میں گر پڑتا۔ اس نے غصیلی نگاہوں سے بے پرواہ انداز میں ڈرائیور کو دیکھا تھا اور سامنے صمد خان کو دیکھ کر اس کی پیشانی پر شکنیں مزید گہری ہو گئیں جب اس نے پیچھے شمشیر خان اور سمندر خان کو دیکھا۔ یہ واحد اور اہم راستہ تھا جو ان کے گاؤں کی سمت جاتا تھا۔ کافی دور تک یہ اکلوتا راستہ تھا پھر آگے جا کر دو راستوں میں بدل جاتا تھا۔ جو دونوں سمتیں ان کے گاؤں کی راہ پر جاتی تھیں۔

صمد خان مسلسل اسے اشارہ کر رہا تھا کہ وہ آگے جا کر انہیں راستہ دے کیونکہ یہ سڑک بہت پتلی تھی۔ دائیں طرف آسمان کی طرح بے وسعت کھائیاں مگرمچھ کی طرح جبڑے کھولے منتظر تھیں۔ جن کی گہرائیوں کا کوئی تعین، کوئی حد معلوم نہ تھی۔ دوسری طرف فلک بوس پہاڑ تھے جن کی چوٹیاں برف سے پوشیدہ کرسٹل کی مانند چمک رہی تھیں۔ سڑک سے بیک وقت ایک گاڑی گزر سکتی تھی کہ سڑک بے حد تنگ تھی سانپ کی طرف بل کھاتی سڑک پر پیچھے ہٹنے کا تصور ہی خودکشی کے مترادف تھا جبکہ شمشیر خان کی جیپ اس پہاڑی راستے کے ابتدائی مراحلے میں داخل ہوئی تھی اگر وہ جیپ پیچھے ہٹا کر راستے دیتے تو خطرہ نہ تھا کیونکہ وہاں زمینی ہموار سطح شروع ہو چکی تھی۔

''اوئے، اندھا ہے؟ یا بہرے کی اولاد ہے؟ اتنی دیر سے ہارن بجاتا ہے۔ راستہ دو ہم کو ہم جائے گا یہاں سے۔'' صمد خان بگڑے تیور سے اس سے مخاطب ہوا اس کے پیچھے سمندر خان بھی اتر کر آ گیا تھا۔

''اندھے اور بہرے کی اولاد تم خود ہو تمہیں نظر نہیں آ رہا کار پیچھے نہیں جا سکتی۔'' مہر یز خان غصے سے گویا ہوا۔

''اوئے پاگل کا بچہ! گاڑی تم الٹی لے کر جائے گا، ہمارا خان کے جو راستے میں آتا ہے وہ پاش پاش ہو جاتا ہے اگر اپنی زندگی چاہتا ہے تو گاڑی الٹی لے کر جاؤ ہمارا خان راستہ نہیں دیتا۔'' سمندر اکبڑ کر رعونت سے بولا۔

''تم نے میرے باپ کو گالی دی ہے، میں تم جیسے پالتو کتوں سے نمٹنا خوب جانتا ہوں۔'' مرحوم باپ کی شان میں کہے گئے لفظ اس کی غیرت برداشت نہ کر سکی تھی۔ وہ شدید غصے میں کار کا دروازہ کھول کر باہر نکلا تھا۔ وہ دونوں بھی اس کے اشتعال انگیز تیور دیکھ کر چوکنا ہو گئے تھے۔

''سنا تھا گیدڑ کی موت آتی ہے تو وہ شہر کا رخ کرتا ہے اور آج تم نے شہر کا نہیں شیر کی کچھار کا رخ کیا ہے۔ بس تمہاری زندگی کا سورج غروب ہونے والا ہے۔'' شمشیر خان اسی لمحے جیپ سے کود کر اتر آیا تھا۔

''شیر! ہونہہ ان کتوں کے آگے تم خود کو شیر سمجھتے ہو گے۔ میری نظر میں تمہاری اوقات پاگل کتے سے زیادہ نہیں ہے۔'' سبریز خان نے انتہائی نفرت و حقارت سے کہا۔

''خان! یہ آپ کی توہین کر رہا ہے۔ میں اسے جان سے مار دوں گا۔''

''خان! اس کی طرف آپ کا پرانا حساب بھی نکلتا ہے اسی دن یہ بچ گیا تھا۔''

''مگر آج نہیں بچ سکتا' شمشیر خان کے دشمن کو یہ زمین لمبے عرصے تک اپنے وجود پر پناہ نہیں دے سکتی۔ بہت جلد وہ میرے شکار کو اسی طرح میرے سامنے لاکھڑا کرتی ہے۔ جس طرح آج تم کھڑے ہو۔'' وہ تحقیرانہ انداز میں کہتا ہوا اس کے مقابل آ گیا تھا۔ اس کی نگاہوں میں درندگی و وحشت یکلخت ابھرنے لگی تھی۔ سبریز خان کی اسے کب سے تلاش تھی۔

''راستے سے ہٹ جاؤ میرے اس نے میرے مرحوم باپ کو گالی دے کر اچھا نہیں کیا ہے۔ تمہارے لیے یہی بہتر ہے کہ میرے راستے سے ہٹ جاؤ۔''

''اتنا ہی دکھ ہے مرے ہوئے باپ کا تو فکر کیوں کرتے ہو، ہم تمہیں بھی اس کے پاس پہنچا دیتے ہیں۔ نہ تم یہاں ہو گے نہ تمہیں افسوس ہو گا۔''
قبل اس کے کہ وہ سنبھلتا' شمشیر خان کی رائفل سے نکلنے والے کئی انگارے اس کی سمت بڑھے تھے فضا دھائیں سے گونج اٹھی تھی۔

☆☆☆

وادی پر غروب ہوتے سورج کی شعاعیں اپنا سونا لٹا رہی تھیں۔ بدلتے موسم نے تمام برف پگھلا ڈالی تھی۔ جس کے وجود سے بے شمار جھرنوں، آبشاروں اور نہروں نے زندگی پائی تھی۔ صارم نے کوچ سے اتر کر طویل سانس لیا جیسے ماحول کی تازگی و شگفتگی یکدم اپنے اندر سمو لینا چاہتا ہو۔ اس نے سوٹ کیس اور سفری بیگ نیچے گھاس پر رکھ دیئے تھے۔ اپنی زمین، اپنے ماحول، اپنی شناخت، اپنے لوگوں کے درمیان آنے کی مسرت نے اسے عجیب ان کہی تازگی، طمانیت و آسودگی بخشی تھی۔ وہ راستے بھر گھر والوں کا اور سب سے زیادہ سبریز کی ناراضگی و خفگی کا تصور کر کے مسکراتا آیا تھا۔ اسے معلوم تھا سبریز اس کی غیر موجودگی کو کس شدت سے محسوس کر رہا ہو گا اور خفا بھی ہو گا لیکن وہ جانتا تھا اس کو دیکھتے ہی اس کی تمام خفگی دور ہو جائے گی اور وجہ معلوم ہونے پر تو وہ خود ہی شرمندہ ہو گا کہ اس کے ہیرے کے سیٹ کی وجہ سے وہ لیٹ ہوا تھا کہ وہ مکمل ہی کل ہو کر آیا تھا اور سیٹ لیتے

ہی وہ روانہ ہو گیا تھا کہ ایک دن اسے پھر بھی شرکت کرنے کا مل گیا تھا کیونکہ اس کی بارات کل تھی اور آج کی رات وہ اس کے ساتھ گپ شپ میں گزارنا چاہتا تھا۔

''صارم خان!'' اس کے نزدیک ایک پجارو آ کر رکی تھی۔

''بابا جانی! چھوٹے اکا! میں آپ لوگوں کو سرپرائز دینا چاہتا تھا آپ کو کس طرح معلوم ہوا کہ میں آج آ رہا ہوں؟'' وہ باری باری ان سے گلے ملتے ہوئے مسرت و اشتیاق آمیز لہجے میں گویا ہوا۔ گاڑی میں موجود چار مسلح محافظوں نے اسے سلام کیا وہ جواب دیتا ہوا چھوٹے اکا کے قریب بیٹھ گیا جبکہ بابا جانی آگے کی سیٹ پر ڈرائیور کے ہمراہ بیٹھ گئے تھے گاڑی تیزی سے آگے کی سمت رواں دواں تھی۔

''دل کو دل سے راہ ہوتی ہے بچے۔'' اکا جان دھیمے سے مسکرائے تھے مگر اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ جبراً مسکرائے ہوں۔ بظاہر ان کے انداز میں گرم جوشی وازحد مسرت کا اظہار تھا جو اس کی آمد پر ہوتا تھا مگر اسے یکدم فضا، ماحول، پراسرار لگنے لگا، اس خطے کی مخصوص ویرانی و اداسی جیسے آج بال کھولے بین کرتی محسوس ہوئی۔ اس کے اندر گویا ایک نامعلوم سی وحشت چکرانے لگی۔

''چھوٹے اکا! سبریز کیوں نہیں آیا؟''

''وہ تمہارا انتظار کر رہا ہے۔'' ان کے لہجے میں کپکپاہٹ تھی؟ یا اسے محسوس ہوئی۔

''کیا وہ مجھ سے ناراض ہے؟ اتنا شدید ناراض کہ آیا بھی نہیں؟'' اسے حیرانگی ہوئی ایسا پہلی دفعہ ہوا تھا۔ ورنہ ناراضگی کے باوجود وہ اسے لینے ضرور آتا تھا اور اس پر نظر پڑتے ہی سب ناراضگی بھول کر گلے لگ جاتا تھا مگر آج...... وہ سوچوں میں الجھا تھا کہ گاڑی اپنا سفر طے کر کے منزل پر پہنچ کر رک گئی تھی۔ اس نے چونک کر باہر دیکھا اور سامنے خاندان کے خاص قبرستان کے گیٹ کو دیکھ کر اس کا دل دھڑکنا بھول گیا تھا۔

''یہ...... یہ ہم یہاں کیوں آئے ہیں؟''

انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا اس کا بازو پکڑ کر اندر لے گئے۔ کئی قبروں کے بعد وہ ایک قبر کے سرہانے کھڑے ہو گئے۔ جس کی نم مٹی اور اس پر پڑے پھولوں کی پتیاں ظاہر کر رہی تھیں کہ قبر تازی ہے۔

''سبریز خان! صارم خان آ گیا۔''

''اٹھو دیکھو، تمہیں صارم خان کا انتظار تھا۔''

بابا جانی یکدم قبر سے لپٹ کر رو پڑے۔

''بابا جانی! سبریز خان؟'' صارم خان پر گویا یکلخت آسمان ٹوٹ کر گر پڑا تھا۔

☆☆☆

''اکا جان...... اکا جان! یہ......؟'' وحشت در وحشت کے صحرا میں سرگرداں وہ متوحش نگاہوں سے چھوٹے اکا کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی بے یقین نگاہیں تازہ مٹی کی نرم لحد پر بکھرے سرخ گلاب کی پتیوں پر مرکوز تھیں۔

''یہ سب کیا ہے؟ سبریز خان کہاں ہے؟ بابا جانی! چھوٹے اکا یہاں سبریز سے کیوں مخاطب ہیں؟ کہاں ہیں وہ؟'' وہ ایک دم قریب کھڑے بابا جانی سے مخاطب ہوا جو بہت ضبط و حوصلے سے کھڑے اس کی وحشت و سراسیمگی کو دیکھ رہے تھے۔

''صارم خاناں! ہمارے مذہب میں امانت میں خیانت کرنے والے کو بددیانت کہا جاتا ہے۔ بہترین مسلمان اور اچھے لوگ پسندیدہ بندے وہی لوگ کہلاتے ہیں جو امانت لوٹانے پڑ واویلا نہ مچائیں۔ خوشی خوشی مالک کو اس کی امانت لوٹا دیں۔ ایسے ہی لوگ اللہ کے پسندیدہ بندے ہوتے ہیں اور یہاں اور وہاں دونوں جگہ کامیاب بھی کہلائے جاتے ہیں۔'' ان کے نرم و شیریں لہجے کی مٹھاس ایسی تھی جیسے طوفان کی آمد سے قبل بند باندھے جاتے ہیں۔

''بابا جانی! مجھے آپ کے پڑھائے ہوئے سارے سبق یاد ہیں لیکن اس وقت میں جن لمحوں سے گزر رہا ہوں وہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ سبریز کہاں ہے؟''

''سبریز، جس کی امانت تھا اس کو ہم نے لوٹا دیا۔ دیکھو خاناں! وہ سو رہا ہے۔'' انہوں نے قبر کی طرف اشارہ کر کے بہت عام سے انداز میں کہا۔

''سبر...... یز...... سو...... رہا ہے نہیں...... بابا جانی! یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ نہیں وہ نہیں سو سکتا؟ اسے نیند بہت کم آتی ہے۔ جو زیادہ سوتے تھے ان سے وہ چڑ جاتا تھا پھر اب کیسے سو سکتا ہے؟'' اتنا شدید اور غیر متوقع صدمہ اسے ملا تھا۔ وہ ایک دم ہی حواس کھو بیٹھا تھا۔

''سبریز خان! اٹھو، تم نہیں سو سکتے، سبریز خان، میں تمہیں سونے نہیں دوں گا، سبریز، سبریز۔''

اس کی کرب آمیز دردناک پکار سے قبرستان کی خاموش فضا گونج اٹھی تھی۔

''صارم خان! سنبھالو خود کو، سبریز خان اب ہم میں نہیں ہے۔ وہ ہم سے بہت دور چلا گیا ہے۔ وہ کبھی نہیں آئے گا۔'' چھوٹے اکا اس کی دیوانگی دیکھ کر اپنے آنسو مزید ضبط نہ کر سکے اور اسے سینے سے لگا کر رونے لگے۔

''ایسا نہیں ہو سکتا چھوٹے اکا! سبریز مجھے چھوڑ کر نہیں جا سکتا، وہ میرے بغیر رہنے کا عادی نہیں ہے۔ وہ مجھے چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔'' وہ مکمل حواس کھو چکا تھا۔

بابا جانی، چھوٹے اکا کے سمجھانے کے باوجود سبریز کو پکارتا پھر رہا تھا۔ چھوٹے اکا اس کی دیوانوں جیسی حالت دیکھ کر اپنے آنسو روک نہ پا رہے تھے۔ بابا جانی اس وقت چٹان بنے ہوئے تھے۔ وہ اس خاندان کی عمارت کا قدیم ستون تھے، وہ کمزور پڑتے خود پر ضبط و برداشت کے پہرے نہ بٹھاتے تو عمارت لمحے بھر میں ٹوٹ پھوٹ کر بکھر جاتی، اور ان کا نام و نشان مٹ کر رہ جاتا جو انہیں کبھی گوارا نہیں تھا۔

''صارم خان! ہوش کرو، تم شجاعت مند مرد ہو اس قبیلے کے ہونے والے سردار۔'' انہوں نے ایک جھٹکے سے قبر سے لپٹے صارم کو جھنجوڑا تھا۔

☆☆☆

''بڑے خان! آپ کیوں اتنے خفا ہیں؟ کیا خطا ہوئی ہے مجھ سے؟'' گل بی بی ان کی مسلسل بے اعتنائی وغصہ برداشت کرتے کرتے عاجز ہوگئی تھیں۔ آخر کار ان کی قوت برداشت جواب دے گئی۔ وہ شہباز خان کے روبرو تھیں۔

''گل خانم! ہم نے سنا تھا عورت زندگی میں ایک بار پیار کرتی ہے۔ اس کے دل کی دنیا ایک بار ہی آباد ہوتی ہے۔ پھر اگر اسے اپنے محبوب سے جدا ہونا پڑ جائے تو، وہ پیار دوسرے مرد سے نہیں کرسکتی، صرف سمجھوتا کرتی ہے۔ جسم پر کسی رشتے کا تسلط رہتا ہے مگر دل پر محبوب کی ہی حکمرانی رہتی ہے۔ تم جیسی عورتوں سے بہتر بازاری عورتیں ہوتی ہیں جو سودا.....''

''شہباز..... خان! مجھے اتنی گندی گالی دینے سے قبل اپنے اور میرے رشتے کے احترام کو ملحوظ خاطر رکھو، مت بھولو، میں تمہاری بیٹیوں کی ماں ہوں۔'' گل خانم غصے وصدمے سے کانپ اٹھی تھیں۔ ان کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ بڑے خان اتنی گھٹیا وغیر مہذب زبان استعمال کریں گے۔

''شاید بیٹیوں کی محبت ہی کا کمال ہے جو تم ابھی تک زندہ پھر رہی ہو۔'' وہ انہیں شعلہ بار نگاہوں سے گھور کر گویا ہوئے۔

''میرا قصور کیا ہے؟ کیا کیا ہے میں نے؟ جو آپ نے حیات کی رسی کا دائرہ مزید میری گردن کے گرد تنگ کر ڈالا ہے۔ مجھ سے غافل ہوئے تو آپ کو ایک مدت گزر گئی اب کس بات کا شکوہ آپ کر رہے ہیں؟''

''تمہارے دل میں ابھی بھی روزم خان کی چاہت پھولوں کی طرح مہکتی نہیں ہے؟'' وہ قریب آ کر قہر آلود نگاہیں ان کے چہرے پر ڈال کر غرائے۔

''بڑے خان!'' وہ پتھرائی نگاہوں سے ان کا چہرہ دیکھنے لگیں۔

''جھوٹ بول رہا ہوں؟ بولو تمہارے دل میں روزم خان ابھی بھی موجود ہے۔ زندہ سلامت۔''

''بڑے خان! یہ کیسی بات کی آپ نے؟ مجھے میری نظروں سے گرا دیا۔ عورت کے لیے اس سے بڑا دکھ اور کیا ہوگا کہ اس کا مجازی خدا، عمر کے اس حصے میں اس پر اتنا گھٹیا الزام لگائے جب وہ عمر کے اس آخری موڑ پر کھڑی ہو۔ آپ نے مجھے بہت بڑی گالی دی ہے خان! بہت بڑی گالی۔'' وہ گہرے صدمے کے اثر میں گھڑی کی گھڑی رہ گئی تھیں۔

''حقیقت بیان کی ہے میں نے، اگر تمہارے اندر روزم خان کی محبت اور یاد کا پودا خاک ہوگیا ہوتا تو اس دن، ان بڈھے کو تم بچانے کے لیے زنانہ دہلیز نہ عبور کرتیں۔'' ان کی وضاحت وذہنیت پر وہ ششدر رہ گئیں۔

''اوہ، یہاں کیا راز و نیاز ہو رہے ہیں؟ جبھی میں کہوں تمہارا مزاج کیوں آج کل اکھڑا اکھڑا رہتا ہے۔ ہوں تو یہ بڑھیا پھر آج کل تم پر ڈورے ڈال رہی ہے۔ لیکن..... تمہاری ساری محنت ضائع جائے گی تمہاری دال نہیں گلنے دوں گی بڑھیا جادوگرنی۔'' یک دم گل جاناں اندر داخل ہوئی اور حسب عادت انہیں دیکھ کر چیخنا چلانا شروع کردیا۔

''گل جاناں! بکواس مت کرو۔ میں بیوی ہوں خان کی۔ بات کرنے آئی ہوں۔''

''تم بیوی ہو تو بھاگ کر میں بھی نہیں آئی ہوں۔'' وہ ان کے روبرو آ کر اکڑ کر بولی۔

"میں تمہارے منہ لگنا پسند نہیں کرتی اس لیے کہ نہ تمہیں اپنی عزت کا خیال ہے اور نہ دوسروں کی عزت کا۔" پہلی بار انہوں نے گل جاناں کو سختی سے جواب دیا تھا۔

"خان! میں نے بڑی جنگ سے بچنے کے لیے بابا صاحب کو بچایا تھا۔ اگر شمشیر خان کی گولی کا وہ نشانہ بن جاتے تو اب تک نہ معلوم کیا ہو چکا ہوتا۔ رزم خان کا نام میری زندگی سے اسی دن ہی مٹ گیا تھا جب میں آپ کی زندگی میں داخل ہوئی تھی۔ عورت کی ذات چار ستونوں پر تعمیر ہوتی ہے۔ پہلا ستون باپ، دوسرا بھائی، تیسرا شوہر اور چوتھا بیٹا۔ اس کے علاوہ اسے کسی پانچویں ستون کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہ چار ستون ہی اسے مضبوط کرتے ہیں، معتبر بناتے ہیں۔ ان رشتوں کے علاوہ مجھے کسی گھٹیا و غیر مہذب رشتے کی نہ تو خواہش ہے اور نہ آرزو۔"

"جب تمہیں کوئی خواہش یا آرزو نہیں تو کیوں آئی ہو خان کے پاس؟" گل جاناں چمک کر گویا ہوئیں۔ شہباز خان خاموش کھڑے تھے۔

"یہ بتانے کہ ورشا کے امتحان ختم ہو گئے ہیں اسے کراچی سے بلوالیں۔"

"اس کے امتحان ختم ہو گئے۔ اب ہمارے شروع ہو جائیں گے۔ میں تو کہوں اس منحوس کو یہاں لانے سے بہتر ہے وہیں کراچی کے سمندر میں پھینک آؤ، ہماری زندگی کی خوشیوں کی دشمن ہے وہ منحوس۔"

"گل جاناں! دل پر ہاتھ رکھ کر بات کیا کرو، تم بھی اولاد والی ہو۔"

"ہاں..... اولاد والی ہوں۔ بیٹیوں کی ماں نہیں ہوں۔ شیر سے بہادر و جوان گبھرو بیٹوں کی ماں ہوں۔" وہ اپنے مخصوص تکبر بھرے لہجے میں گویا ہوئیں۔

"ممتا سب ایک جیسی ہوتی ہے۔ بیٹا، بیٹی کی تفریق نہیں ہوتی اولاد میں۔"

قبل اس کے کہ بات مزید بڑھتی ملازمہ نے اندر آکر شہباز خان کو مہمانوں کی آمد کی اطلاع دی۔

"تم اپنے کمروں میں جاؤ، اسی ہفتے میں ورشا گھر پر آجائے گی۔"

وہ تیز تیز قدموں سے بیٹھک کی طرف بڑھنے لگے۔ ان کے اندر کھد بدسی مچ گئی تھی۔ وہ پچھلے دو روز سے زمینوں کے مقدمے کے سلسلے میں گاؤں سے باہر گئے تھے۔ چند گھنٹے قبل ہی وہ شہر سے آکر بیٹھے تھے۔

"سلام بڑے خان!" اندر بیٹھا صمد خان فوراً کھڑے ہو کر سلام کرنے لگا۔

"شمشیر خان کہاں ہے؟" اسے تنہا دیکھ کر ان کے اندر کی بے چینی و اضطراب مزید سوا ہوا۔

"چھوٹا خان روپوش ہے۔ بڑے خان!" وہ آہستگی سے گویا ہوا۔

"روپوش ہے؟ مگر کیوں؟ دو روز پہلے ہم اس یہاں چھوڑ کر گئے تھے سب درست تھا پھر کیا ہوا؟"

"شاہ افضل خان کے پوتے کو ختم کر ڈالا چھوٹے خان نے۔"

"کیا..... کیوں.....؟ کیسے ہوا سب؟" وہ ایک دم کھڑے ہوئے تھے یہ خبران کے لیے دھماکا تھی۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ

ان کی غیر موجودگی میں ایسا اقدام کر ڈالے گا۔ پریشانی و فکر مندی ان کے سرخ و سپید چہرے سے عیاں ہونے لگی۔

"بڑے خان جی! غلطی چھوٹے خان کی نہیں تھی اور نہ ہی انہوں نے پہل کی تھی۔"

"بکواس مت کرو۔ کہاں ہے تمہارا خان؟" وہ دہاڑ کر گویا ہوئے۔

"وہ... وہ جی! جنگل والے ڈیرے پر ہیں اور آپ کو وہیں بلوایا ہے۔" صمد خان کو ان کا پرطیش انداز بڑی طرح خوف زدہ کر گیا۔

"اچھا... تم گاڑی اسٹارٹ کرو ہم آتے ہیں۔" وہ اندر کی جانب بڑھتے ہوئے گویا ہوئے... بے چینی، اضطراب، انتشار وانکار ان کی چال وچہرے سے مترشح تھے۔

☆☆☆

غروب ہوتے سورج کی شعاعوں میں سرخی جھلک رہی تھی۔ چاروں سمت سربلند کیے پہاڑوں کی چوٹیوں پر دھیما سا سرمئی اندھیرا اترنے لگا تھا۔ ہوائیں خاموش تھیں۔ پھلوں سے لدے درخت، رنگ برنگے پھولوں سے جھکی ڈالیاں، سبزے سے ڈھکے میدان، اس طرح ساکت وصامت کھڑے تھے جیسے ان کے دلوں اور خواہشوں پر چلتے چرکوں کا کرب وہ بھی محسوس کر رہے ہوں۔ ان کے دکھ کرب پر وہ بھی نوحہ کناں ہوں۔ آج سبریز اور گل سانگہ کا سوئم تھا۔ ماحول میں دو جوان اور اچانک ہونے والی اموات کی سوگواری ورنج چھایا ہوا تھا۔ صبح سے بڑی حویلی میں قرآن خوانی ہو رہی تھی۔ مرحومین کے ایصال ثواب کے لیے قرآن خوانی کے علاوہ میلاد شریف کا اہتمام بھی ہوا۔ عصر کے بعد غریبوں، مسکینوں میں کھانا تقسیم ہوا۔ حویلی آہ وفغاں میں ڈوبی ہوئی تھی۔ سبریز کی شادی میں شرکت کرنے والے آج دونوں کے سوئم میں شرکت کے بعد اشک بار آنکھوں سے روانگی کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ گھر کی عورتوں نے ان تین دنوں میں اتنے آنسو بہائے تھے کہ اب آنکھیں کسی صحرا کی مانند خشک وویران تھیں۔ ان کی اس المناک موت کے صدمے سے چور چور دل سے بے ساختہ نکلنے والی آہیں ان کے لبوں سے خارج ہوتی تھیں تو سننے والوں کے دل بھر بھر آتے تھے۔

"زریں گل! صارم کہاں ہے؟ ظہر کے بعد سے مجھے نظر نہیں آیا ہے وہ۔" افضل خان جو بی بی جان کو کچھ دیر سے کھڑے دیکھ رہے تھے۔ وہ مغرب کی نماز کے بعد دعا کے لیے ہاتھ بلند کیے بیٹھی تھیں۔ ان کے لب خاموش تھے۔ پتھرائی ہوئی نگاہیں اوپر کی جانب اٹھی ہوئی تھیں پھر قطرہ قطرہ آنسو ان کے جھریوں زدہ چہرے سے چادر پر گرنے لگے۔ شاہ افضل خان آج کے دن اپنے اندر ایک رنج والم کا ایسا زور آور طوفان چھپائے بظاہر مطمئن پھر رہے تھے کہ اس کو برپا ہونے کا ذرہ بھر بھی راستہ مل جائے تو وادی میں آگ وخون ہواؤں کی مانند بکھر کر رہ جائے اور اسی قیامت کو روکنے کے لیے وہ جوان وچہیتے پوتے کے قتل پہ بھی چشم پوشی اختیار کیے بیٹھے تھے۔ شریک حیات اعظم کے بیٹے بہادر زریں گل کے خاموش آنسو ان کے اندر برچھیاں بن کر اتر رہے تھے۔

"گل...! میں کچھ پوچھ رہا ہوں۔ صارم خان کہاں ہے؟" وہ قریب آکر گویا ہوئے۔

"سبریز خان کہاں؟ کہاں چھوڑ آئے ہیں آپ اسے؟ آپ کو معلوم ہے آج اس کی شادی کا دن ہے۔ اسے بارات لے کر جانا ہے۔ بارہ گھوڑوں کی بگھی میں بارات جائے گی اس کی، میرا سبریز شہزادہ بنے گا آج، اتنی دھوم دھام سے اس کی بارات جائے گی دنیا نے کبھی اتنا کروفر،

شاہانہ انداز نہ دیکھا ہوگا، لوگ مدتوں یاد رکھیں گے میرے سبریز کی شادی کو۔" وہ جاء نماز سے اٹھ کر کہتی ہوئی ان کی طرف بڑھیں۔

"گل زرین! حواسوں میں آؤ۔" وہ ان کا ہاتھ پکڑ کر تخت پر بٹھاتے ہوئے نرم لہجے میں گویا ہوئے۔ ان کے چہرے پر اس قدر وحشت، حسرتوں، دکھوں و یاسیت سے بھری آنکھوں میں انہیں لگا سبریز کا کفن میں لپٹا سفید چہرہ ابھر آیا ہو۔

"کہاں تک حواسوں میں رہوں؟ آپ مجھے ہمیشہ یہی حکم کیوں دیتے ہیں خان! میں کیا صرف دکھ ہی دکھ دیکھنے کے لیے زندہ ہوں؟ خوشیاں کیوں ہمیشہ ہماری دہلیز پر آنے سے قبل اپنا راستہ بدل لیتی ہیں؟ سکھ ہمیں راس کیوں نہیں آتے؟ آج کا دن قیامت کا دن ہے خان، آج اسے دلہا بننا تھا۔ وہ کیوں سفید لباس پہن کر منوں مٹی تلے جا سویا؟" انہوں نے پھر رونا شروع کر دیا۔

"گل! خدارا، سنبھالو خود کو۔ قبل اس کے کہ چٹان نظر آنے والا شاہ افضل خان مٹی کے حقیر تودے کی طرح تمہارے آنسوؤں میں بہہ جائے، خشک کر لو آنسوؤں کو۔ اگر یہ چٹان مٹی بن گئی تو پھر سب کچھ مٹی ہو جائے گا۔ ہماری شناخت، ہماری نسل، ہمارا اصل سب فنا ہو جائے گا، قیامت سے پہلے قیامت آ جائے گی۔" ان کی آواز شدید ضبط سے لرز اٹھی تھی۔ "سبریز خان ہمیں بھی اتنا ہی عزیز تھا جتنا پیارا تمہیں تھا۔ اس کی جدائی گل سانگہ کی جدائی، ایسا ہی لگ رہا ہے جیسے کوئی کند چھری سے ہمیں ذبح کر رہا ہو۔ درد ہمیں بھی ہو رہا ہے۔ تکلیف میں ہم بھی گرفتار ہیں مگر کچھ کہہ نہیں سکتے کہ اگر ایک بار زبان بے قابو ہو گئی تو....."

انہوں نے سختی سے ہونٹوں کو بھینچا تھا، ہلکی سی نمی ان کی بوڑھی آنکھوں میں در آئی تھی۔

"خان جی! صارم وہیں ہوگا سبریز کی قبر پر، جا کر اسے لے آؤ۔ میں اسے اب اپنے سے دور نہیں ہونے دوں گی۔ اپنے آنچل میں چھپا کر رکھوں گی۔ دشمنوں کی خونی جان لیوا نحوس نگاہوں سے۔ سبریز چلا گیا مگر اب صارم کو جانے نہیں دوں گی۔" انہیں کمزور پڑتا دیکھ کر وہ آنسو صاف کر کے گویا ہوئیں۔

☆☆☆

سفر کٹھن و دشوار گزار تھا تین گھنٹے کا سفر ابھی جاری تھا۔ لینڈ کروزر سرسبز و شاداب میدانوں کو عبور کرتی ہوئی اونچے بل کھاتے راستے پر سبک رفتاری سے گامزن تھی۔ شہباز ولی خان آرام دہ نشست پر براجمان گہری سوچوں میں گم تھے۔ گاڑی گھنے و مہیب جنگل کے ٹوٹے پھوٹے راستوں پر محتاط روی سے دوڑ رہی تھی اور جوں جوں راستہ طے ہو رہا تھا اندھیرا ابھی بڑھتا جا رہا تھا۔ حالاں کہ وقت دوپہر کا تھا مگر یہاں گھنے اور پھیلے ہوئے درختوں اور قد آور جھاڑیوں کی بہتات کے باعث اور اکیس ہزار فٹ کے ہوئے بلند و بالا پہاڑوں کی اوٹ کی وجہ سے سورج کی کرنیں یہاں داخل نہیں ہو پاتی تھیں۔ یہاں یزدن کی روشنی میں بھی رات کا سماں لگتا تھا۔ دشوار گزار راستوں اور ہر وقت چھائی رہنے والی گہری دھند کے باعث یہاں کا رخ کرنے کا کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے علاوہ جنگلی جانوروں اور موذی کیڑوں کی موجودگی نے عام انسان کا یہاں آنا ناممکن بنا ڈالا تھا۔

"صمد خان! کتنا راستہ اور باقی ہے؟" شہباز خان اپنے گرد اونی لائٹ براؤن چادر لپیٹتے ہوئے صمد خان سے مخاطب ہوئے۔ گاڑی کی رفتار کے ساتھ سرد ہوائیں بھی بتدریج بڑھ رہی تھیں جس سے جسم میں سردی کا احساس بیدار ہونے لگا تھا۔

''تھوڑا وقت اور لگے گا بڑے خان جی! اگر آپ کو سردی لگ رہا ہو تو تھرموس سے کافی نکال کر دوں۔ نیچے وادی میں ان مہینوں میں خوش گوار موسم ہوتا ہے لیکن پہاڑوں پر برف ہونے کی وجہ سے سارا سال سرور رہتا ہے۔ ہاں یہ بات دوسری ہے یہاں ان دنوں ہم آ جا سکتے ہیں۔ سردی برداشت ہو جاتی ہے۔ موسم سرما میں برف سے راستے بند ہو جاتے ہیں اور سردی سے بچنے کے لیے لوگ گرم علاقوں کا رخ کرتے ہیں۔'' صمد خان اس کی بات پر کافی تھرموس سے نکال کر مگ انہیں پکڑاتے ہوئے سردی کے بارے میں تفصیلات بھی بتاتا جا رہا تھا۔ کافی سے فارغ ہونے کے بعد گاڑی پھر اپنی منزل کی طرف گامزن ہو چکی تھی۔ گرما گرم کافی نے انہیں تقویت بخشی تھی۔

ایک گھنٹے کے مزید سفر کے بعد وہ منزل مقصود پر پہنچے تھے۔ صمد خان نے جیپ ایک پہاڑ کے پاس آ کر روکی تھی اور پھرتی سے اتر کر ان کے لیے دروازہ کھولا تھا جو بہت حیرانگی سے ارد گرد پھیلے درختوں اور جھاڑیوں میں کھلے زرد اور جامنی چھوٹے چھوٹے پھولوں کے گچھوں کو دیکھ رہے تھے۔ ان کی نگاہوں میں ستائش کے ساتھ ساتھ استعجاب بھی موجزن تھا۔ حسب عادت دل ہی دل میں بیٹے کی حکمت ہوشیاری کو داد دے رہے تھے۔

انہوں نے ذرا سا نیچے جھک کر دیکھا ہر سو گہری دھند تھی۔ سرد ہوائیں، نیم اندھیرا، خاموشی و سناٹے کا راج۔

''السلام علیکم باباجان! کیسے پسند آیا میرا نیا ٹھکانہ؟ کوئی سوچ سکتا ہے بھلا یہاں انسان کی موجودگی کا۔ ہزاروں فٹ کی بلندیوں پر آپ کھڑے ہیں۔ نیچے سے دیکھنے والوں کو درختوں اور دھند کے سوا کچھ نظر نہیں آ سکتا۔ اوپر سے بھی نیچے دھند ہی دھند نظر آتی ہے۔ کیسا ہے؟'' وہ گاڑی کی آواز سن کر باہر آ گیا تھا اور باپ کے چہرے پر پھیلے حیرانگی کے رنگ اسے نظر آ گئے تھے۔ وہ بہت ہشاش بشاش موڈ میں تھا مسکرا کر باپ سے مخاطب ہوا تھا۔

''تمہاری ذہانت و فراست کا اگر میں قائل نہ ہوتا تو سب بیٹوں میں تمہیں یوں ہی سب سے زیادہ اہمیت و محبت نہ دیتا۔ یہ بتاؤ شاہ افضل خان کے پوتے کو کیوں مارا؟'' اس کا چہرہ دیکھتے ہی وہ تمام فکر و پریشانی بھول بیٹھے۔ اس مضبوط و بلند سراپا کو دیکھ کر انہیں ہمیشہ تحفظ و طمانیت کا احساس ہوتا تھا جس نے اس وقت بھی غلبہ پا لیا۔

''اس کی موت نے پکارا تھا۔ اندر آئیں صبح پہاڑی بکرے کا شکار کیا ہے۔ سمندر خان اسے روسٹ کر رہا ہے کچھ دیر میں وہ تیار ہو جائے گا۔ آپ کی پسند کے مطابق مسالہ ڈلوایا ہے۔'' وہ ان کے ساتھ چلتا اندر داخل ہو گیا۔ پہاڑ کے اندر غار تھا۔ خوب کشادہ اور ضرورت کا ہر سامان وہاں موجود تھا۔ ایک طرف سمندر خان آگ کے الاؤ پر وہاں کے مخصوص انداز میں بکرا بھون رہا تھا۔ قریب صمد خان قہوہ تیار کر رہا تھا۔ روسٹ اور قہوے کی ملی جلی مہک وہاں بکھری ہوئی تھی۔ سمندر خان نے انہیں اندر داخل ہوتے دیکھ کر کھڑے ہو کر سلام کیا وہ جواب دیتے ہوئے فرشی نشست پر دراز ہو گئے۔ قریب ہی شمشیر خان بیٹھ گیا تھا۔ صمد خان کانچ کی نفیس پیالیوں میں الائچی والا سبز قہوہ انہیں دے کر چلا گیا۔ شہباز خان، شمشیر خان کے بولنے کے منتظر تھے مگر وہ تو مطمئن انداز میں قہوہ پی رہا تھا گویا انہیں یہاں اسی لیے بلوایا ہو۔

''شمشیر خان! میری بات کا جواب دو۔ کیوں کیا تم نے ایسا؟'' شہباز خان نے سخت لہجے میں اس بار استفسار کیا۔

''باباجان! ابھی ابتدا ہے آگے آگے دیکھئے گا شاہ قبیلے کو میں اسی طرح موت کی نیند سلا ڈالوں گا۔ سرمئی پہاڑیوں والا علاقہ جب تک میں

اپنے نام کے ساتھ نہیں لگاؤں گا چین سے نہیں بیٹھوں گا۔"

"پھر اس طرح چوہے کی مانند بل میں کیوں چھپ گئے ہو؟"

"بابا جان! یہ بات آپ نے کی ہے اگر کوئی دوسرا کہتا تو دوسرے لمحے وہ مردے میں شمار کیا جاتا۔" وہ ایک دم بھڑک کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"کتنی مرتبہ سمجھایا ہے جذباتیت کے گھوڑے پر سوار مت ہوا کرو خاناں! مگر تم ہمیشہ جذبات کو اولیت دیتے ہوئے جذبات کی تابعداری میں لگے رہتے ہو۔ سبریز خان کو مار کر کیا سمجھتے ہو وہ خاموش ہو جائیں گے؟ چوڑیاں پہن رکھی ہیں ان لوگوں نے؟ یا وہ مرد نہیں ہیں؟" وہ یک دم طیش میں آ گئے تھے۔

"ہونہہ! مرد؟ مجھ جیسا ایک بھی نہیں ہے مرد۔" وہ گھنی مونچھوں کو بائیں ہاتھ سے بل دیتے ہوئے اکڑ کر فاتحانہ انداز میں گویا ہوا۔

"یہ بچگانہ حرکتیں چھوڑ دو شمشیر خان! ہوش و دانش مندی کی سرزمین پر قدم رکھو۔ آنکھوں اور دماغ کو روشن کرو۔ فتح ہمیشہ دانش مندی و فہم و فراست کے داؤ پیچ لڑا کے حاصل کی جاتی ہے۔ چال عموماً ایسی چلنی چاہیے کہ سانپ بھی مر جائے اور اس کی آنکھوں میں مرنے والے کا عکس بھی نظر نہیں آئے۔" وہ سرگوشیانہ انداز میں بیٹے سے مخاطب تھے۔ ان کے پُر وقار و بارعب چہرے پر اس وقت شیطانیت سی پھیل گئی تھی۔ جس سے ان کا چہرہ بے حد مکروہ لگ رہا تھا۔

"بابا جان! میری موٹی عقل میں آپ کی باریک باریک باتیں کبھی نہیں آ سکتیں۔ آپ اپنی مرضی سے کام کریں مجھے میرے خیال پر چھوڑ دیں۔" اس کا موڈ بدستور آف تھا۔ باپ کا "چوہے" کا خطاب دینا اسے قطعی نہیں بھایا تھا۔

"خاناں! بات سمجھا کرو۔ غصے میں مت آیا کرو۔ کوئی ترکیب لڑاؤ، کوئی حل نکالو۔"

"کچھ نہیں ہوگا بابا جان! بدلے کے لیے بھی ہمت و طاقت چاہیے۔ کچھ نہیں کر سکتے وہ لوگ۔ اگر ان کے پاس طاقت و جرات ہوتی تو ان کا بزرگ ہم سے دوستی کا ہاتھ بڑھانے کیوں آتا؟" اس نے تمسخرانہ انداز میں دلیل پیش کی۔

"تم اپنی عقل سے سوچنے، اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے عادی ہو چکے ہو۔ اب میں سوائے صبر کے اور کیا کر سکتا ہوں۔ بہرحال تم ابھی چند دن یہیں رہنا۔ معاملہ تازہ ہے کوئی آگ بھڑک سکتی ہے۔ بات پرانی ہو جائے گی تو خود ہی سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔"

"ہا..... ہا..... ہا..... بابا جان! آپ کیا سمجھتے ہیں؟ میں ان لوگوں سے چھپ کر بیٹھا ہوں؟ نہیں شمشیر خان شیر ہے گیدڑ نہیں۔ ایک شکار کرنے کے بعد مزید شکار کی طلب مجھے بے چین کر دیتی ہے تو اپنے بے چینیوں اور وحشتوں پر قابو پانے کے لیے اس جنگل میں آ کر جانوروں کا شکار کھیل کر تسکین حاصل کرتا ہوں۔" باپ کی بات پر اس نے بے ساختہ قہقہہ لگایا تھا۔

"بہت خوش ہو؟ یہ صحد کہہ رہا تھا تم روپوش ہو گئے۔" وہ اسے مسرور دیکھ کر خود بھی مسرت محسوس کر رہے تھے۔ وہ فطرتاً خشک مزاج و غصہ ور شخص تھا۔ شاذ و نادر ہی اس کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہوتی تھی۔ آج بات بات پر اس کا مسکرانا، قہقہے لگانا اس بات کی دلیل تھی کہ وہ بے حد خوش و پرسکون ہے۔ اس کو پُر مسرت دیکھ کر وہ بھی تمام اندیشے، واہمے بھول بیٹھے جو یہاں آنے سے قبل انہیں بے چین و بے سکون کیے ہوئے تھے۔ ویسے

بھی وہ اس سے والہانہ محبت کرتے تھے۔ اس کی خوشی میں خوش و رنج میں رنجیدہ ہو جانا ان کا فطری عمل تھا۔

''یہ سر میں دماغ کے بجائے بھوسا لیے گھومتا ہے جو منہ میں آتا ہے بولنے سے نہیں چوکتا۔'' اس کے بھاری ہاتھ کا کرارہ تھپڑ صمد خان کے چہرے پر نشان چھوڑ گیا۔

''معاف کردو خان! زبان ہے پھسل جاتا ہے۔'' وہ فوراً ہاتھ جوڑ کر گڑگڑایا۔

''سنبھال کر رکھا کرا سے ورنہ.....'' وہ تندی سے گویا ہوا۔

''چھوڑو خان! یہ انسان ہیں غلطی فرشتوں سے بھی ہو جایا کرتی ہے۔ تم کھانا لگواؤ میں کچھ دیر آرام کروں گا پھر کھانا کھاتے ہی روانہ ہونا ہے خاصا لمبا سفر ہے۔'' وہ سر سے شملہ اتار کر اسے پکڑاتے ہوئے گاؤ تکیے کے سہارے نیم دراز ہو گئے۔

''بابا جان! وہ شے آ گئی کراچی سے؟'' اسے ایک دم خیال آیا تھا۔

''نہیں۔ کل تربت خان کو روانہ کروں گا اسے لینے کے لیے۔'' وہ آنکھیں موندے گویا ہوئے۔

''اگر اب اس نے کوئی گڑبڑ کی گاؤں آ کر تو بابا جان! اسے زندہ زمین میں دفن کر دوں گا۔'' وہ پیر پٹخ کر تند لہجے میں گویا ہوا۔ ان کی طرف سے خاموشی محسوس کر کے پلٹ کر دیکھا تو وہ بے خبر سو رہے تھے۔ وہ سمندر خان، اور صمد خان کی طرف بڑھ گیا۔

☆☆☆

بدلی	بدلی	سی	فضا	لگتی	ہے
ساری	دنیا	ہی	خفا	لگتی	ہے
دل	کا	دروازہ	کھلا	چھوڑ	دیا
تیرے	قدموں	کی	صدا	لگتی	ہے

''صارم خان! اس طرح کب تک خود سے اور دوسروں سے بے پرواہ رہ سکتے ہو بچے! جو مسافر لوٹ جاتے ہیں کبھی نہ آنے کے لیے ان کی راہ تکنا خود کو دھوکا دینے کے مترادف ہے۔ نکل آؤ اس دھوکے سے، سنبھالو خود کو، زندگی اس طرح سب سے الگ تھلگ رہ کر نہیں گزر سکتی۔ حوصلے سے کام لو۔'' چھوٹے اکا صبح سے گھر سے غائب دیکھ کر اس تک پہنچے تھے۔ وہ شہتوت کے درخت کے نیچے اس پتھر پر تنہا بیٹھا خلاؤں میں گھور رہا تھا۔ سامنے شفاف پانی کی چھوٹی سی ندی بہہ رہی تھی جس کے پانی سے سیراب اردگرد پھیلے سبزے میں خوب صورت کاسنی، گلابی اور نیلے اور سرخ جنگلی پھول کھلے ہوئے منظر کو دلکش بنا رہے تھے۔ ان کے وجود سے نکلتی دھیمی دھیمی مہکار پھیلی ہوئی تھی۔

''چھوٹے اکا! آپ کو معلوم ہے نا، میں اور سبریز یہاں روز بیٹھا کرتے تھے؟ اسے یہ جگہ بے حد پسند تھی۔ وہ کہتا تھا سامنے پہاڑوں کی اوٹ سے نکلتے سورج کو دیکھ کر لگتا ہے زندگی طلوع ہو رہی ہے۔ اسے اجالوں سے عشق تھا، روشنیوں کا اسیر تھا وہ، پھر کیوں اندھیروں میں گم ہو گیا؟''

وہ درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر کے کرب سے گویا ہوا۔ اس کے چہرے پر سوز ہی سوز تھا۔

"انسان اس بات سے بے خبر ہوتا ہے بچے کہ اگلا پل اس کے لیے آنچل میں کیا لا رہا ہے۔ بے بسی و بے خبری کا دوسرا نام انسان ہے۔ ہم ہمیشہ اپنے کل سے بے خبر رہتے ہیں، یہ بے خبری کبھی ہمارے لیے بہتر ثابت ہوتی ہے تو کبھی اذیت ناک بھی بن جاتی ہے۔ لیکن بچے! یہ سب اللہ کے حکم پر ہوتا ہے۔ اس کے ہر کام میں مصلحت ہوتی ہے وہ کبھی ہماری برائی نہیں چاہتا۔ جو ہوا اس کے حکم پر ہوا ہے اور اس کے حکم کے سامنے ہماری کیا بساط کہ دم بھر سکیں۔ صبر کرو۔ دل کو تسلی دو گے تو قرار آئے گا۔ تمہارا دوست تھا، بھائی تھا، بہت عزیز تھا وہ تمہیں۔ میرے بھی بھائی کی نشانی تھی۔ اپنے بچوں سے زیادہ چاہا ہے میں نے اسے بھی اور تمہیں بھی۔ لیکن آج اپنے دل پر پتھر رکھے ہوئے اسے بھولنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ گل سانگہ کے ماں باپ نہیں تھے۔ اسے بھی بی بی جان اور بابا جانی نے سگی بیٹی کی طرح پرورش کیا۔ اس کی شادی کی تیاری بالکل اسی انداز میں کی جس طرح سگے والدین بیٹی کے لیے کرتے ہیں۔ پھر دیکھو کس حوصلے و برداشت سے جہیز کی ایک ایک چیز اپنے ہاتھوں سے انہوں نے سوئم والے دن غریبوں میں تقسیم کی۔ ہم نے دہرا صدمہ اٹھایا پھر بھی پہاڑ بنے ہوئے ہیں۔ تم جوان ہو، بہادر و ہمت والے ہو کر بھی خود کو سنبھال نہیں پا رہے۔ سبریز کے بعد ہم تمہیں کھونے کا حوصلہ نہیں رکھتے۔" وہ اسے سینے سے لگا کر سسک اٹھے۔ اس نے بھی خاموشی سے اپنے دل کا غبار آنسوؤں کی صورت میں ان کے سینے سے لگ کر بہا ڈالا تھا۔

"میرے دل کو قرار نہیں آتا چھوٹے ابا۔ اس کی آہٹیں مجھے محسوس ہوتی ہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے ابھی وہ کسی درخت کے پیچھے سے ہنستا ہوا نکلے گا اور کہے گا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا تم میرے بغیر تنہا کیسے لگتے ہو؟ اور میں کہوں گا بالکل ایسے ہی جیسے کسی شاہین کے پر نوچ کر پھینک دیا گیا ہو۔"

"مت سوچو میری جان! سوچیں آسیب کی طرح بندے کو چمٹ جاتی ہیں۔ بہادر انسانوں کی زندگی میں اس سے بھی کٹھن و ناقابل برداشت موڑ آتے ہیں۔ بہادر و زور آور ایسے موقعوں پر حوصلے و برداشت سے ثابت قدمی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔"

وہ اس کے گرد بازو ڈال کر دوستوں کے انداز میں چل رہے تھے۔ گھر پہنچنے کے بعد وہ سیدھا بی بی جان کے کمرے میں گیا تھا۔ جن کی نرم وشفقت بھری ممتا سے مہکتی آغوش میں سر رکھ کے کسی نوزائیدہ بچے کی طرح آنکھیں بند کر لی تھیں۔ ایک ہفتے سے نیند سے بے نیاز دکھتی آنکھوں میں نیند آہستگی سے اترنے لگی۔ بی بی جان کی نرم روئی کے گالوں جیسی انگلیاں دھیرے دھیرے اس کے گھنے بالوں میں سرایت کرتی اسے نیند کی پر سکون وادی میں اتارنے لگیں۔ وہ دھیرے دھیرے اردگرد سے بے خبر ہوتا چلا گیا۔

بی بی جان بغور اسے سوتے ہوئے دیکھ رہی تھیں۔ بڑھی ہوئی شیو، بے ترتیب بال، ملگجے کپڑے سبریز کی جدائی نے اسے ایک ہفتے میں ہی بدل ڈالا تھا۔ سبریز کی موجودگی میں نظر آنے والے ضارم اور اس وقت بچوں کی مانند بے خبر سوتے، اپنے حال سے بے خبر ہونے والے ضارم میں کتنا فرق پیدا ہو گیا تھا۔ ان کی جان ہی، خوشبوؤں سے مہکتے وجود کے چرچے تھے۔ آج جیسے اس کا وجود ان چیزوں سے نا آشنا لگ رہا تھا۔

آنسوؤں نے پھر خاموشی سے آنکھوں کا راستہ دیکھ لیا تھا۔ اندر کی سوگوار فضا خاموش تھی۔ باہر حویلی کی مردانہ بیٹھک میں شور برپا تھا۔ گل ریز خان جو بزدلوں سے چھپ کر سبریز خان کے قتل کے متعلق معلومات حاصل کر رہا تھا اسے درست معلومات حاصل ہو گئی تھیں۔ اب وہ بدلہ لینے کے لیے بے چین تھا۔ افضل خان اور گل یاز اسے باز رکھنے کی جستجو میں تھے مگر وہ طوفان کی طرح بپھرا ہوا تھا۔

''باباجانی! آپ کو خبر دینے والے نے غلط اطلاع دی ہے کہ سبریز خان اتفاقاً شکاریوں کی گولیوں کی زد میں آ گیا تھا۔ ایسا اتفاقاً نہیں ہوا بلکہ وہ شکاری شکار کھیلنے ہی سبریز خان کا آئے تھے۔ وہ کھیل کر چلے گئے اور ہم یہاں ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے ہیں۔'' جوش و غم سے اس کی آواز بلند تھی۔

''کس نے اطلاع دی ہے تمہیں؟ ست آیا کرو لوگوں کے بہکاوے میں۔'' گل باز خان بیٹے کو ڈپٹ کر گویا ہوئے۔

''میرے آدمی کبھی غلط رپورٹ نہیں دیتے بابا! سبریز خان کو شہباز ولی خان کے بیٹے شمشیر خان نے قتل کیا ہے۔ اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر وہ بزدل گاؤں سے فرار ہے۔ ورنہ خدا کی قسم اس کے گاؤں میں گھس کر بھی اس کا وجود گولیوں سے چھلنی کر ڈالتا لیکن کب تک وہ فرار رہے گا۔ میرے آدمی اس کی کھوج میں ہیں۔ جس دن بھی خبر مل گئی ایسی موت ماروں گا اسے کہ اس کی روح بھی صدیوں تک سسکتی پھرے گی۔'' وہ سفاک و پر عزم لہجے میں بول رہا تھا۔ اس کے چہرے پر چھائی سختی، آنکھوں میں اترتے خون کی سرخی نے باباجانی کی پیشانی پر تفکر کی لکیریں نمودار کر دی تھیں۔ وہ جس خوف سے سب جان کر بھی انجان بن رہے تھے وہی خطرہ ان کی طرف بڑھ چکا تھا۔

''بدلہ لینے سے ہمارا سبریز واپس آ جائے گا؟ گل سانگہ زندہ ہو جائے گی؟ جس کے دل کی دھڑکنیں سبریز کی موت کی خبر سن کر بند ہو گئی تھیں۔ کیا اس کا وجود دوبارہ زندہ ہو جائے گا تمہارے بدلہ لینے سے؟''

''باباجانی! آپ ہمیں بزدلی اور بے غیرتی کا درس دے رہے ہیں۔''

''گل ریز خان! زبان کو لگام دو اپنی۔ تمہاری جرات کیسے ہوئی باباجانی سے اس انداز میں بات کرنے کی؟'' گل باز خان شدید غصے میں بیٹے کی طرف بڑھے تھے۔ اگر باباجانی درمیان میں آ کر ان کا ہاتھ نہیں پکڑ لیتے تو وہ اس پر ہاتھ اٹھانے سے بھی نہ چوکتے۔ باپ دادا کی شان میں گستاخی انہیں ہرگز گوارہ نہ تھی۔

''گل باز خان! غصے پر قابو رکھا کرو بچے! گل ریز نے کوئی گستاخی نہیں کی۔''

''میں اس وقت ہوش میں نہیں ہوں باباجانی! شاید کچھ غلط بول گیا ہوں معافی چاہتا ہوں۔'' وہ سر جھکا کر وہاں سے نکل گیا تھا۔

☆☆☆

گاؤں سے شہباز خان کا خاص ملازم انہیں لینے کے لیے آ چکا تھا۔ ڈھیروں پھل، خشک میوے کے علاوہ دوسری سوغاتیں بھی تھیں جو انہوں نے ملازم کے ہمراہ یہاں روانہ کی تھیں۔ ساتھ ہی ذیشان صاحب اور درخشندہ بیگم کے نام خط بھی تھا جس میں تحریر تھا وہ کسی ناگزیر وجوہات کے باعث نہیں آ سکتے۔ وقت ملتے ہی آئیں گے اور ساتھ ہی فوراً شانو کو روانہ کرنے کی تاکید کی گئی تھی۔

''تم کچھ دن رک نہیں سکتیں؟ حمزہ بھائی اگلے ہفتے اپنے والدین کو لے کر آ رہے ہیں۔ ان کا ارادہ جلد از جلد شادی کرنے کا ہے۔ تب تک تم رک جاؤ۔'' سنبل اسے سامان پیک کرتے دیکھ کر از حد ملول تھی۔

''نہیں مائی ڈیئر! باباجان کا حکم حرف آخر ہے۔ میں ایک دن بھی مزید نہیں رک سکتی یہ مجبوری ہے۔'' وہ نرمی سے گویا ہوئی۔

''کیا تم حمزہ بھائی سے بھی نہیں ملو گی؟ اف! وہ کتنا مس کریں گے تمہیں۔''

''ان کی واپسی کینیڈا سے اگلے ہفتے ہوگی، میں کہاں رک سکتی ہوں سنبل!'' اس کے ملکوتی حسین چہرے پر اپنوں سے ملنے کی مسرت بھی تھی اور راستے اچھے پرخلوص و بے غرض لوگوں کا ساتھ چھوٹنے کا افسوس و دکھ بھی۔

دوسرے دن بارہ بجے کی ان کی فلائٹ تھی۔ فارحہ اور رخشندہ بیگم نے مل کر اس کے لیے اور گھر والوں کے لیے تحائف خرید ے تھے۔ آج کی رات ان کا سونے کا ارادہ ہرگز نہ تھا۔ آج کی رات ان کے ساتھ کی آخری رات تھی جس کے لمحے لمحے کو وہ ایک ساتھ گزارنا چاہتی تھیں۔ رات کا کھانا انہوں نے باہر کھایا۔ کھانے کے بعد کولڈ ڈرنکس کا دور چلا تھا۔ رخشندہ بیگم پھر انہیں لانگ ڈرائیو پر لے گئیں جہاں سے واپسی پر آئس کریم کھا کر وہ گھر لوٹی تھیں۔ گھر آکر بھی ان کی باتوں کا لامتناہی سلسلہ جاری تھا۔ رخشندہ بیگم نے رات ایک بجے تک ان کا ساتھ باتوں میں دیا پھر سونے کے لیے کمرے میں چلی گئی تھیں۔ وہ تینوں رات باتوں میں ہی گزارنا چاہتی تھیں۔ رات دھیرے دھیرے صبح کی جانب محو سفر تھی۔

☆☆☆

''صارم خان! کیا صبح، دوپہر، شام سبریز خان اور گل سانگہ کی قبروں پر چکر لگانے سے تم ان کی محبت کا قرض ادا کر سکتے ہو؟'' گل ریز خان اس کے قریب بیٹھ کر دھیمے مگر مضبوط لہجے میں گویا ہوا۔ صارم سبریز کی قبر کے قریب بیٹھا قرآن کی تلاوت کر کے ابھی فارغ ہوا تھا۔ گل ریز خان کے لہجے میں کوئی ایسی کاری ضرب تھی جو سیدھی اس کے دل پر لگی تھی۔

''نہیں۔ تم کہنا کیا چاہ رہے ہو؟ کھل کر بات کرو۔'' وہ چونک کر گویا ہوا۔

''یہاں سے چلو، بتاتا ہوں تمہیں ساری بات۔'' وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے قبرستان سے باہر لے آیا۔ ایک پرسکون و خاموش گوشے میں لے کر اسے بیٹھ گیا۔

''تمہیں معلوم ہے جس دن سبریز خان کا قتل ہوا اس دن وہ تمہیں لینے لاری اڈے جا رہا تھا؟'' وہ اس کے نزدیک بیٹھتے ہوئے گویا ہوا۔

''قتل......؟ سبریز خان کا قتل ہوا ہے؟ اوہ...... گاڈ! لیکن......''

''غلط ہے وہ خبر جو تمہیں دی گئی ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ سبریز خان کو قتل کیا گیا ہے۔ شمشیر خان نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر اسے مارا ہے۔''

''وہاٹ! شمشیر خان، پھر جھگڑا ہوا تھا اس سے؟'' اضطراب و وحشت نے اس پر پوری شدت سے حملہ کیا تھا۔ وہ مضطرب سا اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

''اس نے پیچھا کب چھوڑا تھا، وار کرتا ہی رہا تھا۔''

''اس کے باوجود تم لوگ اتنے غافل کیوں رہے؟ اور بابا جانی، چھوٹے اکا، لالہ نے اس حقیقت کو کیوں چھپایا؟'' اس کا چہرہ آگ کی مانند دہک اٹھا۔

''مجھے یہ بھی معلوم ہوا ہے...... بابا جانی صلح کا پیغام لے کر شہباز خان کے پاس گئے تھے اور ان نے صلح کرنے کے بجائے انہیں بے عزت کیا اور شمشیر خان نے بابا جانی کو ہلاک کرنے کے لیے فائر کر ڈالا تھا جو عین وقت پر اس کے بڑے لالہ کی مداخلت پر نشانہ چوک گیا تھا ورنہ......''

''اوہ....اوہ، اتنا کچھ ہوتا رہا یہاں پہ، میں بے خبر رہا؟ بابا جانی کو کیا ضرورت پڑ گئی تھی اس حقیر کیڑے کے پاس امن و آشتی کا پیغام لے کر جانے کی؟'' غصے کے الاؤ اس کے اندر بھڑک اٹھے تھے۔

''بابا جانی، بی بی جان سب خوف زدہ ہیں.....وہ جھگڑوں سے ڈرنے لگے ہیں۔ ان کے خوف کا یہ عالم ہے کہ وہ بدلہ لینے کے نام سے بھی خوفزدہ ہو جاتے ہیں اور وہ اس خوف سے واقف ہو گئے ہیں۔ تبھی وہ ہر جرم بہت آسانی و بے خوف انداز میں کر جاتے ہیں۔'' گل ریز خان زخمی ناگ کی طرح بے چین نظر آ رہا تھا۔

''مسئلہ وہی سرمئی پہاڑی والی زمین کا ہے؟''

''ہاں۔''

''زمین کے بے جان ٹکڑوں کی خاطر جیتی جاگتی زندگیاں موت کی آغوش میں پہنچا دینا کہاں کی بہادری ہے؟''

''صارم خان! ہمیں انتقام لینا ہے۔ بابا جانی کی بے عزتی کا جواب جو اپنے گھر کی دہلیز پر انہوں نے کی۔ بدلہ لینا ہے سبریز کے اس خون کا جو پانی کی طرح بہایا گیا ہے۔ کتنا خوش تھا وہ، اور اپنی شادی کی خوشی سے زیادہ اسے تمہارے یہاں مستقل آنے کی مسرت تھی۔ وہ بے حد مسرور ہو کر کہتا تھا صارم کی غیر موجودگی میں میں نے زمینیں سنبھالی ہیں، دیکھ بھال کی ہے وہ آ جائے گا تو میں مزے سے بیٹھ کر اسے زمینوں پر کام کرتے دیکھوں گا، کتنا اچھا لگے گا وہ ماسٹرز کی ڈگری لے کر کھیتوں میں کام کرتا ہوا۔ اس کی باتیں میرے کانوں میں گونج رہی ہیں۔ اسے کیا معلوم تھا کہ اس کی شرارت میں کہی گئی بات کس طرح پوری ہوگی۔ وہ چل دے گا ہمیں تنہا چھوڑ کر، عمر بھر کا دکھ اپنی یاد کی صورت میں تاحیات ہمارے دلوں میں دھڑکا تا رہے گا۔''

گل ریز خان پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ صارم خان کے لیے یہ انکشاف ناقابل برداشت تھا کہ سبریز خان کو شمشیر خان نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر قتل کر ڈالا ہے۔ یہ انکشاف اس کے اندر کے آتش فشاں کو بے قابو کرنے کے لیے کافی تھا۔ سبریز خان کی موت اس کی جدائی اس کی نا آسودہ خواہشات کا درد ایک نئے سرے سے جاگ اٹھا تھا۔ اس کی رگ رگ، پور پور میں شرارے سے دوڑنے لگے۔

''بابا جان کی ذات نامعتبر و ارزاں نہیں ہے جو دشمنوں کو جرأت ہو انہیں ٹیڑھی آنکھ سے دیکھنے کی بھی اور نہ ہی سبریز خان بے وقعت و حقیر تھا۔ اس کے خون کی بوند بوند کا حساب لیں گے۔ کہاں ملے گا شمشیر خان؟'' وہ گل ریز خان کے شانے پر ہاتھ رکھ کر خوف ناک لہجے میں گویا ہوا۔

''وہ گاؤں سے بھاگا ہوا ہے۔ شہباز خان بھی گھر تک محدود ہے۔ دوسرے بھائی اس کے گاؤں سے باہر گئے ہوئے ہیں۔'' گل ریز خان نے اطلاع بہم پہنچائی۔

''تمہیں یہ اطلاعات کہاں سے ملی ہیں؟''

''شمشیر خان کا خاص ملازم ہے سکندر خان! بہت قریب ہے اس کے، ہر راز سے واقف، وہ نشے کا عادی ہے۔ طور خان کے دوست سے اس کی گہری دوستی ہے۔ نشے کی حالت میں وہ اپنے اور شمشیر خان کے کارنامے بہت فخر سے سناتا ہے۔ طور خان کو اس سے معلومات حاصل ہوئیں اور طور خان نے مجھے بتایا۔ اب میں نے طور خان سے کہہ دیا ہے وہ ہوشیاری سے اس سے معلومات لیتا رہے۔ اسے شک نہ ہو اور ہمیں دشمنوں کی خبروں

سے آگاہی مکمل طور پر رہے۔''

''طورخان کیا کہتا ہے؟ وہ کب تک گاؤں واپس آئے گا؟''

''اس بار سمندر خان اس کے دوست کے پاس آیا نہیں، لیکن ایک اہم اطلاع ملی ہے اگر وہ سچ ثابت ہوئی تو سمجھو شمشیر خان تو کیا اس کا باپ بھی بل سے باہر نکل آئے گا۔'' وہ پرجوش انداز میں بولا تھا۔

☆☆☆

ائیر پورٹ پر سنبل، فارحہ، رخشندہ بیگم اسے الوداع کہنے آئی تھیں۔ ذیشان صاحب بزنس کے سلسلے میں ملک سے باہر گئے ہوئے تھے گزشتہ رات انہوں نے مکمل جاگ کر گزاری تھی۔ جس میں ہنسیں بھی، روئیں بھی۔ ایک دوسرے کی سنگت میں قہقہے بھی لگائے تو جدائی کے احساس سے خوب روئیں بھی۔ عجیب سے احساسات ہو رہے تھے ان کے۔

''وہاں جا کر ہمیں بھول مت جانا۔ لیٹرز لکھتی رہنا۔'' سنبل بھرائی ہوئی آواز میں مخاطب ہوئی۔ سوات جانے والی فلائٹ کی روانگی کا اعلان ہو چکا تھا۔

''ورشا! پلیز کوشش کرنا میری شادی میں شرکت کرنے کی۔ تمہارے بغیر کچھ اچھا نہیں لگے گا۔'' فارحہ اسے گلے ملتے وقت التجائیہ انداز میں بولی۔

''کوشش کروں گی۔ میری مجبوری سمجھتی ہو نا تم؟''

''ورشا بیٹے! اپنا خیال رکھنا۔ بہت یاد آؤ گی۔ عادت ہو گئی ہے تم تینوں کو ساتھ دیکھنے کی۔ گھر ویران کر کے جا رہی ہو۔'' رخشندہ بیگم اسے سینے سے لگائے آبدیدہ ہو گئی تھیں۔ فارحہ، سنبل بے ساختہ رو رہی تھیں۔ اس نے بھی برستی آنکھوں سے انہیں خدا حافظ کہا تھا اور تربت خان کے ساتھ اندر بڑھ گئی۔ جہاز فضاؤں میں فراٹے بھرنے لگا تو اس نے سیٹ کی بیک سے سر ٹکا دیا۔ آج دو سال بعد وہ پھر اسی گھٹی گھٹی، سلگتی، مچلتی، گھٹن زدہ زندگی کی طرف گامزن تھی جہاں مرد کی حکمرانی تھی۔ عورت کی کوئی وقعت و عزت جہاں نہ تھی۔ باڑے میں بندھی گائے، گھر میں موجود عورت میں کوئی فرق نہیں تھا۔ ''کیا میں وہاں پھر وہ سب برداشت کر سکوں گی؟ چھوٹی ادے کی بات بے بات چیخ چیخ، شمشیر لالہ کی بے جا پابندیاں و جھڑکیاں، بابا جان کا ان کی حمایت میں اسے ڈانٹنا، ادے اور سخاویہ کے خوف و ڈر سے سفید پڑتے چہرے، گھر کی گھٹی ہوئی بے زار فضا۔'' وہ سوچوں میں الجھی ہوئی سوات ائیر پورٹ پہ اتر گئی تھی۔ وہاں منصور خان ڈرائیور جیپ لیے تیار کھڑا تھا۔ اسے سلام کرنے کے بعد تربت خان نے ساتھ مل کر سامان ڈگی میں رکھا تھا پھر جیپ سوات کے سرسبز و خوب صورت بل کھاتے اونچے نیچے راستوں پر محو سفر تھی۔

کراچی کے مئی کے دنوں کی جھلستی تپتی گرمیوں سے یہاں کی فضا میں بہت ٹھنڈک اور سکون تھا۔ وہ پیچھے بیٹھی باہر کے دل کش و حسین نظاروں کو دیکھ رہی تھی۔ سوات سے اس کے گاؤں کا راستہ کئی گھنٹوں پر مشتمل تھا۔ سوات سے آگے ائیر سروس نہ تھی۔ کیوں کہ وہ آزاد علاقوں میں شمار ہوتے تھے۔ پھر وہاں فلک بوس پہاڑوں، چٹانوں کی ترتیب درست نہ ہونے کے باعث ائیر سروس ناممکن تھی۔

جیپ تیزی سے منزل کی طرف دوڑ رہی تھی۔

''تربت ماما! بابا جان کیوں نہیں آئے مجھے لینے؟'' کل سے مچلتے سوال کو وہ زبان کی نوک پر لے ہی آئی تھی۔

''بی بی صاحبہ! بڑے خان مصروف تھے اس لیے انہوں نے مجھے بھیجا ہے۔'' وہ مودب انداز میں گویا ہوا۔

''شمشیر لالہ! شہروز لالہ، بڑے لالہ! کوئی بھی گھر پر نہیں ہیں؟'' وہ حیرانگی سے دریافت کرنے لگی۔

''نہیں بی بی صاحبہ! دونوں چھوٹا، بڑا خان کام سے گاؤں سے باہر گئے ہیں۔ شمشیر خان بھی گاؤں میں نہیں ہے کسی دوست کے ہاں دعوت پر گیا ہوا ہے۔ اس لیے بڑے خان نہیں آئے۔''

''بیٹی عزیز نہیں ہوتی، لائق محبت و توجہ اس نگر میں بیٹے رہے ہیں۔ اگر بابا آپ مجھے ائرپورٹ سے ہی لینے آجاتے تو کتنی خوش ہوتی میں۔ کیا دو سال کی دوری بھی میری کمی، میرے وجود کی اہمیت، میری غیر موجودگی کا احساس نہ دلا سکی۔'' وہ تصور میں بابا سے مخاطب تھی۔ نمکین شبنمی قطرے اس کی نیلی جھیل جیسی آنکھوں سے ٹپک کر رخساروں کو بھگو گئے۔

دل میں ایک دم ہی بےزاری و کبیدگی کی لہر اٹھی تھی۔ اس نے آنکھیں بند کر کے سیٹ سے سر ٹکا دیا۔ کچھ سفر وہ سو کر پورا کرنا چاہتی تھی۔ وہ گہری نیند میں تھی۔ جب ایک دم جیپ زوردار جھٹکے سے رکی تھی۔ جھٹکا اتنا زوردار تھا کہ اس کا سر تیزی سے لاکڈ دروازے سے ٹکرایا تھا۔ نینداس کی لمحے بھر میں آنکھوں سے غائب ہوگئی۔ درد سے سرخ پیشانی پکڑ کر اس نے آگے دیکھا۔ منصور خان اور تربت خان ہراساں بیٹھے نظر آئے۔

''معافی چاہتا ہوں بی بی صاحبہ! راستے میں یک دم یہ رکاوٹ آگئی ہے۔ اگر اچانک ہم بریک نہیں لگاتا تو گاڑی نیچے کھائی میں گر جاتی۔'' منصور نے مڑ کر اس سے معذرت کی۔

''راستہ صاف کیسے ہوگا؟ سورج ڈوبنے والا ہے۔ دھند بھی یہاں اتنی موجود ہے پھر تو راستہ بھی صاف نظر نہیں آئے گا۔'' وہ سڑک کے درمیان میں پڑے درختوں کے بھاری بھاری ٹکڑے دیکھ کر پریشانی سے گویا ہوئی۔

''بی بی صاحبہ! آپ پریشان مت ہوں۔ ہم ابھی راستہ صاف کر دیتے ہیں۔''

''اچھا..... میں جب تک وہاں بیٹھ کر چائے پیتی ہوں۔ وہ بیگ سے چائے سے بھرا فلاسک اور مگ لے کر جیپ سے اتر آئی۔ سرمئی پہاڑوں کی کوکھ سے بے شمار چشمے گنگناتے ہوئے دھرتی کے دامن میں گر رہے تھے۔ ہر سو سبزہ ہی سبزہ بکھرا ہوا نگاہوں کو سکون بخش رہا تھا۔ رنگ برنگے پھولوں کی شوخیوں نے ماحول کو سحر زدہ بنا ڈالا تھا۔ وہ گھاس پر بیٹھ کر فلاسک سے چائے مگ میں ڈالنے لگی کہ معاً اسے محسوس ہوا کہ کوئی دبے قدموں سے اس کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اس نے غیر ارادی طور پر پیچھے مڑ کر دیکھا اس کے پیچھے دو سیاہ لباس میں ملبوس چہروں کو نقاب سے چھپائے اسلحہ بردار بہت چوکنے انداز میں اس کی جانب بڑھ رہے تھے۔ مگ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا۔ وہ گھبرا کر کھڑی ہوگئی اور قبل اس کے وہ اپنے بچاؤ کی کوئی تدبیر کرتی ان دونوں نے اسے سنبھلنے کا موقع دیے بغیر برق رفتاری سے اس کے چہرے پر کپڑا ڈال کر اس کا چہرہ اتنی مضبوطی سے ہاتھوں سے بھینچا کہ ناک اور منہ مکمل ہاتھوں کی گرفت میں آجانے کی باعث وہ چند لمحے بھی مزاحمت نہ کر سکی پھر سانس گھٹنے کے باعث اس کا ذہن تاریک ہوگیا۔

☆☆☆

''بڑے خان! شمشیر خاناں کہاں ہے؟'' گل جاناں کمرے میں آ کر شہباز خان سے مخاطب ہوئیں۔ جو اپنی سوچوں میں گم بیٹھے تھے۔

''کیوں؟ خیریت؟'' وہ چونک کر گویا ہوئے۔

''وہ بیٹا ہے میرا۔ میری آنکھوں کی ٹھنڈک۔ میرا غرور ہے وہ، کئی دن ہو گئے نظر نہیں آ رہا۔'' وہ ان کے قریب بیٹھ کر کچھ خفگی کا تاثر لے کر گویا ہوئیں۔

''دوستوں کے ہمراہ گیا ہو گا کہیں موج مستی کرنے۔''

''آپ کو معلوم نہیں ہے؟''

''جوان بچہ ہے اس عمر میں طبیعت منہ زور گھوڑے کی مانند ہوتی ہے گل۔ بہتر یہی ہے اس کو اس کی مرضی پر چھوڑ دیں۔ روک ٹوک، پوچھ گچھ سے بیزاری و خودسری پیدا ہوتی ہے۔ اور میں یہ نہیں چاہتا۔''

انہوں نے حسب عادت شمشیر خان کا ٹھکانہ بتانے سے گریز کیا۔

''میں نے کب روک ٹوک کی ہے۔ وہ کل رات چھوٹی ادی نے پیغام پہنچایا تھا۔''

''کیا پیغام پہنچایا تھا؟'' وہ چھوٹی سالی کی باخبر رہنے والی عادت سے واقف تھے سو قدرے مضطرب انداز میں استفسار کیا۔

''اس نے کہلوایا ہے کہ شمشیر خان نے افضل خان کے پوتے کو قتل کر ڈالا ہے۔ اس کی شادی ہے ایک روز پہلے اور اب وہ لوگ اسے تلاش کر رہے ہیں اور شمشیر خان قتل کر کے روپوش ہو گیا ہے۔'' انہوں نے اپنی بھوری بھوری آنکھیں ان کے رنگ بدلتے چہرے پر مرکوز کر کے بہت گہرے لہجے میں پیغام سنایا۔

''بکواس کرتی ہے وہ، شمشیر خان بزدل نہیں ہے جو چھپ جائے گا۔''

''ہاں میں نے بھی اسے کہلوایا ہے یہی۔'' وہ مطمئن انداز میں گویا ہوئیں۔

پھر وہ ان سے خاندان کے دوسرے معاملوں پر بات چیت کرتی رہیں۔ ملازمہ اسی دوران چائے دے کر جا چکی تھی۔ چائے سے فارغ ہوتے ہی شہباز خان اٹھ کھڑے ہوئے انہیں زمینوں کے سلسلے میں چند دنوں کے لیے شہر جانا تھا۔ اسی دم دروازہ نوک کر کے ستاویہ اندر داخل ہوئی۔

''بابا جان! ورشا ابھی تک نہیں پہنچی، اسے کل شام پہنچ جانا چاہیے تھا۔'' اس کا انداز از حد متفکر و پریشان تھا۔

''کل شام؟ میں نے اس کی بات نہیں کی تھی۔'' وہ واسکٹ پہنتے ہوئے سرسری لہجے میں گویا ہوئے جبکہ گل جاناں کی پیشانی پر بل پڑ گئے تھے۔

''کیا مطلب بابا جان؟ کیا آپ نے ورشا کو نہیں بلوایا؟''

''میں نے تربت خان کو حکم دیا تھا اس کی کمر میں درد تھا۔ میں نے کہہ دیا تھا وہ چند روز بعد جا کر لے آئے۔'' ان کا لہجہ عام اور محبت سے عاری تھا۔ جیسے وہ بیٹی کی آمد کی بات نہیں، کسی بے جان پتھر کی بات کر رہے ہوں۔

ان کی بے پروائی و بے نیازی سے ستاویہ کے اندر تک دکھ و اذیت بھر گئی۔ بیٹیوں سے بے پروائی، لاتعلقی، بے وقعتی کی حد تھی۔

''ارے! تمہیں کیا سانپ سونگھ گیا......؟ ہزار دفعہ سمجھایا ہے۔ جاتے وقت منحوس صورت نہیں بنانی چاہیے۔ چلو جاؤ یہاں سے خان کو سفر پر روانہ ہونا ہے۔'' انہوں نے نہایت حقارت سے اسے دھتکارا تھا۔

وہ وہاں سے اپنے کمرے میں آ گئی اور گھٹنوں میں منہ چھپا کر رونے لگی۔ اسے ملال گل جاناں کی زیادتی اور بابا جان کی خاموشی اور بے حسی کا نہ تھا کہ یہ تو ان ماں باپ کی روزمرہ زندگی کا معمول بن چکا تھا بلکہ افسوس اس خوشی کے رنج میں بدل جانے کا تھا جو کل سے وہ ورشا کی آمد کی ایک ایک ساعت، ایک ایک لمحہ گن گن کر گزار رہی تھی کیونکہ کچھ دن قبل بابا جان نے بتایا تھا کہ ورشا پیر کو یہاں شام تک پہنچ جائے گی اور انہوں نے اسی دم سے اس کا انتظار شروع کر دیا تھا۔ پھر کل شام وہ نہ آئی تو وہ اداس ہوئے یہ سوچ کر بیٹھ گئیں کہ وہ شاید کسی وجہ سے کل نہ آئی ہے تو آج تو لازمی آئے گی اور اب بھی تقریباً تمام دن ڈھلنے کو تھا۔ وہ نہیں آئی تو گھبرا کر ان کے پاس پہنچ گئی تھی۔

''سخاوریہ کیا ہوا؟ خیریت تو ہے نا بچے؟'' گل بی بی اندر کمرے میں داخل ہوتی ہوئیں اسے روتے دیکھ کر گھبرا کر بولیں۔

''ادے! آپ پریشان مت ہوں۔'' ماں کو پریشان وحواس باختہ دیکھ کر اس نے جلدی سے آنسو صاف کیے۔

''پھر تم رو کیوں رہی ہو؟ تمہارے بابا نے ورشا کے بارے میں کیا بتایا؟'' وہ اس کے نزدیک بیٹھ کر استفہامیہ لہجے میں گویا ہوئیں۔

''ورشا چند دن بعد آئے گی۔''

''کیوں؟ جب تمہارے بابا نے اپنے بلوانے کا حکم دے دیا تو پھر کس کی مجال ہو سکتی ہے کہ حکم سے سرتابی کر جائے۔'' وہ ان کی بات قطع کر کے بے چین و بے یقین لہجے میں استفسار کرنے لگیں۔

''ادے جان! آج پہلی بار مجھے اپنے اور ورشا کے وجود سے نفرت بھی محسوس ہوئی اور ہمدردی بھی۔ اس گھر کے لیے، یہاں کے مکینوں کے لیے کتنی غیر اہم اور ارزاں ہیں ہم بہنیں، یہ اب پورے طور پر محسوس ہوا ہے اور اتنی شدت سے محسوس ہوا کہ دل چاہ رہا ہے کہ خود بھی زہر کھا لوں اور ورشا کو بھی دے دوں۔''

''ایسی باتیں نہیں کرتے سخاویہ! میں پہلے ہی پریشان ہوں۔ عجیب و نافہم سے واہمے و وسوسے دل و دماغ سے چپٹے ہوئے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا یہ بے چینی و بے قراری کیوں ہے؟'' وہ اس کا سر اپنے سینے سے لگا کر یاسیت بھرے لہجے میں بولیں۔

''تربت خان کی کمر میں درد ہے۔ اس کی وجہ سے وہ نہیں جا سکا ہے۔ تین چار روز میں وہ کراچی جائے گا۔ ورشا کو لینے..... آپ پریشان مت ہوں۔ مجھے رنج اس بات کا ہے کہ ورشا کی بجائے کسی لالہ کو کراچی سے یا کہیں سے بھی لانا ہوتا تو بلا عذر ہر صورت میں حکم کی تعمیل کرتے، مگر ہماری حیثیت سے سب ہی واقف ہیں۔ اس لیے کسی کو کوئی پرواہ و خوف نہیں ہے۔''

سخاویہ جیسی سنجیدہ و تحمل مزاج لڑکی بابا جان کے بے نیاز رویے سے بری طرح ہرٹ ہوئی تھی۔ اس کی باتیں سن کر حسب عادت گل بی بی اسے سمجھانے لگی تھیں۔

☆☆☆

"صارم! کیا سوچ رہے ہو بچے؟" بی بی جان نے روئی کے گالوں جیسی نرم و ملائم انگلیاں اس کے سرخی مائل سنہرے بالوں میں پھیرتے ہوئے شفقت سے پوچھا۔ "مت سوچا کرو اتنا..... سوچیں دیمک کی طرح انسان کو کھوکھلا کر ڈالتی ہیں۔" اسے گم صم و خاموش دیکھ کر وہ آزردگی سے گویا ہوئیں۔

"سوچوں پر بھی بھلا کسی کا اختیار ہوتا ہے؟ یہ بن بلائے مہمان کی طرح وارد ہو جاتی ہیں۔ پھر ان کے وجود سے ذہن ہمہ وقت فکر بیکراں میں گھرا رہتا ہے۔ بی بی جان! آپ ایسا کچھ بتائیں کہ میں..... میں اپنے اختیار میں ہو جاؤں میں..... میں نہیں رہا لگتا ہے اپنے آپ سے بچھڑ گیا ہوں۔ کھو دیا ہے میں نے خود کو، میری ذات، میری شناخت، میرا اپنا پن سب کھو گیا ہے سبریز کے ساتھ میں بھی مر گیا ہوں..... ختم ہو گیا ہوں میں بھی..."

وہ اضطرابی انداز میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وحشت اس کے ہر انداز سے عیاں تھی۔

"کیا تمہیں ہم بوڑھے، بڑھیا پر ترس نہیں آتا؟ کیا ہماری عمر ہے۔ جوان اولادوں کو کفن میں لپیٹے، قبر کی آغوش میں جاتے دیکھنے کی.....؟ اس دل میں اتنے داغ ہیں اولاد کی جدائیوں کے کہ اگر کبھی دکھائی دے جائیں تو شمار نہ کر سکو گے۔ پھر کیوں؟"

بی بی جان بے اختیار رو پڑیں۔ کیونکہ سبریز اور گل سانگہ کو دنیا سے رخصت ہوئے ایک ماہ ہونے کو آیا تھا لیکن صارم اس کی موت کے رنج سے باہر نہ نکلا تھا۔

"بی بی جان پلیز! آپ روئیں مت۔" وہ اپنا مضبوط بازو ان کے شانوں پر رکھ کر رنجیدہ سا ہو کر گویا ہوا۔

"کیسے نہ روؤں؟ سبریز کچھ کہے، سنے بغیر چھوڑ گیا اور تم نے بھی ہمیں نظر انداز کر دیا ہے۔ ہر وقت گم صم رہتے ہو، جیسے اس دنیا سے تمہارا کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہم تمہارے کچھ نہیں لگتے، جانے والے چلے جاتے ہیں لیکن کوئی اس طرح خود کو زندگی سے دور نہیں کرتا صارم خان!"

"بی بی جان! زندگی سے دور میں نہیں ہوا بلکہ زندگی مجھ سے دور ہو گئی ہے۔ آپ پریشان مت ہوں، مجھے کچھ وقت لگے گا سنبھلنے میں۔ آپ میری فکر مت کریں۔ مجھے کچھ نہیں ہو گا۔ بہت سخت جان ہوں۔"

اس کے شکستہ لہجے میں عجب ہی بے چارگی تھی۔ بی بی جان کتنی دیر تک اسے پاس بٹھا کر سمجھاتی رہیں۔ وہ خاموشی سے بیٹھا بظاہر ان کی باتیں سن رہا تھا مگر دل میں اس کے ایک آتش بھڑک رہی تھی۔ جب سے سبریز خان کے قتل کا انکشاف ہوا تھا وہ بے کل و مشتعل ہو گیا تھا۔

سبریز خان کی نیچر کو وہ خوب جانتا تھا کہ وہ بہت پر خلوص، امن پسند اور دوست نواز شخص تھا۔ اس کی سب سے بڑی کمزوری اس کی زمینیں تھیں۔ جس پر ملازموں کی موجودگی کے باوجود وہ خود زمینوں کی دیکھ بھال کرتا تھا۔ اسی جنون کے باعث اس نے تعلیم بھی ادھوری چھوڑ دی تھی۔

بی بی جان کہتی تھیں۔ اسے اپنے باپ کی طرح زمینوں سے عشق ہے اور وہ ہمیشہ مسکرا دیا کرتا تھا۔

پھر کیا وجہ ہو سکتی تھی کہ وہ دشمنوں کے ہاتھوں قبر کی تاریکی میں گم ہو گیا تھا۔ اس کا دل کہہ رہا تھا زیادتی سبریز کی طرف سے نہیں ہوئی ہو گی۔ یقیناً شمشیر خان نے اپنے قول کو صادق کر دکھایا تھا اور شمشیر کا نام ذہن میں گونجتے ہی وہ اپنے بھڑکتے، شوریدہ جذبات کو بے قابو محسوس کرتا تھا۔ اسے ہتھیاروں سے کبھی لگاؤ نہیں رہا تھا حالانکہ پہلی تربیت اس کو ہتھیاروں کو استعمال کرنے کی ہی دی گئی تھی۔ اس کا نشانہ بچپن سے درست و

زبردست رہا تھا جو کبھی کبھی شکار میں پرندوں پر وہ آزماتا تھا۔ یہ تو اس نے کبھی سوچا نہ تھا کہ وہ زندگی کے کسی موڑ پر کسی انسان پر بھی ہتھیار اٹھانے کی خواہش کرے گا۔

بی بی جان کے پاس گاؤں کی چند عورتیں چلی آئیں تو وہ جیکٹ پہن کر باہر نکل آیا۔ موسم دلکش تھا دھوپ ڈھیرے ڈھیرے اردگرد ٹھہری چٹانوں پر بکھر رہی تھی۔ ماحول پر سحر انگیز طلسم چھا رہا تھا۔ پہاڑوں سے گرتے جھرنے، پھلوں سے لدے درخت، پھولوں سے جھکی شاخیں، تاحد نگاہ پھیلا سبزہ، اس نے ایک گہری نگاہ ماحول پر ڈالی تھی پھر تھکے تھکے انداز میں اس کے قدم آگے بڑھنے لگے۔ افسردگی کی دھند ہمہ وقت اسے گرفت میں رکھتی تھی۔

سبریز کی جدائی اسے بالکل ہی بدل گئی تھی۔ اس کی شوخی و شرارتیں، مزاج کی شگفتگی، برجستگی سب رخصت ہو گئی تھی۔ اسے لگتا کوئی ایسی چیز گم ہو گئی ہے جس کی تلاش میں وہ تاحیات سرگرداں رہے بھی تو اسے نہ پا سکے گا۔

حویلی نگاہوں سے اوجھل ہو گئی تھی اس کے قدم غیر اختیاری طور پر پگڈنڈی پر رواں دواں تھے۔ جس کا اختتام قبرستان کے گیٹ پر ہوتا تھا۔

''صارم! صارم خان۔'' وہ سوچوں میں گم اردگرد سے بے نیاز چل رہا تھا کہ اچانک پیچھے سے گل ریز کی آواز سن کر چونک کر رکا تھا۔

''مجھے یقین تھا، تم اسی راستے پر ہو گے۔'' وہ نزدیک آ کر پھولے سانسوں سے بولا۔

''ہوں..... کیا بات ہے؟ خاصے ایکسائیٹڈ لگ رہے ہو؟''

وہ اس کے چہرے پر پھیلے جوش و جذبات محسوس کر کے گویا ہوا۔

''صارم خان! ہم کامیاب ہو گئے، سبریز کے خون کا بدلہ ہم ایسا لیں گے کہ شمشیر خان کی نسلیں مدتوں اپنے زخم مندمل نہ کر پائیں۔''

وہ اس سے لپٹ کر پرعزم پر جوش لہجے میں گویا ہوا۔

''کیا، کیا شمشیر خان باہر آ گیا ہے؟''

''سمجھو ایسا ہی ہے۔''

''کیا مطلب؟'' وہ از حد متعجب انداز میں گویا ہوا۔

''چلو وہیں چل کر معلوم ہو گا۔ میں نے اور طور خان نے رات کو ہی اپنے دشمن کا شکار کر لیا تھا۔ اسے چھوٹی حویلی میں چھوڑ کر رات کو آ گئے تھے، تم تو جانتے ہو بابا جانی رات کو مردوں کا گھر سے باہر رہنا پسند نہیں کرتے، سو میں فوراً ہی حویلی چلا آیا تھا کہ صبح تمہیں ساتھ لے کر چھوٹی حویلی جاؤں گا، تمہاری بہا بھو نے بتایا کہ ابھی گھر سے نکلے ہو، میں سمجھ گیا تھا تم کہاں جا سکتے ہو۔''

''لیکن کیا مطلب؟ کس کو اغواء کیا ہے تم نے؟ کچھ معلوم تو ہو؟''

''بس یوں سمجھو، شمشیر کی گردن کے گرد پھندا ڈال دیا ہے ہم نے، اگر غیرت مند ہو گا تو مر جائے گا۔'' وہ اسے ساتھ لے کر جیپ کی طرف بڑھ گیا۔

☆☆☆

اس کی کیفیت سونے، جاگنے کے درمیان تھی۔ چند لمحات اس کے اسی انداز میں گزر رہے۔ وہ نیم بے ہوشی کی حالت میں آنکھیں کھولے بلند چھت پر کندہ نقش ونگار کو دیکھتی رہی۔ پھر ایک دم ہی جیسے اس کے تاریک ذہن کے گوشوں میں روشنی سی چمکیلی چلی گئی، اس نے حیرانگی وخوف سے ادھر ادھر دیکھا پھر ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گئی، اس کے حواس پوری طرح سے بیدار ہو گئے تھے۔ گزرے ہوئے وقت کی پرچھائیاں اسے ازسرنو یاد آنے لگیں کہ ڈرائیور اور تربت خان راستے میں حائل چٹانی بھاری بھرکم درختوں اور پتھروں کو ہٹانے کے لیے آگے بڑھے تھے اور وہ چائے کا فلاسک اور مگ لے کر جھرنے کے قریب پتھر پر بیٹھ کر خالی مگ میں فلاسک سے انڈیلنے لگی تھی کہ اچانک اسے پیچھے سے کسی کے قدموں کی آہٹیں سنائی دی تھیں اور اس نے پوری طرح انہیں دیکھا بھی نہیں تھا کہ عجیب بو والا رومال اس کی ناک اور منہ کے درمیان اس پھرتی وسختی کے ساتھ رکھا گیا تھا کہ وہ لمحوں میں اردگرد سے بیگانہ ہو کر حواس کھو بیٹھی تھی۔

اب ہوش میں آ کر اس وسیع وعریض کمرے میں خود کو پایا تھا۔

اس کے ذہن میں دھماکے ہو رہے تھے یہ وہ بخوبی جانتی تھی کہ اسے اغواء کر لیا گیا ہے لیکن کیوں؟ اور کس کے اشارے پر؟ اور اغوا کرنے والوں کے کیا عزائم ہیں؟ یہ سوال ہوش کی سرحدوں پر قدم رکھتے ہی اس کے اندر ہلچل مچا رہے تھے۔ اس نے اپنے قریب پڑی چادر سر پر ڈالی اور بھاگ کر سامنے دیوار میں نصب کھڑکی کی طرف بڑھی دونوں پٹ کھول کر باہر دیکھا تو باریک گرل وہاں موجود تھی۔ جو فرار کے سارے راستے مسدود کر رہی تھی۔

اس نے گھبرائی، پریشان کن نگاہوں سے گرل سے نظر آتے مناظر کو دیکھ کر وقت کا اندازہ لگانے کی کوشش کی۔

سورج خاصا بلند ہو چکا تھا۔ سبزے پر اس کی سنہری، روپہلی شعاعوں کا عکس نگاہوں کو خیرہ کر رہا تھا۔ باہر کا منظر بہت دلکش ودلربا تھا۔ سامنے ایک لمبی پگڈنڈی تھی جس کے دونوں جانب رنگین بے تحاشہ خوبصورت پھول پودوں میں کھلے، سبزوں میں مسکرا رہے تھے۔ قریب ہی شفاف پانی کی ندی بہہ رہی تھی۔ جو ارد گرد پہاڑوں سے گرتے جھرنوں کے پانیوں سے وجود میں آئی تھی۔ باہر کے موسم کے تمام دلکشی ورعنائی، خوبصورتی وحسن، انسان کے اندر کے موسم سے وابستگی رکھتی ہے کہ اگر قلب پرسکون وپرمسرت ہے تو خزاں میں بھی بہار کا سماں لگتا ہے اور اگر باہر کا موسم اندر کے موسم سے مطابقت نہیں رکھتا تو ایسے حسین وجنت نظیر نظارے بھی سرخوشی وآسودگی نہیں بخشتے۔

وہ پریشانی، اضطراب، انتشار، گھبراہٹ کے زیر اثر تھی اس وقت موسم کی رعنائی، ماحول کی دلکشی نے اس پر کوئی اثر نہیں کیا تھا۔ اس نے بے تحاشہ کمرے کے اکلوتے دروازے کو کئی بار بری طرح پیٹ ڈالا تھا لیکن لگتا تھا یہاں اس کے علاوہ کوئی دوسرا نہیں تھا۔ وہ بدحواسی سے پورے کمرے میں چکراتی پھر رہی تھی کہ کمرہ جدید انداز میں سجایا گیا تھا۔ فرنیچر، قالین، پردے سب قیمتی ودیدہ زیب تھے۔

وہاں موجود ایک ایک چیز سے غیر موجود لوگوں کی امارت کا اظہار ہو رہا تھا۔

وقت اسے لگ رہا تھا گویا تھم گیا ہو۔ خوشگوار موسم کے باوجود اسے لگ رہا تھا جیسے سینے میں اس کی سانسیں اٹکنے لگی ہوں۔

وہ بے جان انداز میں بیڈ پر بیٹھی تھی۔ اور اسی دم اسے محسوس ہوا جیسے کوئی گاڑی وہاں آ کر رکی ہو۔ وہ بھاگ کر کھڑکی کی سمت بڑھی تھی۔

حویلی کے احاطے میں سرخ گاڑی آ کر رکی تھی۔ کھڑکی سے اس کا پچھلا حصہ نظر آ رہا تھا کوشش کے باوجود وہ آنے والے یا آنے والوں کو نہ دیکھ پائی۔ اس کا دل بری طرح دھڑکنے لگا۔ وہ کھڑکی سے ٹیک لگا کر کھڑی ہوگئی۔ اس کی نگاہیں لکڑی کے بھاری دروازے پر مرکوز تھیں۔ چند ساعتوں بعد اسے محسوس ہوا جیسے دروازے کو باہر سے کھولا جا رہا ہو۔ کیوں کہ وہ دروازہ بھاری لکڑی کا پرانے وقت کا منقش دروازہ تھا۔ آٹومیٹک لاک سسٹم اس میں نہ تھا۔

باہر سے تالا کھولنے کے بعد کنڈی کھولی جا رہی تھی۔ اس ساعت اس کے ذہن کے اندر ایک خیال آیا تھا اس نے برق رفتاری سے سامنے دیوار پر آویزاں تلوار نما چھریوں میں سے ایک چھری نکالی اور بھاگ کر لکڑی کی الماری کے پیچھے چھپ گئی۔

اس کا خوف اس حد تک کم ہوا یہ سوچ کر وہ اپنی عزت پر ہرگز آنچ نہ آنے دے گی۔ اسی دم دروازہ کھولا گیا تھا۔ دھڑکنوں کے بے ہنگم شور میں اس کا پورا وجود ساعت بن گیا تھا۔

''ارے کہاں گئی؟ رات کو یہیں چھوڑ کر گیا تھا۔ گل ریز خان خالی کمرہ دیکھ کر بری طرح بوکھلا اٹھا تھا۔

''کون؟ کس کی بات کر رہے ہو؟'' صارم خان ''گئی'' پر چونک کر گویا ہوا۔

''شمشیر خان کی بہن تھی، رات کو ہی اسے اٹھا کر لائے تھے میں اور طور خان۔'' وہ کرسیوں اور بیڈ کے پیچھے پاگلوں کے انداز میں اسے ڈھونڈ رہا تھا۔

''وہاٹ! دماغ درست ہے تمہارا؟''

''اس وقت میرا واقعی دماغ درست نہیں ہے۔ کہاں گئی الو کی پٹھی؟ جا کہاں سکتی ہے؟ اس کمرے میں سے اس کی روح بھی نہیں نکل سکتی۔'' اس کو ڈھونڈنے میں ناکامی پر وہ بری طرح جھلا رہا تھا۔

''میرا جہاں تک خیال ہے تم ''پیئے'' لگے ہو۔'' وہ منہ بنا کر بولا۔

''صارم خان! مجھے مضحکہ اڑانے والے لوگ ایک لمحے برداشت نہیں ہوتے۔''

''اوہ، پھر میرا خیال ہے رات کو تم نے کوئی خواب دیکھ لیا ہے۔ جو صبح آنکھ کھلنے کے باوجود تم اس کیفیت سے باہر نہیں آسکے ہو۔''

''نہیں، میں اور طور خان اسے اٹھا کر لے کر آئے ہیں راستے میں رات ہوگئی تھی۔ بابا جانی کے خیال سے میں اسے یہاں چھوڑ کر فوراً چلا گیا تھا اور طور خان کو بھی لے گیا تھا کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا کہ بابا جانی کے کان میں معمولی سی بھی جھنک پڑ گئی تو وہ کبھی بھی ہمیں انتقام لینے نہیں دیں گے۔''

''وہ لڑکی نہیں کوئی چڑیل یا جادوگرنی ہوگی، جو یہاں سے مکھی بن کر اڑ گئی۔'' بے ساختہ اسکے لبوں پر مسکراہٹ لمحہ بھر چمک کر معدوم ہوئی تھی۔

''نہیں، وہ کہاں جاسکتی ہے؟ وہ انسان ہی تھی؟''

''اوہ.....اوہ.....اب آئی سمجھ، شکار ہم سے آنکھ مچولی کھیل رہا ہے۔ بہت اچھے صارم خان! اب تمہیں یقین آئے گا کہ میں نشے میں تھا یا خواب کی کیفیت میں، وہ چڑیل ہے، جادوگرنی ہے یا انسان کی بچی!'' گل ریز خان کی نگاہیں لکڑی کی الماری کی جانب اٹھ گئی تھیں۔ جہاں سے ایک

جھلک سرخ و سبز دوپٹہ لہرا کر غائب ہوا تھا۔ وہ طوفان کی طرح آگے بڑھا تھا دوسرے لمحے اس نے ہاتھ بڑھا کر الماری کے پیچھے دبکی ہوئی ورشا کو پکڑ کر گھسیٹنا چاہا تھا اور اسی لمحے ہاتھ میں پکڑی چھری پوری طاقت سے اس نے اس کے بازو پر ماردی تھی۔ اس کی حرکت غیر متوقع اور بالکل جارحانہ تھی گلریز تڑپ کر دور ہٹا تھا اس کے بازو میں چھری پیوست ہو چکی تھی اور خون بہہ رہا تھا۔

''گلریز خان! گل ریز خان!'' صارم ہکا بکا اس کی طرف دوڑا تھا۔

''صارم خان! اس کو مت چھوڑنا، اس کو مت چھوڑنا'' درد سے بری طرح کراہتے ہوئے وہ ہاتھ کے اشارے سے اسے سمجھا رہا تھا۔

صارم خان نے اسے سنبھالتے ہوئے الماری کی سمت دیکھا اور اس کی نگاہیں گویا ساکت ہو کر رہ گئیں۔ وہ گلریز خان کو بھول کر یک ٹک اس کے سپاٹ چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ وہ بھی اسے چند لمحے حیرانگی سے دیکھتی رہی۔ پھر رفتہ رفتہ اس کی نیلگوں آنکھوں میں نفرت کے سرخ الاؤ دہکنے لگے۔

''طور خان! گلریز کی ڈریسنگ کرو یہاں ڈریسنگ کا سامان ہوگا؟''

''جی خان، یہاں پر سب ہے۔ شکار سے واپسی پر اکثر چوٹیں لگ جاتی ہیں۔''

طور خان جو اس کی آواز پر اندر آیا تھا اسکی بات کا جواب دے کر گل ریز خان کو سہارا دے کر وہاں سے لے گیا۔ گل ریز تکلیف سے از حد بے چین ہو رہا تھا۔

''ورشا! آپ؟'' وہ حیرانگی و صدمے سے گزر چکا تھا۔ صارم، گلریز کے کمرے سے جاتے ہی اس سے مخاطب ہوا جو الماری کے پیچھے سے باہر آ گئی تھی۔

''تم اتنے گھٹیا، کمینے اور ذلیل انسان ہو گے، مجھے احساس نہ تھا۔'' وہ نفرت و حقارت کی بجلیاں آنکھوں سے گراتی ہوئی گرجی تھی۔

''شٹ یور ماؤتھ، ورشا آفریدی۔''

''کیوں؟ سچ اچھا نہیں لگتا؟'' وہ تمسخرانہ انداز میں بولی۔

''میں ان چند لوگوں میں سے ہوں، جو سچائی کی راہ پر گامزن ہیں۔ بہر حال یہاں بیٹھو۔ میں گلریز کو دیکھ کر آتا ہوں۔ پھر بات ہو گی۔''

وہ ورشا کو دیکھ کر یکدم الجھن و اضطراب کا شکار ہو گیا تھا۔ گلریز خان کے متعلق اس کا یہ خیال نہ تھا کہ وہ انتقام کی آگ سرد کرنے کے لیے مخالف قبیلے کی لڑکی اٹھا کر لا سکتا ہے؟ اور لڑکی بھی وہ جو اس کی روح میں سمائی ہوئی ہے۔ گلریز خان کے اس گھٹیا اقدام اور دوسرے ورشا آفریدی کے بارے میں اس انکشاف نے کہ وہ شیر خان کی بہن ہے وہ رحیم کے تاروں کی مانند الجھ کر رہ گیا تھا۔

''کیا بات ہو گی؟ میں تم جیسے تھرڈ کلاس بندے سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتی۔ اگر اپنی زندگی چاہتے ہو تو مجھے جانے دو۔'' وہ سمندر کی بپھری ہوئی سرکش موج بنی ہوئی تھی۔

''چھوٹے خان! چھوٹے خان!'' اسی دم طور خان پریشانی سے اسے پکارتا ہوا وہاں داخل ہوا تھا۔

''کیا ہوا؟ طور خان!'' صارم فوراً اس کی سمت متوجہ ہوا تھا۔

''چھوٹے خان! وہ خان کے بہت درد ہو رہا ہے۔''

وہ خونخوار نگاہوں سے سامنے کھڑی ورشا کو دیکھتا ہوا اس سے مخاطب ہوا۔

''اچھا، میں چلتا ہوں۔ تم! یہاں سے نکلنے کی کوشش مت کرنا میں آ رہا ہوں کچھ دیر بعد....'' وہ طور خان کے بعد ورشا سے مخاطب ہوا۔

''نہیں.... میں یہاں نہیں رکوں گی، میں جاؤں گی۔'' وہ چادر درست کرتی ہوئی تیزی سے اس کے مقابل آ گئی۔

''بات سمجھنے کی کوشش کرو، تم تنہا نہیں جا سکتی ہو۔''

''نہیں.... نہیں میں نہیں رکوں گی۔'' وہ دروازے کی طرف بڑھتی ہوئی بولی۔

''ضد نہیں کرو ورشا!'' وہ زچ ہو کر گویا ہوا۔

''تم سے ضد کرنے کا میرا کوئی رشتہ نہیں ہے مجھے یہاں نہیں رکنا۔''

''فی الحال تمہیں یہاں رکنا پڑے گا۔'' اس کی ہٹ دھرمی و تحقیر آمیز لہجہ اس کی جھنجلاہٹ اور الجھنوں کو اشتعال میں بدلنے لگا تھا۔ طور خان کو جانے کا اشارہ کر کے سخت لہجے میں وہ ورشا سے مخاطب ہوا۔

''میں یہاں ایک لمحے رکنا اپنی توہین سمجھتی ہوں۔''

''تم جو بھی سمجھو، مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں ہے۔'' اس بار وہ خاصے اکھڑ و ہٹ دھرم انداز میں گویا ہوا تھا۔

''مجھے یہاں رکنا نہیں ہے۔'' وہ تیزی سے دروازے کی طرف بڑھی تھی۔

''تم شرافت کی زبان سمجھنا نہیں جانتیں۔ شاید؟'' اس نے آگے بڑھ کر اس کا بازو پکڑ کر کھینچتے ہوئے سرد لہجے میں کہا تھا۔

''چھوڑو مجھے۔'' غیر متوقع طور پر اس کی مضبوط گرفت میں اپنا بازو دیکھ کر وہ بپھر کر چیخی تھی اور اس کی گرفت فولادی دیکھ کر اس نے اپنے بازو پر گڑے ہاتھ پر پوری طاقت سے دانت گاڑ دیے تھے۔ جس کا نتیجہ خاطر خواہ نکلا تھا۔ اس نے فوراً ہاتھ ہٹا لیا تھا اور دوسرے ہاتھ سے اسے بیڈ پر پھینک کر کمرے سے باہر نکل گیا اور ساتھ ہی باہر سے کنڈی لگانے کی آواز آئی تھی۔

☆☆☆

''کیا بہت زیادہ تکلیف ہو رہی ہے؟'' وہ گل ریز خان کے سرخ چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے استفسار کرنے لگا۔ جو تکلیف ضبط کرنے کی کوشش میں دانت پر دانت جمائے بیٹھا ہوا تھا۔ بازو میں اس کی ڈریسنگ ہوئی تھی۔

''مجھے تکلیف اس زخم کی نہیں ہے صارم خان! بلکہ اس کے باعث وہ بچ گئی، ورنہ مجھے اس افسوس کا ہو رہا ہے لیکن کب تک مجھ سے بچ سکتی ہے وہ۔'' گل ریز نے غصے سے ورشا کو گالی دیتے ہوئے جھلا کر کہا۔

''شٹ اپ! گل ریز! ہمیں بچپن سے عورت کی عزت و احترام کرنے کی تعلیم دی گئی ہے پھر کس طرح تم اس قدر گھٹیا لہجہ اختیار کر رہے ہو؟''

وہ حقیقتاً بری طرح چپ اٹھا تھا۔

''عورت۔'' کا احترام و ادب کیا جاتا ہے یار! وہ عورت نہیں ہے۔ ناگن ہے۔ دیکھو کتنی سفاکی سے اس نے پہلا وار ہی کتنا کاری کیا ہے۔''

گل ریز خان بازو بندھی پٹی کی طرف اشارہ کر کے زہر خند انداز میں گویا ہوا۔

''چوٹ کھانے میں سراسر غلطی تمہاری ہے۔'' صارم اس کے نزدیک بیٹھتے ہوئے بولا۔

''میری؟ کس طرح؟''

''کوئی اغوا شدہ لڑکی پرمسرت انداز میں اپنے مجرموں کا استقبال نہیں کرتی۔''

''مجرموں کا؟ تمہارا مطلب ہے ہم مجرم ہیں؟''

''ہاں..... عورت پر مردانگی آزمانا درحقیقت بزدلی ہے۔''

''میں اس لیے زیادہ تعلیم کے خلاف ہوں خان، یہ بندے کو بزدل اور بے حوصلہ بنا ڈالتی ہے۔'' اس نے منہ بنا کر کہا۔

''بہرحال یہ بحث کا وقت نہیں ہے اگر تم اپنے فضول مشاغل چھوڑ کر تعلیم کی طرف توجہ دیتے تو اتنی گھٹیا حرکت کرنے کا سوچتے بھی نہیں۔ جو تم نے کر ڈالی ہے اور جس کی تمہیں کوئی ندامت و شرمندگی نہیں ہے۔''

''جو تمہارے دل میں آئے وہ کہو مگر یہ بات پکی ہے۔ میں سبریز خان کے خون کے ایک ایک قطرے کا حساب لوں گا، اور ضرور لوں گا۔''

''کس سے لوگے؟ ایک بے خطا و بے قصور لڑکی سے؟''

''مجھے اس کا احساس نہیں ہے کہ وہ لڑکی بے قصور ہے یا بے خطا، میں سبریز خان اور گل سانگہ کی موت کا انتقام اس سے لوں گا۔ اتنا برا حشر کروں گا اس کا کہ شمشیر خان اپنی بہن کا حشر دیکھ کر اپنی آنے والی نسلوں کو بھی وصیت کر کے مرے گا کہ پھر کبھی خواب میں وہ ہم سے ٹکرانے کی جرات نہ کریں۔'' اس کا عزم مستحکم و پریقین تھا۔

''تمہیں یقین ہے؟ کہ وہ شمشیر خان کی بہن ہے؟ آئی مین، تم نے پہلے اسے کبھی دیکھا ہوا ہے؟'' وہ اندر کی کشمکش ہونٹوں پر لے آیا۔

''نہیں۔ میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ مجھے طور خان نے اطلاع دی تھی کہ شمشیر خان کی بہن پڑھنے کی خاطر کراچی گئی ہوئی تھی۔ اب وہ واپس آرہی ہے۔ میں نے طور خان سے کہا کہ وہ معلوم کرے وہ کس دن، کس وقت آرہی ہے؟ طور خان نے سب معلومات حاصل کر کے مجھے دیں اور میں نے راستے میں رکاوٹیں ڈلوا دیں۔ وقت پر ملازموں کے ہمراہ جیپ وہاں پہنچی تو ملازم راستہ صاف کرنے لگے اور وہ اتر کر تھرموس سے کافی یا چائے وغیرہ کپ میں نکال رہی تھی۔ جب میں اور طور خان جو قریبی درخت پر چھپے بیٹھے تھے درخت سے کود کر اسے اٹھا کر یہاں لے آئے کیونکہ رات وہاں سے یہاں لانے میں ہو گئی تھی۔''

''ملازموں کا کیا کیا تم نے؟''

''اٹھا کر کھائیوں میں پھینک دیا سالوں کو۔'' وہ اس انداز میں گویا ہوا جیسے وہ انسان نہیں کوئی بے جان و فضول اشیا کی حیثیت رکھتے ہوں۔

''تمہیں افسوس کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ان لوگوں نے بھی ہمارے بے شمار بے قصور لوگوں کو مارا ہے۔'' وہ صارم کو تاسف سے ہونٹ بھینچتے دیکھ کر تیزی سے بولا۔

''میں کسی کی سزا، دوسروں کو دینے کا قائل نہیں ہوں۔ جو تم نے کیا وہ انسانیت نہیں درندگی ہے۔ سفاکی پن ہے تم انہیں بھی لا کر قید کر سکتے تھے۔''

اس کے سرخ و سپید چہرے سے کرختگی جھلک رہی تھی۔ نیلی آنکھوں میں سرخی سی چھانے لگی تھی۔

''جب انسان ان حالات سے گزرنے لگتا ہے تو وقت اسے درندگی ہی سکھا دیتا ہے۔ بہر حال تمہیں جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ تمہیں، انتقام لینا ہے اور اس کام کے لیے دل پتھر، اور جذبات برف کرنے پڑتے ہیں۔ ترس، ملال، افسوس ان چیزوں کو خیر باد کہہ ڈالو ورنہ...... سب ختم ہے پھر۔'' وہ درسانیت سے اسے سمجھاتے ہوئے گویا ہوا۔

''انتقام ہمیں ایک شخص سے لینا ہے یار پھر کیوں ہم اپنے اندر کی انسانیت کو فنا کریں۔''

''خان! میں نے دوسرے کمرے میں آپ کا بستر لگا دیا ہے۔'' اندر کمرے سے طور خان نکل کر وہاں آتے ہوئے مودبانہ انداز میں گویا ہوا۔

''او کے...... تم چائے بناؤ، طور خان، یہاں کچھ کھانے کے لیے ہے۔'' صارم کو اچانک ہی یاد آیا کہ وہ رات سے یہاں قید تھی اور اب سورج طلوع ہوئے بھی گھنٹوں گزر چکے تھے۔ اس کی بھوک کے احساس سے وہ طور خان سے مخاطب ہوا تھا۔

''ہاں...... خان یہاں نمکو بھی ہے اور بسکٹ کے پیکٹ کے علاوہ انڈے بھی موجود ہیں۔'' طور خان نے اطلاع فراہم کی تھی۔ وہ اسے کچھ ہدایت دے کر گل ریز خان کی طرف متوجہ ہوا تھا جو بازو پر ہاتھ رکھ کر دیوار سے ٹیک لگا کر آنکھیں موندے بیٹھا تھا۔ اس کے سرخی مائل چہرے سے درد کی اذیت ظاہر ہو رہی تھی لیکن وہ بہت بہادری و ضبط کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

''ارے! یہ کیا کر رہے ہو؟'' وہ صارم خان کو اپنی طرف جھکتے دیکھ کر حیرانگی سے استفسار کرنے لگا۔

''تمہیں اٹھا کر دوسرے کمرے میں لے کر جا رہا ہوں۔'' وہ سنجیدگی سے بولا۔

''ارے، ہاہاہا یار، میں اتنا بھی کمزور نہیں ہوا۔'' وہ قہقہہ لگاتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

☆☆☆

''اے بی بی! میں نے آپ جیسا نڈر اور بے نیاز اس طرح کسی کو نہیں دیکھا جس طرح آپ کا رویہ ہے۔'' بوا نے صوفوں پر ڈھلے ہوئے کشن کو درست کرتے ہوئے بے فکری و طمانیت سے بیڈ پر نیم دراز رسالے کا مطالعہ کرتی کائنات کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیوں بھئی کیا کیا ہے میں نے؟'' وہ ہنوز رسالے پر نگاہیں جمائے بولی۔

''لو بھئی یہ بھی خوب رہی...... ہم یہاں سوچ سوچ کر فکر سے آدھے بھی نہ رہے اور جن کے دم سے یہ مصیبت پیچھے لگی انہیں فکر بھی نہیں ہے اور الٹا ہم سے پوچھا جا رہا ہے کیا کیا ہے؟''

بوا کے ہر انداز سے برہمی و پریشانی عیاں تھی آخر کار اسے متوجہ ہونا پڑا۔

"بوا جان! آپ اور بابا جان کو خواہ مخواہ پریشان و فکر مند ہونے اور رہنے کی عادت پڑ چکی ہے۔ جب میں نے سمجھایا ہے کہ اگر شمشیر خان کو کچھ کرنا ہوتا، یا وہ برا مانتا تو اسی وقت وہ ردعمل ظاہر کرتا، جس قسم کی باتیں ہم اس کے متعلق سن چکے ہیں، اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ہر کام فوری اور براہ راست کرنے کا عادی ہے اگر وہ مائنڈ کرتا تو ہم دونوں ہی اس وقت "اوپر" بیٹھے ہوتے۔" وہ مسکراتی ہوئی اوپر کی جانب اشارہ کر کے بولی۔

"ہائے توبہ بی بی، ایسی دل ہولانے والی باتیں نہ کیا کرو۔ لو بھلا ہم کیوں "اوپر" جاتے، وہی آدم خور شیر آنکھوں والا۔" وہ کانوں کو ہاتھ لگا کر بولیں۔ اور وہ ان کی طرف سے شمشیر کو دیے جانے والے خطاب پر بے ساختہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"قسم سے بوا! کسی کو "نام" دینے میں آپ کا کوئی ثانی نہیں۔"

"ہم جھوٹ نہیں بولتے جیسے دیکھتے ہیں ویسا ہی کہتے ہیں۔ بھائی صاحب گھر فروخت کر کے یہاں سے بہت خاموشی سے نکل جانا چاہتے ہیں تاکہ شمشیر خان کو معلوم نہیں ہو سکے مگر مسئلہ یہ ہے کہ کوئی بھی گھر خریدنے کو تیار نہیں اور دو تین راضی بھی ہیں تو اتنی کم قیمت دے رہے ہیں کہ جس رقم سے ہم کسی شہر میں ایک جھونپڑی بھی نہیں خرید سکتے، بھائی صاحب، اسی سلسلے میں مصروف ہیں۔" وہ کشنز چڑھا کر فارغ ہونے کے بعد وارڈ روب درست کرتے ہوئے گویا ہوئیں۔

"آہ، بامیری سمجھ نہیں آتا! کس طرح سمجھاؤں آپ دونوں کو شمشیر خان کا اتنا خوف ہے آپ دونوں کو کہ اتنا خوف آپ کے دلوں میں اللہ کا بھی نہیں ہوگا، حد ہوگئی ہے خوف کی بھی۔ جب کہہ دیا وہ کچھ نہیں کرے گا۔ اگر اسے کچھ کرنا ہوتا تو وہ اسی وقت کرتا۔ اب ایک ماہ بعد اسے خواب نظر آئے گا۔" وہ رسالہ ایک طرف پٹختے ہوئے زچ لہجے میں اکتا کر بولی۔

"آپ ناراض مت ہوں، میں چائے لے کر آتی ہوں۔"

☆☆☆

گاڑی سانپ کی طرح بل کھاتی سڑک پر رواں دواں تھی۔ ڈرائیور سیٹ پر صمد خان بیٹھا بہت مہارت و احتیاط سے گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا۔ حسب معمول اس کے برابر سمندر خان براجمان تھا اور دوسری سیٹ پر پچھلی طرف اس پر بڑے شاہانہ کروفر سے شمشیر خان بیٹھا باہر گزرتے حسین نظاروں کو دیکھ رہا تھا۔ وہ موڈ کی تبدیلی کی خاطر چند دنوں کے لیے اس خفیہ "ڈیرے" پر گیا تھا لیکن چوتھے دن شکار کرتے ہوئے اس کا پاؤں ایک کانٹے دار جھاڑی میں پھنس کر بری طرح زخمی ہو گیا تھا جس کی وجہ سے اسے دو ہفتے وہیں قیام کرنا پڑا تھا اور آج وہاں سے وہ ان دونوں کو لے کر روانہ ہو گیا تھا۔ موبائل پر بابا نے اسے اپنے چند دنوں کے لیے شہر جانے کی اطلاع دے دی تھی۔ ان کے گاؤں سے باہر جانے کی خبر نے اسے یک گونہ سکون بخشا تھا۔ کیونکہ وہ رنگین مزاج آدمی تھا اور یہاں ڈیرے پر اسنے بہت بوریت سے بھرپور بے کیف دن گزارے تھے۔ اپنی تشنگی و تنہائی کے لمحوں کی کوفت وہ کسی مہربان و نرم و گداز بانہوں کی پناہ میں بھلانا چاہتا تھا۔ اس لیے بابا جان کی روانگی سے اسے مسرت ہوئی تھی کہ وہ ان کی طبیعت سے واقف تھا۔ اپنے پاس اسے فوراً نہ پاکر وہ اس کی تلاش میں سرگرداں ہو جاتے اور یہ بات اس کے لیے ہمیشہ حیرانگی کا باعث ہوتی کہ اسے ہر "خفیہ" جگہ سے برآمد کر لیا کرتے تھے۔

''سمندر خان، پیاس لگ رہی ہے۔'' وہ ایک دم اس سے مخاطب ہوا۔

''بہتر خان! ابھی غلام پانی حاضر کرتا ہے۔'' سمندر خان نے ہمیشہ کے خوشامدی لہجے میں سر جھکا کر کہا۔ اس کا یہی خوشامدانہ چاپلوسی سے پر لہجہ اور فدویانہ انداز شمشیر خان جیسے اڑیل و گرم دماغ بندے کو قابو کیے ہوئے تھا اور اسی نے اسے شمشیر خان کے بہت قریب کر دیا تھا۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا ازدگرد پانی کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا تھا کیونکہ اس علاقے میں زیادہ تر وسیع میدان تھے۔ ارد گرد پھیلے پہاڑ تھے سبزہ بہت کم تھا اور دور دور تک کسی جھرنے یا آبشار کا وجود نظر نہیں آ رہا تھا۔

وہ ادھر اُدھر دیکھتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔

کچھ فاصلے پر اسے چند لڑکیاں رنگ برنگے کپڑوں میں ملبوس سر پر گھڑے اٹھائے آتی ہوئی نظر آئیں۔ اس نے سکون کی سانس لی کہ جانتا تھا کہ تھوڑی دیر اسے اور پانی کی تلاش میں ہو جاتی تو شمشیر خان کے عتاب سے وہ نہیں بچ سکتا تھا۔

''پینے کے لیے پانی مل جائے گا؟'' وہ ان لڑکیوں کے نزدیک آنے پر مخاطب ہوا۔

''ہاں جی! پینے کے لیے ہی نہیں، نہانے کے لیے بھی پانی مل جائے گا۔''

ان تینوں میں سے جامنی اور پھول دار چھینٹ کے لباس میں ملبوس لڑکی شرارت سے چہک کر بولی تھی۔ باقی اس کی ساتھی دونوں لڑکیاں کھی کھی کرنے لگی تھیں۔

''مہربانی..... ابھی صرف پینے کے پانی کی ضرورت ہے۔''

وہ مسکرا کر بولا جبکہ لڑکیاں مسکراتی ہوئی آگے بڑھ گئی تھیں۔

''کہاں جا رہی ہو؟ تم لوگ پانی تو پلا دو۔''

''ہمارے پاس پانی نہیں ہے، آگے جا کر چشمے سے پانی پی لو۔''

دوسری لڑکی بدستور آگے بڑھتی ہوئی چہک کر بولی۔

''لیکن میرے پاس برتن نہیں ہے۔ کس سے پانی پیوں گا۔''

وہ ان تینوں کے ساتھ چلنے لگا تھا۔

''ارے یہ اتنا بڑا برتن ساتھ لیے گھوم رہا ہے، پھر کہہ رہا ہے میرے پاس برتن نہیں ہے۔'' وہ سمندر کے پھیلے ابھرے ہوئے جبڑوں اور موٹے موٹے ہونٹوں کی طرف اشارہ کر کے بولی۔ پھر دونوں ساتھی لڑکیوں کے ساتھ کھلکھلانے لگی۔

''اوہو..... تم تو بہت ہی شریر قسم کی لڑکیاں ہو؟ میرے منہ کو تم نے برتن بنا ڈالا۔ تم ایک گھڑا دے دو مجھ کو، میں چشمے سے پانی بھر کر لے آؤں گا تو واپس کر دوں گا۔ وہاں گاڑی میں ہمارا خان پانی کا انتظار کر رہا ہے اگر ابھی اور دیر ہو گئی تو وہ مجھے گولی مار دے گا۔'' وہ سمجھ گیا تھا لڑکیاں بہت تیز طرار ہیں۔ انہیں قابو کرنے کے لیے اس نے عاجزی و انکساری دکھائی۔

''لالہ! ہمارے گھڑوں میں کھن اور گھی ہے جو ہم آگے بیچ کر آ رہے ہیں اگر گھڑوں میں پانی ہوتا تو ہم پہلے ہی نہ دے دیتے۔'' اس بار وہ لڑکی خاصی شرافت اور سنجیدگی سے مخاطب ہوئی تھی۔

''لیکن تم تو کہہ رہی تھیں کہ نہانے کا بھی پانی ہے۔''

سمندر خان غصے سے بولا کہ محض اتنا وقت وہ یوں ہی ضائع کر چکا تھا۔

''ہاں..... ہاں، ہم نے غلط کب بولا تھا۔ چشمے پر جاؤ۔ وہاں پینے کے علاوہ نہانے کا پانی بھی ملے گا۔'' سمندر خان کی جھلاہٹ پر وہ پیلے وجامنی سوٹ والی لڑکی ہنس کر بولی۔

''بیڑا غرق ہو جائے تم لوگوں کا، خوامخواہ ہمارا اتنا ٹائم خراب کر ڈالا۔ وہاں ہمارا خان ہم پر رائفل سیدھی نشانہ لیے بیٹھا ہوگا۔''

سمندر خان تذبذب کا شکار تھا۔ پانی کا چشمہ یہاں سے کچھ فاصلے پر تھا اور اس کے پاس برتن بھی نہ تھا۔ جس میں وہ پانی لے کر خان کو پلاتا۔ مزید ستم یہ تھا کہ ان نابکار لڑکیوں نے فضول ہی اتنا وقت ضائع کر ڈالا تھا۔ اب اس کے لیے سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ وہ پانی کس میں لے کر جائے؟ اور اگر خالی ہاتھ جاتا ہے تو شمشیر خان کے مزاج سے وہ پوری طرح آگاہی رکھتا تھا۔ وہ بغیر کسی لحاظ ومروت کے اسے گولیوں سے بھون ڈالے گا۔

''خیریت ہے! ایسا گینڈے جیسا جسم رکھنے کے باوجود تم اپنے خان سے اتنا خوفزدہ ہو؟'' وہ لڑکی جو سمندر خان کے چہرے کے رنگ بدلتے دیکھ رہی تھی حیرانگی سے گویا ہوئی۔

''اوہ، خانہ خراب تم نہیں جانتا، ہمارے خان کو، کیسا آدمی ہے وہ۔''

''اچھا..... یہ لو گھڑا، اس میں پانی ہے دے دینا اپنے خان کو'' ایک لڑکی اس کی طرف گھڑا بڑھاتی ہوئی بولی۔

☆☆☆

''کیا سوچ رہے ہو صارم؟'' گل ریز پلنگ پر بیٹھتا ہوا۔ خاموش، صارم سے مخاطب ہوا کمرہ بہت روشن اور خوبصورتی سے آراستہ و پیراستہ تھا۔ فرنیچر قیمتی لکڑی کا پرانے اور نئے طرز سے تیار شدہ دیدہ زیب تھا۔ پلنگ پر نرم بستر پر لائٹ گرین کڑھی ہوئی چادر اور تکیے تھے۔ جن کے سہارے گل ریز خان نیم دراز تھا۔

''مجھے یقین نہیں آ رہا تم اتنی گھٹیا اور پست حرکت کر سکتے ہو۔ بابا جانی، چھوٹے ابا نے ہماری اخلاقی و ذہنی تربیت تو بالکل بے لچک کی تھی۔ پھر تم ایسی کراہت آمیز حرکت کیوں کر بیٹھے؟ کچھ تو خیال کیا ہوتا..... معمولی سا سوچتے تو سہی۔''

وہ از حد سنجیدہ و سرد انداز میں گل ریز سے مخاطب ہوا۔

''کیا..... کیا سوچتے ہم؟''

''اپنی مردانگی، اپنی حمیت، اپنی شجاعت کو داؤ پر لگا کر معلوم کر رہے ہو، کیا کیا ہے؟'' اس کا لہجہ بدستور سرد تھا۔

''تمہارا اشارہ غالباً اس لڑکی کو اٹھا کر لانے کی طرف ہے؟'' گل ریز بغور اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے بولا۔

''ہاں..... خود سوچو! ہمیں ایسی تربیت دی گئی ہے؟''

''میری جان! جنگ اور محبت میں سب جائز ہوتا ہے۔''

''نہیں، یہ مفاد پرست و خود غرض لوگوں کی من مانیاں ہیں۔ ہمارے مذہب میں جائز..... جائز رہتا ہے اور جو ناجائز ہے وہ ناجائز رہتا ہے۔ چاہے جنگ ہو یا امن۔''

''اب تم کیا چاہتے ہو؟ چھوڑ دوں اس لڑکی کو؟''

''ہاں..... کیوں کہ وہ بے قصور ہے۔'' صارم کا سنجیدہ رویہ ہنوز تھا۔

''وہ بے قصور ہے؟ گل سانگہ قصور وار تھی؟ سمیرز نے کیا قصور کیا تھا؟ جواب دو مجھے۔''

گل ریز خان کھڑے ہو کر تیز لہجے میں بولا۔

''جذباتی مت بنو گل ریز!''

''صارم خان! جذباتی تم ہو رہے ہو۔''

''مردوں کی جنگ، مردوں سے لڑی جاتی ہے۔ وقت کا انتظار کرو۔ شمشیر خان کب تک چھپ سکتا ہے؟ بہت جلد اُسے ہم سے ٹکرانا ہے۔ پھر دیکھنا..... کوئی حسرت تمہارے دل میں نہیں رہے گی۔''

''خان چائے۔'' ٹرے میں چائے کے مگ رکھ کر طور خان اندر داخل ہو کر ان کو چائے سرو کرنے لگا۔

''طور خان! وہاں ناشتہ دے دیا تم نے؟'' وہ مگ ہونٹوں سے لگا کر استفسار کرنے لگا۔

''وہ ناشتہ نہیں کرتا خان! بہت غصہ کرتا ہے۔'' اس نے اطلاع دی۔

''کوئی نازو، یہاں اس کے باپ کے ملازم نہیں ہیں، جو نخرے برداشت کریں گے۔''

''میں دیکھتا ہوں۔'' وہ چائے پی کر اٹھ کھڑا ہوا۔

''جب تک میرا ہاتھ ٹھیک نہیں ہو جاتا، تب تک تم اسے دیکھ سکتے ہو۔'' گل ریز خان بستر پر دراز ہوتے ہوئے جُھنس کر گویا ہوا۔ وہ وہاں سے اس کے کمرے میں چلا آیا۔ باہر سے کنڈی کھلی ہوئی تھی اور دروازہ بھی چوپٹ کھلا ہوا دیکھ کر ان کے حواس گم ہونے لگے۔

تیز قدموں سے وہ اندر کی جانب بڑھا تھا کمرہ بالکل خالی پڑا تھا۔

اس نے محتاط انداز میں وارڈ روب کے پیچھے دیکھا کہ وہ چھپنے کے لیے بہترین جگہ تھی جس کا استعمال کر کے وہ گل ریز کو زخمی کر سکتی تھی۔

اسے وہاں نہ پا کر اس کے اندر خطرے کی گھنٹی بجنے لگی۔

وہ تیزی سے کمرے سے نکلا تھا۔ بہت سرعت سے اس نے راہداری کمرے اور دالان دیکھ ڈالے وہ کہیں نہ تھی۔

''طورخان، طورخان!'' اس نے باہر آکر سرد لہجے میں ملازم کو پکارا تھا اس وقت اس کے علاوہ یہاں کوئی اور ملازم نہ تھا۔

''جی خان!'' طورخان اس کی پریشان صورت دیکھ کر بھاگا ہوا آیا تھا۔

''لڑکی کہاں گئی؟'' بے چینی، پریشانی، اضطراب، صارم کے لہجے میں عیاں تھا۔

☆☆☆

''لڑکی! خان اندر کمرے میں تھا۔''

''نہیں ہے اندر۔'' صارم جھلا کر بولا۔

''نہیں ہے؟ ہم ابھی اسے اندر چھوڑ کر آیا تھا۔''

وہ سخت متوحش انداز میں اندر کی طرف بڑھنے لگا۔

''نہیں ہے وہ، میں ہر جگہ دیکھ کر آ رہا ہوں۔ تم دروازہ باہر سے بند کر کے کیوں نہیں آئے تھے؟ دروازہ کھول کر چلے آئے۔'' وہ طورخان کو روکتے ہوئے درشت لہجے میں گویا ہوا۔ اسکی نیل گوں آنکھوں میں اضطراب در اضطراب موجزن تھا۔

''اوہ خان، غلطی ہو گیا ہم بھول گیا تھا۔ دروازہ باہر سے بند کرنا، ہم سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ لڑکی بھاگ جائے گا۔''

طورخان حقیقتاً بوکھلاہٹ و پریشانی سے ناچ اٹھا تھا۔

''تم سے مشورہ کر کے یا اجازت لے کر جاتی وہ۔''

''خان! اسے تلاش کرو، اگر گل ریز خان کو معلوم ہو گیا تو وہ حشر کر دے گا۔ مجھے ان کے غصے سے بڑا خوف آتا ہے۔'' طورخان صارم سے گڑگڑا کر بولا۔

اسی وقت سامنے والے گیٹ سے اندر داخل ہوتی ورشا کو دیکھ کر دونوں ٹھٹک گئے تھے۔ طورخان کو اندر جانے کا اشارہ کر کے وہ ورشا کی طرف بڑھ گیا جو اندر کمرے کی سمت جا چکی تھی۔

''کہاں چلی گئی تھیں؟'' وہ اندر داخل ہو کر تند لہجے میں گویا ہوا۔

''کمرے میں آنے سے قبل اجازت لینا ضروری ہوتی ہے۔'' وہ اس کا سوال نظر انداز کر کے ناگواری سے گویا ہوئی۔ اس کے سرخی مائل چہرے پر ابھی کے اثرات ابھی بھی تھے چہرے پر چند قطرے پانی سے بھیگ کر چپکی ہوئی تھیں۔ اسے جھینپ دیر نہ لگی وہ باتھ روم میں منہ دھونے گئی تھی۔ باتھ روم ہی دیکھنا وہ بھول گیا تھا۔

''مجھے اخلاقیات کا لیکچر دینے کی ضرورت نہیں ہے مس صاحبہ۔''

اس کا بدستور اہانت آمیز لہجہ اسے بری طرح سلگا گیا تھا۔

''جس جذبے کی تمہارے اندر رمق ہی نہیں ہے اسے بھلا لیکچر کیا سدھار سکتا ہے۔'' وہ استہزائیہ انداز میں گویا ہوئی۔ اسکی آنکھوں سے،

اس کے چہرے سے، اس کے لہجے سے، اس کے ایک ایک انداز سے نفرت ہی نفرت چھلکتی تھی اور یہ نفرت اور بدگمانی کا ہی احساس تھا، اظہار تھا کہ وہ بہت حقارت سے اسے تم پکار رہی تھی۔ جس میں اپنائیت یا شناسائی کی معمولی سی بھی رمق نہ تھی۔

''یہ تمہارے لیے لاسٹ وارننگ ہے۔ تم اب کمرے سے نہیں نکلو گی۔'' وہ اس کی سمت رخ پھیر کر گویا ہوا۔

''میں یہاں نہ اپنی مرضی سے آئی ہوں اور نہ ہی اپنی مرضی کے خلاف کوئی حکم مانوں گی۔'' اس کے لہجے سے ہٹ دھرمی بے خوفی جھلکتی تھی۔

''اوکے۔ یہ وقت پر منحصر ہے۔ میں فضول بحث میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا۔ ناشتہ بھیج رہا ہوں۔'' اس نے واپس پلٹتے ہوئے درشت لہجے میں حکم صادر کیا اور باہر سے گیٹ بند کر کے کنڈی لگا کر گل ریز کی طرف بڑھ گیا۔

☆☆☆

''آ دے بے بڑی مدت بعد بہن کی یاد ستائی ہے۔'' گل جاناں بڑی بہن گل صنوبر سے گلے ملتے ہوئے خاصے پر جوش و محبت سے لبریز لہجے میں گویا ہوئیں۔

''مجھے یاد ستائی تو میں چلی آئی مگر تمہیں تو کبھی یاد آتی ہی نہیں۔''

وہ چھوٹی بہن کی پیشانی کو بوسہ دے کر مسکراتے ہوئے شکوہ کناں ہوئیں۔

''ارے چھوڑیں بے بے اتنے عرصے بعد ملے ہیں، شکوے، شکایت کے لیے عمر پڑی ہے۔ یہ بتائیں لالہ کیسے ہیں؟ سفیرہ گل اور سرینہ گل کیسی ہیں؟'' وہ انہیں بڑے پلنگ پر لے کر بیٹھتے ہوئے استفسار کرنے لگیں۔

''سب خیریت سے ہیں۔ تمہارے لالہ میرے ساتھ آتے مگر اچانک ان کے دوست باہر سے آگئے۔ ان کی وجہ سے رکنا پڑا انہیں، سفیرہ سسرال میں ہے۔ بہت خوش ہے۔'' وہ نرم و ملائم براؤن گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر اطمینان سے نیم دراز ہوتے ہوئے گویا ہوئیں۔

''کبھی خود جا کر دیکھا بھی ہے آپ نے یا اس کی سن کر اطمینان سے بیٹھی ہیں کہ وہ خوش ہے۔'' گل جاناں اپنے مخصوص جلے کٹے انداز میں گویا ہوئیں۔

گل صنوبر ان کی بڑی بہن تھیں۔ ان کی شادی کے طویل عرصے بعد اللہ نے ان کی دو بیٹیوں سے گود بھری تھی۔ ان کے شوہر ان کے قبیلے کے مردوں کی مخصوص ذہنیت سے مختلف تھے جو بیٹوں کی پیدائش پر خوشیاں مناتے اور بیٹی کی پیدائش پر سوگ۔ انہوں نے دونوں بیٹیوں کو بیٹوں سے بڑھ کر چاہا اور کبھی صنوبر گل سے بیٹا نہ ہونے کا شکوہ یا آرزو بیان نہیں کی۔ ایک سال قبل وہ بڑی بیٹی سفیرہ کی شادی کر کے فارغ ہوئی تھیں۔

''کیا مطلب؟ کیسی بات کر رہی ہو گل؟ وہ خوش ہے جبھی تو بول رہی ہے۔ میں ماں ہوں اس کے چہرے پر کھی خوشیوں کی روشنی میں نے دیکھی ہے۔'' وہ ان کے انداز پر اچنبھے سے گویا ہوئیں۔

''ارے میری بھولی بے بے، یہی تو آج کل لوگوں کی چالاکیاں ہیں۔ اندر ہی اندر زخم لگاتے ہیں۔ مارتے ہیں اور رونے نہیں دیتے، میں نے چند ہفتے پہلے چھوٹی ادے کے ہاں سفیرہ کو دیکھا تو اور میں دیکھ کر حیران رہ گئی۔ کیسی سرخ و سپید ہوا کرتی تھی۔ شادی سے پہلے اور اس دن اس کا

چہرہ ایسا تھا گویا کسی نے ہلدی مل ڈالی ہو۔ ایک دم زرد چہرہ، آنکھوں کے گرد پھیلے نیم سیاہ دائرے اور جسم ہڈیوں کا پنجر لگ رہا تھا۔ میں تو جبھی کھٹک گئی کہ کوئی بات ہے ضرور، ورنہ سفیرہ کا حسن تو پھولوں کو شرماتا تھا۔ میں نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح تنہائی میں معلوم کروں کیا بات ہے؟ مگر اس کی ساس چالاک، تو بہ تو بہ ایسے اس سے جڑ کر بیٹھی تھی جیسے ذرا بھی ہلنا محال ہو۔"

گل جانان نے نمکین پستے منہ میں ڈال کر اس طرح چبانا شروع کیے گویا پستے نہیں تصور میں سفیرہ کی ساس کی ہڈیاں چبا رہی ہوں۔

"تمہیں غلط فہمی ہوئی گل، اس کی ساس، سسر، نند، دیور سب، بہت اچھے اور محبت کرنے والے ہیں۔ بہت خیال رکھتے ہیں اس کا، اسے کوئی پریشانی نہیں ہے وہاں۔ اس جیسا سسرال بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔"

"رہنے دیجئے بے بے! اچھی ماں ہیں آپ! اس کا زرد چہرہ کمزور جسم نہیں دیکھ رہی ہیں؟"

"اپنا حشر بھی اس نے اپنے ہاتھوں ہی کیا ہے۔ شروع کے دو ماہ تھے خوب ہرنی کی طرح قلانچیں بھرتی پھریں۔ پھر حالت تو خراب ہونی تھی۔"

"وہ تو بچی تھی اور پہلی بار بچیاں کس طرح سمجھ پاتی ہیں۔ یہ تو ساس کا کام تھا کہ ایسی بات تھی تو بہو کا دھیان رکھتیں مجھے تو وہ عورت شکل سے ہی دوغلی لگ رہی تھی۔ ایسے لوگ باہر سے اچھے نظر آتے ہیں۔ بہت اچھے بہت چاہنے والے مگر اندر سے اتنے ہی دل کے سیاہ اور سخت گیر ہوتے ہیں۔ بظاہر تو سفیرہ کو سب چاہتے اور پسند کرتے ہیں مگر دل میں اس کے لیے بغض رکھتے ہیں، جبھی تو ایسا ہوا بے بے! اور ان کے خوف سے سفیرہ کہہ دیتی ہے کہ وہ بہت خوش ہے کہ کل کو اسے تنہا ہی سسرال کو بھگتنا ہے۔ میری مانو بے بے سفیرہ کو گھر بٹھا لو۔ پھر دیکھنا کیسے سیدھے ہوتے ہیں وہ لوگ۔"

"ارے ایسی کوئی بات نہیں ہے گل، میں نے بھی عمر گزاری ہے۔ اچھائی برائی کی تمیز رکھتی ہوں۔ اتنا شعور و ادراک ہے مجھے کہ لوگوں کے چہرے پڑھ سکوں، تم خواہ مخواہ اپنا دل برا مت کرو۔ سفیرہ اب کے گھر آئے گی تو تم خود تنہائی میں پوچھ لینا اس کے سسرال کے بارے میں۔ سب بتا دے گی وہ۔" وہ بہن کی بدگمان فطرت سے واقف تھیں کہ وہ ہر انسان میں علاوہ اپنے اور اپنے بیٹوں کے برائی کا پہلو تلاش کرنے کی عادی تھیں اور جب تک حسب منشا، برائی کشید کر کے رسوائی نہ بانٹ دے۔ انہیں ذرا بھی طمانیت حاصل نہ ہوتی تھی اور یہاں معاملہ ان کی انا کا تھا۔ انہوں نے بہن سے سفیرہ کا رشتہ شمشیر خان کے لیے مانگا تھا، مگر وہ بھانجے کے کردار سے بخوبی واقف تھیں۔ بہت رسانیت سے انہوں نے شوہر کی آڑ لے کر بات رد کر دی تھی۔ بیٹے کو ٹھکرانے اور اپنے مان کے ٹوٹنے کا احساس انہیں شدید تر ہوا تھا۔ اگرچہ وہ رشتہ اپنی مرضی سے لے کر گئی تھیں شمشیر خان، شہباز خان سے بھی رائے لینی ضروری نہیں سمجھی تھی۔ بہن کی طرف سے انکار سن کر توہین و بے عزتی کے احساس کے ساتھ وہ شکر کر رہی تھیں کہ وہ بغیر مشورے سے آئی تھیں۔ ورنہ اس بات پر رنجش کی بنیاد پڑ جاتی اور پھر جیسی تو آپس میں چھوٹیں ہی، بس دل ہی دل تک ان توہین کا انتقام چھپا رکھا۔ انکار نے ان بہن کے رشتے میں نظر نہ آنے والی دراڑ ڈال دی تھی۔ بہن سے ملنا انہوں نے برائے نام کر دیا تھا۔ لیکن جب بھی ملتی تو اتنے خلوص اور اپنائیت و محبت سے کہ صنوبر گل ان کے دل میں چھپے بغض و کینہ کو محسوس نہ کر سکتی تھیں کہ وہ روشن دل و دماغ کی مالک تھیں۔ درگزر اور محبت ان کی طبیعت کا حصہ تھی۔ ہر بات منہ در منہ کہہ دینے کی عادی تھیں۔ وہ سفیرہ کی سسرال میں ان کا کیڑے نکالنا، خالہ کی محبت سمجھتی تھیں۔ اسی لیے ہنس کر گل جانان کو تسلی دیتیں کہ وہ اچھی رہ رہی ہے۔

☆☆☆

"گل باز! صارم اور گلریز خان کہاں ہیں؟ صبح سے شام ہوگئی ابھی تک دونوں گھر نہیں لوٹے معلوم ہے کہاں گئے ہیں؟" شاہ افضل خان جو عصر کی نماز سے فارغ ہو کر مسجد سے آئے تھے سامنے بیٹھے گل باز کی طرف دیکھتے ہوئے فکر مندی سے استفسار کرنے لگے۔

"نہیں بابا جانی، میں کچھ دیر قبل ہی شہر سے آیا ہوں۔" وہ باپ کو دیکھ کر احتراماً کھڑے ہو کر مؤدب انداز میں گویا ہوئے اور ساتھ ہی ان کے آگے کرسی رکھی تھی اور ان کی بیٹھنے کے بعد خود بیٹھے تھے۔

"بابا جانی! گل ریز شکار پر گیا ہے اور کہہ رہا تھا ساتھ صارم کو بھی لے کر جائے گا رات تک یا کل تک واپس آجائیں گے۔"

اندر سے گل باز کی بیوی گل زیبا باہر آتے ہوئے ان سے مخاطب ہوئی تھیں اور ساتھ ہی ملازمہ کو چائے لانے کا حکم دیا تھا۔

"وہ تم کو کیوں بتا کر گیا ہے؟ اس گھر کی بزرگ تم ہو یا بابا جانی؟"

گلباز خان سخت لہجے میں بیوی سے مخاطب ہوئے تھے۔ حالانکہ باپ کی موجودگی کے باعث ان کا لہجہ پست تھا مگر اس انداز میں بھی اتنی برہمی و درشتی تھی کہ لمحے بھر میں گل زیبا کے چہرے کا اطمینان غائب ہو چکا تھا۔

"نن نہیں، میں تو ایسا کبھی سوچ بھی نہیں سکتی، وہ گلریز خان جلدی میں تھا۔ اس لیے بابا جانی کے پاس نہ جا سکا۔"

"وہ جلدی میں تھا۔ لیکن تم صبح سے کیا کر رہی تھیں۔ جو بابا جانی تک ان کی روانگی کی اطلاع نہ پہنچائی؟" سیر یز خان کے قتل کے بعد بابا جانی کی پریشانی و افکار سے وہ بخوبی واقف تھے۔ انہیں اچھی طرح احساس تھا کہ وہ اب بچوں کے معاملے میں بے حد حساس ہو گئے ہیں۔ ان کی معمولی سی گھر سے غیر حاضری سے انہیں وسوسوں و اندیشوں کے ناگ ڈسنے لگتے ہیں۔ گل زیبا کا اطمینان سے اطلاع دینا اور بے پروائی انہیں غصہ دلا گئی تھی۔ اگر باپ کی موجودگی و شیریں مزاج کا لحاظ نہ ہوتا تو وہ پہلی بار ان پر ہاتھ اٹھا دیتے کہ ماں اور باپ انہیں ہر رشتے سے زیادہ عزیز اور پیارے تھے۔

"کیسی بات کر رہے ہو بچے! ہماری بہو بہت ہمارا خیال رکھنے والی، عزت کرنے والی ہے۔ بہت محبت کرتی ہے ہم سے، کوئی بات نہیں۔ گھر کے بکھیڑوں میں بعض اوقات ذہن الجھ جاتا ہے۔" بابا جانی جو اپنی سوچوں میں گم تھے یکدم ہی انہیں بیٹے کے تیوروں کا احساس ہوا تو وہ ملائمت سے مخاطب ہوئے۔

"گھر کے بکھیڑے، ہونہہ۔ جنہیں پانی پلانے کے لیے بھی ملازم میسر ہوں وہ گھر کے بکھیڑوں کو کیا جانیں۔"

وہ قہر آلود نظروں سے بیوی کو گھور کر گویا ہوئے۔

"میں دیکھتی ہوں چائے ابھی تک کیوں نہیں آئی۔"

ان کی بھسم کرتی نگاہوں سے انہوں نے راہ فرار حاصل کی۔

"عورت شیشے کا وجود ہوتی ہے بچے! سختی اور دباؤ سے ٹوٹ کر بکھر جاتی ہے اسے پیار اور احتیاط سے رکھا کرو۔" بابا جانی مسکرا کر مخاطب ہوئے۔

"پیار اور احتیاط کا انجام ہے یہ جو کسی کی پرواہ ہی نہیں ہے۔"

"اپنی غلطی پر شرمسار ہونے والے کو مزید شرمندہ کرنا دانائی نہیں ہے بچے! انگریز خان نے پہلی حرکت کی ہے یہ اور میں فکر مند ہو گیا ہوں۔ اگر کوئی قابل گرفت عمل کی سمت قدم بڑھاتے ہیں تو اس طرح بزرگوں سے دور ہو کر رہے ہیں۔" وہ آسمان کی شفاف نیلگوں وسعتوں کو دیکھتے ہوئے مبہم لہجے میں گویا ہوئے۔

"کیا مطلب بابا جانی؟ گل ریز اور صارم کسی غیر اخلاقی۔"

"اللہ ایسا دن کبھی نہ دکھائے۔ لیکن میں مطمئن نہیں ہو پا رہا ہوں۔ ایک بے نام سا اضطراب مجھے جکڑ رہا ہے۔ عجیب بے شناخت سا احساس وجود پر طاری ہے میں کچھ سمجھ نہیں پا رہا ہوں گل باز خان۔" وہ تذبذب کے انداز میں گویا تھا۔ سرخ وسپید چہرے پر پریشانی و مضطرب سے احساسات پھیلے ہوئے تھے۔

"مجھے یقین ہے بابا جانی! آپ کے اندیشے آپ کی پریشانی و اضطراب بے وجہ نہیں ہوں گے، آپ اجازت دیں تو میں شکار گاہ پر انہیں تلاش کر کے لے آتا ہوں۔" انگریز باپ کو فکر مند دیکھ کر خود بھی بے چین ہو گئے تھے اور اس پریشانی کا حل انہوں نے یہی نکالا تھا۔

"نہیں خان! جنگل بہت وسیع و گھنا ہے۔ انہیں تلاش کرنا آسان تو نہیں ہے۔ خیر اب تم آرام کرو شہر سے آئے ہو۔ تھک گئے ہو گے۔ ہمیں اپنے خون، اپنی تربیت پر مکمل بھروسا ہے کہ وہ ایسا کوئی کام نہیں کر سکتے جس سے ہماری طرف کوئی انگلی اٹھائے۔"

"بابا جانی! اگر انہوں نے ایسا کوئی عمل غلطی سے کر بھی لیا تو میں انہیں معاف نہیں کر دوں گا۔" وہ تپے ہوئے لہجے میں گویا ہوئے۔

"ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ شاید انسان جتنی عمر کی سیڑھیاں چڑھتا آگے بڑھتا جاتا ہے واہمے، وسوسے، اندیشے اور بے معنی سے تفکرات اس پر بادلوں کی طرح چھانے لگتے ہیں۔ میرا بھی یہی حال ہے اور سبریز خان کی جدائی کے بعد تو دل و دماغ کی دنیا ان ہی اندیشوں کے اختیار میں جا بسی ہے۔ ان کی وقت کی دھول سے لبریز آنکھوں میں ہلکی سی نمی تیرنے لگی، جسے چھپانے کے لیے وہ فوراً اٹھ کھڑے ہوئے۔

"بابا جانی چائے لا رہی ہے گل زیبا بیٹھیں آپ۔"

☆☆☆

ڈھلتی شام کے گلابی سائے تیزی سے پھیل رہے تھے۔

سامنے قد آور کھڑکیوں کے شیشوں سے ڈھلتی شام کا سہانا موسم دلکش لگ رہا تھا۔ وسیع تاحد نگاہ پھیلے سبزے پر جنگلی گلابوں کی جھاڑیاں بکھری ہوئی نگاہوں کو مسرور کر رہی تھیں۔ سورج کی زرد شعاعوں نے ہر سو سونا سا بکھیر رکھا تھا۔ سرمئی پہاڑوں کی کوکھ سے جھرنے پھوٹ کر بہہ رہے تھے۔ نگاہوں کو خیرہ کن کرنے اور دل کو سرور و سرخوشی بخشنے والے لے مناظر کی وہاں بہتات تھی۔

صارم کرسی پر بیٹھا اپنے خیالوں میں گم تھا۔ اس کی نگاہیں باہر شیشے کے پار مناظر پر تھیں، مگر ذہن الجھنوں کے پیچ وخم میں سرگرداں تھا۔

"کیا سوچ رہے ہو؟" گل ریز گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر اس سے مخاطب ہوا۔

"ہوں، اوہ کچھ نہیں۔" اس نے چونک کر جواب دیا۔

''طورخان چائے بنا کر لاؤ ایک دم کڑک سی۔''

گلریز نے اندر داخل ہوتے ہوئے طور خان کو حکم دیا تو وہ واپس مڑ گیا۔لیکن اسی لمحے صارم کی آواز پر اسے پلٹنا پڑا۔

''وہاں کھانا لے کر گئے تھے کھایا اس نے؟''

وہ سنجیدگی سے مخاطب ہوا طور خان سے۔

''نہیں خان، وہ نہیں کھاتا، ہم نے بہت منت کیا اس کا صبح ناشتہ بھی نہیں کیا تھا۔رات کا بھی بھوکا ہے۔اب دوپہر سے شام ہوگئی ہے۔ اس طرح بھوکا رہ کر مر جائے گا مگر وہ بہت ضدی ہے خان۔''

طورخان کسی ٹیپ کی مانند مسلسل اسٹارٹ ہوگیا تھا۔

''تم اسکے باپ کے ملازم ہو جو اس کی منتیں کر رہے تھے۔خبردار جو آئندہ ہمارے دشمن سے ہمدردی کرنے کی کوشش کی تو۔'' گلریز خان بری طرح تپ کر گویا ہوا تھا۔

''بہتر خان۔'' طورخان دبے پاؤں وہاں سے نکل گیا جب کہ گلریز کا غصہ ہنوز برقرار تھا۔

''کیا سمجھتی ہے خود کو؟ ہم اس کی منتیں کریں گے۔اس کے آگے گڑگڑائیں گے۔نہیں کھاتی تو نہ سہی۔گلریز مرنے بھی اتنی آسانی سے نہیں دے گا۔''

''گلریز خان! مجھے تمہارا یہ طرزِ عمل بالکل پسند نہیں آرہا۔''

''کیوں کیا کر دیا میں نے؟'' وہ متعجب انداز میں گویا ہوا۔گلریز خان جذباتی اور منتقم طبیعت کا بندہ تھا۔شکست کھانا جس نے سیکھا نہ تھا۔ اپنی برتری و شجاعت کا علم وہ ہر حال میں بلند رکھنا چاہتا تھا۔جس کے لیے اگر اسے پستی میں بھی اترنا پڑتا تو وہ بلا جھجک کود پڑتا۔یہ یہی وجہ تھی کہ سربز کے قتل کے انتقام کے لیے اس نے بلا سوچے سمجھے ورشا کو اغوا کر ڈالا تھا۔جس پر اسے کوئی ندامت و ملال ہرگز نہ تھا۔

''بے حسی و سنگدلی کی انتہا ہے۔ایک کمزور اور بے قصور لڑکی کو تم اغوا کر کے لائے اور پھر اس پر اپنے غیر انسانی سلوک کو حق بجانب سمجھ رہے ہو۔''

صارم تند و سرد لہجے میں اس سے مخاطب ہوا۔

''ہوں، یہ ایک بات تو بتاؤ میری جان! تم آخر اس لڑکی کی اس قدر حمایت کیوں کیے جا رہے ہو؟ کہیں نظرِ عنایت؟''

''فضول بکواس کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' گلریز کی معنی خیز لہجے میں کی جانے والی بات وہ قطع کر کے تیز لہجے میں گویا ہوا۔

''اور تمہیں بھی اس لڑکی کے لیے اتنا جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''شام رات میں تبدیل ہونے کو ہے۔گھر پر بابا جانی، بی بی جان اور چھوٹے آغا پریشان ہو رہے ہوں گے۔قبل اس کے کہ وہ ہمیں تلاش کرتے کرتے یہاں پہنچ جائیں ہمیں یہاں سے گھر چلنا چاہیے۔''

''بے فکر رہو، میں بے بے سے کہہ آیا تھا کہ شکار پر جا رہے ہیں ممکن ہے رات کو واپس نہ آئیں انہوں نے اطلاع دے دی ہوگی۔''

''ہاہاہا، تیرے حواسوں پر وہ لڑکی کیوں سوار ہوگئی ہے؟ طور خان کہہ رہا تھا لڑکی بہت تر ودار ہے۔'' اس نے بائیں آنکھ دبا کر معنی خیز لہجے میں کہا اور اس لمحے صارم نے خود پر بمشکل قابو پایا تھا۔

''لیکن ہم تو اس کی صورت دیکھنے سے قبل ہی گھائل ہو گئے۔'' گلریز اپنے بازو کی سمت اشارہ کر کے قہقہہ لگا کر بولا۔

''میرے خیال میں تم اب آرام کرو۔'' صارم سے مزید برداشت نہیں ہوا تو وہ اسے مشورہ دیتا ہوا باہر کی جانب بڑھ گیا۔ طور خان نے اسے چائے کا مگ پکڑا دیا۔ سورج مغرب کی آغوش میں روپوش ہونے کو تھا۔ دھیرے دھیرے سرمئی نیم سرد اندھیرا بلند و بالا پہاڑوں کی چوٹیوں سے پھسلتا ہوا اردگرد کے ماحول پر پھیل رہا تھا۔ پرندوں کے غول تیزی سے اپنی منزل کی سمت گامزن تھے۔ ہوا سرد اور تیز چلنے لگی تھی۔

وہ چائے سے فارغ ہونے کے بعد بلا مقصد باہر ٹہلتا رہا۔ اس کے اندر اضطراب، بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ گلریز خان کی ہٹ دھرم و ضدی فطرت سے وہ واقف تھا۔ عام حالات میں شاید وہ اس کی برین واشنگ کر بھی دیتا لیکن اس وقت وہ سبریز خان کے قتل اور انتقام کی آگ میں جل رہا تھا۔ اس کی جذباتیت اور ارادوں کی راہ میں اگر بابا جانی بھی آ جاتے تو وہ ہتھیار نہیں ڈالنا چاہے اس کی سزا بھگتنے کے لیے تاحیات خود کو اذیتیں دینا کیوں نہ پڑتیں۔

''خان! اس لڑکی کو آپ کچھ کھلا دو ورنہ اس کو کچھ بھی ہو سکتا ہے۔'' طور خان اس کے نزدیک آ کر آہستگی سے بولا۔

''اسے اغوا کرتے وقت خیال نہیں آیا تمہیں؟ اب ہمدردی فضول ہے۔'' طور خان کی ہمدردی اسے ایک آنکھ نہ بھائی۔

''ہم کیا کر سکتا ہے خان! حکم کا غلام ہے ہم تو، غلام کی خوشیاں اور دکھ مالکوں کی ذات سے وابستہ ہوتے ہیں خان۔'' وہ نہایت عاجزی سے پست لہجے میں گویا ہوا۔

''ہونہہ کون سے مالک کو خوش کرنے کے لیے تم نے اپنے ضمیر کا سودا بخوشی کر ڈالا؟ بابا جانی یا چھوٹے آغا، کون تمہارے اسے گھٹیا اقدام سے خوش ہوں گے؟''

''چھوٹے خان! آپ درست بول رہے ہیں مگر سبریز خان کے خون.....''

''شٹ اپ، اس کا خون اتنا ارزاں نہیں کہ اس گھٹیا انداز میں اس کا انتقام لیا کریں۔'' اس کے تحت لب و لہجے پر طور خان سٹپٹا کر رہ گیا۔

''اچھا کچھ لے کر آؤ میں وہیں جا رہا ہوں۔''

وہ وہاں سے اس کے کمرے کی طرف آ گیا۔ سامنے تالا دیکھ کر اس کے لبوں پر مبہم سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ طور خان نے ڈر کے مارے احتیاطاً کنڈی کے ساتھ تالا بھی لگا دیا تھا اور تالے کے ساتھ ہی چابی بھی لٹک رہی تھی۔ اس نے تالا کھول کر کنڈی ہٹائی اور دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ پہلا قدم رکھتے ہی اسے اچھل کر دور ہونا پڑا تھا اور سنبھلتے سنبھلتے بھی خنجر اس کے سینے پر آیا تھا۔

☆☆☆

''سمندر خان! کب سفر ختم ہوگا؟ شیطان کی آنت کی طرح یہ بڑھتا ہی جا رہا ہے۔'' شمشیر خان اکتائے ہوئے لہجے میں مخاطب ہوا۔

''خان چند گھنٹے اور لگیں گے پھر ہم منزل پر پہنچ جائیں گے۔'' سمندر خان نیاز مندی سے گویا ہوا۔

''ابھی بھی گھنٹے لگیں گے، لعنت ہے تم پر لعنتی آدمی کوئی کام تمہارا جلدی کا نہیں ہے ہر کام گھنٹوں کا ہوتا ہے، ابھی پانی بھی گھنٹوں میں لایا تھا اب راستہ بھی بتاتا ہے گھنٹوں کا ہے۔''

حسب توقع وہ فوراً ہی جلال میں آ گیا تھا۔

''خان جی، پانی لینے گیا تھا تو راستے میں شرارتی لڑکیاں مل گئی تھیں۔ انہوں نے خوب وقت خراب کر کے پانی دیا اب گھنٹوں کی آپ پروا مت کرو وہاں بہت زبردست ملے گا وہاں۔''

سمندر خان اس کے بگڑتے موڈ کو دیکھ کر خاصے خوشامدانہ لہجے میں بولا۔ شمشیر خان چند ثانیے اسے گھورنے کے بعد سیٹ سے ٹیک لگا کر آرام سے بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے سے بیزاری جھلک رہی تھی مگر سمندر خان کو اس نے مزید کچھ نہ کہا تھا۔ سمندر خان بھی اسے خاموش دیکھ کر مطمئن ہو گیا تھا۔

جیپ ہرے بھرے راستے پر رواں دواں تھی۔ ڈرائیور، خاموشی اور مہارت سے ڈرائیو کر رہا تھا۔

''سمندر خان!''

''جی خان۔''

''وہ جو ڈاکٹر آئی ہے گاؤں میں تم نے اسے کھلوا دیا تھا؟'' یکدم ہی شمشیر خان کسی خیال سے چونک کر استفسار کر بیٹھا۔

''کیا خان؟'' سمندر خان بے دھیانی سے بولا۔

''کیا؟'' وہ ایک دم ہی آگ بگولہ ہوا۔ ''یہ تم مجھ سے پوچھ رہے ہو؟''

''خان جی مجھے یاد نہیں۔''

سمندر خان کی حالت اس کے بگڑے تیور دیکھ کر غیر ہونے لگی۔ جانتا تھا وہ جتنا فیاض تھا اتنا ہی بے رحم جلاد بھی تھا۔ خوش ہو جائے تو اس جیسا سخی کوئی نہیں اگر ناراض ہو جائے تو جسم سے کھال لمحے بھر میں اتار لے۔ اس وقت بھی وہ قہر و غضب کی تصویر بنا اسے گھور رہا تھا اور وہ اپنے ذہن پر زور ڈال رہا تھا کہ شمشیر خان نے اس سے کیا کھلوا دیا تھا۔ گھبراہٹ و خوف کی حالت میں وہ کانپنے لگا تھا کہ یکدم اسے یاد آیا کہ جس دن وہ ڈاکٹر کائنات کے گھر گئے تھے وہاں سے واپسی پر خان کا موڈ خلاف توقع بہت خوشگوار اور اچھا تھا۔ اس نے اسے حکم دیا تھا کہ وہ کل صبح ڈاکٹر کو پیغام دے دے کہ وہ اپنا کلینک دوبارہ اسٹارٹ کرے اور ساتھ ساتھ ہی گاؤں کے لوگوں کو بھی اس کا حکم سنانا تھا کہ اب وہ بلا کسی خوف و پریشانی کے ڈاکٹر سے دوائیں۔ دوسرے دن وہ قطعی بھول گیا اس پیغام کو جو اس خطرناک وقت پر یاد آ رہا تھا۔

''یاد آیا کہ نہیں؟ یاد دلاؤں؟''

ششیر خان قریب رکھی بھاری بھرکم رائفل اٹھاتے ہوئے سرد مہری سے بولا۔

''نہیں خان، یاد آگیا۔ بالکل یاد آگیا بھلا کیسے یاد نہ آتا؟ وہ پیغام تو میں نے دوسرے دن ہی ڈاکٹر صاحبہ کو پہنچا دیا تھا۔''

مکاری پن وعیاری سمندر خان کی رگ رگ میں سمائی تھی۔ اس نے جھٹ چالاکی سے دل میں منصوبہ ترتیب دیتے ہوئے اتنی خوبصورتی سے جھوٹ بولا کہ ششیر خان جیسا کائیاں ومکار شخص اس کا جھوٹ نہ سمجھ سکا۔

''دماغ کو حاضر رکھا کر اپنے ورنہ کسی دن ضائع ہو جائے گا میرے ہاتھوں سے۔''

''بہتر خان۔'' وہ نہایت سعادت مندی سے گویا ہوا۔

''تم ہمیں وہاں چھوڑ کر گاؤں چلے جانا وہاں ایک چکر لگا کر دوسرے دن آجانا۔ وہاں کی خیریت معلوم ہو جائے گی۔''

''خان اس بار میں جاؤں گا۔ گاؤں کا چکر لگا کر دوسرے دن آجاؤں گا۔''

''خان آپ کے ساتھ رہے گا۔'' سمندر خان آہستگی سے بولا۔

''کیوں؟ تمہیں گاؤں کیوں یاد آنے لگا۔''

''کوئی خاص بات نہیں خان جی!'' اس نے مسکراتے ہوئے اسے ٹالا تھا۔

اپنے مفاد کی خاطر اس نے یہ فیصلہ کیا تھا ورنہ ششیر خان کے ساتھ ایسی رنگین محفلوں میں وہ بڑے جوش وخروش سے شامل ہوتا تھا۔ لیکن اس وقت اس نے جھوٹ بول کر اپنی جان بچائی تھی اور اب آگے کا راستہ صاف کرنے کی فکر میں وہ گاؤں جانا چاہ رہا تھا کہ ششیر خان کی واپسی سے قبل ہی گاؤں جا کر ڈاکٹر کائنات تک اس کا پیغام پہنچا دے اور ساتھ ہی لوگوں کو بھی سمجھا دے کہ وہ ڈاکٹر کے پاس بے فکری سے جائیں۔

☆☆☆

''گل خانم! کیا ہر وقت اپنے کمرے میں بیٹھی رہتی ہو؟ کبھی باہر نکل کر دنیا دیکھنے کی خواہش بھی کیا کرو چلو اٹھو باہر چلو۔'' گل صنوبر اندر آکر بہت محبت سے گل خانم سے مخاطب ہوئیں جو ابھی فجر کی نماز کے بعد قرآن پاک کی تلاوت سے فارغ ہو کر جا نماز تہہ کر کے رکھ رہی تھیں۔

''آپ نے دیکھ لی، بہت ہے۔ مجھے میرا یہ کمرہ ہی پوری دنیا سے بڑا لگتا ہے۔''

وہ مسکرا کر ان سے مخاطب ہوئیں۔ گل جاناں کی وہ بڑی بہن تھیں۔ مگر اخلاق ومزاج میں ان سے بالکل الٹ تھیں۔ انہیں اپنی بہن کے مزاج وطبیعت سے خود بھی بھرپور اختلاف تھا جس کا اظہار وہ گل جاناں کے روبرو کرتی تھیں۔ جس کی وہ پروا نہ کرتی تھیں۔ گل خانم کا مزاج اور طبیعت ان سے میل کھاتی تھی اس لیے جب بھی وہ یہاں آتیں تو ان کے پاس ہی وقت زیادہ سے زیادہ گزارتی تھیں۔ گل جاناں کی ہزار ہا مخالفت وغصے کے باوجود اب بھی نماز سے فارغ ہو کر وہ سیدھی چلی آئی تھیں کہ انہیں معلوم تھا وہ ماں بیٹی جاگ رہی ہوں گی کیونکہ گل جاناں کی صبح خاصی دیر سے ہوتی تھی۔ اس لیے وہ بلا خوف وخطر یہاں چلی آئی تھیں۔

''ہاں اس مینڈک کی طرح جسے اپنا کنواں ساری دنیا محسوس ہوتا ہے۔''

وہ ہنستی ہوئیں ان کے قریب بیٹھ گئیں۔ اسی اثناء میں سخاویہ چائے لے آئی اور ان کو دینے کے بعد پلنگ لے کر ان کے نزدیک ہی بیٹھ گئی۔

''بیٹیوں سے گھر میں بڑا اجالا ہوتا ہے۔ بڑی خدمت کرتی ہیں بیٹیاں، تم نے تربیت بھی بہت اچھی کی ہے گل جب بھی ملتی ہوں خوشی ہوتی ہے۔ ورشا کی تعلیم اب تو مکمل ہو گئی ہو گی وہ آئی نہیں ابھی تک؟''

''بس چند دنوں میں آنے والی ہے۔'' سخاویہ نے جواب دیا۔

''تم بھی ہمت کر لیتی سخاویہ، تو ڈگری لے سکتی تھیں۔ دیکھو ورشا نے ہمت و حوصلے سے کام لیا تو کامیاب ہو گئی نا آخر۔ آج کل سائنسی دور ہے تعلیم بہت زیادہ ضروری ہو گئی ہے۔ تمہارے انکل تعلیم یافتہ ہیں حالانکہ میں تو ان پڑھ ہوں مگر ان کے سنگ رہ کر اچھی زندگی گزار رہی ہوں۔ ہر چیز کا سلیقہ آ گیا ہے۔ لڑکیوں نے بھی تعلیم حاصل کی ہے، اچھائی، برائی کی تمیز آ گئی ہے۔ اگر تمہارے انکل گاؤں کے عام مردوں کی طرح ہوتے غیر تعلیم یافتہ تو سمجھو، میں عام جاہل عورتوں کی طرح ہوتی۔ لڑاکا، حاسد دوسروں کے عیب تلاش کر کے دنیا میں پھیلانے والی۔''

''یہ بے ایسا بھی شمرو رالالہ کی مہربانی اور محبت ہے جو میں نے چودہ جماعتیں پڑھ لیں یا احساس ندامت تو ہے کہ میرے پاس کوئی ڈگری نہیں ہے مگر یہ احساس کمتری بھی نہیں ہے کہ میں کتابوں اور قلم کی دنیا سے بالکل نابلد ہوں۔ ورشا جیسی باہمت اور حوصلہ مند میں کبھی نہیں بن سکتی بلکہ مجھے مسرت ہے کہ اس نے اپنی خواہش پوری کی اور آگے بھی وہ کامیاب ہو گی۔''

سخاویہ کے لہجے میں بہن کے لیے پیار و محبت تھی۔

''ہاں ہاں انشاء اللہ ایسا ضرور ہو گا اس کے ساتھ اتنی دعائیں ہیں وہ کامیاب ضرور ہو گی۔'' گل صنوبر کے لہجے میں خلوص اور صداقت تھی۔

سخاویہ ناشتے کی تیاری کے لیے باورچی خانے کی طرف چلی گئی۔ کیونکہ نماز سے فارغ ہونے کے بعد وہ صرف چائے لیتی تھیں۔ ناشتہ سب گھر والوں کے بیدار ہونے کے بعد کیا جاتا تھا۔

''خانم! اب سخاویہ کو بھی رخصت کرو، ایک عرصہ ہو گیا منگنی ہوئے۔ دیر فضول ہے۔ لڑکیوں کے فرض سے جتنی جلد فراغت حاصل ہو اتنا بہتر ہے۔''

''ہر ماں کی یہی خواہش ہوتی ہے صنوبر، میری بھی یہی آرزو ہے مگر۔''

''مگر کیا؟''

''شہباز خان، زمین کا بڑا حصہ اور بڑی رقم کا مطالبہ کر رہے ہیں سخاویہ کے بدلے، وہ لوگ رقم دینے کو تیار ہیں مگر زمین کا معمولی سا ٹکڑا بھی دینے کو راضی نہیں۔ شہباز خان کی پہلی ضد چلی آ رہی ہے کہ وہ رقم کے ساتھ زمین کا حصہ بھی دیں۔ اسی ضد و ہٹ دھرمی کے باعث سال پر سال گزر جاتے ہیں۔ سنا ہے مغیث بھی کراچی میں مستقل رہنے لگا ہے۔ کاروبار کے سلسلے میں۔''

''ہاں۔ مجھے بھی معلوم ہوا تھا۔ لڑکی کب تک اس ضد کی وجہ سے بیٹھی رہے گی؟''

''اللہ جانے؟'' انہوں نے سرد آہ بھری۔

''دو بیٹیاں تم نے اسی جہالت کے باعث دنیا سے رخصت کرا دیں۔ اب تو اپنا حق استعمال کرو، آخر تم ماں ہو ان کی۔''

''شاباش ہے بے بے! آپ کی محبت پر۔ ایسی بھی کوئی بہن ہوگی؟ جو اپنی بہن کی سوکن کو بہن و بہنوئی کے خلاف بھڑکائے۔''

انہیں احساس نہ ہوا کہ دبے پاؤں چل کر آنے والی گل جاناں ان کی گفتگو سن رہی ہے۔ وہ اندر آ کر غصے سے چیخ کر گویا ہوئی تھیں۔

''اوہ۔ تمہاری یہ عادت نہ گئی، بلی کی چال چلنے کی اور تم غصہ کیوں ہو رہی ہو؟ میں جو کہہ رہی ہوں درست کہہ رہی ہوں۔ انسان کو بات حق کی اور سچ کہنی چاہیے۔ قبر میں انسان اپنے اعمال اور ایمان ساتھ لے کر جائے گا۔ وہاں کوئی ماں، بہن، بھائی، باپ اولاد قبر کے عذاب سے چھڑانے کے لیے نہیں آئے گا۔''

''تم بھی اللہ کا خوف کرو، تمہاری بھی بیٹیاں ہیں۔ سمجھاؤ اپنے خاوند کو، چھوڑیں فرسودہ طریقوں کو۔ پہلے ان باتوں کو معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا کہ بیٹی کے بدلے زمین جائیدادیں حاصل کی جاتی تھیں بلکہ اچھے اعلیٰ و عزت دار گھرانوں میں جب بھی ایسی روایات کو شدید ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ اب تو نچلے درجے کے گھرانوں میں بھی بیٹی پر پیسہ لینے کے بجائے اپنے حیثیت کے مطابق کچھ دے دلا کر رخصت کیا جاتا ہے۔ یہاں دولت و جائیدادوں کی کثرت کے باوجود وہی صدیوں پرانے رواج قائم ہیں۔ زمین ویسے بھی ہمارے قبیلوں کی کمزوری ہے۔ لوگ جان دینا پسند کرتے ہیں مگر زمین نہیں۔ میں خود خان کو سمجھاؤں گی۔''

انہوں نے بہن کے غصے سے ذرا بھی مرعوب ہوئے بغیر گوشمالی کر ڈالی تھی۔

''نہیں معاف کر دیجیں، غیروں میں رہ کر بالکل غیروں جیسے طور طریقے اپنا لیے ہیں۔ اب ہمیں بھی وہی ترغیب دینے چلی ہیں۔ میرا میاں قبیلہ کا سردار ہے۔ کوئی اٹھائی گیر نہیں ہے اور نہ ہی کوئی بہروپیا ہے جو لوگوں کو دیکھ دیکھ کر روپ بدلتا پھرے، اپنے قبیلے کی تمام رسم و رواج کو بھول جائے۔ قصور آپ کا نہیں ہے بے بے! اس جادوگرنی کا ہے۔ جو اس کے قریب آتا ہے اسے یہ ایسے ہی اپنا بنا لیتی ہے۔ چلو آپ ناشتہ کرو چل کر۔''

وہ نفرت انگیز نگاہیں خاموش بیٹھی گل خانم پر ڈالتے ہوئے گویا ہوئیں جب کہ بے بے نے ملامت آمیز نگاہوں سے سرزنش کی تھی۔

☆☆☆

''دماغ خراب ہو گیا ہے تمہارا؟'' ایمان نے تیزی سے پیچھے ہٹ کر خود کو اس کے وار سے بچایا اور برق رفتاری سے اس کا خنجر والا ہاتھ بھی پکڑ لیا۔

''میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گی۔''

ورشا دانت بھینچ کر خونخوار انداز میں بولی۔ اس وقت اس کی حالت خاصی ابتر تھی بال، ہیئر بینڈ میں جکڑے ہونے کے باوجود چھوٹی چھوٹی لٹوں کی صورت میں بکھرے ہوئے تھے۔ چہرے پر غصے و جنون کے باوجود بھی زردی و پژمردگی چھائی ہوئی تھی۔ نڈھال و تھکن، نیند سے چور آنکھوں میں پھیلی وحشت نے سرخیاں بکھیر دی تھیں۔

''اپنی حد میں رہو، مجھے سختی کرنے پر مجبور نہ کرو۔''

اس نے اس کے ہاتھ سے خنجر چھین کر کھڑکی سے باہر پھینکتے ہوئے سرد مہری سے کہا۔

''ونجتی؟ ہونہہ، کرو، کیا کرو گے؟ کیا کر سکتے ہو تم؟ تم جیسے لوز کریکٹر آدمی سے کمینگی و پستی کی ہی امید کی جا سکتی ہے۔''

''او شٹ اپ مین، میں کہہ رہا ہوں کہ اس بند کرو اپنی تم حد سے بڑھ رہی ہو۔'' اس کا لہجہ اس کا انداز اس کی آنکھوں سے نکلتے نفرت و حقارت کے شعلوں نے اس کا پیمانۂ صبر سا گاڈالا تھا۔

''تم کیا سمجھتے ہو؟ اس طرح چیخ کر میری آواز بند کر دو گے؟''

اس کے چیخنے پر وہ بھی جواباً چیخ کر گویا ہوئی تھی۔

''میں چاہوں تو صرف تمہاری آواز ہی نہیں سانس بھی بند کر سکتا ہوں۔''

''ہاں تو کر دو، کر دو سانس بند تم نے با عزت زندگی کے دروازے تو مجھ پر بند کر دیئے ہیں۔ اب سانس بھی بند کر دو۔ مجھے جینے کی آرزو نہیں ہے۔'' وہ ہذیانی انداز میں چیخنے لگی۔ اسی دم طور خان ٹرے میں لوازمات مع چائے کے لیے آیا تھا صارم کے اشارے پر سامنے رکھی سینٹر ٹیبل پر اس نے ٹرے رکھ دی۔

''چلو غصہ ختم کرو کچھ کھا لو۔ کل رات سے کچھ کھایا نہیں ہے تم نے۔''

اس کے چیخنے چلاتے لہجے میں بے بسی و آنسوؤں کی نمی اس نے محسوس کر لی تھی۔

وہ شوخ مزاج، کھلنڈرا و بے پرواضرور تھا مگر حساسیت و انسانیت سے مبرا ہر گز نہ تھا۔ ورشا کے دکھ کو، اس کے کرب کو، اس کے اضطراب کو وہ بخوبی جان رہا تھا۔ نگریز کے اس اقدام پر اس کو اسی لیے شدید غصہ تھا کہ اس نے انتقام کی خاطر ایک لڑکی کا مستقبل و زندگی تاریک کر ڈالی ہے۔

''ورشا! پلیز ناراضگی و بدگمانی انسانوں سے ہوتی ہے کھانے سے کیوں گریز کر رہی ہو؟'' اسے اسی طرح بے پروا و بے حس انداز میں کھڑا دیکھ کر اسے اپنے لہجے میں نرمی پیدا کرنی پڑی طور خان کمرے سے جا چکا تھا۔

''میں آپ سے کہہ رہا ہوں کھانا کھائیں۔'' اسے ہنوز کھڑے دیکھ کر وہ قریب آ کر جتانے والے انداز میں گویا ہوا۔

''نہیں کھانا مجھے کچھ بھی۔'' وہ ایک پاؤں زور سے فرش پر مار کر بولی۔

''ضد چھوڑ دو، بہت وقت گزر گیا ہے اگر اسی طرح بھوکی رہو گی تو تمہاری طبیعت خراب ہو جائے گی اور یہاں قریب کوئی اسپتال بھی نہیں ہے۔ باہر دیکھو، شام ڈھل چکی ہے۔ گہرے ہوتے اندھیرے کے ساتھ دھند میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔ یہاں شام چھ بجے کے بعد آمد و رفت کی اجازت نہیں ہے کہ اندھیرے اور حد سے زیادہ دھند کے باعث راستہ نظر نہیں آتا۔''

وہ اپنا اشتعال بھلا کر اسے سمجھا رہا تھا مگر اس پر مطلق اثر نہ تھا۔

''ہونے دو، طبیعت خراب ہو گی تو مر ہی جاؤں گی؟ تو مر جانے دو۔''

''پلیز ایسے مت کہو۔''

''کیوں نہیں کہوں؟ مار تم مجھے چکے ہو۔ اپنے گھر والوں کے لیے میں مر گئی ہوں۔ اغوا کی گئی لڑکی کو کوئی قبول نہیں کرتا۔ حتیٰ کہ گھر والے بھی۔ تم نے میرے ساتھ بہت ظلم کیا ہے۔ میری بددعا ہے تمہیں کبھی سکون سے نہیں رہنے دیں گی۔ تمہاری بہنوں کو بھی کوئی اسی طرح اغوا کرائے گا جس طرح تم نے میرے ساتھ کیا ہے۔'' اس کی زبان اس کی آنکھیں پھر شعلے اگلنے لگی تھیں۔

''شٹ اپ، میں کہہ رہا ہوں میں نے تمہیں اغوا نہیں کروایا۔ پھر کیوں تمہاری سمجھ میں نہیں آ رہی بات۔'' اس کی تکرار سے وہ جھنجلا کر بولا۔

''پھر تمہارے باپ نے کروایا ہے؟'' وہ بدتمیزی کی آخری حد تک گر گئی تھی لیکن دوسرا لمحہ اس کے لیے بھاری ثابت ہوا تھا۔

صارم خان کا مضبوط ہاتھ اس کے بائیں رخسار پر اپنی انگلیوں کے پرنٹ ثبت کر گیا۔

''خبردار، جو آئندہ میرے مرحوم باپ کا نام تم نے اپنی زبان سے لیا۔'' اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا آنکھوں سے شرارے نکلنے لگے تھے۔

وہ چند لمحے ساکت نظروں سے رخسار پر ہاتھ رکھے اسے دیکھتی رہی۔

''میں تم سے کہہ رہا ہوں۔ بار بار دہرا رہا ہوں۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔ ایسی گھٹیا و پست حرکت خواب میں بھی مجھ سے سرزد نہیں ہو سکتی۔ لیکن تم ان لوگوں میں سے ہو جو اپنی رائے دوسرے کے بارے میں ایک بار مقرر کر لیتے ہیں تو اس سے ایک انچ پیچھے نہیں سرکتے اس پر برقرار رہتے ہیں۔''

صارم خان کی آنکھوں میں خون کی سرخی چھا گئی تھی۔ وہ غصے و جنون کی اس حالت پر تھا جہاں اسے اپنے ہاتھ اٹھانے والے اقدام پر رتی بھر شرمندگی و افسوس نہ تھا۔

''صارم خان! تمہیں اپنے مردہ باپ کی حرمت کا اتنا خیال ہے پھر میرا باپ تو زندہ ہے۔ میرے بھائی جوان اور غیرت مند ہیں۔ ان کا خیال نہیں ہے تمہیں؟''

وہ کڑوے لہجے میں گویا ہوئی۔

''ہوں۔'' اس نے ایک تیز نگاہ اس پر ڈال کر ہنکارا بھرا۔

''میں بھی فیصلہ کر چکی ہوں یہاں سے اب میری لاش جائے گی۔''

اسے خاموش و لاتعلق دیکھ کر کچھ توقف کے بعد وہ فیصلہ کن لہجے میں گویا ہوئی۔

''خاموشی سے کھانا کھاؤ، عمر پڑی ہے خواب دیکھنے کے لیے۔''

اس کی بات وہ نظر انداز کرکے خشک لہجے میں بولا۔

''میں نے کہہ دیا نہیں کھاؤں گی۔'' وہ غصے میں بولی۔

''شاید تمہیں عزت موافق نہیں آ رہی ہے او کے، میرا فرض تمہیں سمجھانا تھا۔ زبردستی پر تم مجھے خود مجبور کر رہی ہو۔ بعد میں شکایت مت کرنا۔''

اس نے اشتعال میں آگے بڑھتی درشہوار کے بازو پکڑ کر ڈرامائی انداز میں کہا۔

''چھوڑ دو مجھے تم نے ہمت کیسے کی مجھے چھونے کی؟''

وہ جو لوازمات سے پرے پھینکنے کے لیے آگے بڑھ رہی تھی صارم نے اس کا ارادہ بھانپتے ہوئے آگے بڑھ کر اس کے دونوں ہاتھ اپنی گرفت میں لے لیے تھے۔ اس کے اس انداز پر وہ بری طرح بپھر اٹھی تھی۔ خود کو اس کی گرفت سے آزاد کروانے کی جدوجہد میں وہ اس کے سینے سے آ لگی تھی۔

اس کی فولادی گرفت میں وہ خود کو کمزور محسوس کر رہی تھی۔

یکلخت ہی اس پر ادراک کے در وا ہوئے وہ جو بہت دیر سے اسے اپنے اخلاق اور نرم مزاجی سے متاثر کرنے کی کوشش کر رہا تھا از حد بدتمیزی، بدلحاظی، بدکلامی و بداخلاقی کے باوجود اخلاقی حد سے باہر نہیں نکلا تھا۔ اگر وہ شرافت، انسانیت، اخلاقیات کا لبادہ اتار پھینکے تو؟

وہ کوئی مزاحمت کر پائے گی؟ خود کو برباد ہونے سے بچا سکے گی؟ وہ اغواء کی گئی ہے کسی مقصد کسی پلاننگ کے باعث ہی ایسا ہوا ہوگا۔ وہ شخص جس کا کام ہی فلرٹ کرنا، لڑکیوں سے کھلونے کی طرح کھیلنا ہے۔ جس کی رنگین داستانوں اور رنگین نظاروں کی وہ خود چشم دید گواہ تھی۔ اس سے کسی شرافت اور مروت کی امید نہ تھی جو اسے اغوا کروانے کے باوجود بھی خاصا مہذب دبا کردار نظر آ رہا تھا۔ اگر وہ ایکدم ہی اپنی جون میں آ گیا تو میں اب اس کے رحم و کرم پر ہوں۔ اس شخص کے رحم و کرم پر جس کی پرچھائیں سے بھی مجھے کراہت آتی ہے جو کبھی میرے لیے پسندیدہ نہیں رہا۔

وحشت ناک سوچیں مکڑی کی طرح اس کے گرد جال بن رہی تھیں۔

صارم دم بخود رہ گیا۔ اسکے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ کسی بے جان مورتی کی طرح اس کے سینے سے آ لگے گی۔ وہ اسے ٹرے پھینکنے سے باز رکھنا چاہتا تھا۔ اس لیے بڑھ کر بہت آہستگی سے اس نے ورشا کے بازو پکڑے تھے۔

اس کو احساس ہوا یہ درست نہیں ہے۔

وہ ذہنی پستی کا شکار رہتا تھا۔

وہ اُسے دیکھے بنا سرعت سے باہر نکل گیا تھا۔

☆☆☆

اس کی وہ حرکت بالکل غیر ارادی و بے اختیاری تھی۔ وہ فوراً ہی وہاں سے چلا آیا تھا لیکن دل و دماغ پر ابھی بھی ایک مدہوشی چھائی تھی۔ اس نے ستون سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں اور گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ جیسے اندر کی یکلخت جاگ اٹھنے والی گرمی حرارت کو ٹھنڈی ہوا کے ذریعے خارج کر رہا ہو۔ جو فطرتاً آزاد خیال و بے باک طبیعت کا مالک تھا۔ دوران تعلیم اس کی بے شمار لڑکیوں سے دوستی رہی تھی، جن کے ساتھ وہ بے باک انداز میں ملتا تھا کیونکہ وہ لڑکیاں بھی ایسے ماحول کی پروردہ تھیں جہاں ایسی بے باکیوں کو آزاد خیالی سمجھا جاتا تھا جن کا تصور بھی عزت دار گھرانوں میں معیوب تھا۔ اس کی وجاہت پر مرمٹنے والی کچھ لڑکیاں اس کے ایک اشارے پر اپنا آپ وار دینے کو تیار رہتی تھیں۔ مگر اس نے اخلاقیات کی حدود کو پار کر کے پستی کی جانب ایک قدم بھی کبھی نہیں بڑھایا تھا۔ اس حد پر اس کا کردار مضبوط ترین رہا تھا۔

لیکن آج.....

اس پر منکشف ہوا، وہ لڑکی دل کی گہرائیوں میں بس گئی ہے، روح میں اتر گئی ہے۔

اضطرابی انداز میں اس نے بالوں میں انگلیاں پھیری تھیں۔

صارم خان آفریدی! ایک دم ہی حواس گنوا بیٹھے۔ تمہاری خودداری، وقار وانا، شجاعت ومردانگی یہیں تک ہے؟ تمہاری زندگی میں آنے والی پہلی لڑکی تھیں ہے یہ، قبل اس کے بھی ان گنت ملکی وغیر ملکی شوخ وچنچل حسینوں، مہ جبینوں، نازنینوں اور دلربائوں کے جھرمٹ میں تم نے وقت گزارا ہے۔ پھر اس بے ساختہ حرکت پر تم اس قدر نادم ومضطرب سے کیوں ہو؟''

کیا وجہ ہے؟

کیسا اسرار ہے؟

کیوں بے چین ہو؟

اس کے اندر جیسے کوئی سرگوشیاں کرنے لگا اور اس کے اندر بے قراری حد سے سوا ہو گئی۔

''نہیں..... نہیں، میں حواس گنوا نہیں بیٹھا، بلکہ وہ جو غیر ارادی وخود ساختہ فعل سرزد ہوا اس پر مجھے ندامت وشرمندگی کا احساس بے کل کر رہا ہے۔ بے شک میری زندگی میں بے شمار رنگین چہرے آئے ان کے ساتھ میں نے وقت گزارا مگر اس انجوائے منٹ میں وہ لڑکیاں بھی برابر کی حصے دار تھیں۔ ان کی مرضی، ان کی خواہش میرے حوصلے بڑھا گئی تھی۔ ورشا آفریدی، میرے لیے از حد معتبر وباعزت ہے اور میری زندگی میں آنے والی وہ واحد لڑکی ہے جس کو میں زوج کی تمام پاکیزگی کے ساتھ چاہتا ہوں اور جس کو چاہا جاتا ہے اسے رشتوں کی نسبت سے اعلیٰ اور اونچی مسند پر بٹھایا جاتا ہے کہ اس پر اٹھنے والی ہر نظر پاکیزہ واحترام سے لبریز اٹھتی ہے۔ وہ شبنم کے پہلے قطرے کی طرح پاکیزہ ہوتی ہے۔''

سورج کی پہلی شعاع کی طرح اجلی

چاند کی اول کرن کی طرح روشن

کلیوں کے تبسم کی طرح معصوم ہوتی ہے

''ہا..... ہا..... یہ جاننے کے باوجود بھی کہ وہ تبریز خان کے قاتل کی بہن ہے؟'' اس کے اندر بھی جیسے عدالت کا سماں تھا۔ وہ گویا کٹہرے میں کھڑا اپنا دفاع کر رہا تھا۔

''تم اس سے محبت کرتے ہو؟ تبریز خان کے قاتل کی بہن سے؟''

اس کے اندر جیسے کوئی بار بار ہرانے لگا تھا۔ استہزائیہ انداز میں۔

''اوہ..... تبریز خان.....'' وہ یکدم ہی خواب سے جیسے جاگا تھا۔

وہ درد جو اس کے پہلو میں کچھ مدھم ہوا تھا، دوبارہ جاگ اٹھا۔ چند لمحات قبل جو اس کی کیفیت تھی اس سے وہ باہر نکل آیا۔ کسی ردی کے بیچے پرانے اوراق کی مانند اس نے ان خیالات ومحسوسات کو جھٹکا تھا جنہوں نے چند لمحات قبل اسے اپنی گرفت میں لے کر ارد گرد سے بیگانہ کر دیا تھا۔

☆☆☆

''اے بی! میں مرگئی..... اوئی میرا دل قابو میں نہیں آرہا۔'' بوا جو دروازے پر دستک سن کر گئی تھیں، واپسی میں ان کی حالت غیر تھی۔ چہرے کی رنگت سرسوں بنے کے پھول کی طرح زرد، آنکھوں میں خوف کے سائے۔ وہ لرزتی ہوئی بھاگی چلی آئی تھیں اور دل پکڑ کر گرنے کے سے انداز میں بیڈ پر دراز ہوئی تھیں۔

''کیا ہوا بوا..... خیریت تو ہے؟'' کائنات جو ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی بال سنوار رہی تھی، انہیں بدحواس و خوفزدہ انداز میں آتے دیکھ کر گھبرا کر کھڑی ہو کر استفسار کرنے لگی۔

''جس کا ڈر تھا وہی ہوا..... آ گیا نا، دوزخ کا داروغہ پیغام لے کر..... ہائے ہائے اب کیا ہوگا؟ بھائی صاحب بھی گھر میں نہیں ہیں۔''

''کیا..... کون آیا ہے؟'' وہ قریب آ کر متوحش انداز میں بولی۔

''وہی..... جس کا خدشہ تھا..... اے بی! کتنا کہا تم سے، یہ جگہ چھوڑ چلو، ہر جگہ ہر کوئی نہ رہ سکتا۔ کوئی کوئی جگہ موافق آتی ہے بندوں کو۔'' بوا کا انداز ماتمی سا تھا۔ بس سینہ پیٹنے کی کسر باقی رہ گئی تھی۔

''اوفوہ..... کچھ بتائیں گی بھی یا یونہی بے ربط بولتی رہیں گی؟'' ان کی خودکلامی پر وہ جھنجلا کر گویا ہوئی تھی۔

''ارے وہی ہے، آگ کے گولوں کی مانند آنکھوں والا۔'' بوا کی دہشت و وحشت میں سرمو فرق نہ آیا تھا۔

''اوہ..... شمشیر خان آیا ہے کیا؟'' وہ چونک کر گویا ہوئی۔

''وہ نہیں اس کا گارڈ ہے، کہہ رہا ہے اپنے مالک کا کوئی پیغام لایا ہے۔''

''حد ہوگئی بوا! آپ سے بھی ایسے ڈر کر بھاگی آئی ہیں کوئی جیسے غیر انسانی مخلوق کو دیکھ لیا ہو۔ اسے ڈرائنگ روم میں بٹھایا یا ایسے ہی باہر چھوڑ کر آگئی ہیں؟'' وہ جلدی سے بالوں کو لپیٹ کر بینڈ میں ٹھونستی ہوئی مسکرا کر بولی اس کے چہرے پر قدرے اطمینان جھلکنے لگا تھا۔

''جا کہاں رہی ہیں آپ؟'' وہ اسے دوپٹہ شانوں پر ڈالتے دیکھ کر حیرانگی سے استفسار کرنے لگیں۔

''معلوم کروں نا جا کر وہ کس کا پیغام لایا ہے اور کیوں لایا ہے؟''

''اے بی بی، کچھ ہوش کی دوا کرو، لو بھلا تم چلی ہیں اس مسٹنڈے سے پیغام وصول کرنے، یہ بال میں نے دھوپ میں سفید نہیں کیے بی، انسانوں کو سمجھنے، نگاہوں کو پہچاننے کا خوب تجربہ رکھتی ہوں۔ یہ لوگ نیت کے کھوٹے ہیں، مجھے بڈھی کھوسٹ کو بے حیائی سے دیدے پھاڑ پھاڑ کر گھور رہا تھا، تو تم..... نہیں بی، میں آپ کو جانے نہیں دوں گی، موئے کمبخت کی آنکھوں میں جہنم دہکتا ہے۔'' بوا نے عزم سے ہاتھ پھیلا کر اس کی راہ میں حائل ہوئی تھیں۔

''کچھ نہیں ہوتا بوا جان، میں کوئی موم کا وجود نہیں رکھتی کہ اس کی نگاہوں سے پگھل جاؤں گی یا پانی بن کر بہنے لگوں گی۔ جب تک ہماری نیت سالم رہتی ہے دوسرے کی نیت کا کھوٹ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔'' وہ ان کو رسانیت سے سمجھاتی ہوئی گویا ہوئی۔ ان کی آنکھوں کا خوف، چہرے کی متغیر رنگت، دہشت سے کانپتے وجود کی لرزش نے اس کے لہجے کو نرم کر دیا تھا۔

بوا چند لمحے اسے بے بس نگاہوں سے دیکھتی رہیں کہ اس لمحے انہیں احساس ہوا وہ ان کی ملازمہ ہیں، ماں نہیں، بلاشبہ انہوں نے اسے ماں کی طرح چاہا، محبت دی، ممتا نچھاور کی، مگر سب کچھ کرنے کے باوجود وہ ملازمہ کے منصب سے ماں کے رتبے کا استحقاق و افتخار حاصل نہیں کر سکتی تھیں۔ یہ احساس کچھ اس برق رفتاری سے ان کے دل و دماغ پر حاوی ہوا تھا کہ یکلخت ان کے تنے ہوئے بازو شاخ سے ٹوٹی ٹہنیوں کی طرح بے جان سے انداز میں سائیڈوں میں نیچے گر گئے۔ چہرے پر افسردگی و حزن و ملال برسنے لگا تھا۔

''ٹھیک ہے بی بی، چلیں، لیکن میں ساتھ چلوں گی۔'' ان کے لہجے سے اضمحلال مترشح تھا۔ کائنات نے بغور ان کے چہرے کی رنگ دیکھی تھی۔

''بوا جان، آپ مائنڈ کر رہی ہیں، آپ خود سوچیں، بابا گھر میں نہیں ہیں، ہم دونوں کے علاوہ اور کون ہے گھر میں؟ بتائیں بوا جان، اس سے بات کرنا بھی ضروری ہے۔ بابا نے بتایا تو تھا ناں کہ کس مزاج کے ہیں یہ لوگ، ذرا بھی ان کے معاملے میں روگردانی برتی جائے تو زبان کے بجائے گولی سے وجہ دریافت کرتے ہیں۔'' کائنات نے ان کے گلے میں بازو ڈال کر اپنائیت سے کہا تو بوا جو دھوپ چھاؤں جیسے مزاج کی مالک تھیں فوراً ہی خوش ہو کر اپنی جون میں آ گئیں۔

''سلام بی بی صاب! شمشیر خان نے پیغام بھیجا ہے کہ آپ اپنا مطب چالو کر لو۔ ہمارا خان کوئی اعتراض نہیں کرے گا۔'' اسے دیکھتے ہی سمندر خان خاصے مہذب انداز میں اس سے مخاطب ہوا تھا حالانکہ حسب عادت اس کی نگاہوں نے مخصوص وارفتگی و ہوس سے اس کی صبیح چہرے کو گھورا تھا مگر کائنات کا سپاٹ چہرہ نگاہوں سے جھانکتے اعتماد و اطمینان نے اسے نگاہوں کے رنگ بدلنے پر مجبور کر ڈالا تھا۔

''کیوں..... میں اب کیوں اپنا کلینک اسٹارٹ کر لوں؟'' کائنات طنز آمیز لہجے میں استفسار کرنے لگی۔ بوا اس کے قریب کھڑی تھی۔ بہت چوکنا و ہوشیار انداز میں کہ کسی بھی لمحے ان کا ہاتھ پکڑ کر بھاگ اٹھیں گی۔

''اس لیے کہ یہ خان کا حکم ہے۔'' وہ دانتوں کی نمائش کر کے بولا۔

''خان ہو گا وہ تمہارا اور تم اس کا حکم ماننے پر مامور ہو گے، میں اب کلینک نہیں کھول سکتی، میرا اسٹاف جا چکا ہے، دوائیاں و دیگر ضروری اشیاء بھی نہیں ہیں اب، جا کر کہہ دو اپنے خان سے، میں اب کلینک نہیں کھولوں گی۔'' بالکل انوکھے و غیر متوقع پیغام نے یکلخت ہی اسے وہ تمام پریشانیاں و محنت کے زیاں کا احساس دلا دیا تھا جو کلینک یہاں کھولنے سے قبل اور بعد میں اسے، بوا، بابا اور اسٹاف کو اٹھانی پڑی تھیں۔ پھر وہ شخص کون ہوتا ہے؟ اسے ایسے احکامات کا پابند کرنے والا۔

''سوچ لو بی بی صاحب! ہمارا خان انکار سننے کا عادی نہیں ہے۔'' سمندر خان قدرے آگے جھک کر سخت دھمکی آمیز لہجے میں گویا ہوا۔

''اچھا..... اچھا میاں! اب تم جاؤ، جو تمہارا خان چاہتا ہے وہی ہو گا۔'' بوا فوراً ہی جلدی سے بول اٹھیں اور کائنات کو مزید بولنے کا موقع نہیں دیا تھا۔

''بوا آپ بھی کمال کرتی ہیں؟'' سمندر خان کے جانے کے بعد وہ خفگی سے بولی۔

''کمال کرنا ہی پڑتا ہے بی بی، دریا میں رہ کر مگر مچھ سے بیر باندھنا عقلمندی نہیں ہے۔'' وہ اسے تھامتی ہوئی اندر لے گئیں۔

☆☆☆

گل جاناں بہت حیرانگی سے بہن کو سامان باندھتے دیکھ رہی تھیں۔

''بے بے! یہ کہاں کی تیاری ہو رہی ہے؟'' وہ ان کے قریب بیٹھتے ہوئے بولیں۔

''کہاں کی تیاری ہو گی بھلا گھر جاؤں گی، ثمل آج کل میں گھر آ جائے گی۔ اگلی یونیورسٹی کی چھٹی کے ساتھ ہی ہاسٹل کی چھٹیاں بھی ہو جاتی ہیں۔'' وہ اپنے کپڑے اور کچھ تحائف جو گل خانم نے ان کو اور ان کی بیٹیوں کو دیے تھے سفری بیگ میں رکھتے ہوئے دھیرے سے ہنس کر بولی۔

''نہیں بے بے! ابھی میں آپ کو نہیں جانے دوں گی، بڑے خان آ جائیں تو ان سے بات کر کے جائیے گا۔'' وہ ان کے ہاتھ سے بیگ لے کر اپنے پاس رکھ کر اصرار سے بولی۔

''بات کیا کرنی ہے گل، وہ نہ معلوم کب آئیں، میں رک نہیں سکتی، میرے طرف سے دعا پہنچا دینا۔ ثمل کی عادت کو تو جانتی ہو تم، وہ اپنے سامنے مجھے ہر دم موجود دیکھنا چاہتی ہے۔'' بہن کی محبت کے احساس سے وہ ایک دم سرشار ہو گئی تھی۔

''ہاں، کیوں نہیں لیکن اسے اب تمہارے بغیر بھی تو رہنے کی عادت ڈالنی چاہیے۔'' وہ مسکرا کر معنی خیز انداز میں گویا ہوئی۔

''ارے وہ تو ہاسٹل میں بھی اپنے باپ کے خوف سے رہتی ہے، اگر باپ کے تعلیم دلانے کے جنون سے واقف نہ ہوتی تو کبھی نہ رہتی۔''

''ارے چھوڑیں بے بے! اپنی ایمل کا بھی یہی حال تھا، اب دیکھ لیں کیسے آپ کے بغیر رہ رہی ہے کہ نہیں۔ آپ سے ملنے بھی صبح شام تک کے لیے ہی آتی ہے۔''

''خیر...... یہ تو اللہ کا نظام ہے گل، وہ بندوں کو غیر محسوس طریقے سے خود ہی وقت اور حالات کا عادی بنا ڈالتا ہے اور اس کی شان ہے کہ محسوس بھی نہیں ہوتا۔''

گل جاناں کے لہجے میں چھپے طنز و کدورت کو محسوس کر کے لمحے بھر کو وہ بدگمان سی ہو گئی۔

''ہاں...... یہ بات تو ہے، اچھا تم جانے کا قصد کر بیٹھی ہو تو جا کر ہی چھوڑو گی۔ لیکن یہ بتا کر جاؤ اب کب گھر میں ملیں گے؟ تا کہ میں بڑے خان کو لے کر آؤں تو بات ہو سکے اور بے بے، اب میں اپنی بات منوا کر ہی اٹھوں گی۔''

''کیسی بات گل؟ صاف صاف کرو، کیوں پہیلیاں بجھوا رہی ہو؟''

گل جاناں کے میٹھے لہجے میں کچھ ایسا ہی چونکا دینے والا تاثر تھا۔ وہ جز بز ہو کر گویا ہوئیں۔

''او ہو، بے بے، بڑا آ گیا تمہارا...... لیکن تمہاری یہ بھولنے کی عادت نہ گئی۔'' ان کے انداز میں نخوت اور کچھ بے زاری پنہاں تھی۔

''ثمل کو شمشیر خان کے لیے مانگنے آؤں گی، اپنی بہو بنانا چاہتی ہوں اسے۔''

''ثمل کو نہیں، ایمل کو مانگا تھا تم نے، لیکن میں نے منع کر دیا تھا۔ ثمل کا جب کوئی ذکر ہی نہیں تھا۔'' وہ ان کو بغور دیکھتے ہوئے تحمل سے بولیں۔

''اب ذکر کر تو رہی ہوں بے بے، ایمل نہ سہی، ثمل تو میری بہو بن سکتی ہے۔ میرے لیے دونوں بھانجیوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ ایمل میرے بیٹے کے نصیب میں نہ تھی مگر ثمل تو اب میرے بیٹے کا بخت بن کر رہے گی۔'' وہ اٹل انداز میں بولی۔

گل صنوبر کو بہن کا بے مروت و ہٹ دھرم انداز قطعی نہ بھایا تھا، وہ سمجھ گئی تھیں، گل جاناں اب اپنی اصلیت یعنی ہٹ دھرمی، بدلحاظی و بے مروتی، بداخلاقی پر اتر آئی ہیں جو ان کے وجود کی شناخت بن چکی تھیں۔ اس لیے انہوں نے بھی دوٹوک بات کرنے کی ٹھان لی تھی کیونکہ ان کی معمولی سی بھی نرمی اور درگزر ان کی بیٹی کا مستقبل تاریک کرسکتی تھی۔

''یہ کس طرح ممکن ہے گل جاناں، جب بڑی بیٹی کا رشتہ میں نے نہ دیا تھا تو چھوٹی بیٹی کا کس طرح دے سکتی ہوں؟''

''کیوں..... کیا خرابی ہے میرے خوبرو جوان بیٹے میں؟'' وہ بل کھا کر گویا ہوئیں۔

''خرابی اس میں نہیں، ہم میں ہے۔'' انہوں نے بات ختم کرنے کی خاطر کہا۔

''نہیں بے بے، ایک بار اپنی عزت پر زد لگوالیا تھا میں نے لیکن اس بار میں خاموش نہیں بیٹھوں گی، آخر کیا وجہ ہے؟ کیوں میرے بیٹے کو رشتہ نہیں دے رہیں، وہ بدصورت ہے، اپاہج نکما ہے، دولت و جائیداد کا مالک نہیں ہے؟ آخر کیا برائی ہے میرے بیٹے میں بے بے.....؟''

''بات کو مت بڑھاؤ گل! اپنے باغ کے پھل کے داغ بھی کبھی نظر آتے ہیں؟ وہ تمہارا بیٹا ہے ہر ماں اپنی اولاد کے عیب و ہنر سے واقف ہوتی ہے۔ شمشیر کا کردار کیسا ہے، اس سے تم بھی واقف ہو اور میں بھی اور صاف بات یہ ہے کہ بیٹیوں کے معاملے میں رشتے بہت سوچ سمجھ کر طے کیے جاتے ہیں۔ یہ ساری زندگی کا معاملہ ہوتا ہے، جان بوجھ کر کوئی اپنی بیٹی کو کنوئیں میں دھکا نہیں دیتا گل.....؟''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟ میرے گھر میں بیٹھ کر میرے ہی بیٹے پر کیچڑ اچھال رہی ہو؟ واہ بھئی واہ! میرا بیٹا جو بھی کرے کوئی اس کی طرف انگلی نہیں اٹھا سکتا۔ وہ مرد ہے۔ پہلے اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھو، تمہاری بیٹیاں دوسرے شہروں میں کیا کیا گل کھلا رہی ہیں، پڑھائی کے بہانے لڑکے پھانس رہی ہیں۔'' وہ بلا لحاظ و مروت چیخ چیخ کر بولنے لگیں، ان کی بادامی آنکھوں میں بہن کے لیے کوئی محبت و عزت نہ تھی۔

''گل! خدا کا خوف کرو کیوں بہتان باندھ رہی ہو میری بچیوں پر.....''

''ارے واہ! اپنے پر آئی تو کیسے لگی؟ اپنی اولاد سے بڑھ کر عزیز کوئی رشتہ نہیں ہوتا۔ تم سمجھتی ہو تم سے کوسوں میل دور رہتی ہوں تو مجھے تمہاری کوئی خبر نہیں ملتی، اس خیال میں نہ رہنا، رتی رتی خبر رہتی ہے مجھے۔''

''پھر کیوں میری بدچلن لڑکی کو بہو بنانا چاہتی ہو؟'' گل صنوبر تپ کر بولیں۔

''میں تمہاری طرح بدلحاظ اور بے مروت نہیں ہوں بے بے! اپنے ہی اپنوں کو سمیٹتے ہیں اب جیسی بھی ہیں وہ میری بہن کی بیٹیاں ہیں، اس لیے مجھے عزیز ہیں۔''

''نہیں، معاف کرو بھئی اپنی محبت کو، میری بیٹی تمہاری بہو کبھی نہیں بنے گی۔ آنکھوں دیکھی مکھی کوئی نہیں نگلتا، ایک تو تمہارا مزاج، دوسرے تمہارے بیٹے کے کرتوت، میری بیٹی تو جیتے جی جہنم رسید ہو جائے گی۔ میں اپنے ہاتھ سے اس کا گلا گھونٹ کر مار سکتی ہوں مگر تمہاری بہو نہیں بناؤں گی۔ کان کھول کر سن لو، آج بھی اور دس سال بعد بھی میرا یہی فیصلہ ہوگا۔''

گل صنوبر کی برداشت ختم ہوگئی تو وہ بھی بھڑک کر گویا ہوئیں۔

''سوچ لو بے بے، ایسی باتوں سے دلوں میں فرق آجاتا ہے اور اگر دلوں میں فرق آجائے تو رشتے بھی ثابت نہیں رہتے۔'' گل جاناں کھڑے ہو کر پھنکاریں۔

''تم نے ہی ابھی کہا تھا کہ اپنی اولاد سے بڑھ کر کوئی رشتہ عزیز نہیں ہوتا، جس طرح تم کو اپنی اولاد عزیز ہے اسی طرح مجھے بھی اپنی اولاد بہت پیاری ہے۔''

''دکھادیا ناں تم نے اپنا سوتیلا پن! ہونہہ!..... اگر میری سگی بہن ہوتی تو اس طرح سلوک کرتی میرے ساتھ، چلی جاؤ یہاں سے۔ آج سے میں تمہارے لیے مر گئی اور تم میرے لیے اب کوئی تعلق نہیں رکھنا مجھ سے۔''

ان کا غصہ انتہا کو پہنچ گیا تھا۔ اپنے خوبرو بہادر بیٹے کا بار بار ٹھکرائے جانا انہیں ایک آنکھ نہیں بھایا۔ از حد سنگدلی و سفاکی سے انہوں نے فیصلہ سنا ڈالا تھا۔ گل صنوبر چند لمحے ان کے بگڑے چہرے کو دیکھتی رہیں۔ وہ اس بات سے بے خبر تھیں کہ گل جاناں اپنے سگے سوتیلے پن کا زہر بھرے بیٹھی ہیں۔

وہ گل جاناں کے والد کی پہلی بیوی سے تھیں۔ جن کے انتقال کے بعد انہوں نے گل جاناں کی والدہ سے شادی کی تھی اور شادی کے دو سال بعد گل جاناں پیدا ہوئی تھیں۔ انہوں نے ہمیشہ انہیں سگی بہن سمجھا بلکہ گل سے بڑی گل تاباں کو بھی انہوں نے کبھی سوتیلا نہ سمجھا تھا۔ اس لمحے جیسے ان کی عمر بھر کی محبت و ریاضت مٹی میں مل گئی تھی۔ انہوں نے خاموشی سے سامان اٹھانا شروع کر دیا۔ آنسو بہت آہستگی سے ان کی آنکھوں سے بہنے لگے تھے کہ دل پر لگنے والی چوٹ بہت کاری و بھرپور تھی۔

☆☆☆

''صارم! اب تو میرا بازو کافی بہتر ہے، تم حویلی چلے جاؤ، میں شام تک چلا جاؤں گا۔'' گلریز خان ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد صارم سے مخاطب ہوا جو خاموش بیٹھا چائے کے سپ لے رہا تھا۔

''کیوں..... تم کیوں بعد میں آؤ گے؟ ساتھ چلو، بابا جانی اور آغا جان تمہیں نہ ساتھ دیکھ کر متفکر ہوں گے۔'' اس نے سنجیدگی سے کہا۔

''میں شام تک آجاؤں گا تم کوئی بھی بہانہ کر دینا۔''

''تم شام تک کیوں آؤ گے؟'' صارم نے بغور اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''بھاگ کر رہا شکار ٹھکانے لگا کر ہی آؤں گا۔'' وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔ صارم کو یکدم ہی وریشا کا خیال آیا۔ وہ ان الجھنوں میں اس کے ذہن سے محو ہو گئی تھی۔

''مثلاً کس طرح ٹھکانے لگاؤ گے؟''

''چھوڑو مت پوچھو، ورنہ تمہارے اندر کا تعلیم یافتہ و مہذب انسان جاگ اٹھے گا۔'' گلریز استہزائیہ انداز میں دھیرے سے ہنس کر گویا ہوا۔

''انسان ہونے کے علاوہ غیر تعلیم یافتہ اور غیر مہذب تم بھی نہیں ہو گلریز خان.....!'' صارم ناگواری سے اس کی جانب دیکھتا ہوا گویا ہوا۔

''لیکن تمہاری طرح تعلیم و تہذیب کا غلام بھی نہیں ہوں۔ ان چیزوں کا وہیں استعمال کرتا ہوں جہاں ان کی ضرورت ہوتی ہے۔''

''فی الوقت میں ان باتوں پر بحث کرنے کے موڈ میں نہیں ہوں۔''

''جبھی کہہ رہا ہوں تم گھر چلے جاؤ، میں کام ختم کر کے طور خان کے ساتھ آ جاؤں گا۔'' گلریز بدستور اسی ضدی انداز میں کہہ رہا تھا۔

''نہیں، ایسا ممکن نہیں ہے۔ میں نہیں جاؤں گا اور نہ تمہیں کوئی غیر انسانی عمل کرنے دوں گا۔ خود سوچو گلریز ہمیں ایسے کام کی تربیت نہیں دی گئی۔'' وہ کھڑا ہو کر فیصلہ کن انداز میں بولا تھا۔

''ایک بات بتاؤ؟'' گلریز کی نگاہیں بہت گہرائی سے اس کے چہرے کا جائزہ لے رہی تھیں جیسے وہ کچھ کھوجنا چاہ رہی ہوں۔

''ہاں..... ہاں پوچھو، کیا پوچھنا چاہ رہے ہو؟'' اس کے انداز سے ہی صارم بھی چوکنا ہو گیا تھا۔

''وہ لڑکی..... تمہیں پسند آ گئی ہے؟''

''کیسی باتیں کر رہے ہو گلریز، دماغ درست ہے تمہارا؟'' وہ جزبز ہو کر گویا ہوا۔

''مجھ سے کچھ چھپانے کی کوشش مت کرنا صارم خان!'' وہ سنجیدگی سے بولا۔

''فضول بکواس مت کرو، بہتر یہی ہے اس لڑکی کو چھوڑ دو اور حویلی چلو۔ نا معلوم کیا ہو گیا ہے تمہیں، ہر وقت بے مصرف سوچوں میں الجھے رہو گے تو ایسے ہی فضول خیالات ذہن میں آئیں گے۔''

''مجھے تو کچھ نہیں ہوا لیکن تمہاری طرف سے میں مطمئن نہیں ہوں۔'' گلریز خان کا لہجہ بدستور تھا۔ وہ ابھی بھی جانچتی، ٹٹولتی نگاہوں سے صارم کے چہرے کا جائزہ لے رہا تھا۔

''اگر تم مجھے مطمئن دیکھنا چاہتے ہو گل خان تو اس لڑکی کو چھوڑ دو۔''

''کیوں، آخر کیوں؟ میں یہی تو پوچھنا چاہتا ہوں، تمہیں اس لڑکی سے اس قدر ہمدردی پیدا کیوں ہو رہی ہے؟'' وہ اس کی بات قطع کر کے جھنجلاہٹ بھرے انداز میں گویا ہوا تھا۔ صارم کے قطعی انداز نے اس کو پیچ و تاب میں مبتلا کر ڈالا تھا۔

''اس لیے کہ وہ لڑکی ہے اور.....''

''لڑکی ہے تو کیا ہوا، دشمنوں کی لڑکی ہے، اگر تمہیں اس لیے شرمندگی ہو رہی ہے تو تمہیں شرم سے ڈوب مرنا چاہیے کہ تم سبریز خان کے قاتل کی بہن کے ساتھ ہمدردی کر رہے ہو، میں دشمن کے گھر کے کسی کتے کے ساتھ بھی رحم کرنے کا قائل نہیں ہوں۔ پھر یہ تو ایک لڑکی ہے۔'' گلریز نے تیزی سے اس کی بات قطع کر کے کہا۔

''پھر تو حقیقتاً میرے لیے ڈوب مرنے کا مقام ہی ہے کہ میں تم جیسے انسانیت سے عاری اور اخلاقیات سے نابلد شخص سے تعلق رکھتا ہوں۔ میرے نزدیک یہ انتقام نہیں سراسر بزدلی و حماقت ہے اور میں تمہیں ایسا ہرگز کرنے نہیں دوں گا۔'' غصے سے سرخ ہوتے چہرے پر عزم و یقین ثبت ہو کر رہ گیا تھا۔

''خان.....لڑکی نے ناشتہ کرلیا ہے۔'' اسی دم طور خان نے آ کر مسرت بھرے لہجے میں اطلاع دی تھی۔ صارم کے چہرے پر اطمینان کی ہلکی سی رمق ابھر کر غائب ہوئی تھی جبکہ گلریز کے چہرے پر طنزیہ و فاخرانہ مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔

''کب تک نہیں کرتی، بھوک بہت ظالم شے ہے، بڑے بڑے سورماؤں سے خود کو منوالیتی ہے۔ پھر وہ ایک نازک و کمزور جان رکھنے والی لڑکی ہے بھلا کب تک فائٹ کر سکتی تھی۔''

''درست کہتے ہو آپ خان!'' طور خان نے ناشتے کے برتن سمیٹ کر لے جاتے ہوئے تائید کی۔

''طور خان گیراج میں جو کار بند ہے اسے باہر نکال کر صارم کے حوالے کرو، یہ جائے گا میں اور تم معاملہ نمٹا کر ہی چلیں گے۔''

''کوئی ضرورت نہیں ہے طور خان، جا کر اپنا کام کرو میں نہیں جا رہا۔'' صارم خان سرد مہری سے گلریز کے حکم کو نظر انداز کر کے بولا۔ طور خان گومگو کی حالت میں وہاں کھڑا تھا کہ کس کا حکم مانے اور کس کا نہیں۔ حیثیت دونوں کی اس کے لیے اہم و یکساں تھی۔ گلریز کے ساتھ وہ اکثر و بیشتر رہتا تھا۔ اس کی تند مزاج و غصیلی ہٹ دھرم طبیعت سے بخوبی واقف تھا اور صارم خان کے متعلق بھی بخوبی جانتا تھا۔ گو وہ زیادہ عرصہ گاؤں سے باہر ہی رہتا تھا، تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے چھٹیوں میں بھی کبھی کبھار آتا تھا تو چند دن رک کر سبریز کے ساتھ غیر ممالک کے ٹور پر نکل جاتا لیکن اس کی حیثیت گلریز خان سے بلند تھی کہ وہ اپنے باپ کی چھوڑی ہوئی وارثت کا وارث اور ان کے بعد قبیلے کا سردار تھا۔ اس کی حیثیت و مرتبہ بلند تر تھا۔ وہ خود کو دوراہے پر محسوس کر رہا تھا پھر گلریز نے اسے جانے کا اشارہ کر کے اس کشمکش سے نکالا۔

''صارم.....! وہ لڑکی بہت حسین ہے، بہت دلکش حسن کی مالک ہے اور میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ حسن تمہاری کمزوری ہے۔ اگر تم ..... کچھ وقت اس لڑکی کے ساتھ گزارنا چاہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا لیکن اس لڑکی کو مرنا بہر طور پڑے گا۔'' وہ صارم خان کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا سفاکی سے گویا ہوا۔

''کیا ہوا.....اس طرح کیوں دیکھ رہے ہو؟'' اس کی آنکھوں میں پھیلتی ہوئی سرخی، چہرے پر پھیلتا آتشیں رنگ وہ یکلخت آتش فشاں بن گیا تھا۔

''تم.....تم اس قدر گھٹیا و عامیانہ سوچ رکھتے ہو مجھے معلوم نہیں تھا۔ مائی گاڈ.....کاش مجھے آغا جان کا خیال نہیں ہوتا تو میں تمہیں ایسی لغو بات کہنے پر قتل کر ڈالتا۔'' اس کے دھیمے سیدھے لہجے میں اس قدر تمسخر و تحقیر تھی کہ چند ثانیے گلریز خان جیسا ہٹ دھرم و زور آور شخص جھجک کر رہ گیا۔

''تمہیں معلوم ہے..... دنیا کا پہلا قتل کیوں ہوا؟'' گلریز خان سنبھل کر گویا ہوا۔

اس نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ غصے و جنون سے اس کی حالت بری تھی۔

''ایک لڑکی کی خاطر.....! سمجھے، ایک بھائی نے بھائی کو قتل، اس فتنہ یعنی لڑکی کے پیچھے ہی کیا تھا، اگر تم مجھے قتل کر ڈالو گے تو کوئی نئی بات نہیں ہوگی۔''

''گلریز خان! مرد بنو، مردوں کی لڑائی مردوں سے لڑا کرتے ہیں جو درمیان میں عورت کو گھسیٹ لیتے ہیں وہ میری نگاہوں میں مرد نہیں

ہوتے۔ ہمیشہ سے ہم لوگوں کو عورت کی عزت کرنے اور اس کی حرمت کی پاسداری کا درس دیا گیا ہے۔ مجھے اعتراف ہے کہ جنس مخالف سے میری دوستی رہی ہے میں ان کی کمپنی کو پسند کرتا ہوں لیکن ان دوستیوں کو حد سے تجاوز نہیں کرنے دیا۔ اپنی حیثیت، کردار، خاندانی وقار پر کوئی بدنما داغ لگنے نہیں دیا اور نہ ہی میرے نزدیک کبھی اتنی عامیانہ و غلیظ سوچیں بھٹکی ہیں۔'' اس نے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے تند لہجے میں کہا۔

''تمہارا مطلب ہے لڑکی کو ایسے ہی چھوڑ دیں؟''

''ہاں......!''

''اچھا...... میں تمہاری جذباتی بات مان لیتا ہوں لیکن اس لڑکی کو مرنا پھر بھی پڑے گا۔ کیوں کہ اغواء کی گئی لڑکی کی مثال اس پھلی کی سی ہے کہ جو خراب ہو جائے تو کوئی لمحہ بھر بھی گھر میں رکھنے کو تیار نہیں ہوتا اور باہر پھینکنے سے بھی گریز نہیں کرتا ہے۔ وہ یہاں سے بچ کر جائے گی وہاں اس کے باپ بھائی مار دیں گے۔''

''وہ ان کا در د سر ہو گا اس سے ہمیں کوئی غرض نہیں رکھنی چاہیے۔''

''اچھا تم کہتے ہو تو لڑکی کو چھوڑ دیتا ہوں۔ ایک گھٹیا لڑکی کی خاطر میں تم جیسے بھائی کو کھونا نہیں چاہتا، سیریز کو کھو دیا اب حوصلہ نہیں ہے۔'' وہ صارم کو سینے سے لگاتا ہوا گلوگیر انداز میں بولا۔

☆☆☆

''صمد خان...... !خان کدھر ہے؟'' سمندر خان نے جو ابھی گاؤں سے لوٹا تھا، ریسٹ ہاؤس کے باہر بیٹھے صمد خان کے قریب آ کر پوچھا۔

''کہاں ہو گا، پڑا ہے اندر......'' صمد خان اندر کی جانب اشارہ کر کے برا سا منہ بنا کر بولا۔

سمندر خان سے اس کی دوستی از حد گہری و مضبوط تھی۔ وہ شمشیر خان کی کبھی کبھار کی جانے والی زیادتیوں کو ایک دوسرے کو بتا کر دل کا غبار نکالا کرتے۔ اب بھی ایسا ہی تھا شاید، صمد خان جو کسی زیادتی کے باعث بھرا بیٹھا تھا۔ سمندر خان کو دیکھتے ہی ناراضگی بھرے انداز میں گویا ہوا۔

''او ہو، کیا ہوا خانان، جو شعلہ بنا بیٹھا ہے۔ خان نے حصہ نہیں دیا؟ تبھی اتنا خفا خفا لگ رہا ہے۔'' سمندر خان اس کی جانب بیٹھ کر معنی خیز سرگوشیانہ لہجے میں استفسار کرنے لگا۔

''بات نہیں کرو اس نیم (نام)......'' وہ کھسیا کر بولا۔

''ہوا کیا ہے؟ کچھ بتاؤ تو سہی۔ خان نے میرے متعلق تو معلوم نہیں کیا تھا دوبارہ؟''

''خان تمہارے متعلق کیا پوچھے گا، اسے اپنا ہوش نہیں تھا رات کو۔''

''اسے چیز بھی تو آفت ملا ہے یارا! بہت بھاگ دوڑ کے بعد ایسے چاند کے مافق چہرے والی لڑکی کو ڈھونڈا تھا جو نا جتنی بھی غضب کا ہے اور گاتی بھی قیامت ہے۔'' سمندر خان سینہ پھلا کر فخریہ انداز میں گویا ہوا۔

''جبھی ہم کو خان نے دودھ میں گرا مکھی کی موافق نکال پھینکا۔ ہمارا اوقات تو اس کتے کی موافق ہے جو مالک کے مزاج کا محتاج ہے۔''

''چھوڑ یار! کیوں دل خراب کرتا ہے، جب خان کا مزاج اچھا ہوتا ہے تو عنایتیں بھی خوب کرتا ہے۔ وہ اپنے مزاج کے مطابق چلنے والا آدمی ہے۔'' سمندر خان نے صمد خان کی رنجیدگی ختم کرنے کی غرض سے کہا۔

''ہاں..... اسی لیے تو یہیں پڑا ہے ورنہ شہر میں ہم کو اچھی نوکری مل سکتی ہے۔''

''رات کو کب آیا تھا خان..... اب واپسی کا کیا پروگرام ہے؟''

''صبح آیا ہے۔ جب سے پڑا سو رہا ہے۔ ابھی بتایا نہیں کہ کب واپس جائے گا۔ تم بتاؤ اس ڈاکٹرنی سے بات ہوگئی؟ کیا اس نے مطب کھول لیا؟''

سمندر خان کے سمجھانے بجھانے سے صمد خان کی آزردگی بہت حد تک دور ہوگئی تھی۔ سو وہ اب اطمینان سے بیٹھ کر اس سے بات کر رہا تھا اور ساتھ ہی گیٹ سے کچھ فاصلے پر چھوٹے سے ہوٹل پر قہوہ کا آرڈر بھی دے آیا تھا۔

''ہاں، وہ ڈاکٹرنی بڑے دماغ والی ہے، مان ہی نہیں رہی تھی۔''

''خان کا حکم نہیں مان رہی تھی..... تم نے اسے خان کا نہیں بتایا تھا؟'' صمد خان نے حیرانگی سے اس کی بات قطع کر کے استفسار کیا۔ وہ کبھی اس کے حکم سے روگردانی کا سوچ نہ سکتے تھے۔

ایک لڑکی کی جرأت اسے سچ مچ حیران کر گئی تھی۔

''ہاں، بتایا تھا..... تو وہ بولی، وہ خان ہوگا تمہارا.....''

''وہ لڑکی بولی؟ اگر خان نے سن لیا تو.....''

''تو خان کو کون بتا رہا ہے بے وقوف میں نے بھی دھمکی دے ڈالی، وہ لڑکی تو پھر بھی نہیں ڈری مگر اس کے ساتھ جو بڑھیا ہوتی ہے اس نے ڈر کر حامی بھر لی اور اسے اندر لے گئی وہاں سے میں یہاں چلا آیا۔''

''لگتا ہے خان کو وہ لڑکی پسند آگئی ہے اس سے پہلے تو اس نے کبھی اتنا احسان کسی پر نہیں کیا۔''

''لگتا تو مجھے بھی ایسا ہی ہے۔ واہ! کیا نصیب ہیں ہمارے خان کے بھی ایک دل میں، ایک محل میں.....'' دونوں نے ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر زوردار قہقہہ لگایا تھا۔

☆☆☆

شیر خان کا لایا ہوا ناشتہ اس نے خواہش کے باوجود واپس نہیں کیا تھا۔ اسے احساس ہوگیا تھا کہ صارم حد سے تجاوز کرسکتا ہے اور وہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ غیر دانستگی میں بھی ان کی کسی غیر ارادی جسارت کا شکار ہو۔ رات کو اس نے ٹھنڈے دل و دماغ سے اپنی حالت کا موازنہ کیا تھا۔ سوچ و افکار کے سمندر کی عمیق تہہ سے جو انکشاف و دانشمندی کا موتی اسے ملا، اس نے اس کی اوقات سورج کی روشنی کی طرح اس پر آشکار کر ڈالی تھی۔

گھر سے بھاگی ہوئی لڑکی اور اغوا کی ہوئی لڑکی میں سر مو فرق نہیں ہوتا۔ خربوزہ چھری پر گرے یا چھری خربوزے پر، بات ایک ہی ہے۔ بہر حال لڑکیاں دونوں صورتوں میں قابل قبول نہیں ہوتیں حالانکہ اغواء کی گئی لڑکی خود سے فرار ہونے والی لڑکی سے معصوم و بے خبر ہوتی ہے کیونکہ اس

میں اس کی رضا شامل نہیں ہوتی لیکن پھر بھی معاشرے میں اس کے لیے تنگ دلی کے رشتے پائے جاتے ہیں۔ وہ بھی اپنی مرضی وخوشی سے اغوا نہیں ہوئی تھی اور ان سے چھٹکارا پانے کے لیے وہ ہر ممکن کوشش کر چکی تھی جو بری طرح ناکام ثابت ہوئی تھی۔ رات کو صارم کی غیر ارادی حرکت نے اسے بری طرح سہما ڈالا تھا۔

اس کے جانے کے بعد کتنی دیر تک وہ اپنے دھک دھک کرتے بے قابو دل کو سنبھالتی رہی۔ بے شک جو بھی ہوا وہ بالکل بے ساختہ و بے اختیار انداز میں ہوا۔ جس پر صارم کے چہرے پر پھیلتے خجالت واز حد شرمندگی و بوکھلاہٹ کے رنگ اس نے واضح طور پر محسوس کیے تھے۔ وہ پھر رکا بھی نہیں تھا۔ فوراً ہی وہاں سے چلا گیا تھا اور ساتھ ہی اسے اپنے توانا و مضبوط وجود کا احساس بھی دلا گیا تھا۔

اور شاہ ساری رات خوف واندیشوں کی شاہراہ پر چلتی رہی۔ وہ مضبوط وجود رکھنے والا شخص جسے اپنی وجاہت اور کردار پر حد سے زیادہ ناز تھا۔ جس نے قدم قدم پر اس پر، اپنے جذبے لٹائے تھے۔ اپنی بے تابیاں ظاہر کرنا چاہی تھیں اس کی بھرپور نفرت وحقارت، تذلیل کے باوجود درگزر اور محبت سے نظر انداز کیا تھا پھر اس نے ایک دم سے ہی اپنی تمام بے عزتی کا بدلہ لینے کے لیے اس کو اغواہ کروالیا تھا اور اپنے ساتھی کے سامنے یوں پوز کیا تھا جیسے وہ اس کی حرکت سے واقف نہ رہی ہو لیکن اسے اپنی گرفت میں لانے کے باوجود، اپنے دام میں پھنسانے کے باوجود، شرافت کا چولہ پہنے ہوئے تھا اور اپنے اس گھٹیا طرز عمل سے انکاری تھا۔ اگر اس نے اپنی ظاہری شرافت وحمیت کا ملبوس اتار پھینکا تو؟ وہ کب تک مزاحمت کر سکتی ہے؟ اپنے بچاؤ کی کوئی ڈھال اس کے پاس نہ تھی۔ اپنی عصمت بچانے کے لیے ان کے پاس واحد راستہ یہی تھا کہ وہ خاموشی سے بلا چون وچرا اس کی بات مان لے اور وقت آنے پر اس سے بھرپور انتقام لے۔

بہت سوچ وبچار کے بعد اس نے صبح ناشتہ بہت خاموشی سے کیا تھا۔ ناشتہ کے نام پر چند لقمے زہر مار کیے تھے۔ وہ بھی حلق میں اسی طرح اٹک رہے تھے جیسے کسی عزیز کو دفنانے کے بعد کھانا حلق میں اٹک جاتا ہے۔ یہاں اسے بھی ایسا ہی لگ رہا تھا جیسے وہ خود کو دفنانے کے بعد کھانا کھا رہی ہو۔ ہاں وہ مر ہی تو گئی تھی۔ اپنے لیے بھی، گھر والوں کے لیے بھی۔

اپنے وجود کی آزردگی وشکادیا اور دادے کی یاد اس کی آنکھوں میں پانی بن کر بہنے لگی، بے بسی و درماندگی کے احساس نے گویا اسے آگ کے صحرا میں لا پھینکا تھا، دل میں لگی آگ کو سرد آنسوؤں کی نمی میں بجھاتی رہی۔

اس وقت بھی وہ گھٹنوں میں سر چھپائے اپنے دل کا بوجھ ہٹانا چاہ رہی تھی کہ معاً باہر سے کنڈی کھلنے کی آواز آئی۔ اس نے اپنی چادر درست کر کے دروازے کی سمت دیکھا۔ اندر آتے صارم خان سے بے ساختہ اس کی نگاہیں ٹکرائی تھیں اور اس نے فوراً ہی نگاہیں جھکالی تھیں۔ لیکن صارم کے لیے بیا ایک لمحہ ہی بہت تھا۔ اس کی بھیگی بھیگی آنکھوں میں جو تڑپ و بے بسی تھی وہ کسی تیز دھار آلے کی مانند اس کے دل کے اندر تراز و ہوتی چلی گئی۔ لمحہ بھر کے لیے وہ دم بخود سا کھڑا رہ گیا، کتنا تکلیف دہ ہوتا ہے اپنی عزیز تر ہستی کو رنجیدہ وآزردہ دیکھنا۔ اس وقت وہ جذباتی طور پر اس کے احساسات پر اس انداز میں اثر انداز نہیں تھی۔ جو جذبہ وہ اس کے لیے اپنے دل میں موجزن محسوس کرتا تھا کیونکہ اس وقت وہ شہریز کے قاتل کی بہن تھی جس سے نفرت نہیں تو محبت کا جذبہ بھی اس کے اندر موجود نہ تھا۔ اس وقت وہ صرف ایک لڑکی تھی۔ بے بس، مجبور دلاچار لڑکی جو جبراً اٹھا کر لائی گئی تھی۔

اس کے ساتھ کی گئی گھناؤنی حرکت کے باعث وہ اسکی ہمدردی و توجہ کی مستحق تھی۔ فی الوقت اس کا پیار، محبت، عشق سب سبریز خان کے ساتھ سو گیا تھا۔

''آپ..... رو رہی ہیں۔ کیوں؟'' وہ اس کے قریب قدرے جھک کر سنجیدگی سے گویا ہوا تھا لیکن اس کی خاموشی نے فوراً ہی اسے اپنے سوال کے بے معنی واحمقانہ ہونے کا احساس دلا دیا تھا۔ وہ ہونٹ بھینچ کر رہ گیا۔

''مجھے احساس ہے، آپ کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے جس کے لیے میں بے حد شرمندہ ہوں، میں آپ کو یہاں سے آزاد کر رہا ہوں، اس امید کے ساتھ کہ آپ ہماری اس غلطی کو معاف کر دیں گی، میں مانتا ہوں آپ کے ساتھ بہت ظلم ہوا ہے مگر اعلیٰ ظرف کے لوگ بڑے بڑے مجرموں کو معاف کر دیا کرتے ہیں۔''

وہ ٹھہر ٹھہر کر لفظ ادا کر رہا تھا۔ وجیہہ چہرے پر حقیقی شرمندگی و افسوس تھا۔

''میری سمجھ میں نہیں آ رہا، آپ نے ایسا کیوں کیا؟ اور اب مجھ سے معافی کے بھی خواستگار ہیں۔ میں آپ کے رحم و کرم پر ہوں آپ جو چاہیں مجھ سے مانگ سکتے ہیں، منوا سکتے ہیں۔ پھر التجائیہ انداز اور افسوس و دکھ، شرمندگی کس مقصد کے لیے؟'' وہ دوپٹے سے آنسو پونچھ کر بولی۔

''شاید آپ نے میری بات پر یقین نہ کرنے کا عہد کیا ہے۔ میرے بار بار کہنے، یقین دلانے کے باوجود آپ کی ایک ہی رٹ ہے۔ اس مقام پر مجھے ایک دانا کا قول یاد آ رہا ہے کہ وہم کا علاج حکیم لقمان بھی دریافت نہیں کر پائے تھے اور آج سائنس کامیابی و کامرانی کے باوجود اس خطرناک مرض کا علاج دریافت نہیں ہو سکا ہے اور یہ میری بدقسمتی ہے کہ اس لاعلاج مرض کی ایک مریضہ کو مجھے ہینڈل کرنا پڑ رہا ہے۔ آپ جلدی سے باہر آ جائیں میں باہر انتظار کر رہا ہوں، شام سے پہلے پہلے ہمیں یہ علاقہ چھوڑ دینا ہے۔''

وہ اسے حکم دیتا سرعت سے باہر نکل گیا۔ درشا کو پہلے تو یقین نہیں آیا کہ وہ یہاں سے آزاد ہو رہی ہے۔ خود صیاد اس کی آزادی کی بات کر رہا تھا پھر یکدم ہی پریشانی و بوکھلاہٹ کے نئے در وا ہو گئے تھے اسے یہ بھی اس کی کوئی چال لگ رہی تھی۔ سانپ کا ڈسا رسی سے بھی خوفزدہ ہو جاتا ہے بالکل اسی طرح جیسے انجانے میں کیے گئے ایک غلط طرز عمل کی سیاہی کسی نیک و پارسا شخص کی تمام زیست پر تاریکی مسلط کر دے۔ وہ بھی صارم کے خلوص و نیت پر شک کر رہی تھی۔

اس کی شخصیت، اس کا کردار، اس کا نام اس کے لیے شروع سے ہی ناپسندیدہ ترین رہا تھا اب تو وہ حقیقتاً اس کے لیے ناقابل بھروسہ و ناقابل یقین شخص بن چکا تھا۔

وہ اٹھتے اٹھتے بیٹھ گئی۔ عجیب کشمکش و پیچ میں پھنس گئی تھی۔

''صارم خان..... عورت اور ناگن پر کبھی یقین نہیں کرنا چاہیے۔ موقع ملتے ہی انسان کو ایسا ڈستی ہے کہ وہ پانی بھی نہیں مانگ پاتا۔'' گلریز خان نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر ہمدردی سے کہا۔ گو کہ اس نے درشا کو صارم کے جارحانہ تیور دیکھ کر زندہ چھوڑ دیا تھا لیکن اسپے اس عمل نے اس کے اندر بیزاری و غصہ بھر ڈالا تھا۔ اس کے اندر کی جھنجلاہٹ و غصے کا شکار بار بار طوفان بن رہا تھا۔

''گلریز......! ہم ہمیشہ وہ کاٹتے ہیں جو ہم نے بویا ہوتا ہے۔ گناہ انجانے میں ہو یا دانستہ، سزا و عذاب ضرور بھگتنا پڑتا ہے، ہمارے اعمال، ہمارے فعل، ضرور ہماری ذات کا اہم پہلو سنبھالے ہوتے ہیں۔ جہاں ہماری نیکیوں کو اجاگر کرتے ہیں وہاں برائیوں کو بھی ابھارتے ہیں۔ بعض اوقات تنہا آدمی کی جذباتی لغزش کئی نسلوں کو بھگتنی پڑتی ہے اور میں نہیں چاہتا میری آنے والی نسل میری کسی بداعمالی کی سزا بھگتے۔ میرے یقین و اعتماد کی عمارت میں تم پہلے ہی دراڑیں ڈال چکے ہو اگر اب مجھے یقین ڈانوا ڈول ہوا بھی تو میرے لیے نئی بات نہیں ہوگی۔ جس نے مجھے شاک پہنچے'' جواباً وہ بھی اس کے شانے پر ہاتھ رکھے ازحد سنجیدگی سے بولا۔

''حساسیت و جذباتیت کی اندھیری دنیا سے باہر نکل آؤ، خاقان، اس بے مہر و بے حس دور میں تم جیسوں کے لیے کچھ نہیں رکھا سوائے فریب و دھوکے کے۔''

''تم جاؤ..... میں اسے چھوڑ آتا ہوں۔'' صارم خان نے یکدم ہی موضوع بدل ڈالا تھا۔ گلریز نے اسے دیکھ کر ٹھنڈی سانس بھر کر نفی میں سر ہلایا تھا جیسے کہہ رہا ہو ''وہ اسے نہیں سمجھا سکتا۔''

''نہیں پہلے تم جاؤ، ہم بعد میں جائیں گے تم جلدی نکل جاؤ اسے حویلی تک چھوڑنے مت پہنچ جانا ورنہ سمجھ لینا ایسی قیامت آئے گی کہ کچھ نہیں بچے گا۔ میں اندر جا رہا ہوں۔ مجھے ڈر ہے اسے سامنے دیکھ کر کہیں میں اپنے عہد سے نہ پھر جاؤں۔'' وہ جلدی سے اندر بڑھ گیا۔ طور خان گیراج سے کار نکال کر کپڑے سے اس کی گرد صاف کر رہا تھا۔ کافی انتظار کے بعد وہ اس کے کمرے میں آیا اور اسے اطمینان سے بیٹھا دیکھ کر اس کا دماغ گھوم گیا۔

''میں نے آپ سے کہا تھا میں انتظار کر رہا ہوں باہر اور شام سے پہلے پہلے اس علاقے سے نکل جانا ہے۔ سمجھانے کے باوجود آپ سکون سے بیٹھی ہیں؟'' وہ سرد مہری سے گویا ہوا تھا۔ موڈ خاصا بگڑا ہوا اور خطرناک تیور تھے۔

''کہاں لے کر جائیں گے آپ مجھے...... ایک قید خانے سے دوسرے قید خانے......؟'' وہ کھڑی ہو کر تمسخرانہ انداز میں پوچھنے لگی۔

''ابھی کچھ دیر قبل میں نے آپ کو سمجھایا تھا کہ وہم و شک کا کوئی علاج نہیں ہوتا۔ ماسوائے اس کے کہ بندہ خود تو خبطی ہو اور اپنے ساتھ دوسروں کو بھی پاگل بنا ڈالے۔'' وہ تیز لہجے میں مخاطب ہوا تھا...... جبکہ درشہوار پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔

''پلیز...... میری بات سمجھنے کی کوشش کریں۔ اس وقت آپ کی ناز برداریاں اٹھانے کا ٹائم نہیں ہے میرے پاس اور نہ ہی کوئی ایسی اعلیٰ و معتبر شخصیت یہاں ہے جس پر آپ یقین کر سکیں۔ مجبوری ہے آپ کو مجھ پر اعتماد کرنا پڑے گا...... چلیں۔ آپ مجھے انتہائی قدم اٹھانے پر مجبور نہ کریں۔'' اسے دیکھ کر وہ غرا کر بولا کیونکہ وہ پہلے والے انداز میں بیٹھی تھی ذرا بھی ٹس سے مس نہ ہوئی تھی۔

''لیکن...... میں کس طرح یقین کر لوں کہ آپ میرے گھر لے کر جا رہے ہیں؟''

''اوہ...... اچھا آپ بتائیے آپ کو کس طرح آئے گا یقین؟ میں اسی طرح آپ کو یقین دلانے کی کوشش کروں گا۔'' وہ ایک طویل سانس لے کر اس بار ملائم و پرخلوص لہجے میں گویا ہوا۔ اس کی نیلگوں آنکھیں لمحے بھر کو اس کی چادر کے ہالے میں دمکتے چہرے پر پڑی تھیں۔ قبل اس کے کہ وہ کسی سرکش جذبے کے بہاؤ میں بہتا فوراً ہی اگلی طرف سے رخ موڑ کر کھڑا ہو گیا۔

ورشا اضطرابی انداز میں بار بار ہاتھوں کی انگلیوں کو ایک دوسرے میں پیوست کر رہی تھی۔ وہ فیصلہ نہ کر پا رہی تھی۔ اس کے ساتھ جانا سود مند رہے گا یا یہاں رہنا؟ لیکن یہ جگہ بھی اسی کی تھی وہ نہ یہاں محفوظ تھی اور نہ کہیں اور پھر اس پر اعتماد کرنا ہی ہوگا۔ اگر وہ کسی اور جگہ لے جانے کی کوشش کرے گا تو اپنی جان دے دے گی مگر اس کے مذموم عزائم پورے نہیں ہونے دے گی۔'' اس نے دل میں تہیہ کیا اور اس کے ساتھ جانے کو تیار ہو گئی۔

''ہو گیا فیصلہ؟'' اس نے مڑ کر اس سے دریافت کیا۔

''جی..... چلیں!'' اس نے چادر اپنے گرد لپیٹتے ہوئے مضبوط لہجے میں کہا۔

☆☆☆

گل صنوبر رنجیدہ و ملول سی صبح ہی روانہ ہو گئی تھیں۔ گل جاناں نے از راہ مروت بھی انہیں روکنے یا معذرت کرنے کی زحمت گوارہ نہیں کی تھی بلکہ بے حسی و خود پرستی کی انتہا تھی کہ وہ کسی پریشانی یا تاسف کا شکار ہونے کے بجائے اس بات سے خوش تھیں۔ انہوں نے بیٹے کو رشتہ نہ دینے کا انتقام لے لیا ہے۔

''چھوٹی مالکن.....! ڈرائیور منصور خان کے گھر سے اس کی عورت آئی ہے کہتی ہے وہ دو دن سے گھر نہیں پہنچا ہے۔'' ملازمہ نے آ کر اطلاع دی۔

''تو ہمیں کیا معلوم کہاں گیا ہے، بڑے خان رستم کے ساتھ شہر گئے ہیں۔''

''چھوٹی مالکن وہ کہتی ہے چھوٹی بی بی کو جہاز کے اڈے سے لینے گیا ہے۔''

''چھوٹی مالکن! ورشا.....؟'' وہ چونک کر بولیں۔

''آہو جی.....'' ملازمہ نے اثبات میں گردن ہلائی۔

''بلاؤ اسے.....'' ملازمہ فوراً ہی منصور خان کی بیوی کو بلا لائی۔ سرخ و سبز پرنٹ کی پشواز، سبز تنگ پائنچوں کی شلوار اور زرد شیشے کی کڑھائی کی چادر میں ملبوس سرخ و سپید چہرے والی وہ عورت خاصی ہراساں و پریشان سی اندر داخل ہوئی تھی۔ گل جاناں کو سلام کر کے دروازے کی چوکھٹ کے پاس ہی کھڑی ہو گئی تھی۔

''کون کہتا ہے؟ تیرا خاوند چھوٹی بی بی کو لینے جہاز کے اڈے پر گیا تھا؟'' وہ اپنی ترچھی نگاہیں اس کے چہرے پر گاڑھ کر سخت لہجے میں مخاطب ہوئیں۔

''وہ چھوٹی مالکن.....! اس کے پاس بڑے خان کا ملازم گیا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ بڑے خان کا کوئی ملازم چھوٹی بی بی کو کراچی شہر سے لینے گیا ہے ان کی پڑھائی ختم ہو گئی ہے۔ وہ شام کو جہاز کے اڈے پر پہنچ جائیں گے۔ منصور خان اسی وقت روانہ ہو گیا تھا اور مجھ سے کہہ گیا تھا کہ وہ آج رات دیر سے آئے گا۔ پھر وہ اس وقت سے ابھی تک گھر نہیں پہنچا۔''

''تم جاؤ، بڑے خان آ جائیں ان سے معلوم ہوگا کہ اصل معاملہ کیا ہے۔ بڑے خان آج رات تک آ جائیں گے۔'' وہ سلام کر کے ملازمہ

کے ساتھ واپس چلی گئی۔ نگل جاناں سوچ کے تانے بانے میں الجھ گئیں۔ منصور خان کی بیوی کی باتیں اسے درست لگ رہی تھیں کیونکہ ورشا تعلیم مکمل کر کے واپس آ رہی تھی۔ اس بات سے بہت کم لوگ واقف تھے کہ وہ تعلیم کی غرض سے کراچی گئی ہوئی ہے۔ خاص خاص رشتے دار اور چند ملازم اس حقیقت سے باخبر تھے۔ منصور خان کی بیوی کی اطلاع بالکل درست تھی۔ اب انہیں اس پریشانی و تجسس نے بے قرار و متجسس کر ڈالا تھا کہ وہ آئی تو کہاں گئی؟ ساتھ میں ملازم اور ڈرائیور دونوں ہی غائب تھے۔

''سلام چھوٹی ادے۔۔۔۔۔ کیا سوچ رہی ہو؟'' اسی دم دھم دھم کرتا شمشیر خان اندر آ کر اپنی بھاری و گونج دار آواز میں ان سے مخاطب ہوا۔

''اوہ۔۔۔۔۔ شمشیر خان آ گئے، کہاں چلے جاتے ہو؟ تمہارے آنے اور جانے کا کوئی وقت ہی نہیں ہے، تمہیں اپنی ادے کا بھی خیال نہیں ہے۔ گھر سے بغیر بتائے غائب ہو جاتے ہو۔'' وہ اچانک بیٹے کو سامنے دیکھ کر مسرت سے کپکپاتے ہوئے لہجے میں شکایت آمیز انداز میں گویا ہوئیں۔

''میں مرد بچہ ہوں ادے! کیا تمہاری طرح چوڑیاں پہن کر گھر میں بیٹھ جاؤں۔'' ماں کی محبت و شفقت کی شدتوں سے وہ بخوبی واقف تھا۔ اس لیے دھیرے سے مسکرا کر بولا۔

''ارے چوڑیاں پہنیں میرے بیٹے کے دشمن۔۔۔۔۔ میرا بچہ تو شیر ہے شیر۔۔۔۔۔!''

''بابا جان کہاں ہیں؟'' وہ بیڈ پر نیم دراز ہو کر استفسار کرنے لگا۔

''وہ شہر گئے ہیں، نئی فصل کی تیاریوں کے سلسلے میں، آج رات تک آ جائیں گے۔''

''شمشیر خان۔۔۔۔۔! میں نے ابھی ایک بات سنی ہے۔'' وہ اس کے نزدیک بیٹھ کر سرگوشیانہ انداز میں گویا ہوئی تھیں۔ ان کا انداز کچھ اپنے اندر اس قدر پراسراریت لیے ہوئے تھا کہ شمشیر خان جیسا بے پروا اور موٹے دماغ کا بندہ چونک کر سیدھا بیٹھ گیا۔

''ابھی تمہارے آنے سے پہلے ڈرائیور منصور خان کی بیوی آئی تھی وہ کہہ رہی تھی منصور دو دن سے گھر نہیں آیا۔'' وہ تفصیل سے اسے بتا کر بولیں۔

''کیا۔۔۔۔۔ کیا کہہ رہی ہو ادے، ورشا گھر نہیں آئی؟'' ان کی خلاف توقع وہ بھڑک کر کھڑا ہو گیا تھا۔ پرسکون چہرے پر یکلخت شعلے سے بھڑک اٹھے تھے۔ جن کا عکس آنکھوں میں سرخی بن کر چھانے لگا تھا۔

''آہستہ بولو خان! اس کی ماں سن لے گی تو جان کھا جائے گی، پہلے ہی کیا کم اس نے کان کھائے ہوئے ہیں۔''

''ڈرتا نہیں ہوں میں کسی سے، جب وہ یہاں نہیں آئی تو کہاں گئی؟''

''کہاں گئی؟ ارے اس لڑکی کے چلن تو پہلے ہی درست نہیں تھے بھاگ گئی ہوگی کسی چہیتے کے ساتھ، ہو نہ ہو گی نام روشن برادری، قبیلے کا۔''

''اگر ایسی بات ہوئی تو ادے، میں اسے زندہ زمین میں گاڑ دوں گا۔''

''کہاں جا رہے ہو؟'' وہ اسے طوفان کی طرح دروازے کی سمت جاتے دیکھ کر بولیں۔

''جا رہا ہوں میں، لے کر آؤں گا اسے چاہے اس کے لیے مجھے پہاڑ توڑنا پڑیں یا زمین کھودنا، میں اسے ہر طریقے سے ڈھونڈ نکالوں گا۔

اس نے شمشیر خان کی غیرت کو للکارا ہے۔" وہ دہاڑتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

اس کے چیخنے کی آوازیں پورے اندرونی رہائشی حصے میں گونج اٹھی تھیں۔

"نہیں شمشیر خان، میں تمہیں نہیں جانے دوں گی۔ تم پر ایسی لاکھوں بیٹیاں قربان کردوں، جانے دو اس بدذات کو۔ ایسی لڑکیاں بہت جلد برباد ہو کر باپ کی دہلیز پر آتی ہیں۔ وہ بھی جلد ہی آئے گی جب میں خود اپنے ہاتھوں سے اسے زندہ دفن کر ڈالوں گی۔ تمہیں کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اس کے گندے خون سے اپنے ہاتھ خراب کرنے کی۔" وہ تیز تیز چلتے ہوئے شمشیر کے پیچھے تقریباً بھاگ رہی تھیں مگر شمشیر خان کے اوپر خون سوار ہو چکا تھا۔ وہ شعلوں کی طرح دہکتا، بھڑکتا ماں کی گریہ وزاری سے بے نیاز آگے بڑھتے جا رہا تھا۔

اس کے قدموں میں جھک گل جاناں کی منت وسماجت کی آوازیں اور ان کے چوٹی میں بندھے گھنگھروں کی چھما چھم نے ایک عجیب سا شور فضاؤں میں پیدا کر دیا تھا۔ اتنے شور وغل کے باوجود کسی ملازمہ کی جرات نہ تھی کہ وہ آکر دیکھے یا معلوم کرے۔ شمشیر خان کی موجودگی میں ویسے بھی ملازم گھر کے کونوں کھدروں میں روپوش ہو جایا کرتے تھے کہ اس کے جلالی مزاج سے سب ہی خائف تھے۔

"مجھے مت روک اوبے، ورنہ میں خود کو گولی مار لوں گا۔" وہ مڑ کر قہر بھرے انداز میں گویا ہوا تھا۔ اس کی حالت کچھ ایسی تھی کہ وہ ساکت وجامد کھڑی رہ گئیں۔

☆☆☆

سبزے کے درمیان بل کھاتے سڑک پر کار دوڑ رہی تھی اگرچہ وقت دوپہر کا تھا مگر آسمان پر چھائے سیاہ بادل کے ٹکڑے سورج سے آنکھ مچولی کھیلنے میں مصروف تھے۔ کبھی سیاہ بدلی کے شریر ٹکڑے سورج پر چھا جاتے تو کبھی سورج ان کی گرفت سے آزاد ہو کر مسکراتا ہوا اپنی شعاعیں ہر سو لٹانے لگتا۔ دھوپ چھاؤں کا منظر جاری تھا۔

صارم ہونٹ بھینچے کار ڈرائیو کر رہا تھا۔ اس کے وجیہہ چہرے پر اس وقت از حد سنجیدگی تھی۔ پچھلی سیٹ پر ورشا چادر کو اچھی طرح لپیٹے بیٹھی سوچوں میں گم تھی۔ صارم نے دو تین بار مڑ کر اس کے چہرے پر نظروں کی گرفت کی تھی۔ ہر بار وہ نگاہیں جھکائے سوچوں میں مستغرق نظر آئی۔ اردگرد سے بے نیاز کسی اور ہی دنیا میں پہنچی ہوئی تھی۔

روانہ ہوتے وقت گلریز خان نے بار بار تاکید کی تھی کہ وہ اس سے ہوشیار رہے۔ اعتبار نہیں کرے اس پر اور اسے اس کی بچگانہ احتیاطوں پر ہنسی آرہی تھی۔ بھلا ایک کمزور سی لڑکی جو پہلے ہی خود پر بیت جانے والے سانحے کے باعث اپنے حال اور مستقبل سے خائف و پریشان تھی اور وہ کسی کو کیا زک پہنچا سکتی تھی؟ اور وہ بھی اس جیسے توانا و مضبوط شخص کو۔ اسے گلریز کے خیالات سے اتفاق نہیں تھا۔ وہ اس کے ساتھ خاموشی سے چلی آئی تھی۔ پھر کوئی تکرار و بحث نہیں کی تھی۔

صارم کو دو گھنٹے کے اس سفر میں اس کی خاموشی بری طرح کھل رہی تھی۔ وہ چاہتا تھا وہ کچھ کہے، کچھ بولے، چاہے اس کے منہ سے نکلنے والے لفظ شعلوں کی صورت میں ہوں۔ اسے ہر بات منظور تھی مگر خاموشی، اس کی خاموشی بڑی پر اسرار اور ایک انجانی اذیت سے دوچار کر رہی تھی۔

اس کے رگ و پے میں عجیب سے کھلبلی وسنسناہٹ دوڑا رہی تھی۔ بالکل اس ساحرہ کی مانند جو اپنے جادو کے سحر سے انسان کو مکھی بنا کر دیوار سے چپکا دے یا پھول بنا کر اپنے جوڑے میں سجا لے۔

''آپ، ناراض ہیں مجھ سے؟'' اس نے اندر کی وحشت سے گھبرا کر اسے متوجہ کیا۔

''ہاں ...... جی ...... نہیں نہ'' اس نے چونک کر سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

''پھر اس قدر خاموش کیوں ہیں؟''

''آپ کا خیال ہے، مجھے قہقہے لگانے چاہئیں۔''

''قہقہے ...... قہقہے تو میں نے آپ کو نارمل حالات میں لگاتے نہیں دیکھا۔ ان حالات میں آپ سے مسکرانے کی توقع بھی نہیں کی جاسکتی۔''

''پھر کیا چاہتے ہیں آپ؟'' انداز بالکل بیگانہ و سرد مہر تھا۔

''آپ جو سوچ رہی ہیں جو خوف ہے آپ کو، وہ آپ مجھ سے شیئر کریں، خوشیاں بانٹنے سے بڑھتی ہیں، دکھ کسی ہمدرد کو بتانے سے دل کا بوجھ ہلکا ہوتا ہے۔''

''بشرطیکہ کوئی ہمدرد ہو۔'' وہ لفظ ہمدرد چبا کر، جتا کر بولی۔

''یعنی آپ کے دل میں ابھی بدگمانی و بداعتمادی کی آلودگی موجود ہے۔ اوکے اس کثافت کو وقت ہی صاف کرسکتا ہے۔ میرا کہنا، میرا سوچنا، میری کوشش آپ کے لیے قابل قبول نہیں ہے۔ اس بے اعتمادی کا احساس مجھے رہے گا۔'' اس نے از حد سنجیدگی سے کہہ کر خاموشی اختیار کرلی۔

کار دل کش سبزہ زاروں و بلند و بالا پہاڑوں کے درمیان بنے راستوں سے گزر رہی تھی۔ ماحول میں ان خطوں کی مخصوص ویرانی و خاموشی پھیلی ہوئی تھی۔

ورشا گلاس ونڈو سے نظر آتے نظاروں کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے اندر ایک آگ سی بھڑک رہی تھی۔ یہ خیال شدت سے آرہا تھا کہ دو دن قبل ہی وہ ان راستوں سے گزرتے ہوئے کتنی خوش و مطمئن تھی۔ جلد از جلد راستوں کی مسافتیں سمٹ جانے کے انتظار میں بیٹھے ادے، سخاوید اور بابا جان، لالہ سے ملنے کی تڑپ۔

ادے کی ممتا بھری نرم و مہکتی آغوش میں سمانے کی مسرت۔

سخاوید کی محبت و خلوص بھری سنگت کی سرخوشی۔

لالہ کی مشفقانہ و از حد محبت و پذیرائی کا بھرپور احساس۔

بابا جان کے گرم و نرم مزاج کی شیرینی۔

راستہ طویل لگ رہا تھا، مگر اپنوں سے ملنے انہیں دیکھنے کی خوشی نے راستے کی طوالت کو خوشگوار بنا ڈالا تھا۔

اب بھی وہی راستہ ہے، اسے یقین آگیا تھا۔ وہ اسے گھر ہی لے کر جارہا ہے لیکن دو دن گھر سے باہر گزارنے کے بعد کون اسے گھر کی

دہلیز پار کرنے دے گا؟ وہ وہی تھی، ویسی ہی تھی، کلیوں کی طرح پاکیزہ، ستاروں کی مانند باعصمت و روشن، لیکن کون یقین کرے گا؟ وہ بے خطا ہو کر بھی مجرم تھی۔

''نہیں، مجھے پیاس لگ رہی ہے۔'' اس کے اندر باہر، ارد گرد ہر طرف آگ ہی آگ پھیل گئی۔ بے اختیار انداز میں اس نے صارم سے کہا تھا۔ اس نے کار روک دی تھی۔ ورشا بھی اس کے ساتھ ہی باہر نکل آئی تھی۔ سبزے کو چھوتی پھولوں سے مہکتی ہوا نے ان کا کھلکھلا کر استقبال کیا تھا۔

سیاہ بادل ہر سو چھائے ہوئے تھے جن کے باعث دن بھی ہلکے سیاہی مائل اندھیرے کی لپیٹ میں آ گیا تھا۔ ٹھنڈی مست ہوائیں گدگدا رہی تھیں۔ عجیب مدہوش و دلربا سا سماں تھا۔

''کہاں سے پانی پئیں گی آپ؟'' اس نے کچھ فاصلے پر کھڑی ارد گرد کا جائزہ لیتی ورشا کو دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔ کیونکہ یہ بہت سر سبز علاقہ تھا۔

یہاں سبزے، درختوں اور رنگ رنگ کے پھولوں کے علاوہ پھلوں کی بہتات تھی۔ جھرنے ہر چھوٹے بڑے پہاڑ کی کوکھ سے بہہ رہے تھے۔ قدرت کی صناعی کے حسین شاہکاروں پر نگاہ نہ ٹھہر رہی تھی۔

''وہاں سے.....'' اس نے ایک بلند و بالا پہاڑ کی طرف اشارہ کر کے کہا وہ پہاڑ بہت بلند تھا اور اس سے بہت تیزی سے ایک بڑا آبشار بہہ رہا تھا۔ صارم نے اس کی انگلی کی سمت دیکھا پھر مسکرا کر بولا۔

''آپ اتنے بلند پہاڑ پر چڑھ جائیں گی؟''

''میری زندگی کے گزشتہ سال ان پہاڑوں کے درمیان ہی گزرے ہیں۔'' وہ سپاٹ و تند لہجے میں گویا ہوئی اور تیزی سے اس طرف قدم بڑھا دیے۔

''او کے.....ایز یو وش.....!'' صارم شانے اچکا کر اس کے پیچھے چل پڑا۔

پھر آدھے گھنٹے کی مسافت انہیں طے کرنی پڑی۔ اس بلند و بالا پہاڑ کی چوٹی پر پہنچے میں، اوپر ایک دم سرخ سیب درخت پر لٹک رہے تھے۔ بہت خوبصورت پھولوں کے پودے وہاں نگاہوں کو خیرہ کر رہے تھے۔ صارم نے گہرا سانس لے کر تمام خوشبوؤں کو اپنے اندر سمویا تھا۔ ورشا بلندی سے پستی کا جائزہ لے رہی تھی۔ نیچے پھیلے درخت و پودے ننھے منے وجود میں ڈھلے ہوئے لگ رہے تھے۔ اس کے اندر کوئی غبار بڑھتا جا رہا تھا۔

''آپ پہلے پانی.....جلدی کیجیے، شام بڑھ رہی ہے، یہ دھند پھیلتی جا رہی ہے۔ جلد ہی رات ہو جائے گی۔'' صارم اسے گم صم دیکھ کر مخاطب ہوا اور خود جھک کر پانی کو دونوں ہاتھوں میں بھر کر پینے لگا۔ اسی دم وہ قیامت بن کر مڑی تھی اور پوری طاقت سے بے خبر صارم کو پہاڑ کی چوٹی سے دھکا دیا تھا۔ خاموش سناٹوں میں اس کی دلخراش چیخ گونج اٹھی تھی۔ وہ بے جان پتھر کی طرح لڑھکتا نیچے گہرائیوں میں گم ہو رہا تھا۔ ورشا کے فاتحانہ قہقہے فضا میں گونج رہے تھے۔

☆☆☆

صارم بے جان پتھر کی مانند نیچے کی جانب گرتا جا رہا تھا۔ ورشا اسے گرتے دیکھ کر ہذیانی انداز میں قہقہے لگا رہی تھی۔ اس کی نگاہوں میں وحشت رقص کر رہی تھی۔ ہونٹوں سے نکلتے قہقہے، آنکھوں سے بہتے آنسوؤں میں، اس وقت مکمل حواس باختگی و بیگانگی تھی۔

فضا یکلخت ہی ساکت ہوگئی تھی۔ سیاہ آسمان، بلند و بالا پہاڑ، اونچے، اونچے درخت، سبزے میں مسکراتے پھول، یکدم ہی گم صم ہو کر ایک عورت کے انتقام کو دیکھ رہے تھے۔

عورت کو ایثار و وفا کی دیوی ہے۔

مہرباں ہو جائے تو اپنا سب کچھ نچھاور کر دے۔

اپنا تن من وار کر مرد کے قدموں کی خاک بن جائے۔

خود تشنہ رہ کر اس کو سیراب کر ڈالے۔

خود شکستہ ہو کر اس کو فاتح بنا ڈالے۔

لیکن اگر کہیں اس کے اعتماد کو پامال کیا جائے۔ اس کی انا و نسوانیت کو مجروح کیا جائے تو ناگن سے زیادہ زہریلی، منتقم مزاج ثابت ہو۔

شیرنی سے زیادہ سفاک و بے درد۔

لومڑی سے زیادہ چالاک و عیار بن جاتی ہے۔ اس وقت ورشا بھی کوئی ظالم بدروح لگ رہی تھی۔ صارم لمحوں میں ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا لیا اور ہچکیوں سے اس کا جسم لرزنے لگا۔ صارم خان، میری زندگی میں خوشیوں کا فقدان اول روز سے رہا ہے۔ مسرتیں ہمیشہ میرا دامن چھوڑ کر آگے کی سمت بڑھ جاتی ہیں اور میں بچپن سے ان کے تعاقب میں رہتی ہوں۔ خوشیاں مجھے بھول جاتی ہیں۔ بلکہ نہیں، شاید وہ مجھے شناخت نہیں کرتیں، مجھے جانتی ہی نہیں۔ ایک طویل عرصے بعد ایک کٹھن و صبر آزما انتظار کے بعد۔ میں نے مسرتوں سے اپنا تعارف کرایا تھا۔ ان سے دوستی کرنے کی بھرپور سعی کی تھی۔ بہت محنت و جدوجہد کے بعد انہیں اپنے دامن میں لے کر میں نے گاؤں کا رخ کیا تھا لیکن تم نے ہاں تم نے میرے دامن سے خوشیاں چھین کر بدنامی و رسوائی کی سیاہی میرے چہرے پر مل دی ہے۔ اب میں کس طرح لوگوں کو منہ دکھاؤں گی کہ میرا دامن اجلا ہے، میرا آنچل بے داغ ہے لیکن لوگ میرا یقین نہیں کریں گے۔ میں کس کس کو بتاؤں گی کہ گھر سے تین دن اور دو راتیں باہر گزارنے کے باوجود میں شبنم کی طرح پاکیزہ ہوں وہ بہتے آنسوؤں کے ساتھ بڑبڑا رہی تھی۔

کاش، میں عام لڑکیوں کی طرح ہوتی۔ بزدل، بے ہمت، بے حوصلہ تو اپنے دشمن کو ختم کرنے کے بعد خود کو بھی ختم کر ڈالتی۔ مٹا دیتی اپنے وجود کو، فنا کر ڈالتی اپنے آپ کو لیکن، میں ایسا نہیں کروں گی۔ میں اپنی بے گناہی ثابت کراؤں گی۔ میں نے ایسی ذلت آمیز اور خاموش موت مرنے کے لئے تعلیم حاصل نہیں کی۔ میں بے حوصلہ نہیں ہوں۔ میں بے ہمت و بزدل نہیں ہوں، ہاں میں لوگوں کی چبھتی، کاٹتی، لہو لہو کرتی نگاہوں کا مقابلہ کروں گی۔ جو قصور میں نے نہیں کیا اس کی سزا کیوں بھگتوں؟

یکدم اس کے اندر پہلے والی ورشا بیدار ہوگئی جو حق پر مرنے، صداقت پر جان دینے والی تھی۔ جو شمشیر خان اور گل جاناں کی ہزار ہا مخالفت

وناپسندیدگی کے باوجود شہر گئی تھی۔ جس نے پہلی بار اکھڑ، بے مروت باپ کا فیصلہ اپنے لیے کرایا تھا۔

''دھیمی، دھیمی ہوا یکلخت ہی آندھی کی صورت اختیار کرنے لگی تھی۔ جس کے ساتھ موٹی موٹی بوندیں گرنے لگی تھیں۔ وہ سنبھل سنبھل کر پہاڑ سے نیچے اتر رہی تھی۔ چڑھتے وقت اسے کوئی خوف واندیشہ نہیں تھا۔ کیونکہ اس وقت اس کے اندر غصے اور انتقام کی آگ پوری شدت سے بھڑک رہی تھی۔ صارم سے بدلہ لینے کا فیصلہ وہ دو دن ریسٹ ہاؤس میں کر چکی تھی۔ راستے بھر اس کی نگاہیں بلند وبالا پہاڑوں کو جانچتی رہی تھیں۔ آخر کار اس کی نگاہ انتخاب اس پہاڑ پر اٹھی تھی کیونکہ یہ پہاڑ بہت بلند تھا اور اس کے اردگرد گہری کھائیاں بھی تھیں۔ وہ یہی چاہتی تھی کہ صارم کو اتنی ہی بلندی سے دھکا دے کہ اس کی ایک ایک ہڈی ٹوٹ کر بکھر جائے اور اس کا ٹوٹا پھوٹا وجود کھائیوں کی اندھیری تہوں میں گر کر گم ہو جائے۔ اسے یقین تھا صارم منع نہیں کرے گا۔ اس کی حسب توقع اس نے انکار نہیں کیا بلکہ بڑی مسرت سے اسے پہاڑ پر لے آیا تھا جیسے یہ اس کی بھی خواہش رہی ہو یا وہ اس کی خواہش نا لینے کی ہمت نہ رکھتا ہو۔ شاید اسی مقام پر آ کر وہ اپنی قلبی کیفیت سے مغلوب ہو گیا تھا۔ ورشا پہاڑ سے نیچے اتری تو آندھی تھم چکی تھی۔ البتہ بوندوں نے بارش کی صورت اختیار کر لی تھی۔ وہ حیران و پریشان کار کو دیکھ رہی تھی جو سامنے سے آ رہی تھی۔

☆☆☆

''گل......!'' یہ شور کیا ہے؟ کہاں جا رہا ہے شمشیر خان......؟''

گل خانم عصر کی نماز ادا کر رہی تھی۔ ان ماں بیٹے کے شور وغل کی آوازیں متواتر ان کی سماعت سے ٹکرا رہی تھیں۔ نیت بندھی ہونے کے باعث وہ فوراً نہ آ سکی تھی۔ سلام پھیرتے ہی پریشان وحیران سی وہ گل جاناں سے استفسار کرنے لگیں۔ پیچھے ان کے زرد چہرے، کپکپاتے جسم کو بمشکل سنبھالتی سجاویہ تھی۔ شمشیر خان کے غصے سے سب ہی خائف رہتے تھے۔ مگر سجاویہ کا تو خوف کے مارے دل بند ہونے لگتا تھا۔

''ہماری عزتوں کے جنازے نکلنے کا شور اور کیسا شور تھا۔'' وہ غرا کر پلٹی تھیں۔ ان کا لہجہ خونخوار و چنگھاڑتا ہوا تھا۔

''اللہ نہ کرے گل جاناں......! سوچ سمجھ کر بولا کرو۔'' وہ دہل کر پریشانی سے بولیں۔

''یہ تمہارا قصور ہے، بیٹیاں پیدا کی تھیں تو سوچ سمجھ کر کرتیں۔ اس سے تو بہتر تھا بانجھ ہی رہتیں، بتائے دے رہی ہوں اگر میرے بچے کو ایک خراش بھی آئی تو......'' انہوں نے گل خانم اور سجاویہ کو حقارت بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔ ان کے چہرے، لہجے سے تنفر اور تحقیر برس رہی تھی۔

''کیا ہوا ہے چھوٹی ادے؟ کوئی بات ہو گئی ہے؟ لالہ اتنے غصے میں کیوں گئے ہیں اور کہاں گئے ہیں؟'' سجاویہ کا دل نامعلوم وسوسوں و اندیشوں سے بیٹھا جا رہا تھا۔ بے نام سی بے کلی و اضطراب اس کے رگ وپے میں لحہ بہ لحہ سرایت کرتا جا رہا تھا۔ اس کے حواس پر پراسرار سائے رفتہ رفتہ پھیلتے جا رہے تھے۔

گل جاناں دوسروں کے احساسات سے بے بہرہ فقط اپنی سناتی جاتی تھیں۔ اپنے بڑھتے اضطراب، متوحش حالت پر قابو پانے کے لیے سجاویہ نے ہمت کر کے کہا۔

''اس بدچلن و آوارہ کی لاش لینے گیا ہے۔ مجھے پہلے ہی معلوم تھا بدکردار لڑکی نے اپنے باپ کے شملے کو ضرور ٹھوکر ماری ہوگی۔''

''کک..... کس کی بات کر رہی ہو گل؟'' گل خانم کا دل جیسے کسی نے یکدم ہی مٹھی میں لے کر بھینچ دیا ہو۔ باوجود کوشش کے وہ زبان کی لڑکھڑاہٹ پر قابو نہ پا سکی تھی۔ گل جاناں کی آنکھوں میں لکھی تحریر صاف عیاں تھی۔

''اسی کی جو پہلے ہی ہمارے چہروں پر کالک مل کر گاؤں اور حویلی کی دہلیز پھلانگ کر شہر گئی تھی۔ دیکھ لو کیسی اچھی و عمدہ تعلیم سیکھ کر آئی ہے کہ آتے ہی باپ بھائیوں کی ناک کاٹ دی۔ بھاگ گئی اپنے عاشق کے ساتھ.....''

''گل..... جاناں..... اللہ کے غضب سے ڈرو۔''

گل خانم کو لگا جیسے کسی آتش فشاں کے زیر سایہ آگئی ہو۔ ان کے رُوم رُوم میں دھماکے ہو رہے تھے۔ دل سوکھے پتے کی مانند کانپنے لگا تھا۔ آنکھوں کے اندھیرے کی دبیز چادر سی تن گئی تھی۔ بے ساختہ ان کے منہ سے چند جملے نکلے تھے۔

''میں کیوں ڈروں؟ جب تم ماں بیٹیوں کو خوف نہیں ہے۔ ہونہہ.....! اس کو کہتے ہیں دیدہ دلیری، میں تو کہتی ہوں، اس بدبخت، بے ہدایت کی لاش بھی دستیاب نہ ہو۔ میرے بچے کو اس بے حیا کے ناپاک گندے خون سے ہاتھ نہ رنگنے پڑیں۔''

گل جاناں ہاتھ پھیلا کر کوسنے دینے لگیں۔ گل خانم کے حواس اک دم ہی ساتھ چھوڑ گئے تھے۔ وہ تیورا کر فرش پر گری تھیں اور لمحے بھر میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گئی تھیں۔ سخاوہ بری طرح روتی ہوئی ماں کو ہوش میں لانے کی کوشش کر رہی تھی۔

''ہونہہ، ماں بیٹی سب ڈرامے باز ہیں۔'' وہ نفرت آمیز لہجے میں کہتی ہوئیں راستے میں گری گل خانم کو پھلانگ کر آگے بڑھ گئی تھیں۔

☆☆☆

سمندر خان، صمد خان کے ساتھ اخروٹ کے درخت کے نیچے بچھی چارپائی پر نیم دراز حقے سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ ساتھ ساتھ باتیں بھی کر رہے تھے کہ سامنے سے آتے شمشیر خان کو دیکھ کر ہڑبڑا کر کھڑے ہو گئے۔ ان کے چہرے پر یکلخت ہی پریشانی و بدحواسی چھا گئی۔ عموماً ایسا ہی وقت ہوتا تھا جب وہ شدید اشتعال میں ہوتا تو تمام ملازم مالک کے تعلقات ایک طرف رکھ کر چلا آتا تھا۔ اس وقت بھی انہیں یہی محسوس ہو رہا تھا کہ وہ از حد جنون میں ہے۔ اس کی بھاری چپلوں سے اٹھتے مٹی کے غبار جو اس کی ٹھوکروں سے اٹھ رہے تھے۔ سرخ آگ کی طرح دہکتا چہرہ، تنے عضلات، اکڑی چال اس کی حالت کو عیاں کر رہی تھی۔ سمندر خان نے، صمد خان کو اور صمد خان نے استفہامیہ نگاہوں سے سمندر خان کو دیکھا۔ جیسے ایک دوسرے کو تنبیہہ کر رہے ہوں کہ ہوشیار رہنا معاملہ گڑبڑ ہے۔

''سمندر خان..... ! اسلحہ اٹھاؤ اور چلو میرے ساتھ۔'' وہ قریب آ کر دہاڑا تھا۔

''بہتر خان.....!'' سمندر خان نے مودبانہ انداز میں کہا اور برق رفتاری سے صمد خان جیپ لے کر اس کے نزدیک آ گیا۔ وہ پھرتی سے اس میں سوار ہو گیا تھا۔ جیپ کی ڈگی کے نیچے بنے خانے میں جدید اسلحہ موجود تھا جو سمندر خان نکال کر سیٹ پر رکھ کر بیٹھ چکا تھا۔

جیپ تیزی سے حویلی کے رقبے سے دور نکل آئی تھی۔ دائیں طرف کھیت تھے، بائیں طرف شفاف پانی کا چشمہ بہہ رہا تھا۔ موسم نے

یکدم ہی پلٹا کھایا تھا۔ تیز ہوا چلنے کے بعد بارش برسنے لگی تھی۔ سیاہ بادلوں نے شام میں بھی رات کا اندھیرا پھیلا دیا تھا۔

صمد خان نے ڈرتے ڈرتے جیپ روک دی تھی۔ راستے کا اسے معلوم نہ تھا کہ وہ کہاں جانا چاہتا ہے۔ وہ خود میں اتنی ہمت نہیں محسوس کر رہا تھا کہ اس سے منزل کا معلوم کر سکے۔

''کیا ہوا، گاڑی کیوں روکی ہے؟'' حسب توقع وہ دھاڑا تھا۔

''خان۔۔۔۔ خان، آگے راستہ خراب ہے اور بارش میں پھسلن بھی بہت ہو جاتا ہے۔ ایسے میں گاڑی کھائیوں میں گر جانے کا خطرہ ہوتا ہے۔ آپ کہاں جاؤ گے؟''

سکندر خان متوجب وخیاں شاراندار میں گویا ہوا، صمد خان نے تشکر بھرا سانس لیا۔

''کہاں جانا ہے، مجھے کہاں جانا ہے؟'' وہ خود کلامی کے انداز میں گویا ہوا۔ اسے خود معلوم نہ تھا کہ وہ کہاں جائے گا، کس طرح ورشا کو تلاش کرے گا؟

وہ جذباتی آدمی تھا۔ فوراً ہی طیش وغضب میں آ جانا اس کی فطرت ثانیہ تھی۔ اب بھی یہی ہوا تھا۔ جس سالے وار انداز میں چھوٹی ادے نے ورشا کے فرار ہونے کی خبر اسے پہنچائی تھی وہ اسے پوری طرح بھڑکا گئی تھی۔ اس نے سوچ لیا تھا ورشا کو ڈھونڈ کر اپنے ہاتھوں سے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے گا۔ پورے خاندان و حویلی میں وہ واحد اسکی حریف رہی تھی۔ اس کی اس سے کبھی نہیں بنی تھی۔ سجاد یا اس کے آگے کبھی ٹھہرتی نہ تھی۔ خوفزدہ ہرنی کی مانند اس کے قدموں کی دھمک محسوس کر کے چھپ جایا کرتی تھی مگر ورشا وہ واحد لڑکی تھی جو اس سے کبھی خوفزدہ نہیں ہوئی بلکہ کئی بار اس کے مقابل بھی آئی اور آخر میں اس کی بھرپور مخالفت اور رکاوٹوں کے باوجود اسے شکست دے کر کراچی حصول تعلیم کے لیے چلی گئی اور یہی وہ گھڑی تھی جب اس کے خلاف اس کے دل میں نفرت پیدا ہو گئی تھی۔ بھائیوں میں سب سے چھوٹا ہونے کے باوجود حویلی میں ہمیشہ سے اس کی من مانی، حکمرانی چلتی تھی اور کسی نے بھی اس کے مقابل آنے یا اعتراض کی کوشش نہیں کی تھی۔ جو وہ چاہتا وہ حویلی میں، حویلی سے باہر ہوتا تھا۔ اس کی مرضی کے خلاف کوئی کچھ کرنے کی جرأت واستطاعت نہ رکھتا تھا۔ ورشا جو سب میں چھوٹی تھی اور لڑکی تھی، لڑکی جو اس قبیلے میں کوئی اہمیت واختیار نہ رکھتی تھی۔ اس نے پہلی بار بابا سے اپنے حق میں فیصلہ کروا کر اسے پہلی شکست سے دوچار کیا تھا وہ جب سے اسکے خون کا پیاسا ہو گیا تھا۔

پہلی فتح۔۔۔۔۔!

پہلی شکست۔۔۔۔

پہلی کامرانی

پہلی ہار۔۔۔۔

کوئی نہیں بھولتا، وہ جب سے اس موقع کی تاک میں تھا کہ ورشا کے خلاف ذرا کوئی ثبوت ملے اور وہ اپنی شکست کا بدلہ لے کر انتقام کی آگ بجھائے۔ انتقام جو اس کے شریانوں میں خون بن کر ہمہ وقت گردش کرتا تھا۔ جو ماں ایک دودھ کے ساتھ شیر خواری میں ہی پرورش پانے لگا تھا

جو اس کی عمر کے ساتھ ساتھ بڑھ کر پختہ ہوتا چلا گیا تھا اور آخر کار اس کی زیست کا حاصل بن گیا تھا۔ اس کو وراثت میں بھی انتقام ہی ملا تھا۔ جب بات بدلے سے، انتقام تک آجاتی ہے تو پھر ہر رشتے کی پہچان مٹ جاتی ہے۔ تب ایک ہی رشتہ چلتا ہے، یاد رہتا ہے۔

انتقام...... انتقام......

اس کے علاوہ کوئی جذبہ، کوئی رشتہ یاد نہیں ہوتا اور وہ بھی یہ بھول چکا تھا کہ ورشا اس کی بہن ہے، اسی کا خون ہے، وہ یہ سب بھول چکا تھا۔

''خان......! کوئی پریشانی ہے؟'' سمندر خان اسے خیالوں میں گم صم دیکھ کر گویا ہوا۔

''پریشانی...... نہیں، ہاں صمد خان، منصور خان کے ہاں چلو'' وہ سمندر خان کے سوال کو نظر انداز کر کے ایک نئے خیال کے تحت چونک کر گویا ہوا۔

ایک گھنٹے کی مسافت کے بعد جیپ منصور خان کے گھر کے باہر کھڑی تھی۔ سمندر خان اس کی بیوی کو بلا لایا تھا۔ اس نے وہیں عام سی بیٹھک میں شمشیر خان کو دیکھ کر سلام کیا اور خود پاس پڑی کرسی کو اپنی چادر سے صاف کرنے لگی۔

''خان یہاں بیٹھنے نہیں آئے ہیں جو پوچھیں اس کا جواب دے۔'' سمندر خان تحکم بھرے انداز میں اس سے مخاطب ہوا۔

''میرے تو بخت جاگ اٹھے ہیں لالہ، میرے جھونپڑے میں خان نے قدم رکھے ہیں۔''

''بس...... بس فالتو بات نہیں جو پوچھا جائے اس کا جواب دو۔'' اک دم شمشیر خان کھڑے کھڑے دہاڑا تھا۔ اس کی بھاری و سرد آواز سے مختصر ٹوٹے پھوٹے سامان والی بیٹھک گونج اٹھی۔ منصور خان کی ادھیڑ عمر بیوی یکدم ہی خوفزدہ ہو کر خاموش ہو گئی۔

''منصور خان کب سے گھر نہیں آیا اور گھر سے جاتے وقت کیا کہہ کر گیا تھا؟''

''منصور خان کو بڑے خان کا ملازم تربت خان بلا لے آیا تھا۔''

اس عورت نے ہدایت کے مطابق مختصر جواب دیا۔

''کیا کہہ کر گیا تھا وہ، کہاں جا رہا ہے؟''

''وہ کہہ رہا تھا کہ کراچی سے تربت خان ورشا بی بی کو لینے جا رہا ہے۔ وہ جلد ہی واپس آئے گا پھر ایک دن بعد بڑے خان کا دوسرا ملازم آیا اور کہا کہ شام کو جہاز کے اڈے پر جانا ہے، تربت خان اور ورشا بی بی آ رہی ہیں۔ وہ پیغام سنتے ہی چلا گیا اور مجھے کہہ کر گیا تھا کہ کھانا گھر آ کر ہی کھائے گا۔ آج تین دن ہو گئے خان نہ وہ خود آیا اور نہ ہی اس کی کوئی خبر ملی، ہر جگہ دیکھ آئی ہوں۔ وہ کہیں نہیں گیا۔'' وہ روتے بتانے لگی۔

''تو نے کتنے لوگوں کو بتایا ہے کہ منصور خان ورشا کو لینے گیا تھا؟''

شمشیر خان کا لہجہ دھیما تھا لیکن اس میں اتنی درندگی و سفاکیت تھی کہ منصور خان کی بیوی کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ وہ رونا بھول کر خوف سے اس کی شکل دیکھنے لگی۔

''کسی کو بھی نہیں خان۔''

''سچ سچ بتا، اگر تو نے جھوٹ بولا تو تیری گردن کاٹ کر یہیں پھینک دوں گا۔''

"نہیں.....نہیں خان خدا کی قسم میں سچ کہہ رہی ہوں۔"

اس کے اوپر شدید لرزہ طاری ہو گیا تھا جبکہ شمشیر خان کی سرخ سرخ نگاہیں اسے اچھی طرح جانچ رہی تھیں۔ گویا وہ اس کی قسم کی تصدیق کرنا چاہ رہا ہو۔

"آپ یقین کرو خان، میں سچ کہہ رہی ہوں۔ منصور خان نے ہمیشہ مجھے منع کیا کہ اس کی کوئی بات کسی کو بھی نہیں بتایا کروں۔ میں نے ہمیشہ اس کا کہا مانا ہے۔"

"سمندر خان.....! اس کو ایک معقول رقم دے دو۔ سن اے عورت صبح یہ گاؤں چھوڑ کر چلی جانا۔ پھر کبھی خواب میں اس جگہ کا تذکرہ کسی سے مت کرنا۔ تیرے خاوند کی جب بھی کوئی خبر ملی تجھ تک پہنچا دی جائے گی۔ مگر تو یہاں کا رخ کبھی مت کرنا۔"

وہ فیصلہ کن لہجے میں کہتا ہوا بیٹھک سے باہر نکل آیا۔ پیچھے پیچھے وہ عورت دہائیاں دیتی آ رہی تھی۔ جسے سمندر خان ڈانٹ ڈپٹ کر خاموش کرا رہا تھا۔

"خان جو ایک بار فیصلہ کر لیتے ہیں وہ کبھی واپس نہیں لیتے، شکر کر تیرا خیال کر رہے ہیں۔ اگر یہاں سے تجھے ایسے ہی نکال دیں تو تو کیا کر لے گی؟"

"یہ ظلم ہے لالہ، ہمارے خاوند کی خدمتوں کا یہ صلہ ہے؟ کیوں اپنا گھر اپنا گاؤں چھوڑ کر ہم جائیں؟ منصور خان کی وفاداری کا یہ انعام ہے؟"

وہ روتے ہوئے شکوے کر رہی تھی۔ منتیں کر رہی تھی۔

"تیرے خاوند کی خدمتوں کے صلے میں اسے لمبی رقم ملتی ہے۔ بڑا خان بہت خیال رکھتا ہے منصور خان کا، اس لیے چھوٹا خان بھی بہت رعایت کر گیا ہے۔ یہ لو وہ پیسہ کل صبح فوراً یہاں سے چلی جانا۔ خان کی حکم عدولی کرنے والا زیادہ دن زندہ نہیں رہتا۔"

سمندر خان بڑے نوٹ خاصی تعداد میں اسے تھما کر باہر آ کر جیپ میں بیٹھ گیا تھا۔ صمد خان نے اس کے بیٹھتے ہی جیپ چلا دی تھی۔ شمشیر خان خاموش بیٹھا تھا۔

"خان.....! اب کہاں جائیں گے؟" سمندر خان کچھ توقف کے بعد گویا ہوا۔

"تربت خان کے پاس....."

"تربت خان، منصور خان کے ساتھ ہی گیا ہوا ہے تو وہ نہیں ملے گا۔"

"اس کے گھر میں کوئی تو ہوگا۔ منصور خان کی عورت کی طرح وہاں بھی خبر ہوگی۔"

"تربت خان تنہا رہنے والا آدمی ہے خان، اس نے ساری زندگی شادی نہیں کی۔ اس کا ماں، باپ، بہن بھائی کوئی نہیں ہے۔ وہاں جانا فضول ہوگا۔" سمندر خان نے رسانیت سے سمجھایا جو اس کی سمجھ میں آ گیا تھا۔

"صمد خان، واپس حویلی چلو، صبح پلاننگ کر کے نکلیں گے۔"

☆☆☆

''خاناں.....!تم نے کیوں صارم خان کو لڑکی کے ساتھ جانے دیا؟'' طورخان نے برابر کی سیٹ پر براجمان خاموش بیٹھے گلریز خان سے استفسار کیا۔ وہ خود گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا۔

''طورخان..... بزرگ کہتے ہیں جہاں بڑے نقصان کا اندیشہ ہو وہاں چھوٹا نقصان برداشت کر کے بڑے نقصان سے بچنا چاہیے۔ صارم کی آنکھوں میں، میں نے وہ جنون دیکھ لیا تھا اگر میں لڑکی اس کے حوالے نہیں کرتا تو وہ میری لاش سے گزر کر بھی لڑکی کو بچا لیتا۔ قصداً میں نے لڑکی خاموشی سے اس کے حوالے کر دی۔ یہ حقیقت ہے کہ میں سبریز کے بعد صارم کی جدائی، اس کی ناراضگی برداشت نہیں کر سکتا۔'' گلریز نے ایک طویل و سرد سانس خارج کر کے سیٹ سے ٹیک لگالی۔

''صارم خان لڑکی کو کہاں چھوڑے گا؟'' کچھ توقف کے بعد طورخان پھر گویا ہوا۔

''اس سے کچھ بعید نہیں کہ وہ اسے لے کر شہباز خان کی حویلی ہی پہنچ جائے۔''

''اوہ..... اگر ایسا صارم خان نے کیا تو بہت برا ہوگا۔ وہ لوگ دشمنوں کے ساتھ نرمی کرنے کے قائل نہیں ہیں خان، ان کی بندوقیں فوراً شعلے اُگلنے لگتی ہیں۔''

مارے خوف و گھبراہٹ کے طورخان اس کی بات قطع کر کے بوکھلا کر بولا۔

''اسی لیے میں ان کی روانگی کے ایک گھنٹے بعد وہاں سے چلا ہوں تا کہ اگر ایسی کوئی بات ہو بھی جائے تو ہم سنبھال لیں گے۔''

''لڑکی ہمارے پاس سے زندہ چلی گئی۔ اسے شاید مرنا نہیں تھا ہمارے ہاتھوں لیکن مزے کی بات یہ ہے کہ اب اس کے باپ بھائی ہی جان سے ماردیں گے۔ ایسی لڑکی کو کون قبول کرتا ہے۔ چاہے وہ گھر سے بھاگی ہوئی ہو یا گھر سے اٹھائی گئی ہو۔ وہ اب اپنوں کے ہاتھوں قتل ہوگی۔''

گلریز خان قہقہہ لگا کر ہنس پڑا تھا۔ جیسے وہ پہلے سے آگاہ تھا۔

''میں جانتا ہوں، گاؤں کے رواجوں کو لیکن صارم خان نہیں جانتا۔ وہ زیادہ تر گاؤں سے باہر رہا ہے اور کتابوں کی دنیا کا باسی بن چکا ہے۔ وہ سوچتا ہے باہر کی دنیا میں وہی کچھ ہوتا ہے جو کتابوں کے قاعدے و قانون ہیں۔ اگر حالات سے آگاہی رکھتا تو ایسا احمقانہ قدم کبھی نہیں اٹھاتا۔''

''رکو..... وہ کار صارم خان کی ہی ہے نا؟'' سبزے کے قریب کھڑی سرخ کار دور سے ہی نظر آرہی تھی۔ موسلا دھار برستی بارش کے زور میں اس وقت کمی آگئی تھی۔

طورخان کو بھی کار نظر آگئی تھی۔ وہ گلریز کے ساتھ کار خالی دیکھ کر چونک اٹھا تھا۔

''کہاں گیا صارم؟ اور وہ لڑکی بھی غائب ہے۔'' طورخان تیزی رفتاری سے کار کی طرف بڑھا تھا۔ گلریز ہکا بکا خالی کار کو دیکھ رہا تھا اور بڑبڑا رہا تھا۔

''لگتا ہے خان وہ لڑکی چھوٹے خان کے ساتھ کوئی چال چل گئی۔''

''بہت مکار و چالاک تھی وہ لڑکی لیکن دونوں غائب کہاں ہوئے ہوں گے؟'' گلریز خان بے تابانہ نگاہوں سے اردگرد کا جائزہ لے رہا تھا۔

''کار یہیں ہے تو خان، ان کو بھی یہاں ہی موجود ہونا چاہیے۔ ہوا کیا ہے کچھ سمجھ میں نہیں آتا خان، چھوٹا خان اتنا پڑھا لکھا ہو کر اس قدر عقل مند و باشعور ہونے کے باوجود یہ کیا کر بیٹھا ہے؟''

''زیادہ پڑھائی انسان کا دماغ خراب کر دیتی ہے کچھ اور نہیں اس لیے میں اس کے خلاف ہوں اب نا معلوم کیا ہوا ہے، کہاں غائب ہیں کیسے معلوم ہوگا؟''

جھنجلاہٹ، غصہ اور پریشانی اس پر سوار تھی۔ علاقہ چٹانی ہونے کے باعث بارش کے باوجود وہاں پھسلن اور کیچڑ نہیں تھی۔ موٹی موٹی بوندیں ابھی بھی برس رہی تھیں۔ فضا میں خنکی کے ساتھ ساتھ اندھیرا ابھی بڑھ رہا تھا۔

وہ دونوں دیوانوں کی طرح انہیں تلاش کر رہے تھے۔

گلریز کا دل گواہی دے رہا تھا۔ صارم کسی مصیبت میں پھنس چکا ہے۔ وہ بار بار اپنے ذہن میں گونجنے والی اس آواز کو دبانا چاہ رہا تھا لیکن وہ مسلسل اس کے ذہن میں گونج رہی تھی اور وہ از حد متوحش ہوتا جا رہا تھا۔

آخر کار بہت جلد اس کے اندر بولتے وہم کو حیات مل گئی تھی۔ ڈھونڈتے، ڈھونڈتے اس کی نگاہ نیچے بہنے والے چشمے پر پڑی تو ایک لمحے کو تو زمین و آسمان اس کے آگے گردش کرنے لگے۔ چشمے کے قریب جنگلی پھولوں کی گھنی جھاڑیوں پر اسے کوئی وجود بے سدھ پڑا نظر آ رہا تھا۔ جس کے لباس سے اسے شناخت کرنے میں دیر نہ لگی وہ صارم تھا۔ وہ بدحواس سا چیختا ہوا اس کی طرف دوڑا تھا اسے اس طرح دوڑتے دیکھ کر طور خان بھی اس کے پیچھے لپکا تھا۔

''صارم خان..... صارم خان آنکھیں کھولو، کیا ہوا تمہیں؟'' گلریز خان نے زخموں سے چور صارم خان کو بہت احتیاط سے ان پھولوں کی نرم جھاڑیوں سے بازوؤں میں اٹھایا تھا۔ وہ شدید زخمی تھا۔ بارش کے برستے پانی سے اس کے زخم گہرے اور صاف نظر آ رہے تھے۔ بارش کے باعث اس کا خون زیادہ نہیں بہا تھا لیکن اس کی بے ہوشی اور زخموں کی حالت تسلی بخش نہیں تھی۔

''گاڑی، پوری رفتار سے چلاؤ، ہمیں جلدی اسپتال پہنچنا ہے۔'' گلریز، صارم کو پچھلی نشست پر آرام سے لٹا کر پریشانی سے بولا۔

''خان... لڑکی؟''

''ارے گولی مارو لڑکی کو۔ یہ اسی کی وجہ سے ہوا ہے۔ وہ فرار ہو چکی ہے لیکن میں اب اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔''

گلریز خان غصے سے چیخ کر طور خان سے مخاطب ہوا تھا۔ طور خان نے فوراً ہی گاڑی اسٹارٹ کر دی تھی۔ گلریز صارم کا سر اپنی گود میں رکھے، بار بار اس کی نبض چیک کر رہا تھا جو بہت سست رفتاری سے چل رہی تھی اور ساتھ ہی اس کا بھی دل ڈوبے رہا تھا۔ صارم کی نازک حالت، اسے یقین تھا اگر وہ آج گھر نہ پہنچے تو کل صبح ہی بابا جانی ان کی تلاش شروع کر دیں گے۔ وہ انہیں کیا بتائے گا؟''

☆☆☆

رات کا آخر پہر تھا۔ ایک عالم محو خواب تھا۔ بڑی حویلی میں چند نفوس تھے جو رات کے اس پہر جو میٹھی نیند کا پہر ہوتا ہے نیند سے مبرا

آنکھوں سے جاگ رہے تھے۔ بابا جانی صبح سے صارم اور گلریز کی آمد کا انتظار کر رہے تھے جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ پریشانی و تشویش میں تبدیل ہوتا جا رہا تھا۔ وہ خاموشی سے جاء نماز بچھا کر اللہ کے حضور کھڑے ہو گئے تھے کہ نماز سے بہتر و مضبوط پناہ گاہ اس دنیا میں کوئی نہیں۔ نماز دل کو سکون بھی عطا کرتی ہے۔ اللہ کا قرب بھی حاصل ہوتا ہے۔

گلباز خان کو ایک پل سکون و قرار نہ مل رہا تھا۔ وہ بے قراری و غصے تلے ادھر ادھر کمرے میں چکرا رہے تھے۔ کبھی رک کر دیوار گیر گھڑی دیکھنے لگتے کبھی کھڑکی سے پردہ ہٹا کر باہر پھیلے اندھیرے کو دیکھنے لگتے۔ ان کی قہر آلود نگاہیں وقفے وقفے سے بستر پر بیٹھی ڈری، سہمی خوفزدہ سی گل زیبا پر اٹھ رہی تھیں۔

''آپ بیٹھ جائیں نا خان، ساری رات ہو گئی ہے آپ کو اس طرح ٹہلتے ٹہلتے۔'' گل زیبا نے ڈرتے ڈرتے التجائیہ انداز میں گلباز خان سے کہا۔

''میری فکر مت کرو۔ اپنی اور اپنے لاڈلے کی فکر کرو، مجھے صبح کے سورج کا انتظار ہے۔ ڈھونڈ نکالوں گا۔ اس بدبخت کو۔ بہت شہہ دے رکھی ہے تم نے بتاؤں گا دونوں ماں بیٹے کو۔'' وہ بری طرح گرج کر بولے تھے۔

''وہ کہیں چھپا تھوڑی ہے۔ بارش کی وجہ سے نہیں آئے ہیں۔ صبح آ جائیں گے، آپ کو تو یونہی عادت پڑ گئی ہے ذرا ذرا سی بات پر پریشان ہونے کی۔''

وہ ڈرتے ڈرتے بھی اپنے دل کی بات کہہ گئی تھیں۔ جواباً انہوں نے ایسی کھلتی نگاہوں سے انہیں دیکھا تھا کہ وہ گڑبڑا کر آنکھیں جھکا کر بیٹھ گئی تھیں۔

''تم جیسی عاقبت نااندیش اور بیوقوف عورتیں ہمیشہ سر پکڑ کر روتی ہیں۔ جب اولاد ہاتھوں سے نکل جاتی ہے تو اپنی بے وقوفیاں پچھتانے کے لیے رہ جاتی ہیں؟''

''آپ آرام کرو خان، میرا دل کہتا ہے وہ ٹھیک ہیں صبح تک لوٹ آئیں گے۔''

''لیکن میرا دل کہتا ہے کچھ ٹھیک نہیں ہے، کوئی نہ کوئی بات ضرور ہے۔ گلریز بے پرواہ و غیر ذمے داری کا مظاہرہ کر سکتا ہے کیونکہ وہ تمہاری طرح بے وقوف، احمق اور لاابالی ہے مگر صارم بہت سمجھدار اور ذمے داری کو سمجھنے والا حساس بچہ ہے۔ اس کی طرف سے بھی کوئی اطلاع نہیں آئی ہے اور مجھے تشویش ہو رہی ہے کوئی نہ کوئی خطرناک بات ضرور ہے۔'' وہ پریشان لہجے میں گویا ہوئے۔ ان کے چہرے پر پریشانی و فکر کے گہرے رنگ تھے جو اس حقیقت کے غماز تھے کہ وہ گلریز سے زیادہ صارم کو چاہتے تھے۔

''ہونہہ..... پہلی بار ایسا باپ دیکھ رہی ہوں جو اپنی سگی اولاد سے زیادہ بھائی کے بیٹے کو عزیز رکھتا ہو۔'' ان کے احمق و بے وقوف کے خطابات دینے پر گل زیبا بری طرح تلملا اٹھی تھیں۔ تمام ڈر و خوف بالائے طاق رکھ کر طنز آمیز لہجے میں بولی تھیں۔ گلباز خان کے بگڑتے تیور دیکھ کر انہوں نے منہ سختی سے بند کر لیا تھا۔

☆☆☆

''صارم..... ! رک جاؤ، اتنی بلندی پر مت چڑھو دیکھو گر جاؤ گے۔ صارم..... میری بات مانو، مت چڑھو اتنی بلندی پر، دیکھ گر..... آہ..... بچاؤ..... میرا صارم گر گیا، میرا بچہ گر رہا ہے۔ پکڑو..... بچاؤ۔''

بابا جانی نے فجر کے دو فرض پڑھنے کے بعد سلام پھیر کر دیکھا اور جاء نماز کا کونہ پائنتی کی جانب سے موڑ کر بی بی جان کی طرف بڑھے جو سوتے میں بدحواسی سے چلا رہی تھیں۔

''شیریں گل..... شیریں گل، ہوش کرو، کیا ہوا ہے؟'' وہ انہیں جھنجوڑتے ہوئے پکار رہے تھے۔ چند لمحے بعد انہوں نے آنکھیں کھول دیں۔

''صارم کہاں ہے؟'' وہ بے ساختہ ادھر ادھر دیکھتی ہوئی استفسار کرنے لگیں۔

''صارم، وہ شکار پر گیا ہوا ہے، تم کوئی خواب دیکھ رہی تھیں۔''

''خواب..... نہیں وہ حقیقت تھی، میرا بچہ پہاڑ سے گرا ہے۔''

''کیا صبح ہی صبح ناخوشگوار باتیں کر رہی ہو، وہ خواب تھا اور خواب کی تعبیر ہمیشہ الٹی ہوتی ہے۔ چلو اٹھ کر فجر کی نماز ادا کرو۔ وہ آتا ہوگا۔'' دل ان کا بھی اندر سے لرز رہا تھا لیکن اپنی حالت پر قابو پا کر ان سے نرمی سے گویا ہوئے۔

''نہیں افضل خان، میری ماں کہتی تھیں صبح کے وقت دیکھے جانے والے خواب سچے ہوتے ہیں۔ اگر یہ جھوٹ ہے تو میرے اندر بے چینی کیوں پھیلی ہوئی ہے۔ ایک آگ ہے جو جلائے ڈالے رہی ہے۔'' وہ بری طرح رونے لگیں۔

''یہ سب شیطانی وسوسے ہیں شیریں گل، لاحول پڑھو اور فجر کی نماز ادا کرو۔''

''رب کرے یہ خواب خواب ہی ہو، اب طاقت نہیں ہے اس وجود میں کسی صدمے کو برداشت کرنے کی۔'' وہ دوپٹے سے آنسوؤں سے نم چہرہ صاف کرتے ہوئے دعائیہ انداز میں گویا ہوئیں۔

''اللہ پر بھروسا رکھو نیک بخت، وہ کبھی بھی بندے کو اس کی برداشت سے زیادہ نہیں آزماتا اور اس کی آزمائش کسی مصلحت سے خالی نہیں ہوتی۔ میں شیر خان کو حکم دے دیتا ہوں کہ وہ بکرے کاٹ کر گوشت غریبوں میں بانٹ دے۔ صدقہ ہر مصیبت و آفات کے آگے ڈھال بن جاتا ہے۔''

وہ سیاہ و سفید نما پگڑی سر پر باندھنے کے بعد جوتے پہن کر باہر نکل گئے۔

شیریں گل وضو کے بعد بہت خشوع و خضوع سے نماز پڑھنے کھڑی ہو گئی تھیں۔

شاہ افضل خان حویلی سے ملحقہ حجرے میں آکر بیٹھ گئے۔ یہ ان کا روز کا معمول تھا۔ فجر کی نماز کے بعد وہ اشراق کی نماز تک تلاوت قرآن پاک اور تسبیح و وظائف میں مشغول ہو جاتے۔ پھر اشراق کی نماز سے فارغ ہو کر حجرے میں ہی ہلکا پھلکا ناشتہ کرتے پھر گاؤں کے لوگ اپنی پریشانیاں اور مسائل لے کر آ جاتے۔ جن کا وہ مناسب طریقے سے حل بتاتے اور ضرورت مندوں کی ہر ممکن مدد کیا کرتے تھے۔ وہاں کے لوگ ان کی دریا دلی، سخاوت اور انصاف پسندی و خوش مزاجی کے باعث انہیں بہت چاہتے اور پسند کرتے تھے۔

وہ اشراق کی نماز سے فارغ ہوئے تھے۔ گلباز سلام کر کے ان کے قریب بیٹھ گئے۔ انہوں نے گہری نظروں سے ان کا جائزہ لیا۔ سرخ

آنکھیں، پژمردہ چہرہ، تھکن زدہ انداز گواہ تھا کہ وہ رات کو ایک پل بھی نہ سو سکے تھے۔

''بہت تھکے تھکے لگ رہے ہو خان! رات سوئے نہیں؟''

''جس پریشانی اور فکر نے آپ کو تمام رات بستر سے دور رکھا میں بھلا کس طرح آرام کر سکتا تھا۔ بلکہ مجھے افسوس ہے میری اولاد کی وجہ سے آپ بے آرام اور پریشان ہیں۔'' گلباز خان باپ کی پریشانی کے خیال سے زچ پڑنے تھے۔

''ارے.....ارے..... رے گلباز بچے، کیا کرتے ہو، کیا وہ میری اولاد نہیں ہے؟ اپنی اولاد سے زیادہ پیاری اولاد کی اولاد ہوتی ہے۔ وہ مجھے تم سے بھی زیادہ عزیز و پیارے ہیں۔ آ جائیں گے۔ نوجوان ہیں ہر اونچ نیچ سے بے نیاز، دراصل قصور ان کا بھی نہیں ہے۔ یہ عمر ہوتی ہے ایسی بے پرواہ لاابالی پن کی ہے۔ کل کو گھر بار والے ہو جائیں گے۔ بیوی بچوں کی ذمے داری پڑے گی تو سب سنبھل جائیں گے۔ یہ دور ان کی لاشعوری و لاعلمی کا دور ہے۔ جینے دو انہیں اس خوبصورت دور میں۔ پھر کہاں یہ حسین وقت ہاتھ آتا ہے۔'' بابا جانی بیٹے کے دلی احساس سے بخوبی واقف تھے۔ ان کا شمار ان لوگوں میں ہوتا تھا جو ماں باپ کی خوشی و احترام اپنی زندگی سے بڑھ کر عزیز رکھتے ہیں۔ انہوں نے بہت رسانیت سے انہیں سمجھایا تھا۔

''بابا جانی! میں آپ سے اجازت لینے آیا تھا تاکہ ان لوگوں کو دیکھ کر آؤں۔ کیا وجہ ہے وہ لوگ کل بھی نہیں آئے ہیں۔''

''کہاں دیکھو گے انہیں؟ جنگل مختصر تو نہیں ہے؟''

''میں پہلے ریسٹ ہاؤس جاؤں گا، عموماً وہ لوگ شکار کا گوشت وہاں بھون کر کھاتے ہیں۔''

''کیوں اتنا تردد کرتے ہو گلباز خان، آ جائیں گے آج انتظار اور کر لیتے ہیں۔''

''بہتر بابا جانی..... جیسا آپ بہتر سمجھیں۔'' ہمیشہ کی طرح انہوں نے اپنی رضا کے آگے باپ کی منشاء کو فوقیت دی تھی۔ اسی اثنا میں ملازم ناشتہ لے آیا تھا۔ ناشتے کو دونوں کا ہی دل نہیں چاہ رہا تھا ایک دوسرے کے اصرار پر دونوں نے ایک ایک کپ چائے پی تھی۔ چائے پی کر فارغ ہی ہوئے تھے کہ ملازم شیر خان نے طور خان کے آنے کی اطلاع دی تھی۔

''بھجواؤ سے اندر فوراً۔'' گلباز خان نے کہا۔ ان کا اضطراب بے اختیار ہی عروج پر جا پہنچا تھا۔ وہ اٹھ کر بے چینی سے چکر لگانے لگے۔

''بیٹھ جاؤ گلباز خان، کیوں اس قدر پریشان ہو رہے ہو۔'' بابا جانی نرمی سے گویا ہوئے۔

''بابا جانی، طور خان، گلریز اور صارم کے ساتھ ہی تھا، پھر وہ تنہا کیوں آیا ہے اور کس کا پیغام لایا ہے؟'' وہ سخت متوحش و ہراساں تھے۔

''اللہ سے ہمیشہ اچھی امید رکھنی چاہیے بچے۔'' بابا جانی ان کے قریب ان کا سر درد پڑتا تھا اپنے ہاتھوں میں لے کر بردبار لہجے میں گویا ہوئے۔

طور خان اندر داخل ہو کر انہیں سلام کر کے ایک طرف کھڑا ہو گیا۔

''طور خان! کس کا پیغام لائے ہو؟ گلریز خان اور صارم خان کہاں ہیں؟''

بابا جانی اس کے سلام کا جواب دے کر شفیق و ملائمت بھرے انداز میں گویا ہوئے۔

''بڑے خان......! وہ صارم خان......'' وہ از حد گھبرایا ہوا تھا۔

''کیا ہوا صارم خان کو؟'' گلباز خان از حد متوحش انداز میں اسے جھنجوڑ کر پوچھنے لگے۔

''خان...... وہ پہاڑ سے گر کر شدید زخمی ہو گئے ہیں۔''

''کہاں ہیں وہ؟'' بابا جانی کا ذہن سائیں سائیں کرنے لگا۔ شیریں گل کے الفاظ ان کے کان میں گونج رہے تھے۔ جو لوگ دل سے قریب رہتے ہیں۔ دل وابستگی، قلبی روابط خود بخود ہی آپس میں استوار ہو جاتے ہیں۔ پھر مسرت کا احساس نہ سہی مگر دکھ و تکلیف کا ادراک کسی نہ کسی طور پر محسوس ہونے ہی لگ جاتا ہے۔ کل سے جو بے نام سی، بے چینی و اضطراب انہیں بے کل و مضطرب کیے ہوئے تھا اس کی وجہ یہ تھی۔ ان کا چہیتا عزیز لخت جگر تکلیف میں تھا تو خود بخود وہ بھی انجانی تکلیف میں مبتلا رہے تھے۔ خون کی کشش اور سچی محبتوں کی تاثیر ایسی ہی ہوتی ہے۔

''بابا جانی......! اسپتال چل رہے ہیں۔ میں ذرا بی بی جان سے کوئی بہانہ کر کے آتا ہوں۔ ورنہ وہ پریشان رہیں گی۔ ہمیں نا معلوم کتنا وقت وہاں لگ جائے۔ طور خان کہہ رہا ہے اسے ابھی ہوش نہیں آیا کل شام سے وہ بے ہوش ہے۔''

گلباز خان داخلی دروازے کی سمت بڑھتے ہوئے ان سے مخاطب تھا۔

☆☆☆

دور سے آتی گاڑی کو دیکھ کر وہ چونکی تھی۔ اس نے سوچا کہ گاڑی جیسے ہی قریب آئے اس سے مدد مانگے کہ وہ اسے گاؤں پہنچا دے، یہاں سے گاؤں کا فاصلہ زیادہ نہ تھا۔ یہ سوچ کر وہ آگے بڑھی تھی اور ایک پتھر کی اوٹ میں چھپ گئی۔ چند لمحوں بعد وہ گاڑی قریب ہی رکی تھی۔ اسے یکدم ہی کسی خطرے کا احساس ہونے لگا۔ وہ دھڑ دھڑاتے دل کے ساتھ بالکل ساکت کر پتھر سے لگ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ بارش دھیمی دھیمی اب بھی برس رہی تھی۔

''یہاں تو کوئی نہیں ہے خان!'' کچھ فاصلے سے ایک مردانہ بھاری آواز آئی۔

''ہوں..... مجھے محسوس ہوا تھا جیسے یہاں کوئی لڑکی کھڑی ہے۔ میں سمجھا وہ بدبخت ہو گی۔''

''کاش..... مجھے مل جاتی تو..... ابھی اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے یہیں دفن کر دیتا۔ شمشیر خان کی عزت اور خاندان، قبیلے کے وقار کو داغ لگانے کی جس نے غلطی کی وہ عبرت ناک موت مرا۔'' شمشیر خان کا خونخوار خوفناک لہجہ بالکل غیر متوقع طور پر سن کر اس کا اوپر کا سانس اوپر، نیچے کا سانس نیچے رہ گیا۔ تو گویا اس کے اغواء کی خبر گاؤں پہنچ چکی تھی اور وہ اسے کسی اور رنگ میں لے رہے تھے۔ ورشا کو سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ شمشیر خان اسی کے متعلق بات کر رہا ہے اور شاید اسے تلاش بھی کر رہا ہے۔

''چلو..... میرا وہم ہو گا یا شاید اس کی زندگی باقی ہے ابھی۔ خیر کب تک؟ کل صبح سے میں گاؤں سے باہر اسے تلاش کروں گا۔ گاؤں میں آنے کی ہمت وہ نہیں کر سکتی۔''

کچھ دیر کے بعد گاڑی اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی اور چند لمحوں بعد نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔ وہ گھومتا سر لے کر نیچے پتھریلی زمین پر بیٹھتی چلی گئی۔ آخر وہی ہوا تھا جس کا اسے ڈر تھا۔

وہ بے قصور تھی۔

بے خطا تھی۔

لیکن پھر بھی مجرم ٹھہرائی گئی تھی۔ شمشیر خان اس کے خون کا پیاسا ہوا گھوم رہا تھا۔ اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے دفن کر دینے کے درپے تھا۔ جیسے وہ کاغذ کا حقیر ورق تھی یا کسی ستے کپڑے کا بے جان ٹکڑا۔

اس کا تمام حوصلہ، ہمت، عزم، پانی میں کاغذ کی ناؤ کی طرح ڈوب گیا تھا۔

وہ سوچ رہی تھی حویلی جا کر اپنی بے گناہی ثابت کرے گی۔

سب کو بتائے گی کہ وہ بے قصور ہے، لاتعلق ہے۔

مگر اسے یقین ہو گیا کہ وہ حویلی میں داخل ہونے سے قبل ہی موت کے گھاٹ اتار دی جائے گی۔ باہر شمشیر خان گھات لگائے بیٹھا ہے تو اندر چھوٹی اد ے زبان کے ہتھیار تیار کیے بیٹھی ہوں گی۔ اس کی مظلوم و سادہ مزاج ماں، بے زبان و معصوم بہن بھی اس کے باعث عتاب کا شکار ہوں گی۔ بابا جان سے بھی ہمدردی و شفقت کی امید نہیں رکھی جا سکتی۔

''پھر کہاں جاؤں میرے مولا، میرے رب، میں یہ کس امتحان میں پڑ گئی؟ میرے اللہ..... میری مشکلوں کو دور کر دے۔ رات کے اس

اندھیرے میں برستی برسات میں کہاں جاؤں؟ کس کا در کھٹکھٹاؤں؟ کون میرا ہے اب، میں کہاں جاؤں؟"

وہ روتی ہوئی اپنے رب سے دعا مانگ رہی تھی، پناہ مانگ رہی تھی۔

بارش میں تیزی آتی جا رہی تھی۔ شام رات میں ڈھل رہی تھی۔ بھیگی بھیگی ہوائیں اس کے بھیگے ہوئے وجود سے ٹکرائیں تو سردی کے باعث اس کا جسم سن ہونے لگا۔

شمشیر خان کی گاڑی جانے کے بعد اس کے قدم خود بخود اپنے گاؤں جانے والے راستے کی سمت اٹھنے لگے جیسے کوئی غیر مرئی طاقت اسے اپنی طرف کھینچ رہی ہو۔ پھیلتی تاریکی اور بڑھتی بارش و سردی کے احساس نے جیسے اس کے حواس منجمد کر دیے تھے۔ سردی سے کپکپاتے وجود کے ساتھ وہ آگے بڑھ رہی تھی۔ دور سے گاؤں کی گلیاں اور پتھر سے بنی جھونپڑیاں نظر آنے لگی تھیں۔ جن میں جلتے چراغ و لالٹین کی روشنی رات کی تاریکی کا مقابلہ کرنے کے لیے ناکافی تھی۔ اس نے ایک لمحہ رک کر سامنے نگاہ ڈالی تھی۔ جیسے فیصلہ کر رہی ہو کہ آگے جائے یا نہ جائے۔ مرنا دونوں حالتوں میں تھا۔ حویلی جاتی تو شمشیر خان کی گولی اسے زندگی کی قید سے رہائی دے دیتی اور اگر یہاں رات گزارتی تو سردی و بارش اور بھوک کی شدت سے اکڑ کر مر جاتی۔

ابھی وہ اسی تذبذب میں تھی کہ اچانک ایک عورت اس سے آ کر لپٹ گئی۔ اس ناگہانی آفت پر اس کے ہونٹوں سے بے ساختہ چیخ نکلی تھی۔ اس نے لاشعوری انداز میں اس کی گرفت سے نکلنا چاہا جو بے سود تھا۔

"کہاں چلی گئی تھی؟ ہاں تجھے ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گئی۔ تجھے کہا بھی تھا لکڑیاں لینے دور مت جانا۔ راستہ بھول جائے گی پھر کون ڈھونڈ کر لائے گا تجھے۔ تجھ میں اتنی طاقت نہیں ہے لیکن تجھے خیال نہیں ہے۔ دور نکل گئی۔ میں تلاش کر کے تھک گئی۔ لیکن شکر ہے خدا کا آج تو مل گئی۔ چل گھر چل، سارے کپڑے بھیگ گئے۔ بیمار پڑ جائے گی۔ چل میں نے تیرے لیے نئے کپڑے بنائے ہیں۔"

وہ عورت مسلسل بول رہی تھی اور دیوانوں کی طرح اس کے ہاتھوں کو، ماتھے کو چوم رہی تھی۔ اس کے بیمار و کمزور لہجے میں از حد مسرت پنہاں تھی۔

اس کی گرفت بہت مضبوطی سے اس کے ہاتھوں پر تھی۔ گویا وہ نہیں گئی تو وہ اسے زبردستی گھسیٹ کر اپنے ساتھ لے جائے گی۔

درشا اس نئی وانوکھی صورتحال سے حیران و پریشان تھی۔ اس عورت کی خود کلامی و گفتگو کا انداز، بے شناخت حرکات و سکنات۔ اس کی گرفت سے بڑی گرمجوشی و سرخوشی عیاں تھی۔

اندھیرے میں بھی اس کی آنکھوں میں خوشی سے چمکنے والی روشنی نظر آ رہی تھی۔

"میں وہ نہیں ہوں جسے آپ تلاش کر رہی ہیں۔"

بڑی دقت سے اس کے حلق سے آواز برآمد ہوئی۔

"نہیں..... تم میری بیٹی ہو، جھوٹ مت بولو" اس نے پہلے سے بھی زیادہ شدت سے اس کے ہاتھوں پر گرفت قائم کر لی جیسے اس کے

فوراً فرار ہونے کا احتمال ہو۔

"صابرہ خانم..... اے صابرہ خانم، اس وقت گھر سے کیوں نکلا ہے تم؟"

ورشا نے دیکھا ایک بزرگ دائیں ہاتھ میں چھتری اور بائیں ہاتھ میں لالٹین پکڑے اس طرف آ رہے تھے۔ ان کی نگاہیں ورشا پر تھیں۔

"آؤ..... آؤ زوری خان، دیکھو ہماری گلفشاں مل گئی۔ تم کہتے تھے وہ کبھی نہیں آئے گی۔ دیکھو میں نے ڈھونڈ نکالا، اپنی گلفشاں کو ڈھونڈ نکالا۔" وہ بڑے زور و شور سے انہیں بتا رہی تھی۔ اس کا جوش و خروش دیکھنے کے قابل تھا۔

"پاگل ہوگئی ہے صابرہ، کس کو پکڑ رکھا ہے؟ کون ہو بی بی تم؟" وہ وقت کے غبار سے اٹی آنکھوں سے اس کے چہرے کو بغور دیکھ رہے تھے۔

"یہ کون ہیں بابا اور کس گلفشاں کو تلاش کر رہی ہیں؟" ورشا نے اس عورت کی محبت سے متاثر ہو کر سوالیہ انداز میں استفسار کیا۔

"یہ بدنصیب میری گھر والی ہے بی بی، گلفشاں میری بیٹی تھی، ایک دن کھائی میں گر کر مرگئی اور اس دن سے یہ صدمے سے پاگل ہوگئی ہے۔ جب بھی کسی جوان لڑکی کو دیکھتی ہے اسے اپنی بیٹی گلفشاں ہی سمجھتی ہے۔ گھر میں بند کر کے رکھتا ہوں اسے۔ ورنہ اسی طرح پوری وادی میں ڈھونڈتی پھرتی ہے۔ میں حویلی میں چوکیدار ہوں۔ آج بھی اپنی ڈیوٹی پر گیا تھا جلدی میں دروازے کو باہر سے بند کرنا بھول گیا۔ راستے میں ہی مجھے خیال آیا تو میں گھر آ گیا۔ اسے وہاں نہ پا کر ڈھونڈتا ڈھونڈتا یہاں آیا ہوں۔ کون ہو بی بی آپ؟ اور یہاں کیسے ہو اس وقت؟" بوڑھے چوکیدار کو تفصیل بتاتے بتاتے اچانک اس کا خیال آیا تو وہ بڑی اپنائیت سے استفسار کرنے لگا۔

ورشا جو اس کے حویلی میں چوکیدار ہونے کا سن کر کچھ پریشان و فکرمند ہوگئی تھی پھر خود ہی اس نے اس خیال کو جھٹک دیا کہ وہ چوکیدار اسے کیا پہچانے گا۔ جب وہ خود ہی اسے نہیں جانتی کیونکہ حویلی وسیع و عریض رقبے پر بنائی گئی تھی اور اس کے گیٹ بھی ایک سے زائد تھے۔ اس لیے چوکیداروں کی تعداد زیادہ تھی اور کسی کو اجازت نہ تھی کہ زنانہ حصے میں جائے۔ اس خیال کے آتے ہی وہ بےفکر ہو کر بولی۔

"بابا میں دوسرے گاؤں جا رہی تھی۔ یہاں راستہ بھٹک کر آ گئی ہوں۔"

"آج کل کا وقت خراب ہے بچے، اس طرح جوان لڑکی کو اکیلے گھر سے نہیں نکلنا چاہیے۔ چلو تم ابھی رات ہمارا گھر پر گزارو، صبح ہم ڈیوٹی سے آ کر تمہیں خود تمہارا گاؤں چھوڑ کر آئے گا۔"

اس نے خود کو وقت و حالات کی منشاء پر چھوڑ دیا کہ اس وقت اپنے اس کے جان کے دشمن بنے ہوئے تھے۔ وارثوں کی موجودگی میں وہ بےاماں اور لاوارث ہو چکی تھی۔ گویا نہ پیروں تلے زمین رہی تھی اور نہ سر پر چھت۔ ایسے میں اسے بیٹی کی موت سے پاگل عورت کی جنون خیز محبت، بوڑھے چوکیدار کی بےغرض اور پرخلوص سخاوت امداد غیبی محسوس ہوئی۔ وہ شمشیر خان کی گفتگو سن چکی تھی اور وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ اسی گاؤں کے ایک کچے گھر کی چار دیواری میں پناہ گزیں ہوگی۔

گاؤں کے عام گھروں جیسا وہ چھوٹا سا گھر تھا۔ صابرہ کے مارے خوشی کے زمین پر پاؤں نہیں ٹک رہے تھے۔ اس نے آتے ہی اس کے آگے صندوق سے نکال نکال کر کپڑوں کے ڈھیر لگا دیے۔ تمام کپڑے تیز رنگ کے تھے اور سب پر بہترین کشیدہ کاری تھی۔

"بی بی..... یہ کپڑے گلفشاں کے جہیز کے لیے یہ بدنصیب بناتی رہتی ہے اسے یقین ہی نہیں آتا کہ گلفشاں..... خیر بیٹی اس میں سے کوئی جوڑا پہن لو، بھیگ گئی ہو سردی لگ جائے گی۔" روزی خان افسردہ سا وہاں سے چلا گیا۔

"وہ نہیں یہ..... !میں نے تیرے لیے بنایا ہے۔ دیکھو اچھا ہے نا؟" ورشا نے ان سوٹوں میں سے قدرے ہلکے کلر اور ہلکی کڑھائی والا سوٹ منتخب کیا تو صابرہ جو خود بھی دوسرا لباس تبدیل کر کے آئی تھی اس کے ہاتھ سے وہ سوٹ اٹھا کر سرخ کلر کا فراک سوٹ اٹھا کر اسے دیتی ہوئی پوچھنے لگی۔ سرخ سوٹ پر شوخ رنگوں کی دیدہ زیب کڑھائی کے ساتھ چھوٹے چھوٹے شیشے بھی لگے ہوئے تھے۔ وہ کڑھائی فراک کے دامن، چولی، آستینوں کے علاوہ شلوار کے پائنچوں اور دوپٹہ پر کی گئی تھی سردی اسے شدت سے لگنے لگی تھی۔ صابرہ کی آنکھوں میں جلتی شوق واصرار کی مشعلیں اسے مجبور کر گئیں۔

وہ خاموشی سے سوٹ اس کے ہاتھ سے لے کر بدلنے چلی گئی۔

وہ کپڑے بدل کر بال سکھانے لگی۔ صابرہ کئی بار اس کی بلائیں لے چکی تھی۔

"آجاؤ بیٹی، کھانا کھاؤ نا معلوم تمہیں ہمارا کھانا اچھا لگے کہ نہیں لیکن بھوکے رہنے سے بہتر ہے کھالو" روزی خان نے نیچے بچھے ٹاٹ کے فرش پر دستر خوان بچھا کر کھانا رکھا تھا اور ورشا سے مخاطب ہوا تھا۔

"آؤ..... چل میں تجھے اپنے ہاتھ سے کھلاؤں گی، نامعلوم کب سے کھانا نہیں کھایا۔ سوکھ کر کانٹا ہو رہی ہے۔" صابرہ اسے بٹھا کر اپنے ہاتھ سے کھلانے لگی۔

"تم بھی کھاؤ نا۔" اس نے ایک لقمہ اس کے منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

"ہاں، میں کھاؤں گی، پہلے اپنی بچی کو کھلاؤں گی۔"

اس کی محبت کی تاثیر تھی یا پچھلے دنوں پیٹ بھر کر نہ کھانے کی وجہ یہ کہ اس نے بالکل سادہ سے انداز میں پکا ہوا چنے کی دال اور لوکی کا سالن تنور کی موٹی سوئی روٹی سے بہت رغبت سے کھایا۔ ساتھ صابرہ اور روزی خان بھی کھا رہے تھے۔

"کھانا بہت مزے کا تھا بابا، آپ تو کہہ رہے تھے مجھے پسند نہیں آئے گا۔"

"دل رکھ رہی ہو بیٹی، ورنہ بڑے بڑے لوگ ایسے کھانوں کو دیکھتے بھی نہیں۔" وہ انکساری سے مسکرا کر گویا ہوئے۔

"وہ بڑے لوگ ہوں گے۔" ورشا دستر خوان سے برتن سمیٹتے ہوئے بولی۔

"بیٹی..... تم بھی مجھے لگتا تو کسی بڑے گھر کی رہی ہو۔"

"ارے نہیں بابا، اچھا بتائیں باورچی خانہ کدھر ہے؟" اس نے جلدی سے بات گھماتے ہوئے پوچھا۔

"یہ ہم خود رکھ دے گا، تم ہمارا مہمان ہے، ہم مہمانوں سے کام نہیں کرواتا۔ تم آرام کرو ہم رکھ دے گا۔" وہ اس کے ہاتھ سے برتن اور دستر خوان لے گئے۔

صابرہ اب بالکل گم صم و خاموش بیٹھ گئی تھی۔ جیسے اس ماحول سے ان کا کوئی تعلق نہ ہو۔ کچھ دیر بعد روزی خان ٹرے میں تین کپ گرم گرم قہوے کے لے کر اندر داخل ہوا۔ ورشا اور صابرہ کو دینے کے بعد وہ اپنا کپ لے کر ایک طرف بیٹھ گیا۔

''میں چلوں گا اب، تم بیٹی دروازہ اندر سے بند کر لینا۔'' اس نے چھتری اور لالٹین اٹھا کر باہر کی جانب بڑھتے ہوئے ورشا سے کہا۔ ورشا اٹھ کر ان کی تقلید میں چلتی کمرے سے ملحقہ صحن میں آ گئی۔ صابرہ نے اسے اٹھتے دیکھ کر سختی سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ ورشا نے اس سے ہاتھ چھڑانے کی قطعی کوشش نہیں کی بلکہ بہت اپنائیت سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔

''بابا..... آپ کا جانا ضروری ہے؟ اتنی سردی ہو رہی ہے صبح چلے جایئے گا، اندھیرا ابھی بہت پھیل گیا ہے۔'' بوڑھے اور لاغر سے روزی خان پر اسے بہت ترس آیا۔

''نہیں بیٹے، اوپر والا مالک بخش دیتا ہے۔ نیچے والا مالک رحم نہیں کرتا۔ پیٹ پالنے کے لیے مشقت کرنی پڑتی ہے۔ جانا تو مجھے پڑے گا۔'' وہ مدھم انداز میں گویا تھے۔

''بابا..... آپ کے اور بچے نہیں ہیں؟'' صحن سے دروازے تک جاتے ہوئے ورشا مکمل معلومات حاصل کرنا چاہتی تھی۔ اسے ایک دم ہی ان دونوں سے از حد ہمدردی والگاؤ محسوس ہونے لگا تھا۔

''شادی کے پندرہ سال بعد گلشیاں پیدا ہوئی تھی۔ وہ اکلوتی اولاد تھی۔ اسے مالک نے دے کر دلہن لے بھی لیا۔'' وہ ایک غمگین آہ بھر کر گویا ہوئے اور اسے اندر سے کنڈی لگانے کا کہہ کر باہر نکل گئے۔

ورشا نے دونوں دروازے کے پٹ ملا کر بند کرنے کے بعد کنڈی لگائی اور صابرہ کے ساتھ اندر آ گئی۔ کمرے میں دو پلنگ تھے جن پر بستر موجود تھے۔ وہ ایک پلنگ پر لیٹ گئی جبکہ دوسرے پلنگ پر صابرہ لیٹ گئی تھی اور چند لمحوں بعد بے خبر سو رہی تھی۔ وہ کروٹ کے بل لیٹ کر اپنی زندگی کے ان پر پیچ حالات کے بارے میں سوچنے لگی۔ کمرے میں لالٹین کی زرد روشنی پھیلی ہوئی تھی جو خاموش و ویران ماحول کو مزید وحشت ناک بنا رہی تھی۔ سوچیں بن بلائے مہمانوں کی طرح اس پر وارد ہو رہی تھیں۔ وہ اس وقت سب سے فرار چاہتی تھی۔ تین دن کی ذہنی ٹوٹ پھوٹ نے اسے تھکا ڈالا تھا۔

اس وقت وہ کسی کے متعلق کچھ نہیں سوچنا چاہتی تھی۔

الجھنوں و تفکرات سے بچنے کے لیے اس نے آنکھیں بند کر ڈالیں اور نیند جلد ہی اس پر مہربان ہو گئی۔ وہ کچھ دیر بعد نیند سے بے سدھ پڑی تھی۔

☆☆☆

''صارم خان کیسا ہے؟'' گلباز خان، بابا جانی سے پہلے گلریز سے مخاطب ہوئے، پریشانی و بے قراری ان کے ہر انداز سے عیاں تھی۔ گلریز کے سلام کا جواب بھی انہوں نے نہیں دیا تھا۔

''بہتر ہے..... اسے ابھی ہوش آیا ہے۔'' گلریز باپ کے بگڑے تیوروں سے خائف تھا۔

''کیسا ہے وہ......؟ چوٹیں زیادہ تو نہیں آئیں۔''

''گلباز خان، چل رہے ہیں صارم خان کے پاس، کیوں اتنے فکر مند ہوتے ہو۔''

بابا جانی نے انہیں گلریز سے سخت لہجے میں بات کرتے دیکھ کر دھیرے سے سرزنش کی۔ وہ ہونٹ بھینچ کر خاموش ہو گئے اور تیزی سے ان کے ساتھ صارم کے روم کی طرف بڑھنے لگے۔

بیڈ پر دراز پٹیوں میں جکڑے صارم کو دیکھ کر انہیں اپنے حواس مختل ہوتے محسوس ہوئے۔ صارم کی آنکھیں بند تھیں۔ قریب ہی نرس کھڑی ڈرپ درست کر رہی تھی۔

بابا جانی نے اسے نظر بھر کر دیکھا، پھر طوز خان کو لے کر ڈاکٹر روم کی طرف چلے گئے۔

آکا جان بڑی بے تابی سے اس کی طرف بڑھے تھے اور اس کی وائٹ ڈریسنگ میں جکڑے ماتھے پر بوسہ دے کر گلریز سے مخاطب ہوئے۔

''تم کہہ رہے تھے، یہ ہوش میں آ گیا ہے۔''

''بابا جان! مجھے نرس نے یہی بتایا تھا۔ میں اندر آ رہا تھا لیکن آپ کو آتے دیکھ کر رک گیا۔''

''سر......! صارم صاحب ہوش میں آ گئے تھے۔ لیکن انہیں تکلیف بہت محسوس ہو رہی تھی۔ جس کی وجہ سے ڈاکٹر نے انہیں نیند کا انجکشن لگایا ہے۔ اب یہ شام تک جاگیں گے تو تکلیف کم محسوس کریں گے۔'' نرس نے انہیں صورتحال سے آگاہ کیا۔

''سسٹر......اسے کوئی خطرہ تو نہیں ہے؟ چوٹیں زیادہ گہری تو نہیں ہیں؟''

''خطرے سے تو یہ اب باہر ہیں، البتہ چوٹیں زیادہ گہری آئی ہیں۔'' نرس مطلع کر کے چلی گئی اور ساتھ ہی مریض کو ڈسٹرب نہ کرنے کی تاکید بھی کی۔

''سچ سچ بتاؤ......ہوا کیا تھا؟'' گلباز صوفے پر بیٹھ کر گلریز سے مخاطب ہوئے۔

''بابا......یہ پہاڑ سے گر گیا تھا۔''

''نہیں، اصل بات بتاؤ، یہ پہاڑ پر پہلی بار نہیں چڑھا تھا۔ یہ پہاڑوں کا بیٹا ہے، کسی چڑی مار کی اولاد نہیں ہے۔ اصل قصہ کیا ہے وہ بتاؤ؟''

ان کی قہر برساتی نگاہیں گلریز کو چھید رہی تھیں۔

اس کا پاؤں پھسل گیا تھا۔ وہ نگاہیں جھکا کر آہستگی سے گویا ہوا۔

''میں کبھی بھی یقین نہیں کروں گا۔ میرا دل گواہی دے رہا ہے یہ بات نہیں ہے۔''

وہ بیٹے کو خشمگیں نگاہوں سے گھورتے ہوئے اٹل لہجے میں گویا تھے۔ گلریز خان باپ کی سخت گیر طبیعت سے واقف تھا۔ وہ شش و پنج میں مبتلا تھا۔ اگر انہیں اصل بات بتاتا ہے تو مشکل، اگر خاموش رہتا ہے تو گلباز خان کبھی مطمئن نہیں ہوسکتے۔ صارم کے مکمل ہوش میں آنے تک وہ خاموش رہنا چاہتا تھا۔

''کیا بولنے کی صلاحیت سے بالکل محروم ہو گئے ہو؟'' وہ اسے گم صم و خاموش دیکھ کر غرائے۔

''نہیں بابا جان، آپ میری بات کو سچ نہیں مان رہے۔ میرا خیال ہے پھر آپ صارم کے ہوش میں آنے تک کا انتظار کریں تو بہتر ہے۔'' وہ آہستگی سے گویا ہوا۔

اسی دم بابا جان، طورخان کے ہمراہ اندر داخل ہوئے تھے۔ ان کے بارعب چہرے پر سنجیدگی و تھکن تھی۔ انہوں نے آہستہ آہستہ صارم کے بیڈ کی طرف قدم بڑھائے تھے اور جھک کر اس کی طرف بغور دیکھنے لگے۔ اس کے سرخ و سپید چہرے پر اس وقت زردی پھیلی ہوئی تھی۔ چہرے پر خراشیں معمولی سی تھیں۔ فراخ پیشانی پر بھاری ڈریسنگ تھی۔ دائیں بازو میں ڈرپ لگی تھی، ڈریسنگ دونوں بازوؤں پر موجود تھی۔ سرخ کمبل اس کے سینے تک ڈھکا ہوا تھا۔ کمبل ہٹا کر اس کے زخم شمار کرنے کی ہمت ان میں نہ تھی۔

''بابا جانی! آپ آرام کریں، صارم کو چند گھنٹوں بعد ہوش آجائے گا۔''

گلریز خان نے آگے بڑھ کر ان کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔

وہ جو یک ٹک اس کے چہرے، اس کی بند آنکھوں پر ساکت دراز پلکوں کو تک رہے تھے گلریز خان کی آواز انہیں حواسوں میں لائی۔ انہوں نے طویل سانس لے کر جھک کر اس کی جلتی پیشانی چومی۔ گلریز کے سہارے چلتے ہوئے صوفے پر نیم دراز ہو گئے۔

''بابا جانی! آپ فکر مت کریں، صارم خان ٹھیک ہے۔'' گلباز خان ان کے نزدیک بیٹھ کر انہیں دلاسہ دینے لگے۔

☆☆☆

بڑے کمرے میں ولی شہباز خان ٹہل رہے تھے۔ ان کے انداز میں بھڑکتے شعلوں جیسی تپش تھی۔ وہ صبح گھر پہنچے تھے۔ ان کے آتے ہی گل جاناں نے خوب مسالے لگا کر ورشا کے فرار کی خبر سنا ڈالی تھی۔ جسے سن کر وہ اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکے تھے۔

از حد غضب ناک انداز میں گل خانم کے کمرے میں گئے تھے۔ گل خانم پہلے ہی اس صدمے سے جیتے جاگتے مجسمے کی مانند ہو گئی تھیں۔ سجادیہ کا رو رو کر برا حال تھا۔

وہ کچھ بولے بغیر کمرے میں آ گئے۔ انہیں اپنے ملازمین کا انتظار تھا۔

''بڑے خان جی..... اب جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ مٹی ڈالیں اس بے حیا پر، کچھ کھا پی لیں میں نے صبح سے کچھ نہیں کھایا۔'' گل جاناں قریب آ کر لگاوٹ بھرے انداز میں بولیں۔

''ہوش کی دوا کر گل، یہاں میری، میرے قبیلے کی عزت و ناموس کا جنازہ نکل گیا اور تم مجھے کھانے کا کہہ رہی ہو اگر کھلانا ہی چاہتی ہو تو زہر کھلاؤ۔'' وہ غصے سے دہاڑ کر گویا ہوئے تھے۔

''رب نہ کرے، زہر کھائیں تمہارے دشمن خان۔''

''دشمن زہر کیوں کھائیں گے، وہ تو مٹھائیاں کھائیں گے، گھی کے چراغ جلائیں گے، ولی قبیلے کی ناموس، آن، بان، شان سب مٹی ہو گئی۔''

''زندہ تمہیں چھوڑوں گا..... ورشے گل، میں نے زندگی کی پہلی اور بھیانک غلطی کی ہے جو لڑکی کی ذات پر اعتماد و بھروسا کیا اور اپنی اور قبیلے کی حرمت کو داغ دار کر ڈالا۔ لیکن تم بچ کر کہیں نہیں جا سکتیں، میرے شکاری کتے تمہیں زمین کی تہہ سے بھی ڈھونڈ نکالیں گے تمہیں کہیں پناہ نہیں مل سکتی، کہیں بھی نہیں۔''

شہباز ولی خان زخمی شیر کی سی حالت میں مسلسل ٹہل رہے تھے۔ ہر گزرتا لمحہ ان کے غیظ و غضب میں مسلسل اضافہ کر رہا تھا۔ ان کا چہرہ آگ کی مانند دہک رہا تھا۔ وہ تصور میں ورشا سے مخاطب تھے۔

''اس دن کے لیے اسے شہر بھیجا تھا پڑھنے کے لیے بابا جان!'' پردہ ہٹا کر اسی دم شمشیر خان اندر داخل ہو کر بڑے طنزیہ و کٹیلے لہجے میں ان سے مخاطب ہوا تھا۔

''شمشیر خان! میرے زخموں پر نمک مت چھڑکو۔''

''پھر کیا پھول برساؤں؟'' وہ کڑوے لہجے میں گویا ہوا۔

''اگر خاموش نہیں رہ سکتے تو دفعہ ہو جاؤ یہاں سے۔''

''جوان بیٹے سے کس طرح بات کر رہے ہیں، اس بدذات لڑکی کا کیا ہم کیوں بھگتیں؟'' گل جاناں فوراً چمک کر بولیں۔

''ادے..... آواز ذرا نیچی کر کے بات کیا کرو اور یہ بات گھر سے باہر نہیں نکلنی چاہیے۔ سمجھ گئیں نا؟'' وہ ان کے چیخ چیخ کر بولنے پر معترض ہوا۔

''یہ بات بھی کوئی چھپنے والی ہے اور کب تک ہم چھپائیں گے۔ سب کو ہی معلوم ہے وہ آنے والی ہے۔'' انہیں بیٹے کی بات قطعی نہیں بھائی۔ وہ ناگواری سے بولیں۔

''کہہ دینا مر گئی وہ۔ وہیں دفنا دیا تھا اس کو۔'' بڑے خان نفرت انگیز لہجے میں بولے۔

''مرنا تو اسے ویسے بھی ہے اگر مل جائے ایک بار زندہ زمین میں دفن نہ کر دیا تو شہباز خان نام نہیں میرا۔''

''میرے ہوتے ہوئے آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے بابا جان، جا رہا ہوں میں، شام تک ڈھونڈ نکالوں گا۔ اس وادی میں اڑنے والے پرندوں پر بھی ہماری نگاہ رہتی ہے۔ پھر انسان بھلا کس طرح چھپ سکتے ہیں؟'' شمشیر خان مخصوص متکبرانہ لہجے میں گویا ہوا۔

''نہیں بچے! اب تم آرام کرو، شاید تمہاری رات سوتے نہیں ہوئی! ابھی شہباز خان کے بازوؤں میں اتنی طاقت ہے کہ.....''

''نہیں بابا جان، ایسا ممکن نہیں ہے، کم از کم میری موجودگی میں آپ خوار ہوں۔ میں ڈھونڈ نکالوں گا اسے لیکن پھر آپ کو وعدہ کرنا ہوگا؟''

وہ خوشگوار موڈ میں تھا جو باپ کی سخت سرزنش کو بھی آسانی سے نظر انداز کر گیا تھا۔ ورنہ باپ کا بارعب انداز وہ برداشت نہیں کرتا تھا۔

''یہاں ہماری عزت پر بنی ہوئی ہے خان اور تمہیں وعدے وعید یاد آ رہے ہیں۔'' شہباز خان ایک مرتبہ پھر جھنجلا گئے تھے۔ وہ حقیقتاً ذہنی کرب میں مبتلا تھے۔

''ہمارے چہرے سیاہ کر کے فرار ہونے والی جب میرے ہاتھ لگے گی اس کا جو حشر کروں گا پھر کوئی مجھے نہیں روکے گا۔''

شمشیر خان نے مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے سرد خوفناک لہجے میں کہا۔

''کوئی کیا بول سکتا ہے؟ ایسی بدچلن و بدکردار لڑکیوں کا جو بھی انجام ہو۔ بھیانک و عبرت ناک ہو تا کہ آئندہ کسی لڑکی کو اپنا سوچنے کی ہمت بھی نہ ہو۔'' گل جاناں نے بہت مسرت سے بیٹے کی ہمت بندھائی تھی۔ وہ باپ کو حویلی کے اندر ہی رہنے کا کہہ کر باہر نکل آیا تھا۔

ڈیرے پر سمندر خان اور صمد خان ایک شخص کے ہمراہ موجود تھے۔ اسے دیکھ کر تینوں کھڑے ہو گئے۔ جبکہ ایک انجان شخص کو ڈیرے پر دیکھ کر اس کے تیور بگڑ گئے تھے کیونکہ یہاں صرف خاص خاص لوگ ہی آتے تھے۔

''کون ہے یہ؟'' ان کے سلام کے جواب میں اس نے بگڑ کر پوچھا۔

''خان..... مخبر ہے، ایک خاص خبر لایا ہے۔ اس لیے ہم اسے یہاں لے آئے۔'' سمندر خان جو اس کے مزاج و عادات سے واقف تھا، فوراً بولا۔

''کیسی خبر؟ کس کی خبر ہے۔'' وہ سہمے ہوئے شخص سے بولا۔

''خان..... خان وہ آپ کا نام لیتے تھے۔ آپ کی بہن۔''

''میری بہن میرا نام؟ کیا جانتے ہو بتاؤ..... بتاؤ۔ جلدی بتاؤ۔ ورنہ ابھی گردن توڑ دوں گا۔''

وہ ایک جست میں اس کے نزدیک پہنچا تھا اور اس کی گردن کچھ اس انداز میں پکڑی تھی کہ اس کی آنکھیں باہر کو نکل آئی تھیں۔

''بھونک..... بھونکتا کیوں نہیں؟''

''خان، خان..... اس کی گردن تو چھوڑو، یہ کس طرح بولے گا۔'' سمندر خان نے آگے بڑھ کر کہا تو اس نے جھٹکے سے اس کی گردن چھوڑ دی۔

''خان..... میں جانتا ہوں آپ کی بہن کہاں ہے۔''

☆☆☆

''کیا درست کہہ رہے ہو تم؟''

''ہاں خان، میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا اور کانوں سے سنا ہے۔''

''کیا دیکھا تھا؟ کیا سنا تھا جلدی بتا؟''

''شاہ قبیلے کا گلریز خان اپنے ملازم سے کہہ رہا تھا کہ بابا جانی قبیلے کی رسم و روایات کے خلاف بہرام خان کے خون کا بدلہ لینے کے بجائے جنگ سے بچنے کے لیے قتل کو حادثے کا نام دے رہے ہیں اور وہ ایسا کبھی نہیں ہونے دے گا۔ سرکار! آپ کو نیچا دکھانے کے لیے یعنی بدلہ لینے کے لیے اس نے آپ کی بہن کو اغوا کیا ہے۔ وہ کہہ رہا تھا کہ شمشیر خان سے ایسا بدلہ لے گا کہ وہ غیرت مند ہوگا تو غیرت سے خود ہی ڈوب مرے گا۔'' وہ شخص اس کے خوفناک تیوروں سے اس حد تک خوفزدہ ہو گیا تھا کہ بغیر رکے ساری باتیں بتاتا چلا گیا۔

شمشیر خان کے خون میں شرارے دوڑنے لگے۔ معاملہ اس کی توقع کے برعکس نکلا تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کوئی اس سے بدلہ لینے کا

ارادہ بھی کرسکتا ہے۔ ارادہ ہی نہیں بلکہ یہاں عملی ثبوت پیش ہو چکا تھا اور اس کے مقابل بہت ہوشیار، مکار و شاطر دشمن تھے جس نے دانستہ اس کی عزت و غیرت پر ہاتھ ڈال کر اس کی شہ رگ کو کچل ڈالا تھا۔

بے شک اس نے انہیں اپنے باپ کی بیٹیوں کے رشتے سے منظور کیا تھا، اور نہ کبھی اپنی بہنوں کے رشتے سے قبول نہیں کیا تھا لیکن اب سوال اس کی حمیت، باپ کی غیرت، قبیلے کی عصمت اور برادری کی عزت و ناموس کا پیدا ہو گیا تھا۔ اگر قتل کے بدلے قتل ہو جاتا تو انہونی یا ناقابل قبول بات نہ ہوتی مگر......

''تو نے یہ سب کہاں سے سنا؟'' سمندر خان نے سخت لہجے میں کہا۔

''خان! میں لکڑیاں اکٹھی کرنے گیا تھا۔ جب میں نے گلریز خان اور طور خان کو پتھروں اور گرے ہوئے درختوں سے سڑک کو بند کرتے دیکھا تو مجھے احساس ہوا کچھ گڑبڑ ہونے والی ہے۔ میں اپنی جان بچانے کے لیے درخت پر ہی خاموش بیٹھا رہا۔ پھر کچھ دیر بعد سڑک پر بڑے خان کی گاڑی آ کر رکی، راستہ بند دیکھ کر ڈرائیور منصور اور تربت خان باہر نکل آئے اور بی بی بھی چائے کا فلاسک لے کر سبزے پر بیٹھ گئیں۔ منصور خان اور تربت خان بھاری پتھروں کو ہٹا رہے تھے کہ پہاڑ کے پیچھے چھپے ہوئے گلریز خان اور طور خان نکلے۔ انہوں نے کوئی کپڑا سونگھا کر بی بی کو سیکنڈوں میں بے ہوش کر دیا پھر منصور خان اور طور خان کو گولیاں مار کر کھائیوں میں پھینک دیا۔ ساتھ ہی گاڑی کو بھی، اور پھر بی بی کو اٹھا کر اپنی گاڑی میں ڈال کر جنگل کی طرف لے گئے تھے۔'' وہ جلدی جلدی بول رہا تھا۔ شمشیر خان کی خون آشام نگاہیں ان کے چہرے پر تھیں۔ اسے اپنا دم نکلتا محسوس ہو رہا تھا جبکہ صمد اور سمندر خان مودب کھڑے تھے۔

''دو دن بعد آ کر بتا رہا ہے تو؟'' وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا سرد لہجے میں بولا۔

''خان! میں اسی وقت آ گیا تھا مگر حویلی سے معلوم ہوا نہ آپ تھے اور نہ بڑے خان، اس وجہ سے خاموش ہو گیا تھا۔''

''اچھا، اور کس کس کو بتایا ہے تو نے یہ سب؟'' وہ ایک دم اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا عجیب و سرد لہجے میں استفسار کرنے لگا۔

''نہ جی، میں نے کسی کو نہیں بتایا، کس کو بتاتا؟'' وہ بوکھلا کر سہمے ہوئے لہجے میں گویا ہوا تھا۔

''میں جانتا ہوں خان! اسے یہ ایسا بندہ نہیں ہے یہ سچ کہہ رہا ہے یہ۔''

''اچھا پھر تو ایسی اطلاع دینے پر 'خصوصی' انعام سے نوازنا چاہیے۔'' سمندر خان کی یقین دہانی پر وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔ مخبر انعام و اکرام کے تصور سے خوش ہو گیا تھا، گویا اطلاع دینے کا مطلب یہی تھا۔ ابھی مسرت سے اس کی باچھیں کھلی ہی تھیں کہ یکدم شمشیر خان کے ہاتھ میں پستول دیکھ کر اس کی آنکھیں خوف سے پھٹ گئیں۔ استعجاب سے کھلے ہونٹوں کے درمیان دو سرخ شعلے یکے بعد دیگرے گھسے تھے اور وہ اسی پل زمین پر اپنے خون میں پڑا تڑپ رہا تھا۔

''جا تجھے زندگی کی قید سے آزاد کیا۔ اس سے بڑا تحفہ تیرے لیے کیا ہو سکتا تھا۔ آزاد کر دیا تجھے زندگی کی مشقتوں سے۔''

☆☆☆

نہ معلوم کیا وقت تھا جب اسے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی بہت زور زور سے دروازہ دھڑ دھڑا رہا ہو۔ اس نے نیند سے بوجھل آنکھیں کھول کر خوفزدگی سے باہر صحن کی سمت دیکھا۔ لمحے کے ہزارویں حصے میں اندیشوں اور خوف کے ناگ پوری طاقت سے حملہ آور ہو چکے تھے۔ نیند چند لمحوں میں غائب ہو گئی تھی۔

وہ دوپٹہ درست کرتی متوحش سی کھڑی ہو گئی تھی لیکن ابھی ایک قدم بھی نہ بڑھایا تھا کہ اسے لگا جیسے کسی نے ٹانگ پکڑ کر پوری شدت سے کھینچی ہو۔ سنبھلتے سنبھلتے بھی وہ اپنے پلنگ پر گر گئی تھی۔ پھر غور کرنے پر معلوم ہوا کہ صابرہ بی بی کو اس کے شاید بھاگ جانے کا خوف تھا۔ وہ اس کی ٹانگ دوپٹے سے باندھ کر اپنی ٹانگ سے دوپٹہ باندھ کر سوئی تھی۔ وہ رات کو اتنی گہری نیند سوئی تھی کہ محسوس ہی نہ کر سکتی تھی۔ صابرہ بھی لگتا تھا برسوں بعد سوئی تھی جو اتنی نیند اتنی گہری اور پرسکون تھی کہ زور زور سے دروازہ پیٹے جانے اور ورشا کے اٹھنے، گرنے اور دوپٹے سے پاؤں آزاد کرنے کی کارروائی کے باوجود وہ یونہی بے خبر سوتی رہی۔

ورشا نے فکرمندی کی نگاہیں اس پر ڈالیں اور دروازہ کھولنے صحن کی جانب بڑھ گئی۔ گہرے بادل اب بھی چھائے ہوئے تھے۔ موٹی موٹی بوندیں گر رہی تھیں۔

''کون ہے؟'' اس نے وسوسوں وخوف کے درمیان پوچھا۔

''دروازہ کھولو، میں ہوں بیٹی روزی خان۔'' باہر سے روزی خان کی آواز سن کر اس کے منتشر حواس ٹھکانے آ گئے۔ فوراً دروازہ کھول ڈالا۔''

''سو رہی تھیں بیٹی، میں کب سے دروازہ بجا رہا ہوں۔'' وہ اندر آ گئے۔ ہاتھ میں پکڑی چھتری اور لالٹین، دوسرے ہاتھ میں کاغذ کا لفافہ تھا۔ لفافہ انہوں نے ورشا کی طرف بڑھایا۔ چھتری اور لالٹین کمرے سے ملحقہ چھوٹی سی کوٹھری میں رکھ کر وہ کمرے میں آ گئے۔ ورشا دروازہ بند کر کے کمرے میں آ گئی تھی اور لفافہ لکڑی کی میز پر رکھ دیا تھا۔

''حیرت ہے صابرہ ابھی تک سو رہی ہے۔ ورنہ جب سے گلفشاں ابدی نیند سوئی ہے اس بدنصیب کی نیند ہی اڑ گئی تھی۔'' روزی خان بیوی کو گہری پرسکون نیند سوتے دیکھ کر آزردہ وغمگین لہجے میں گویا ہوا۔ پھر اپنی نم ہو جانے والی آنکھوں کی نمی صاف کر کے میز پر رکھا لفافہ اٹھا کر خاموش بیٹھی ورشا سے پوچھنے لگا۔

''بیٹی! تم ناشتے میں کیا کھاؤ گی؟ میں انڈے اور ڈبل روٹی لے آیا ہوں، مکھن گھر میں موجود ہے اگر کچھ اور کھانا ہو تو بتا دو میں لے آؤں گا۔''

''آپ نے اتنا تکلف کیوں کیا بابا! جو گھر میں موجود تھا وہ میں کھا لیتی۔''

''تکلف کیسا بیٹی! آپ مہمان ہو ہمارا، مہمان اللہ کی رحمت ہوتا ہے بیٹی! اللہ کی رحمت تو خوش نصیبوں پر ہوتی ہے۔''

''ہاں بابا! آپ جیسے لوگ بھی رحمت ہوتے ہیں۔ مجھ جیسے لوگوں کے لیے جو رشتوں کے لامتناہی جال اور سائبان کے ہوتے ہوئے بھی بے آسرا اور بے ٹھکانہ ہو جاتے ہیں۔'' اس نے دلسوزی سے کہا تھا اور منہ ہاتھ دھونے صحن کی جانب بڑھ گئی تھی۔

☆☆☆

کہا تو تھا کہ سرابوں میں پیر مت رکھنا

کہا تو تھا کہ گلابوں سے خار چن لینا

کہا تو تھا کہ سویروں میں دھوپ مت لکھنا

کہا تو تھا کہ ستاروں کا ٹوٹنا تکنا

کہا تو تھا کہ اندھیروں سے دوستی رکھنا

کہا تو تھا کہ نہیں زندگی میں مرنا تم

کہا تو تھا کہ محبت کبھی نہ کرنا تم

صارم کو ہوش آ چکا تھا۔ بابا جانی، گلباز خان اس سے چند باتیں کرنے کے بعد اس کے اصرار پر گھر چلے گئے تھے کیونکہ ان کے سامنے اس نے خود کو سنبھال لیا تھا۔ کسی طرح بھی انہیں یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ وہ ازحد تکلیف میں ہے۔ ان کے پژمردہ چہرے، سرخ فکرمند کی چھلکاتی نگاہیں اس امر کی غماز تھیں کہ وہ رات بھر سوئے نہیں تھے۔

وہ گلریز خان کو اس کی مکمل دیکھ بھال کرنے اور خیال رکھنے کا کہہ کر مجبوراً گھر لوٹ آئے تھے کہ گھر پر موجود عورتوں کے لیے ان میں سے ایک کی غیر حاضری بھی پریشانی میں مبتلا کر سکتی تھی۔ وہ لوگ گلریز اور صارم کی غیر موجودگی کے باعث ویسے ہی پریشان تھیں۔

ان کے جانے کے بعد ایک مرتبہ پھر صارم نیند اور دوائیوں کے زیر اثر سو گیا تھا۔

پھر رات کے اگلے پہر وہ جاگا تھا۔ کمرے میں ہلکی روشنی تھی۔ اے سی آن ہونے کے باعث خنکی پورے کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ طور خان نیچے ماربل کے فرش پر فوم کا گدا بچھائے بے خبر سو رہا تھا۔ سامنے بچھے سنگل فولڈنگ بیڈ پر گلریز کروٹ کے بل لیٹا ہوا نہ معلوم سو رہا تھا یا جاگ رہا تھا، صارم کی جانب اس کی پشت تھی۔

صارم نے نگاہ وہاں سے ہٹا کر ڈرپ اسٹینڈ پر ڈالی، اس کی غنودگی کے دوران فوراً ڈرپ نئی لگائی گئی تھی۔ وہ خاموشی سے قطرہ قطرہ گرتے اس پانی کو دیکھنے لگا جو توانائی بن کر اس کے جسم میں داخل ہو رہا تھا لیکن اسے اپنا جسم بے جان ہی محسوس ہو رہا تھا۔

آدھی رات کے اس پہر میں سناٹے ویرانی، خاموشی و وحشت وہ اپنے اندر پوری طاقت سے سرایت ہوتے محسوس کر رہا تھا۔ جسم سے زیادہ گہرے گھاؤ اس کی روح پر لگے تھے۔

اس کا اعتماد، اس کی نیک نیتی،

اس کا جذبہ ایثار و ہمدردی۔

مروت و اعتماد کو ورشا کی اس سفاکی، خود غرضی، احسان فراموشی و بے حسی نے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ بظاہر ازحد معصوم و لکش نظر آنے والی لڑکی، اندر سے اس حد تک بے رحم و بے مروت ہوگی۔

''جاگ گئے؟ کیا سوچ رہے ہو؟'' گلریز نے جو سویا نہیں تھا۔ کروٹ بدل کر اس کی طرف رخ کیا تو صارم کو آنکھیں کھولے، سوچوں میں مستغرق دیکھ کر اس کے قریب چلا آیا اور قریب رکھی چیئر پر بیٹھ کر استفسار کرنے لگا۔

''آں..... ہاں کچھ بھی نہیں۔''

''کچھ تو سوچ رہے ہو؟''

''یہی کہ تم اگر مجھے اٹھا کر نہیں لاتے تو اب تک میں ''اوپر'' پہنچ چکا ہوتا۔''

''صارم خان! میں نے بابا جان اور بابا جانی کو مطمئن کرنے کے لیے کہانی بنائی تھی کہ تم شکار کرتے ہوئے پاؤں پھسل جانے کی وجہ سے گر گئے اور میں اسپتال لے آیا۔ اس کہانی سے وہ دونوں مطمئن ہو گئے۔'' وہ جھک کر اس کے چہرے پر گہری نظر ڈالتے ہوئے گویا ہوا لیکن میں حقیقت حال جان کر رہوں گا، اور تم مجھے احمق نہیں بنا سکتے سمجھے۔''

''میرے خیال میں بنے بنائے کو بنانا محض حماقت اور وقت کا زیاں ہے۔'' وہ مسکرا کر شریر لہجے میں بولا۔

''مجھے باتوں میں مت اڑاؤ، خان، ٹھیک ٹھیک بتاؤ، وہ لڑکی کہاں گئی؟ تم پہاڑ سے گرے نہیں بلکہ گرائے گئے ہو، اور وہ لڑکی تمہیں گرا کر بھاگ گئی نا؟'' گلریز کا لہجہ یقین سے پر تھا۔

''ہوں، کچھ ایسا ہی ہے۔'' وہ نگاہیں چرا کر گویا ہوا۔

''لیکن، کس طرح؟ کیسے صارم خان! وہ لڑکی اتنی زور آور تھی کہ تم جیسے مضبوط و قوی آدمی کو گرا کر بھاگ گئی؟''

''زور آور نہیں بخت آور کہو۔ یا شاید میرا نصیب ہی سیاہ ہو گیا تھا۔ اس وقت جو کچھ بھی ہوا، میں اس وقت کچھ بھی اس کے متعلق سوچنا یا بتانا نہیں چاہتا۔ تم اب کچھ نہیں پوچھو گے۔'' وہ بے حد سنجیدہ انداز میں گویا ہوا تھا۔

''ٹھیک ہے۔ میں نہیں پوچھوں گا مگر سوچنے پر تم پابندی نہیں لگا سکتے تم جیسے لوگوں کے ساتھ یہی ہوتا ہے اور ہونا بھی یہی چاہیے۔'' گلریز غصے سے کھڑا ہو کر بڑبڑا رہا تھا۔ ''بہت ترس آ رہا تھا نا تمہیں اس چڑیل پر، دیکھا کہا تھا نا عورت پر کبھی یقین نہ کرنا۔ وہ موقع ملتے ہی ڈس لیتی ہے۔ بندے کو تڑپنے کا موقع بھی نہیں ملتا۔ شکر کرو، میں رک گیا تھا۔ مجھے کچھ کچھ احساس تھا کہ تمہاری ہمدرد طبیعت، کوئی نہ کوئی گل ضرور کھلائے گی۔''

''پلیز، گلریز، سو جاؤ رات بہت ہو چکی ہے۔''

''تم مجھے اصل بات بتاؤ پہلے پھر مجھے نیند آئے گی۔'' وہ سنجیدگی سے بولا۔

''گلریز، میں اس وقت جسمانی و روحانی اذیت سے شدید دوچار ہوں۔ فار گاڈ سیک پلیز، مجھ سے اس وقت کچھ معلوم نہ کرو تو بہتر ہے۔''

اس کے جھنجلائے و سرد لہجے میں کچھ ایسا سوز و کرب پنہاں تھا کہ گلریز نے چند ثانیے اس کی جانب تاسف بھرے انداز میں دیکھا پھر اسے اپنی طرف متوجہ نہ پا کر شانے اچکاتے ہوئے اپنے بیڈ کی طرف بڑھ گیا۔ کافی دیر تک بے چینی و اضطراب سے کروٹیں بدلتا رہا پھر آخر کار نیند کی ملکہ اس پر مہربان ہو چکی تھی۔

صارم آنکھیں بند کیے اپنے اندر برپا جنگ سے نبرد آزما تھا۔

''اعتماد، روشنی سے زیادہ روشن۔

پانی سے زیادہ شفاف۔

چاند کی کرنوں سے زیادہ اجلا۔

ستاروں سے زیادہ منور۔

اور شیشے کی مانند نازک ہوتا ہے۔ جو قائم رہے تو چٹان کی طرح مضبوط محسوس ہوتا ہے اور اگر ذرا سی ٹھیس لگ جائے تو کانچ کے برتن کی طرح ٹوٹ کر لمحوں میں ریزہ ریزہ ہو کر بکھر جاتا ہے۔

اس کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔

اس نے ورشا کو اندھیروں سے نکال کر اجالوں میں لانا چاہا تھا۔

اور اس نے......آہ......

اس نے زور سے آنکھیں بند کی تھیں۔

☆☆☆

''دھیرج دھیرج شمشیر خان! ایک دم اس قدر جذباتی مت ہو جایا کرو، کہ عقل و شعور کی تمام حدیں عبور کر بیٹھو۔'' شہباز خان اسے زخمی چیتے کی مانند انتقامی کارروائی مکمل کرتے دیکھ کر نرمی سے گویا ہوئے تھے۔

''ایسا بزدلی کا سبق مت دیا کریں بابا جان، اتنی بڑی بات ہو گئی، وہ ہماری عزت، غیرت، قبیلے کی عصمت پر داغ لگا گئے۔ ہماری لڑکی اغواء کر لی، ہماری حمیت و بہادری پر سیاہی پھیلا دی، پھر بھی آپ عقل و دانش کے گھوڑے دوڑانے کی تلقین کر رہے ہیں؟ دشمن ہماری عزت سے کھیل گئے اور ہم......''

''شمشیر خان! زبان کو لگام دو، ورشا خان، شہباز خان کی بیٹی اور تمہاری بہن ہے۔ اتنی ہمت و حیا ہے اس میں کہ وہ جان تو دے سکتی ہے لیکن باپ کے شملے اور بھائی کی غیرت پر کوئی داغ نہیں لگنے دے سکتی۔ اتنا مجھے یقین و بھروسہ ہے اس پر۔''

''لیکن اس بات پر کون یقین کرے گا؟ کس کس کی زبان پکڑیں گے؟ کس کس کی انگلیاں توڑیں گے؟ کس کس کا منہ بند کریں گے؟ کس کس کو بتائیں گے؟'' اس کا پور پور سلگ رہا تھا۔

''جب میرا دل مطمئن ہے تو مجھے کسی کی بھی پروا نہیں ہے۔''

''آپ کو پروا نہیں ہے بابا جان، لیکن میں برداشت نہیں کر سکتا۔''

''اس طرح کام نہیں ہوتے خان، یہ معاملہ ایسا نہیں ہے۔ ہمیں جرگے سے فیصلہ کروانا ہوگا۔ شاہ ولی قبیلے والوں کو ہم اس طرح نہیں

چھوڑیں گے۔"

"نہیں، میں بات جرگے تک نہیں پہنچنے دوں گا۔ یہ ہماری کھلی بے عزتی ہوگی، شمشیر خان سب کچھ برداشت کر سکتا ہے مگر رسوائی و ذلت ہرگز برداشت نہیں کرتا۔ میں نے صرف دو باتیں ہی ازبر کی ہیں 'مارو یا مر جاؤ' بس اس کے سوا کوئی تیسرا راستہ میں نے دیکھا ہی نہیں۔ اور نہ میں دیکھنا چاہتا بھی نہیں؟" وہ زمین پر قدم مار کر بہت ضدی و اٹل لہجے میں بولا۔ شہباز خان نے گہری نگاہوں سے بیٹے کے تنے اعصاب و دہکتے چہرے کو دیکھا پھر سر جھٹک کر کرسی پر نیم دراز ہو گئے۔ شمشیر خان نے کچھ دیر قبل آ کر اطلاع دی تھی کہ ورشا فرار نہیں ہوئی بلکہ اسے سبریز کے چچا کے بیٹے نے سبریز کے خون کا بدلہ لینے کے لیے اغوا کرا لیا ہے۔ ان کے اندر کہیں اطمینان و اعتماد کی معمولی سی طمانیت ابھری تھی۔ ورشا کے فرار کا سن کر انہیں یقین نہ آیا تھا کہ وہ ایسی ہو سکتی ہے۔ بے شک وہ ضدو خود سری میں بیٹوں سے بھی بڑھ کر نکلی تھی۔

دوسری بیٹیوں سے بالکل مختلف و منفرد

جو اپنا حق چھین کر لینا جانتی تھی۔

حالانکہ وہ اپنے حقوق، اپنی ذات کی اہمیت سے بھی بے بہرہ رہی تھیں۔

وہ خود کو منوانا جانتی تھی۔ اپنے وجود کی اہمیت سے بخوبی آگاہ تھی۔ جائز کو جائز، ناجائز کو ناجائز منہ در منہ کہنے کا حوصلہ رکھتی تھی۔ خلوص و محبت میں گردن کٹوا سکتی تھی مگر کسی کی فرعونیت کے آگے سر جھکانا اس نے سیکھا ہی نہ تھا۔

وہ شعلہ بھی تھی، شبنم بھی۔

پھول بھی تھی اور خار بھی۔

لیکن انہیں یقین تھا وہ بدکردار نہیں تھی۔ وہ باپ کے شملے کو زمین بوس کرنے سے بہتر مرنا پسند کرتی مگر اس قدر گھٹیا اور رذیل حرکت کی مرتکب نہیں ہو سکتی تھی۔ وقت نے ثابت کر دیا۔ ان کے گمان غلط نہیں تھے۔ ان کا اعتماد رائگاں نہیں گیا تھا۔ وہ ان کی امید و یقین کی کسوٹی پر کھری ثابت ہوئی تھی۔

"کیا سوچ رہے ہیں بابا جان؟ میں ہتھیار نہیں ڈالوں گا۔" وہ انہیں کرسی پر آنکھیں موندے بیٹھے دیکھ کر ہٹ دھرم لہجے میں بولا۔

"ہم جنگل میں زندگی نہیں گزار رہے شمشیر، ہم انسانوں میں رہ رہے ہیں۔ ہمارے قبیلے کے قانون ہیں جن پر عمل کرنا ہمارا فریضہ ہے۔ ہم کچھ حدود، کچھ روایتوں کے پابند ہیں۔ کچھ دستور ہیں جن کو نبھانے کا قانون ہم پر لاگو ہوتا ہے۔ بچی لڑکی کے معاملے میں ہمیں جرگے کا سہارا لینا ہوگا۔"

"نہیں..... نہیں..... نہیں بابا جان یہ بات گھر سے باہر جا نہیں سکتی، کہ....." یکدم ہی وہ طیش میں کھڑا ہو گیا تھا۔ آنکھوں سے گویا خون چھلکنے لگا تھا۔ "یہ بات گھر سے باہر نہیں نکلے گی۔" وہ سرد مہری سے کہنے لگا۔

"پھر کیا مقصد ہے؟ بچی کو ان کے حوالے کر دوں؟" شہباز خان، اس بار خاصے تلخ و ترش انداز میں گویا تھے۔

"یہ میں نے کب کہا؟"

''تمہاری باتوں کا کیا مقصد ہے؟''

''اسے تو مجھے برآمد کر لینا ہے لیکن وہ پھر اس گھر میں نہیں آئے گی۔''

''پھر کہاں جائے گی۔'' وہ اس کے انداز پر الجھ کر رہ گئے تھے۔

''قبرستان۔'' بھرپور سفاکی و درندگی اس کے وجود پر چھائی ہوئی تھی۔

''کیوں؟ دماغ خراب ہو گیا ہے تمہارا شمشیر خان، جانتے ہو وہ بے گناہ ہے۔ بے قصور ہے پھر کیوں؟''

''وہ بے گناہ، بے قصور ہے تو بے غیرت و بے حمیت ہم بھی نہیں ہیں۔ کس طرح ہم اسے قبول کر سکتے ہیں، جسے ہمارے دشمنوں نے۔''

''خاموش ہو جاؤ شمشیر خان۔'' وہ گرجے۔

''میں خاموش ہوں، خاموش رہوں گا۔ لیکن وہ اب زندہ نہیں رہے گی۔ یہ میرا فیصلہ ہے بابا جان! آپ بھول رہے ہیں۔ ہمارے ہاں ایسی لڑکیوں کو قبول نہیں کیا جاتا لڑکیاں قصوروار ہوں یا بے قصور، سزائے موت انہیں بھگتنی پڑتی ہے۔ ہاں میرا یہ وعدہ ہے۔ میں اپنے دشمنوں کو زندہ نہیں چھوڑوں گا...... انہوں نے ہماری عزت پر ہاتھ ڈال کر اپنی آنے والی نسلوں تک کے مستقبل تاریک کر ڈالے ہیں۔''

''پہلے ورشا کا پتہ لگاؤ، پھر بعد میں کرو جو کچھ کرنا ہے، کیونکہ پہل تمہاری طرف سے ہوئی ہے تم نے سبریز خان کو قتل کیا ہے۔ اس لیے ہوش و حواس سے کام لو۔ دشمنوں کو معاف کرنے کا میں بھی عادی نہیں ہوں۔'' وہ اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر ملائمت سے گویا ہوئے۔

☆☆☆

کمرے میں پر ہول سناٹا و ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ در و دیوار سے عجیب یاسیت و وحشتیں لپٹی دکھائی دے رہی تھیں۔ دل کو بے جان، دماغ کو مفلوج کر دینے والے وسوسے و پریشانیاں پوری طاقت سے حملہ آور تھیں۔

سجادیہ نے سوچی ہوئی سرخ نگاہوں سے ماں کے سفید ہوتے ہوئے چہرے کو دیکھا۔ دو دن گزرے تھے یا دو صدیاں؟

''یا...... شاید زندگی ہی اپنا احساس کھو بیٹھی تھی۔

کتنا کٹھن ہوتا ہے مرتے ہوئے کو بھلا دینا۔

لیکن اس سے بھی زیادہ اذیت ناک و نا ممکن ہوتا ہے، زندہ کو فراموش کر ڈالنا۔ سجادیہ نے ماں کے قریب بیٹھ کر آنکھیں موند لیں۔

زندگی تو پہلے بھی بہل نہ تھی۔

مگر اب تو گویا کانٹوں پر گھسٹتے ہوئے دن گزر رہے تھے۔

ہر آتی جاتی سانس کے ساتھ آنے والے لمحوں کا خوف تھا۔

ایک کند چھری گویا ہر لحظہ شہ رگ کی سمت بڑھ رہی تھی۔

یہ دستورِ دنیا آخر کب فنا ہوگا؟

قصور ایک کا ہوتا ہے۔

سزا سب کو بھگتنی پڑتی ہے۔

جرم ایک سے سرزد ہوتا ہے۔

پھانسی کا پھندا سب کا مقدر بنتا ہے۔

کیا ورشا اس حد تک خود غرض و خود پرست ہو سکتی ہے؟

وہ جو ظلم و جبر کے خلاف برسر پیکار تھی۔ کیا اپنے سگوں پر ایسا ''سفاک'' اور ''شرمناک'' ظلم کر سکتی ہے؟

کلیوں کی طرح پاکیزہ۔

شبنم کے قطروں کی طرح شفاف۔

شگوفوں کی پتیوں کی مانند نرم و نازک حساس و دل گداز احساسات رکھنے والی میری بہن، کیا اپنی نگاہوں سے گرا دینے والا عمل کر سکتی ہے؟

نہیں...... نہ دل اس بات کو مانتا ہے، نہ دماغ اقرار کرتا ہے۔

وہ ضدی، نڈر، خودسر ہی مگر...... اس کا کردار بہت مضبوط، ٹھوس، بے لچک اور قابل ستائش تھا۔

پھر...... یہ سب کیا ہے؟

میری بہن کہاں گئی؟ کیا حادثہ اس کے ساتھ گزرا؟

وہ ہمارے گرد محیط اندھیروں کو اجالوں میں بدلنے کا عزم لے کر یہاں آ رہی تھی...... پھر...... پھر کہاں اندھیروں میں ڈوب گئی؟

'ورشا' میری بہن، میری جان، میری آس، کہاں کھو گئی ہو تم؟ آ جاؤ خدارا چلی آؤ، دیکھو تمہارے دکھ میں جیتی جاگتی لاش بن گئی ہیں۔

در و بام سے وحشتیں و ویرانیاں لپٹ کر نوحہ پڑھتی نظر آتی ہیں۔ میں بہت تنہا ہو گئی ہوں، بہت دکھی، بہت پریشان، سب دشمن بن گئے ہیں۔ ایسا لگتا ہے قدموں کے نیچے نہ زمین رہی ہے، اور نہ سر پر آسمان، ہواؤں میں معلق ہو گئی ہوں، تم آ جاؤ ورشا تم آ جاؤ۔ سوچوں اور پریشانیوں سے گھبرا کر اس نے رونا شروع کر دیا۔

جب سے ورشا کے فرار کی خبر انہیں ملی تھی گل خانم صدمے سے گم صم ہو کر رہ گئی تھیں۔ گل جاناں نے اس دوران میں ان پر عرصہ حیات تنگ کر ڈالا تھا۔ ان دونوں کو کمرے میں مقید کر دیا تھا۔

شہباز خان پہلے ان سے بے اعتنائی و بے نیازی برتتے تھے، اب تو گویا وہ ان کی صورت دیکھنے کے بھی روادار نہ تھے۔ جیسے اس کے اس عمل کی ذمے داری ان پر عائد ہوتی ہو۔

گل خانم ارد گرد سے بیگانہ تھیں۔ جبکہ وہ گھنٹہ گزر گیا تھی کوئی بھی اس کٹھن گھڑی میں مہربان و پرسان حال نہ رہا تھا۔

☆☆☆

گزشتہ دوروز سے جاری بارش کا سلسلہ آج تیسرے دن اختتام پذیر ہوا تھا۔ وہ دوپہر کے کھانے سے فارغ ہو کر روزی خان اور اس کی بیوی صابرہ کے پاس بیٹھی ہوئی، بغور فریم میں جکڑے کپڑے پر مہارت سے رنگ برنگی ریشمی دھاگوں سے، دیدہ زیب انداز میں شاہکار بناتے ہوئے صابرہ کے ہاتھوں کو دیکھ رہی تھی۔

اسے حیرانگی کے ساتھ مسرت بھی ہو رہی تھی وہ گاؤں کی سیدھی، سادی ان پڑھ گنوار عورت کتنی مہارت سے، کتنی ذہانت و لیاقت سے کپڑوں پر رنگوں سے پھول تخلیق کر رہی تھی۔ وہ تعلیمی شعور سے نابلد تھی۔

باہر کی دنیا کے فیشن و سلیقوں سے بے بہرہ ہونے کے باوجود ان کی ذہنی وسعت، رنگوں کا انتخاب قابل ستائش تھا۔

ذہانت و قابلیت ڈگریوں کی محتاج نہیں ہوتی، وہ اپنا آپ منوا لیتی ہے۔

''بیٹی! آج موسم صاف ہے۔ اگر جانا چاہو تو میں چھوڑ آؤں گا۔'' روزی خان کی آواز نے ماحول کی خاموشی میں ارتعاش پیدا کیا تو وہ جو بہت محویت سے صابرہ کے چلتے رنگوں کی جادوگری پھیلاتے ہاتھوں کو دیکھ رہی تھی، یکدم ہی چونک کر سیدھی ہو گئی تھی۔

''نہیں، یہ کہیں نہیں جائے گی، میں اپنی گلفشاں کو کہیں جانے نہیں دوں گی۔'' صابرہ یکدم ہی تڑپ کر اٹھی تھی اور آگے بڑھ کر پوری طاقت سے ورشا کو لپٹا لیا تھا۔ اس کے اس بے ساختہ عمل سے قریب رکھی رنگین دھاگوں کی لچھیاں، شیشے کے چوکور ٹکڑے، فریم، سوئیاں، پتھریلے فرش پر بکھر گئے تھے۔

''میں کہیں نہیں جاؤں گی اماں، تمہیں چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گی۔'' وہ صابرہ کے سینے پر سر رکھے بھرائے لہجے میں بول رہی تھی۔

''صابرہ! تو تو بالکل جھلی ہو گئی ہے۔ کیوں یقین نہیں کرتی، ہماری گلفشاں اب اس دنیا میں.....''

''بابا! رہنے دیں، مت کچھ کہیں۔'' ورشا ان کی بات قطع کر کے یاسیت سے گویا ہوئی۔ صابرہ اس سے اسی طرح شدت سے لپٹی ہوئی تھی۔

''بیٹی! ایسا کب تک کرو گی؟ تمہیں گھر جانا ہے اپنے..... صابرہ کی خاطر کب تک رک سکتی ہو؟'' صابرہ جنگل سے لکڑیاں چننے چلی گئی تو روزی خان ورشا سے مخاطب ہوئے تھے۔ اس وقت شام کا گلابی رنگ کائنات پر پھیل رہا تھا۔

''بابا! میرا دل نہیں مانتا، اماں کو اس طرح چھوڑ کر جانے کو۔''

''لیکن بیٹی! کہاں سے آئی ہو؟ کیا تمہارے گھر والے انتظار نہیں کر رہے ہوں گے، بیٹیاں اس طرح گھر سے باہر رہنے لگیں تو، لوگ نہ صرف ان کا بلکہ گھر والوں کا جینا دوبھر کر دیتے ہیں، کیا بات ہے؟ کیوں گھر سے نکلی تھیں۔ اور اب گھر کیوں جانا نہیں چاہتی ہو؟''

فہم و فراست، شعور و آگہی کا ادراک ہر ذی ہوش رکھتا ہے۔ روزی خان عمر رسیدہ و جہاندیدہ شخص تھا، وہ اس کی خاموشی و صابرہ سے محبت، لگاؤ اور اپنائیت کو محسوس کر رہا تھا۔ اس بات نے اسے چونکا دیا تھا کہ تین دن گزرنے کے باوجود اس لڑکی نے گھر جانے کی بات نہیں کی تھی۔ وہ اتنے اطمینان و اپنائیت سے یہاں رہ رہی تھی گویا وہ یہاں کی مکین ہے۔ شکل و صورت، انداز و گفتار سے وہ کسی اعلیٰ و مہذب گھرانے کی لگتی تھی۔ اس کے کسی بھی انداز سے کسی بھی گھٹیا یا سطحی پن کا اظہار نہیں ہوتا تھا۔ وہ بہت پاکیزہ رکھ رکھاؤ رکھنے والی، پر وقار لڑکی تھی۔ پھر کیا وجہ تھی کہ وہ گھر نہ جاتی تھی اور نہ

کچھ بتانے پر آمادہ تھی؟

''تم نے بتایا نہیں بیٹی!'' وہ اسے گم صم دیکھ کر استفسار کرنے لگے۔

''بابا! کیا میں آپ پر بوجھ بن گئی ہوں؟''

''نہیں بچے نہیں، ایسی بات نہیں، انسان بھی بھلا کسی پر بوجھ بن سکتا ہے بلکہ تم تو ہمارے واسطے رحمت خداوندی بن کر آیا ہے بیٹی، صابرہ خانم، تمہیں دیکھ کر کیسا بہل گیا ہے۔ اپنا دکھ، اپنا روگ، اپنا غم بھول گیا ہے۔ تمہارے آنے سے ہمارا گھر روشن ہو گیا ہے۔ ہر جگہ اجالا پھیل گیا ہے۔ صابرہ خانم کو دیکھا تم نے، کتنا خوش رہنے لگا ہے۔ ورنہ وہ سب بھول گیا تھا۔ گھر، خاوند، زندگی، اپنا آپ، اسے صرف گلفشاں یاد تھی۔ ابھی بھی وہ بالکل ٹھیک تو نہیں ہوئی لیکن گھر کو گھر سمجھنے لگی ہے۔ ورنہ اسے گھر میں بند کر کے رکھنا پڑتا تھا۔ وہ رنگ برنگے کپڑے کا ڈھیر کے علاوہ کچھ نہیں کرتی تھی۔''

''میں بتاؤں گی بابا، اپنے بارے میں سب کچھ بتاؤں گی، آپ اب تو ڈیوٹی پر جا رہے ہیں۔ کل میں آپ کو سب کچھ بتا دوں گی، لیکن آپ کو ایک وعدہ کرنا ہوگا۔ آپ کسی کو میرے بارے میں نہیں بتائیں گے۔''

☆☆☆

جاناں

تجھے دیکھنا چاہوں تو

حیا سے میری پلکیں جھک جاتی ہیں

تجھے سوچنا چاہوں تو دل مرا

قیامت سی، دھڑکنوں کے حصار میں آ جاتا ہے

ایک انہونی سی خواہش

دل میں ہلکورے لینے لگتی ہے

میں بھی اپنا ہاتھ تیرے ہاتھوں میں رکھ کر

تجھے دیکھ سکوں سوچ سکوں

مگر پھر میں یہ سب سوچ کر رہ جاتی ہوں

خود سے شرما جاتی ہوں

''اے بی..... میں کہہ رہی ہوں ذرا تیز تیز قدم بڑھا لو۔ اگر اسی چیونٹی کی رفتار سے چلتی رہیں تو رات یہیں ہو جائے گی، اور گاڑی بھی نہیں ملے گی، دو دن پہلے ہی عادت ہوتے۔ اب یہ بھی ضائع کرنے ہیں؟ ادھر گاؤں کی عورتوں سے ناک میں دم کر رکھا ہے۔ اس کمبخت اپنے باپ کا پیغام سنتے ہی ایسی کلینک پر ٹوٹی ہیں جیسے سیاہ چونٹیاں جس کے مارے اپنے خولوں سے نکل پڑتی ہیں۔''

''افوہ، بوا جان! ایک تو آپ بہت بولتی ہیں۔ دیکھیں کتنا سہانا موسم ہو رہا ہے اور آپ کو احساس ہی نہیں ہے۔'' کائنات جو خوشگوار موسم سے خوش تھی، ان کے اکتائے و جھنجلائے انداز پر چڑ کر گویا ہوئی۔

''واہ..... موسم کی بھی خوب کہی بی بی، یہاں کا موسم تو ہوتا ہی سہانا ہے۔ مجھے ڈر ہے اگر اللہ نہ کرے، کہیں وہ سرخ آنکھوں والا مل گیا تو سہانا موسم، روح فرسا ماحول میں بدل جائے گا۔ دیکھتے بھی اس کا علاقہ ہے یہ۔''

''میں تو یہی چاہ رہی ہوں، وہ مل جائے۔''

''ارے کیوں بد دعا مانگ رہی ہو بی، اچھی اچھی باتیں سوچا کرو۔ نہ معلوم کون سی گھڑی قبولیت کی ہو۔'' حسب عادت وہ دل پر ہاتھ رکھ کر دہل کر بولیں۔

''آں..... ہاں، آپ تو بس یونہی اس ڈیسنٹ مین سے کبیدہ خاطر رہتی ہیں۔ کتنا اسمارٹ، ویل آف، چارمنگ اینڈ ہینڈسم ہے وہ۔''

''دیکھو بی! مرد کی وجاہت و خوبروئی نہیں دیکھی جاتی، اس کی شرافت و لیاقت، کردار کی بلندی اور ذات کی پختگی دیکھی جاتی ہے۔''

''کیا برائی ہے اس میں؟ اتنا بیسٹ تو ہے وہ۔''

''رہنے دو، آپ اس کے متعلق کچھ نہیں جانتیں۔ گاؤں کی عورتوں سے میں نے اس کے متعلق ایسی ایسی باتیں سنی ہیں کہ پوچھو نہیں تو بہتر ہیں۔'' بوا دونوں کانوں کو ہاتھ لگا تیں توبہ کرنے کے انداز میں گویا ہوئیں۔

کائنات کو ان کا یہ انداز بالکل نہ بھایا۔ وہ منہ بنا کر چلنے لگی۔

اونچے لمبے، سرخ و سپید بظاہر پر کشش و وجیہہ پرسنالٹی والے شمشیر خان سے وہ پہلی ملاقات میں ہی متاثر ہو گئی تھی۔ جب اس نے اس سے ہی اس کے متعلق شکایت کی تھی، وہ بھی خاصے سخت جملوں میں۔ اور جواباً اس کا پر سکون رد عمل اسے اس کا گرویدہ بنا گیا تھا۔

اب کلینک کھولنے کی اجازت دے کر تو اس نے بالکل ہی اسے اپنا اسیر کر لیا تھا۔

''ناراض ہو گئی ہو بی؟'' وہ اس کی خاموشی کو محسوس کر کے کچھ توقف کے بعد گویا ہوئیں۔

''نہیں، آپ سے ناراض ہو کر کیا کرنا ہے۔'' وہ مسکرا کر بولی۔

''میں جانتی ہوں، آپ برا مان گئی ہیں لیکن میں آپ کی بھلائی چاہتی ہوں۔''

''مجھے معلوم ہے بوا، آپ کی تمام چاہتیں، رفاقتیں، محبتیں، فوازشیں صرف اور صرف میرے لیے ہی وقف ہیں مگر میں اب بالغ ہو چکی ہوں۔ دودھ کے دانت ٹوٹے عرصہ ہو چکا ہے۔ انگلی پکڑ کر چلنے کی عمر سے دور نکل آئی ہوں۔ اچھے اور برے کی تمیز رکھتی ہوں میں بوا، آپ مجھے کمسن بچے کی طرح گائیڈ کرنا چھوڑ دیں۔'' وہ چلتے چلتے ان کی کمر کے گرد ہاتھ لپیٹ کر بولی۔ اس کے لہجے میں شوخی، آنکھوں میں سنجیدگی موجزن تھی۔ بوا نے ایک ٹھنڈی سانس بھری، اور بالکل خاموش ہو گئیں۔ سمجھ گئی تھیں۔ وہ اس وقت جذبات کے سمندر کی گہرائیوں میں ڈوب چکی ہے۔ اس وقت شعور و دانشمندی کی سطح پر لانا حماقت در حماقت تھی۔

ابھی تھوڑا ہی فاصلہ طے کیا تھا کہ سامنے پتلی سی سیاہ ناگن کی طرح بل کھاتی سڑک پر دوڑتی سرخ لینڈ کروزر کو پہچان کر حسب عادت بوا کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا سانس نیچے رہ گیا۔ یکدم ہی انہیں اپنا دل بند ہوتا محسوس ہوا۔

''کیا ہوا، بوا؟'' کائنات ان کا زرد چہرہ دیکھ کر استفسار کرنے لگی۔

''وہی ہونا جس کا ڈر تھا، شیطان کا نام لو وہ حاضر ہوا۔''

''حد کرتی ہیں آپ بھی بوا'' قریب آتی گاڑی کو وہ بھی دیکھ رہی تھی۔ غیر محسوس انداز میں اس کے دل کی دھڑکنوں کا ارتعاش بدل گیا تھا۔ وہ اپنی اس کیفیت و انداز پر خود بھی حیران تھی۔

''سلام ڈاکٹر صاب، کہاں جاتے ہو آپ؟'' گاڑی ان کے قریب آ کر رکی تھی۔ جس میں سے سمندر خان تیزی سے باہر آ کر خاصے مہذب و مودب انداز میں اس سے مخاطب ہوا تھا۔ ڈارک گرے کاٹن کے شلوار سوٹ پر آف وائٹ گرم چادر شانوں پر ڈالے..... اپنے مخصوص انداز میں شمشیر خان بھی گاڑی سے باہر آ گیا تھا۔

کائنات نے دھیمے لہجے میں اسے سلام کیا تھا۔ جس کا جواب اس نے اثبات میں سر ہلا کر دیا تھا۔ بوا نے بھی سلام کیا تھا مگر ان کی آواز اندر ہی گھٹ کر رہ گئی تھی۔

''کہاں جا رہی ہیں آپ؟'' اس کی سرخ نگاہوں کی تپش اس کے عارضوں پر گلال بکھیرنے لگی۔ پلکیں ایک دم منوں بوجھ تلے جھک گئیں۔

''ارے بھیا، ذرا پشاور تک جا رہے ہیں۔ کلینک میں نرسوں کی ضرورت ہے۔ وہاں کچھ لڑکیاں ہیں، جنہوں نے نرسنگ ٹریننگ لے رکھی انہیں ہی لینے جا رہے ہیں۔'' بوا جو کائنات کی کیفیت سے آگاہ تھیں، ہمت کر کے بولیں تو بولتی چلی گئیں۔

''اچھا، صمد خان! گاڑی میں لے کر جاؤ، ان کو جتنا وقت لگے جائے ان کو ساتھ لے کر آنا۔'' اس نے فوراً صمد خان کو حکم دیا۔

''ارے نہیں، آپ یہ تکلیف نہ کریں تو بہتر ہے۔ ہم وین میں چلے جائیں گے۔'' کائنات مسکرا کر گویا ہوئی۔

''تکلف آپ کر رہی ہیں۔ گھر میں گاڑی موجود ہے تو آپ کیوں دوسری گاڑیوں میں تکلیف اٹھائیں۔'' عادت کے برخلاف وہ نرم لہجے میں بولا تھا۔ اس کے مضبوط گلابی ہونٹوں پر در آنے والی دھیمی مسکراہٹ بہت آشنا بھلی لگ رہی تھی۔ اس کے گداز لہجے میں کچھ ایسا اسرار و قطعیت اور اپنائیت تھی کہ وہ مزید انکار نہ کر سکی۔ صمد خان نے دروازہ کھول دیا تھا۔

''کیا کر رہی ہیں؟ نہ معلوم کہاں پھڑ وادے یہ، کوتی آنکھوں والا۔'' بوا نے اسے آگے بڑھتے دیکھ کر سرگوشی کی جو اس نے سنی ان سنی کر ڈالی۔

''ہمارے یہاں کوئی عورت چادر کے بغیر نہیں گھومتی۔ مجھے امید ہے آئندہ آپ خیال رکھیں گی۔'' اس نے چار جٹ کے سیاہ کلر کے تنگ پائنچاسے، کرتے پر گلے میں ڈالے چندری دوپٹے کو دیکھتے ہوئے اپنی چادر شانوں سے اتار کر اسکے سر پر ڈالتے ہوئے سرگوشیانہ انداز میں کہا۔

سمندر خان اور صمد خان نے از حد حیران نگاہوں سے شمشیر خان کو دیکھا۔ پھر معنی خیز انداز میں ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

وہ شخص جو عزتیں تار تار کرنا، چادریں اتارنا اپنا فرض سمجھتا تھا۔ آج کس طرح عزت و احترام سے اس نے اس ڈاکٹر کے عریاں سر پر اپنی

عزت کی چادر ڈھانپ کر اپنا یا انوکھا روپ دکھایا تھا۔

''شکریہ، چھوٹے خان! آپ کو آئندہ شکایت نہیں ہوگی۔'' اس نے مسکرا کر تشکرانہ انداز میں کہا اور چادر کو اپنے گرد اچھی طرح لپیٹ کر گاڑی کے اندر بیٹھ گئی۔

☆☆☆

بعض اوقات کتنا دکھ دیتے ہیں وہ لوگ جن کو دل چاہتا ہے۔ جن کی دید کی آنکھیں منتظر رہتی ہیں۔

سماعت جن کی آہٹوں پر بڑھ جاتی ہے۔

دل جن کے لیے اپنے تمام درد اکر دیتا ہے۔

دل و دماغ جس کے تصور سے ہی گل و گلزار ہو جاتے ہیں۔

نگاہوں میں زندگی کی شمعیں جل اٹھتی ہیں۔

دھڑکنوں میں حیات افروز ہلچل مچلنے لگتی ہے۔

پھر اگر کوئی سنگدلی سے سب کچھ چھین لے تو؟

آنکھوں میں دید کی بجائے موت کی نیند دیتا چاہے؟

دل کی دھڑکنوں کو ہمیشہ کے لیے خاموش کرنا چاہے؟

سماعتوں میں وحشت ناک سناٹے۔

آنکھوں میں ابدی اندھیرے۔

اور زندگی کو موت کی اندھیری گود میں پھینک دے تو..... محبت کہاں ہوتی ہے؟ یہ دھوکہ فریب ریا بن جاتی ہے۔

محبت ہی انسان کے وجود کی بنیاد ہے۔

محبت ہی انسان کی شناخت ہے۔

پھر کیوں لوگ اتنی خوبصورتی، روشنی، چاشنی کو چھوڑ کر نفرت کی کڑواہٹ و تلخی سے دوسروں کی زندگی زہر زہر کر ڈالتے ہیں؟

صارم! کیا سوچ رہے ہو؟ نگریز جو مسلسل اسے سوچوں میں گرد و گردش سے بے نیاز لیٹے دیکھ رہا تھا اس کے قریب بیٹھتا ہوا نرمی سے گویا ہوا۔

''کچھ نہیں، کیا سوچوں گا سوائے اس کے کہ کب ان زنجیروں سے نجات ملے گی؟ تنگ آ گیا ہوں یہاں لیٹے لیٹے۔''

اس نے گہری سانس خارج کرتے ہوئے بیزار لہجے میں کہا۔ سوچوں کے اذیت ناک صحراؤں میں وہ ہمہ وقت ہی سرپٹ دوڑتا رہتا تھا۔

اس کی سب کلی دبے قراری ہنوز قائم تھی۔

ورشا نے اس کے خلوص، اس کی مروت، اس کی رواداری، اس کے درگزر و اعتماد کو کند چھری سے ذبح کیا تھا۔ اور اتنی سفاکی اور سنگدلی

سے کیا تھا کہ وہ ہر لمحہ، ہر آن، ہر ساعت اپنے زخموں میں ٹیسیں برداشت کرتے کرتے نڈھال ہو چکا تھا۔

"بہت جلد اٹھ جاؤ گے تم، بس چند دنوں کی بات ہے۔" گُلریز نے تسلی دی۔

"گھر پر بی بی جان اور سورے کو معلوم ہے؟ وہ بہت پریشان ہو رہی ہوں گی۔"

"نہیں، ان سے بابا جانی نے بہانہ کر دیا ہے کہ ہم دونوں زمینوں کے سلسلے میں شہر گئے ہیں۔ چند دنوں بعد آئیں گے۔ اسی وجہ سے بابا جانی اور بابا جان الگ الگ ٹائم پر یہاں آتے ہیں۔"

"آکا جان آئے تھے؟"

"ہاں۔ وہ صبح ہی آ گئے تھے، تم سو رہے تھے، کچھ دیر بیٹھ کر چلے گئے۔"

"مجھے اٹھایا بھی نہیں؟ کتنے دن ہو گئے ہیں ان سے بات کیے ہوئے۔" وہ خفگی بھرے انداز میں مخاطب ہوا۔

"تم مجھ پر ناراض مت ہو۔ میں نے بابا سے کہا تھا کہ تمہیں اٹھا دیتا ہوں لیکن وہ کہنے لگے تمہاری نیند خراب نہ کروں۔ وہ کل آ کر مل لیں گے۔"

"ان محبتوں نے ہی تو مجھے زندہ رکھا ہوا ہے۔"

"چائے پیو گے، منگواؤں؟"

"ہاں منگوا لو۔" وہ تکیوں کے سہارے نیم دراز ہو کر بولا۔

"صارم خان!" انٹر کام پر چائے کا آرڈر دینے کے بعد وہ کرسی گھسیٹ کر بالکل اس کے بیڈ کے قریب رکھ کر اس سے سنجیدہ لہجے میں مخاطب ہوا۔

"ہاں..... کیا ہوا؟" صارم نے اس کی جانب بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"تمہیں معلوم ہے؟ میرے اندر ہلچل مچی ہوئی ہے۔"

"اوہ..... رئیلی!"

"میں مذاق کے موڈ میں نہیں ہوں۔"

"مذاق کہاں کر رہا ہوں بلکہ شکر کر رہا ہوں تم جیسے بندے کے اندر بھی ہلچل مچی۔"

"صارم! ہومت، تم اچھی طرح سمجھ رہے ہو جو میں پوچھنا چاہ رہا ہوں۔"

"تمہارے خیال میں، میں علم نجوم جانتا ہوں؟ یا ساحرانہ طاقتیں حاصل کر رکھی ہیں میں نے جو مجھے آ کر آگاہ کر دیں گی کہ تم کیا پوچھنا چاہ رہے ہو؟"

"وہ لڑکی تمہیں پہاڑ سے دھکا دے کر کہاں گئی؟ اور تمہیں اس نے دھکا دیا کیسے؟ بلکہ تم اسے پہاڑ پر لے کر چڑھے کیوں؟"

"تمہیں کس طرح معلوم ہوا کہ وہ لڑکی گھر نہیں پہنچی؟" صارم اس کے دوسرے سوال کو نظر انداز کر کے چونک کر استفسار کرنے لگا۔

''میں نے ''مخبر'' چھوڑے ہوئے ہیں وہاں۔''

''کلیئر رپورٹ ہے؟'' صارم کی تمام بدگمانی ہوا بن گئی تھی۔

''ہاں...... وہاں پہلے یہ رپورٹ پہنچی تھی کہ وہ لڑکی اپنے عاشق کے ساتھ فرار ہو گئی ہے لیکن پھر میرے آدمیوں نے یہ بات ان کے کانوں تک پہنچائی کہ لڑکی کو ہم نے اغواء کروایا تھا سبریز خان کے قتل کا بدلہ لینے کے لیے......''

''پھر...... پھر کیا ہوا؟'' صارم اچانک در آنے والے واہموں میں گھرنے لگا۔

''پھر...... وہ لوگ پہلے ہی اس کے جانی دشمن ہو رہے تھے۔ زندہ اب بھی نہیں چھوڑیں گے اسے۔ کیونکہ اس لڑکی کی زندگی ان کی بے غیرتی اور قبیلے کی بے عزتی گردانی جائے گی۔ وہ اسے مارنے کے لیے تلاش کر رہے ہیں۔ تم کن سوچوں میں کھوگئے ہو یار! لو چائے پیو۔'' گلریز خان کینٹین سے چائے لانے والے لڑکے سے چائے کے مگ لے کر ان میں سے ایک اس کی طرف بڑھا کر بولا۔

''کہیں اس لڑکی نے خودکشی تو نہیں کر لی؟'' یہ خیال برق کی طرح کوندا تھا۔

''تمہیں دھکا دینے کے بعد؟'' گلریز خان تمسخر خیزی سے گویا ہوا۔

''ہوں۔ ہو سکتا ہے جب وہ گھر نہیں پہنچی تو کہاں جا سکتی ہے؟''

''تمہیں ضرورت کیا پڑ گئی تھی اسے پہاڑ پر لے کر جانے کی؟''

''وہ پانی پینا چاہتی تھی وہاں سے۔'' صارم جھنجلا کر بولا۔

''تم اتنے اس کے فرمانبردار تھے بلکہ سعادت مند تھے۔ اس نے کہا اور تم چل پڑے؟''

''گلریز خان! میں نے تمہارے عمل کی سزا پائی ہے۔''

''میں نے اپنی ذات کی تسکین کے لیے کچھ نہیں کیا تھا، جو کچھ کیا، سبریز خان کی محبت کا قرض اتارنے کے لیے کیا۔ میں اپنے بڑوں کی طرح حقیقت پر مصلحت کا نقاب نہیں چڑھا سکتا۔ قتل کو حادثے کا نام دے کر، اپنے دشمنوں کو مزید من مانی و درندگی کی اجازت دے کر۔ لڑکی کو میں نے کسی غلط فعل کے لیے اغواء نہیں کیا تھا......''

ایک دم ہی دونوں کی نگاہ دروازے پر پڑی تھی جہاں افضل خان ہاتھ میں براؤن سونے کے دستے والی چھڑی پکڑے ساکت و صامت کھڑے تھے۔ گلریز کے ہاتھ سے چائے کا مگ گر گیا۔ صارم خان بھی بیٹھے بیٹھے بوکھلا کر کھڑا ہو گیا تھا۔

☆☆☆

''اوہ! آپ بڑے خان کی بیٹی ہو؟'' اس نے صبح ان کی واپسی پر ساری بات بالکل درست حرف بہ حرف ان کو سنا ڈالی تھی۔ وہ اتفاقاً وہاں صابر دین بی بی کی وجہ سے آ گئی تھی یا اس رات اس کی غیبی مدد ہوئی تھی۔ شاید اسے ابھی زندہ رہنا تھا۔ اس کی سانسیں باقی تھیں۔

جب تک وقت نہ آ جائے، موت خود زندگی کی حفاظت کرتی ہے۔

''اگر صابرہ وہاں نہ آتیں، روزی خان اس پر ترس کھا کر تنہائی، رات اندھیرے اور برستی بارش کا خیال کر کے گھر نہ لاتا تو وہ تھکن، بھوک اور سردی سے اکڑ کر مر جاتی۔ تین دن وہ صابرہ کے بہانے سے رہی تھی۔ روزی خان کے استفسار کے باوجود اس کو اپنا یوں رہنا پسند نہ تھا پھر وہ روزی خان کو پرکھ چکی تھی کہ وہ یقیناً اس کی مدد کرنے سے انکار نہیں کر سکتے۔ بات صاف ہونے کے بعد وہ بہ آسانی و بے خوف وہاں رہ سکتی تھی۔

''ہاں بابا! اگر آپ اس رات مجھے نہ ملتے تو شاید میں اب تک زندہ نہیں ہوتی۔''

''ایسا نہیں کہو بیٹی، اللہ بڑا غفور الرحیم ہے۔ وہ اپنے بیگناہ، بے خطا بندوں کی مدد ضرور کرتا ہے۔ آپ بے فکر ہو کر رہو یہاں اگرچہ یہ جھونپڑی آپ کے قابل تو نہیں ہے، مگر سر چھپانے کا آسرا ضرور ہے۔'' روزی خان اس کی حیثیت جان کر ایک دم ہی مرعوب و مودب ہو گیا تھا۔

''آپ کی یہ جھونپڑی سونے چاندی کے بنے محلوں سے بہت خوبصورت و مضبوط ہے بابا! یہاں خلوص، محبت، بے غرض و بے لوث پیار کرنے والے لوگ رہتے ہیں۔ ایسے لوگ جن کو دیکھ کر محسوس ہوتا ہے انسانیت ابھی مری نہیں ہے۔ خود غرضی و ظلم کی حکمرانی پوری طرح سب پر مسلط نہیں ہوئی۔ فرشتوں کی خصلت رکھنے والے لوگ، ابھی اس مکر و فریب، نفسانفسی و مادہ پرست دنیا میں موجود ہیں، جبھی یہ دنیا بھی قائم ہے ابھی۔''

''شرمندہ نہیں کرو بیٹی، یہ ہمارا فرض ہے جو ہم نبھا رہے ہیں۔ ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان پر بہت حق ہے۔''

''بابا! آپ کوشش کیجیے گا کسی طرح میں ادے اور سخاویہ سے ملاقات کرلوں۔''

''نہ... نہ بیٹی! ابھی منہ سے بھی ایسی بات نہیں نکالنا، شمشیر خان، بہت غصہ ور اور نڈر آدمی ہے۔ وہ بندوق پہلے چلاتا ہے سوچتا بعد میں ہے۔ ہم بھی آج کل اس کو بہت زیادہ غصے وجلال میں دیکھتا ہے۔ بڑا خان بھی ایسا ہی مزاج میں ہے۔ حویلی کے دروازوں پر پہرہ بھی بہت سخت ہو گیا ہے۔''

''یہ سب میری وجہ سے ہے۔'' ورشا غمگین لہجے میں بولی۔

''دکھی نہیں ہو بیٹی تم بے گناہ ہو رب، ضرور کوئی راہ نکالے گا۔''

''بابا! آپ کو ایک کام کرنا ہوگا۔'' ایک دم ہی اسے خیال آیا کہ صارم کے متعلق معلوم کروایا جائے۔ اس کی لاش ملی یا نہیں، کیونکہ چھ سات روز گزر چکے تھے۔ اب تک اس کے ساتھیوں تک اطلاع پہنچ چکی ہوگی۔

''شاہ قبیلے میں معلوم کر کے آئیں کہ اس خبیث کی لاش ملی یا نہیں؟'' اس نے از حد نفرت و حقارت بھرے انداز میں کہا۔

''وہاں میری ماسی کا بیٹا ہوتا ہے۔ اس سے ملنے کے بہانے سے جاؤں گا پھر باتوں باتوں میں معلوم کروں گا۔''

''ضرور جائیے گا بابا، اس ذلیل شخص کی وجہ سے آج گھر بدر ہوں۔ اپنوں کے اتنے قریب ہوتے ہوئے بھی کتنی دور ہوں۔ نہ معلوم ان پر کیا گزر رہی ہوگی؟ چھوٹی ادے نے تو ان کی زندگی دوزخ بنا ڈالی ہوگی۔ جیتے جی وہ آگ میں جل رہی ہوں گی۔''

اس نے بے اختیار گھٹنوں میں چہرہ چھپا لیا اور شدت سے رونے لگی۔

☆☆☆

''بابا جانی آ......آ...... یہ نا......'' گلریز خان بوکھلا کر بولا۔

''ہونہہ...... جانوروں کا شکار کرنے گئے تھے یا لڑکی کا؟''

وہ دونوں کو کھا جانے والی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولے کہ ندامت و شرمندگی سے ان کی نگاہوں کے ساتھ سر بھی جھکا گئے تھے۔

''گلریز جذباتی اور بے عقل انسان ہے لیکن صارم، صارم خان، مجھے تم سے......'' بولتے بولتے انہوں نے ملامت آمیز نگاہوں سے صارم کی طرف دیکھا۔ ''مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی صارم!''

''بابا جانی، بابا جانی، صارم بے قصور ہے۔ یہ سب میں نے کیا ہے۔ صارم کو تو ریسٹ ہاؤس جا کر معلوم ہوا تھا۔'' گلریز ان کے قریب جا کر عاجزانہ لہجے میں بولا۔

''کس طرح یقین کریں ہم؟ آج ہماری تمام تربیت، اخلاق، اعتماد کا خون ہو گیا ہے۔ ہماری سات پشتوں میں کسی نے ایسا ذلیل، گھٹیا اور پست کام نہیں کیا۔ ہمارے بزرگوں کی روحیں بھی تڑپ اٹھی ہوں گی۔ کیا صلہ دیا ہے تم نے؟ واہ! شرم سے ہماری گردن ہی جھکا دی۔ اس دن کے لیے، اس وقت، اس گھڑی کے لیے ہم زندہ تھے شاید'' ان کی کانپتی، لرزتی، دکھوں و صدموں سے بوجھل آواز نم تھی۔

''بابا جانی! پلیز جو کچھ بھی ہوا، اس پر ہم شرمندہ ہیں۔''

''تمہارے شرمندہ ہونے سے اس لڑکی کی عصمت مل جائے گی؟ اس کی عزت، حیا، وقار، بحال ہو جائے گا؟'' وہ گرج کر بولے۔

''ایسا کچھ نہیں ہوا بابا جانی! آپ کی تربیت، اعتماد اتنا کھوکھلا اور کمزور نہیں ہے جو ایک لڑکی کی خاطر نفس سے شکست کھا جائے۔'' اس بار صارم کے لہجے میں تندی و سرد مہری تھی۔

''کون یقین کرے گا؟ کس طرح وہ لڑکی اپنی بے گناہی و پاک دامنی ثابت کرے گی؟''

''آپ بیٹھیں بابا جانی۔''

''ہاتھ مت لگاؤ مجھے، مت گندہ کرو میرے وجود کو'' انہوں نے بہت طیش میں گلریز کے ہاتھ کو اپنے شانے سے جھٹکا تھا۔ گلریز کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑ گیا تھا۔

''بابا جانی! بات سمجھنے کی کوشش کریں۔'' صارم بہت مشکل سے بیڈ سے اٹھا تھا۔ لمحے بھر میں شدید ترین تکلیف سے اس کی رنگت زرد پڑ گئی۔ سرد موسم کے باوجود اس کا چہرہ پسینے پسینے ہو گیا۔ اسے اس طرح اٹھتے دیکھ کر وہ اس کی طرف بڑھے تھے۔

''بستر سے کیوں اٹھتے ہو، زخموں کے ٹانکے کھل جائیں گے۔'' گلریز نے اسے پکڑ کر وہیں بیڈ پر لٹا دیا۔ بابا جانی اس سے مخاطب ہوئے تھے۔

''آپ کی بدگمانی بڑھتی جا رہی ہے بابا جانی!'' صارم گلریز خان کو زیر عتاب دیکھ کر اس کی سائیڈ لیتے ہوئے بولا۔ حالانکہ اس طرح اٹھنے سے اس کے زخموں میں ناقابل برداشت درد ہونے لگا تھا جس کو برداشت کرنے کی کوشش میں اس کا چہرہ سرخ ہوتا جا رہا تھا۔

''آج مجھے اتنا صدمہ ہوا جتنا سبریز خان کے جانے پر بھی نہ ہوا تھا۔''

بابا جانی شکستہ و بکھری دیوار کی مانند ریزہ ریزہ ہوئے جا رہے تھے۔ ''سبریز خان کا وجود بے مول، اس کا خون ارزاں اور اس کی موت کوئی اہمیت نہیں رکھتی تھی؟ جو آپ نے اس کے قتل کو حادثے کا نام دے کر معاملہ ختم کر ڈالا؟''

''پھر کیا کرتا؟ ایک قتل کے بدلے ہزاروں قتل کروا تا؟ دشمنی کی آگ جو کئی نسلوں کو بھسم کرنے کے بعد اب ٹھنڈی ہوئی تھی۔ اسے پھر بھڑکا دیتا؟ سبریز شہید ہوا، اس نے اپنے دشمن کو قتل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ ہمارا مذہب ہمیں آپس میں دست و گریبان ہونے کا سبق نہیں دیتا۔ تم نے وہ حدیث نہیں سنی کہ اگر ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو قتل کرے گا تو وہ جنت میں نہیں جائے گا۔ معاف کر دینا، درگزر کر دینا بہترین وصف ہیں میرے بچو! میں نے تمہیں ہمیشہ یہی سبق دیا ہے۔ دنیا کی زندگی بہت مختصر ہے۔ سراسر دھوکہ وفریب۔ کیوں شیطان کے شر میں پھنس کر، اس کے بہکاوے میں آ کر اپنی آخرت تباہ کر رہے ہو۔ سبریز چلا گیا، تم نے لڑکی اغواء کی، کیا ہوا؟ سبریز واپس آ گیا؟ اپنے بھائی کو بستر پر تکلیف میں پڑے دیکھ کر تمہیں سکون مل گیا؟ تمہارے انتقامی جذبے، جنونی طبیعت کو قرار آ گیا؟ شاید تمہیں سکون مل بھی گیا ہو...... لیکن ہمارا شملہ، ہمارا افتخار، ہمارا فخر تم نے پاش پاش کر ڈالا ہے۔ آہ، یہ سوچ بھی شہ رگ کو کچل رہی ہے کہ شاہ افضل خان کے پوتوں نے لڑکی کو اغوا کیا۔''

''بابا جانی یہ سب میرا کیا دھرا ہے۔ یہ غلطی مجھ سے ہوئی ہے۔ صارم بھی بہت خفا ہوا تھا مجھ پر، لیکن میں انتقام میں اندھا ہو گیا تھا۔ ہر وقت میری نگاہوں میں سبریز خان کی خون سے تر لاش گھومتی رہتی تھی۔ یہ سوچ، یہ دکھ مجھے چین نہیں لینے دے رہا تھا کہ وہ شادی سے ایک دن پہلے سارے ارمان لے کر چلا گیا۔ وہ بہت صلح جو اور نرم فطرت رکھتا تھا۔ اگر لڑنے مرنے والا بندہ ہوتا تو میں صبر کر لیتا کہ اس کی بھی غلطی ہو گی مگر وہ انتہا رحم دل اور امن پسند تھا کہ اس نے اپنی زندگی میں کوئی چیونٹی بھی نہیں ماری ہو گی۔ پھر ایسے بندے کو اس طرح مار ڈالنا، میں برداشت نہیں کر سکا اور غصے، انتقام، جنون میں وہ کر بیٹھا جس کا تصور اب مجھے شرمسار کر رہا ہے۔ بابا جانی! آپ جو چاہیں سزا دے دیں، مجھے منظور ہو گی مگر مجھ سے ناراض مت ہوں۔ میں ہر سزا پانے کو تیار ہوں۔'' گلریز خان ان کا ہاتھ آنکھوں سے لگا کر رو پڑا۔

''تمہارے اس فعل نے ہمیں ہماری نگاہوں سے گرا دیا ہے۔ اب اس کا ایک ہی حل ہے تم اس لڑکی سے شادی کر لو۔ اس کو اپنی عزت کا آنچل اوڑھا دو۔ اس طرح ہم سرخرو ہو جائیں گے۔''

☆☆☆

''بابا جانی! وہ متحیر سا ان کے بارعب و پُرعزم چہرے کو دیکھتا رہ گیا اس کا وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ وہ اس طرح کا حکم بھی دے سکتے ہیں۔''

''یہ کس طرح ممکن ہے؟ میں...... اس لڑکی سے شادی کر لوں، جس کے بھائی نے ہمارے خوشیوں بھرے ہنستے گھر میں موت کے اندھیرے پھیلا دیئے۔ ہمارے ارمانوں، مسرتوں، خواہشوں کو ہمیشہ کے لیے مٹی تلے دفن کر دیا۔ میں اس بھائی کی بہن سے شادی کروں؟ جس نے ایک گھر سے ایک وقت میں دو جوان جنازے اٹھوا دیئے؟'' گلریز خان غم و غصے سے لرز اٹھا تھا۔

''جرم بھائی نے کیا ہے۔ سزا بہن کو نہیں مل سکتی گلریز خان! یہ ہمارے قبیلے کا دستور کبھی نہیں رہا۔'' شاہ افضل فہمائشی لہجے میں بولے۔

''قاتل کو سزا کے بغیر معاف کر دینا بھی ہماری روایات نہیں ہیں۔''

''گلریز خان! تم گستاخی کے مرتکب ہو رہے ہو۔ بابا جانی کے سامنے چھوٹے اکا بھی زبان نہیں چلاتے پھر تم.....'' صارم خان جو خاموش لیٹا ہوا ان کی گفتگو سن رہا تھا، بول پڑا۔ گلریز سے خاصے سرد و برہم لہجے میں گویا ہوا۔ اس کے لہجے و چہرے پر کچھ ایسی ہی تپش تھی کہ گلریز خان یکلخت خاموش ہو گیا۔

''میرا مقصد بابا جانی کی توہین نہیں ہے صارم، لیکن جو بابا چاہ رہے ہیں وہ مجھے کبھی بھی قبول نہیں ہوگا۔ دشمن کے آگے ہتھیار ڈال دینا مجھے کبھی گوارہ نہیں۔''

''پھر میں بھی تمہیں گھر میں رکھنا گوارہ نہیں کروں گا، نافرمانوں کی میرے دل، میرے گھر میں قطعی گنجائش نہیں ہے۔'' فیصلہ سنا کر وہ لمحے بھر بھی نہیں رکے تھے۔ ڈرائیور کے ہمراہ گاؤں روانہ ہو گئے۔

گلریز نے مدد طلب نگاہوں سے صارم کی طرف دیکھا۔ اس نے سختی سے آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔

☆☆☆

''بیٹی! تو مجھے چھوڑ کر تو نہیں جائے گی نا؟'' درشا، صابرہ کے بالوں میں تیل ڈال رہی تھی کہ وہ اس کے ہاتھ پکڑ کر بے حد محبت و تشویش زدہ لہجے میں استفسار کرنے لگی۔ اس کے ذہن و دماغ نے اس حادثے کو قبول نہیں کیا تھا اور اب وہ ہر لڑکی کو اپنی بیٹی سمجھتی تھی۔

''تو بولتی کیوں نہیں؟ کیا تو چلی جائے گی؟ پھر مجھے چھوڑ کر چلی جائے گی؟''

''نہیں..... نہیں اماں! میں تجھے چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گی۔ کبھی نہیں جاؤں گی۔ اس بے مہر، بے مروت دور میں تم نے ہی تو مجھے رشتوں سے اٹوٹ بندھن کا احساس بخشا ہے۔ اس بے ثباتی و نفسانفسی کے سحر میں غرق لوگوں کی چالبازیوں و عیاریوں نے مجھے زندگی سے نفرت کا درس دیا تھا۔ تم تو میری مسیحا ہو اماں، میری زخمی روح کی آبلہ پائی کو تمہارے ہی پیار کے مرہم نے شفا بخشی ہے۔ میرے بے روح ہوتی زندگی کو تمہاری وجہ سے ہی حیات نو میسر ہوئی ہے۔ میں تمہیں چھوڑ کر نہیں جا سکتی۔ میں کہیں نہیں جاؤں گی۔'' وہ بے اختیار صابرہ کے سینے سے لگ کر سسک اٹھی۔ دل میں چھپائے غبار کو آنسوؤں کے سہارے فرار کی راہ ملی تھی۔

''ارے تو کیوں روتی ہے! کیا دکھ ہے، مجھے بتا مجھے کیوں رو رہی ہے تو؟'' اس نے تڑپ کر درشا کو سینے سے لگا لیا اور اس کے بالوں کو چومنے لگی۔

''مجھے کوئی دکھ نہیں ہے۔''

''پھر رو کیوں رہی ہے؟'' صابرہ نے اپنی چادر کے پلو سے اس کے آنسو پونچھے۔

''کچھ نہیں ہوا بس ایسے ہی، چلو تم پہلے چوٹی بندھواؤ، دو دن سے بال نہیں بنائے ہیں۔ کپڑے بھی میلے ہو رہے ہیں۔ میں کپڑے نکالتی ہوں۔ تبدیل کر لینا۔''

اس نے بمشکل اپنے آنسوؤں پر قابو پا کر دھیرے دھیرے بال سلجھاتے ہوئے صابرہ سے کہا۔

''ہاں ..... ہاں کیوں نہیں، میری بیٹی کہے گی تو میں چوٹی بھی باندھوں گی اور کپڑے بھی بدلوں گی۔'' اس نے خوشی خاص بھری تھی۔ وردشا مسکرا کر رہ گئی۔

☆☆☆

''صارم! تم میری مدد کرو، ورنہ بابا جانی جو کہہ رہے ہیں، وہ کر کے ہی چھوڑیں گے۔''

بابا جانی جا چکے تھے۔ جب سے گلریز خان کسی مضطرب و بے قرار روح کی مانند کمرے میں ادھر سے ادھر چکرا تا پھر رہا تھا۔ صارم بیڈ پر لیٹا سپاٹ چہرے و بے تاثر نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''میں کیا مدد کر سکتا ہوں تمہاری؟ فی الحال تم مجھے تنہا چھوڑ دو تو بہتر ہے۔''

''کیوں بھئی، کیا ہوا؟ تم پریشان ہو یا کوئی تکلیف ہو رہی ہے؟''

''کچھ نہیں ہوا مجھے، میں اب یہاں سے آزادی چاہتا ہوں۔ تنگ آچکا ہوں اس قید سے۔'' وہ جھنجلائے لہجے میں سائیڈ ٹیبل پر رکھی دوائیوں کی بوتلوں کو فرش پر پھینکتے ہوئے بولا۔

''اچھا..... اچھا۔ میں نے ڈاکٹر سے بات کی تھی۔ تم پرسوں تک ڈسچارج ہو جاؤ گے۔ مت گھبراؤ اتنا۔ میں یہاں تمہاری خاطر ہی رکا ہوا ہوں۔ ورنہ اب تک شمشیر خان سے ٹکرا چکا ہوتا۔''

''تم شمشیر خان سے ٹکراؤ یا اس کے باپ سے، بھاڑ میں جاؤ، مجھے تنہا چھوڑ دو۔''

''صارم! صارم خان؟ میری طرف دیکھو۔'' گلریز نے آگے بڑھ کر اس کے چہرے سے ہاتھ ہٹاتے ہوئے کہا۔ ''دیکھو نا۔'' اس نے زبردستی ہاتھ اس کی آنکھوں کے گرد سے ہٹایا۔

''کیا ہوا؟'' صارم نے اپنی سرخ آنکھیں کھول کر اسے گھورا۔

''جب سے بابا جانی نے مجھے حکم سنایا ہے تب سے تم کچھ عجیب سے لگ رہے ہو۔''

''عجیب سا لگ رہا ہوں؟ یعنی میرے سینگ نکل آئے ہیں یا دم؟''

''اگر سینگ نکلتے یا دم، تو تم عجیب نہیں عجوبہ لگتے۔'' گلریز ہنس پڑا تھا۔ ''لیکن تم مجھے پریشان لگ رہے ہو۔''

''نہیں، مجھے کوئی پریشانی نہیں ہے، میں سونا چاہتا ہوں اس وقت یہی پریشانی ہے کہ تم مجھے سونے نہیں دے رہے۔'' صارم نے دوبارہ آنکھوں پر بازو رکھ لیا تھا۔ گلریز چند ثانیے اس کی جانب دیکھتا رہا پھر دروازہ بند کرتا ہوا باہر نکل گیا۔

صارم کا عجیب بے معنی سا رویہ اسے فکر مند کر گیا تھا۔

☆☆☆

شہباز خان نے کر ختگی و بے گانگی سے بھرپور نگاہیں خاموش گم صم بیٹھی گل خانم پر ڈالی تھیں۔ سخاوت منت سماجت کر کے انہیں یہاں لائی

تھی۔ ماں کی اس حالت نے اس متوحش کر ڈالا تھا۔

''کھانا کیوں نہیں کھاتیں؟ مرنے والوں کو بھی رو کر کھانا پڑتا ہے۔ پھر وہ تو زندہ ہے ابھی، پھر کس کے سوگ میں نہیں کھا رہی ہو۔'' ان کی نگاہوں کی کرختگی چہرے کی بے گانگی لہجے میں سمٹ آئی تھی۔ سخاویہ سہم کر ماں سے قریب ہوگئی۔

''میری بچی بے قصور ہے خان، ورشا بے گناہ ہے، وہ جان تو دے سکتی ہے لیکن اپنے باپ کے شملے کو قدموں تلے نہیں روند سکتی۔ یہ کسی دشمن کی چال ہے خان، میری ورشا ایسی نہیں ہے۔'' گل خانم ایک دم ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

''میں بہت پریشان ہوں اس وقت..... اس لیے کوئی بحث کرنا نہیں چاہتا'' انہوں نے سخت لہجے میں کہا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتے کمرے سے نکل گئے۔

''ادے! مت روؤ، خاموش ہو جاؤ میرا دل بھی کہتا ہے کہ ورشا بے قصور ہے۔ وہ بہت جلد ہمارے پاس آجائے گی۔ فکر مت کرو۔'' ماں کو تسلی دیتے دیتے وہ بھی سسک پڑی تھی۔

''ایسی دعا نہیں مانگو، اسے ہمارے پاس نہیں آنا چاہیے۔ بالکل نہیں آنا چاہیے۔ ورنہ یہ ظالم اسے مار ڈالیں گے، قتل کر دیں گے۔'' گل خانم متوحش ہو کر بولی تھیں۔

''پھر کہاں جائے گی وہ؟ ہمارے سوا اور کون ہے اس کا؟''

''اللہ..... وہی ہے جس نے پیدا کیا ہے، میں نے آج سے اسے اللہ کے حوالے کیا۔ یا اللہ! تو ظاہر و پوشیدہ سے واقف ہے۔ دلوں کے حال، نیتوں کے حال بخوبی جانتا ہے۔ اپنی بچی کو میں نے آج سے تیرے سپرد کیا۔ یا اللہ! اس کی حفاظت کرنا، اس کو اپنی رحمت کے سائے میں رکھنا، بے شک تو ستر ماؤں سے زیادہ خیال رکھنے والا، محبت کرنے والا ہے۔ اپنی ورشا کو میں نے تیری پناہ میں دیا۔''

وہ اپنے رب سے مخاطب تھی۔ طمانیت و آسودگی غیر محسوس انداز میں ان کی روح میں سرایت کر رہی تھی۔

☆☆☆

شاہ افضل خان کی حویلی میں گہما گہمی تھی۔

صارم تندرست ہو کر اسپتال سے گھر آچکا تھا۔ اسی خوشی میں وہاں جشن کا سا سماں تھا۔ صدقے و خیرات مستحق لوگوں میں تقسیم ہو رہی تھیں۔

صارم کی عیادت کو دور دور سے لوگ آرہے تھے۔

جن کی رواج کے مطابق خوب خاطر و مدارت کی جارہی تھی۔

بی بی جان کو اپنے خواب کا سچ ثابت ہونے کا از حد قلق تھا۔ صارم کو اسپتال سے گھر لانے سے قبل بابا جانی نے انہیں بتایا کہ وہ حادثے میں معمولی سا زخمی ہو گیا ہے اور چند دن اسپتال رہ کر گھر آرہا ہے۔ معلوم ہونے پر وہ اتنی شاکڈ نہیں ہوئی تھیں جو وہ اچانک اسے دیکھ کر ہو تھیں۔ اب بھی وہ مسلسل اس کے قریب بیٹھیں مختلف صورتیں پڑھ کر دم کر رہی تھیں۔ دونوں بہوئیں بھی کچھ دیر قبل اٹھ کر گئی تھیں۔ صارم کو نیند نہیں آرہی تھی مگر

بات کرنے کو طبیعت آمادہ نہیں تھی۔ سو خاموشی سے آنکھیں بند کیے لیٹا یہی ظاہر کر رہا تھا جیسے گہری نیند میں ہو۔

زخم تمام بھر گئے تھے ماسوائے ایک زخم کے جو ورشا کی سفاکی اور ظالمانہ طرز عمل نے لگایا تھا۔ وہ زخم ناسور بن کر تا حیات اسے اذیت سے دو چار کرتا رہے گا۔

اس کا اسے کامل یقین تھا۔

ورشا کی محبت، چاہت، اسے چاہنے کی خواہش۔

اسے اپنا بنا لینے کا عزم

اسے تسخیر کر لینے کا جذبہ

جیسے کچے رنگوں کی طرح اس کے دل سے اتر گئے تھے۔

وہ اس کی زندگی میں داخل ہونے والی پہلی لڑکی تھی۔ جو اپنی معصومیت، حسن و پاکیزگی کے باعث دل کے ایوانوں پر حکمرانی کرنے لگی تھی۔

اس نے اس سے بہت پاکیزہ، شفاف، سچی محبت کی تھی۔

لیکن جواب میں اس نے اسے پہاڑ سے ہی نہیں اس کی نگاہوں سے بھی گرا ڈالا تھا۔ اب دل اس کا نام بھی سننا گوارا نہیں کر رہا تھا۔

بابا جانی نے گلریز کو ورشا سے شادی کرنے کا حکم دیا تھا۔ جسے سن کر بھی اس کے اندر کوئی ہلچل یا بے چینی نہیں پھیلی تھی۔ صرف اس نے اپنے اندر سناٹے اترتے محسوس کیے تھے۔

لا حد ٹھنڈک کا احساس

بے پناہ تاریکیوں کے ہجوم

بے حد سناٹے وہ بے حسی کے موسم

کوئی ملال افسوس یا چھن جانے کا دکھ اس نے محسوس ہی نہیں کیا۔

یہ اس کے اندر نیا جنم لینے والی نفرت و انتقام کا نیا روپ تھا۔

وہ بچپن سے ہی ایسا تھا۔ انتہا پسند۔

محبت میں ٹوٹ کر چاہنے والا، جان نچھاور کر دینے والا۔

نفرت میں توڑ دینے والا۔ جان نکال دینے والا۔

''بابا جانی! صارم سو گیا ہے؟'' گل باز خان نے کمرے میں آتے ہوئے پوچھا تھا۔

''ہاں، تھک گیا ہے۔ کل سے مہمانوں کی آمد و رفت نے بچے کو بے چین کر ڈالا۔'' بی بی جان اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر بولیں تو وہ جو آغا جان کی آواز سن کر آنکھیں کھولنا چاہ رہا تھا لیکن بی بی جان کی شفقت بھری آواز سن کر وہ ویسے ہی لیٹا رہا۔

''یہ عورتیں بھی عجیب طبیعت کی مالک ہوتی ہیں۔ لوگ اگر عیادت کو نہ آئیں تو انہیں شکوے و شکایات ہو جاتی ہیں کہ فلاں فلاں مزاج پرسی کو نہیں آیا، لوگوں میں محبت نہیں رہی..... مروت و خیال ناپید ہو گیا وغیرہ وغیرہ..... اور اگر عزیزوں کی محبت جوش دکھائے تو پھر یہ شکوہ ہوتا ہے کہ بے چلن کر رکھا ہے۔''

شاہ افضل خان بی بی جان کی طرف دیکھ کر مسکرا کر بولے تو بی بی جان نے خفگی سے رخ پھیر لیا۔

''ہماری بی بی جان ایسی نہیں ہیں بابا جانی! صارم خان کے خیال سے کہہ رہی ہیں۔ ورنہ بی بی جان کی مہمان نوازی و مروت و خوش اخلاقی کا ڈنکا دور دور تک بجتا ہے۔''

''بیٹے ہو نا، ماں کی حمایت تو لو گے ہی، تمہاری ماں اگر اس وقت گرم گرم کافی پلوا دیں تو ہم بھی ان کی مروت و خوش اخلاقی کے گرویدہ ہو جائیں گے۔''

''صاف کیوں نہیں کہتے خان! کہ میں یہاں سے چلی جاؤں۔ نہ معلوم باپ بیٹے کس گٹھ جوڑ میں لگے ہوئے ہیں۔ بتاتے کیوں نہیں؟ کیا ہو رہا ہے؟ کیا ہونے والا ہے؟ کچھ مجھے بھی معلوم ہو، میں کوئی ناسمجھ بچی نہیں ہوں خان۔'' بی بی جان خاصے غصے سے اٹھ کر مخاطب ہوئیں۔

''زندگی میں جو بھی کام میں نے کیا، ایسے ہر موقع پر میں نے تمہیں شریک کیا ہے۔ اب بھی جب وقت آئے گا، میں کوئی فیصلہ خاموشی سے نہیں کروں گا۔''

بابا جانی کے لہجے میں تحکم بھری قطعیت تھی۔ بی بی جان خاموشی سے اٹھ کر کمرے سے نکل گئی تھیں۔ کمرے کی خاموشی میں چند لمحے بعد شاہ افضل کی آواز گونجی۔

''وہ نہیں مانا، چلا گیا گھر سے؟''

''ہاں، آپ کو کیسے معلوم ہوا؟ جبکہ مجھے بھی ابھی ابھی معلوم ہوا ہے۔''

''بعض باتیں ''چہرے'' زبان سے پہلے ہی کہہ دیا کرتے ہیں اور تمہارا چہرہ بھی کہہ رہا ہے کہ ہمارے خدشات درست ثابت ہوئے ہیں۔''

''میں اسے معاف نہیں کروں گا، بابا جانی! سرکش گھوڑوں اور سرکش انسانوں کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہیے یہ اچھی طرح جانتا ہوں میں۔'' گلباز خان پر طیش لہجے میں بولے۔

''نہیں، ابھی ہم خاموش رہو گے، ہمیں جو کچھ کرنا ہے وہ ہم کر کے رہیں گے۔''

وہ باتیں کرتے ہوئے باہر نکل گئے تھے۔ صارم نے تنہائی پاتے ہی آنکھیں کھول ڈالی تھیں۔

بابا جانی کا عزم

آکا جان کی سعادت مندی

گلریز خان کی سرکشی

وہ کسی بھی صورت دشمن قبیلے کی لڑکی کو شریک حیات بنانے کو راضی نہ تھا۔

بابا جانی بھی حکم کی تکمیل کرانے میں چٹان بنے ہوئے تھے۔

آکا جان جو حقیقت حال معلوم ہونے کے بعد گلریز خان کو جان سے مار دینے کے درپے ہو گئے تھے اب بھی باپ کے حکم کے آگے اس کی سرکشی نہیں چلنے دیں گے۔

آپس میں ہی جنگ کی تباہی پھیلنے والی تھی۔ جسے روکنا از حد ضروری تھا۔

اس نے تفکرانہ انداز میں سوچا تھا۔ اسی دم آہٹ ہوئی اور خوشبو کا زبردست جھونکا اندر داخل ہوا تھا۔ اس نے چونک کر دیکھا اور سمٹ کر لیٹ گیا۔

''کتنی مرتبہ سمجھایا ہے۔ کمرے میں داخل ہونے سے قبل ناک کیا کرو۔''

سرخ و فیروزی کنٹراسٹ پشواز سوٹ میں ملبوس بیں سنوری گلاب کی مانند مہکتی ترزگون خانم کو دیکھ کر اس نے تند لہجے میں کہا۔

''ایسے تکلفات غیروں کے لیے ہوتے ہیں۔'' وہ بہت بے تکلفی سے اس کے بیڈ کے نزدیک بیٹھ کر اس کی طرف جھک کر بولی۔

''تم...... میرے ہو...... اس لحاظ سے یہ کمرا بھی میرا ہے۔''

''شٹ اپ۔ بکل جا دیہاں سے۔ مجھے تمہاری فضول بکواس سے کوئی سروکار نہیں ہے۔''

''کب تک؟ آخر کب تک مجھ سے پیچھا چھڑاؤ گے صارم خان! آخر کار تمہیں پلٹ کر میرے نزدیک ہی آنا ہے۔ پھر تم سے......''

''میں تم سے شادی نہیں کروں گا، کبھی نہیں کروں گا۔ یہ تم اچھی طرح سن لو۔'' اس نے سخت لہجے میں کہا اور ساتھ ہی اسے جانے کا اشارہ کیا تھا۔

''کیوں؟ مجھ میں کیا کمی ہے؟ ہائی ایجوکیٹڈ ہوں، ماڈ ہوں، تمہارے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چل سکتی ہوں۔ حسین ہوں، جوان ہوں کیا کمی ہے مجھ میں؟''

اس کے چہرے کے ہر نقش سے تفاخر جھلک رہا تھا۔

''اس حیا اور معصومیت کی جو اس قبیلے کی عورتوں اور دوشیزاؤں کے کردار اور چہروں پر ہمیشہ چمکتی رہی ہے۔ تعلیم انسان کو شعور دیتی ہے۔ غلط اور درست کی تمیز سکھاتی ہے۔ اندھیروں سے نکال کر اجالوں کی راہ گزر پر گامزن کرتی ہے۔ بابا جانی نے قبیلے کے رسم و رواج توڑ کر یہاں علم و آگہی کے چراغ اس لیے روشن کیے کہ ہم جاہلوں کی طرح غیر مہذبانہ زندگی نہ گزاریں لیکن تم نے ثابت کر دیا کہ تم جیسے لوگوں کو تعلیم صرف گمراہ کرتی ہے۔ جو اندھیروں سے نکلنے کی کوشش نہیں کرتے، وہ تا حیات بھٹکتے رہتے ہیں۔''

صارم نے قہر آلود نگاہوں سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے زہر خند لہجے میں کہا۔

''کیوں......؟ مجھ میں کیا بے حیائی دیکھ لی تم نے، جو اس طرح کہہ رہے ہو۔''

''میں تم سے کوئی بکواس مزید نہیں چاہتا۔ بہتر یہی ہے کہ تم یہاں سے چلی جاؤ، ورنہ میں اکا جان سے کہہ دوں گا، جو میں کہنا نہیں چاہتا۔''

اس کے خوفناک تیور اور بگڑا ہوا مزاج دیکھ کر زرگون خانم پیر پٹخ کر چلی گئی۔

☆☆☆

شمشیر خان خاموش بیٹھا ہوا گل جاناں کی باتیں سن رہا تھا جو وہ رازدارانہ انداز میں اس کے نزدیک بیٹھی ہوئی کر رہی تھیں۔

''لیکن ادے! بابا جان کو سب معلوم ہو گیا ہے۔ وہ کسی طرح نہیں مانیں گے۔''

''یہ کام مجھ پہ چھوڑ دے خاناں! بڑے خان وہی کریں گے جو میں کہوں گی۔'' ان کے لہجے میں بلا کی خود اعتمادی اور عزت پنہاں تھی۔

''یہ بات کسی کو بتانے کی ضرورت ہی نہیں ہے کہ دُرشا، ہمارے دشمنوں کے جال میں پھنسی ہے۔ وہی بات اٹل رکھو کہ وہ اپنے عاشق کے ساتھ فرار ہوئی ہے۔ اس طرح اس کے لیے کوئی ''رحم'' کی گنجائش ہی نہیں نکلے گی۔ کیونکہ وہ ہماری راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔''

''ٹھیک ہے ادے! تم بابا جان کو سنبھالنا، باقی کام میرا ہے۔''

وہ اپنے مخصوص انداز میں چادر کا پلو جھٹک کر شانے پر ڈالتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

''تو فکر نہیں کر، اس کے بدلے کی جائیداد بھی ہمیں ہی ملے گی۔'' گل جاناں بھی بیٹے کے ہمراہ کھڑی ہو کر مسرت افزا لہجے میں بولیں۔

''لیکن...... ایک ہفتے سے زیادہ ہو گیا اُسے غائب ہوئے اور میرے آدمیوں کی جاسوسی کے مطابق وہ اغواء ہونے کے تیسرے دن افضل شاہ کے بیٹے کے ساتھ کہیں جا رہی تھی اور راستے میں اسے پہاڑ سے دھکا دے کر بھاگ گئی۔''

''ارے، یہ کب ہوا؟ کس نے خبر دی تمہیں؟ بڑی حیرت انگیز بات ہے، پھر کہاں گئی؟ اب تو اسے ڈھونڈنا اور لازمی ہو گیا ہے۔ اس لڑکے کا کیا ہوا؟ یقیناً مر گیا ہوگا۔''

گل جاناں کے لیے یہ خبر ازحد حیرت انگیز تھی۔ وہ بری طرح بوکھلا اٹھی تھیں۔

''بچ گیا ہے وہ، یہ شاہ قبیلے والے بڑے ڈھیٹ و سخت جان ہوتے ہیں۔ مجھے بھی یہ خبر آج ہی ملی ہے۔ تھوڑا روپیہ خرچ کرنا پڑتا ہے ادے! آج کل ناممکن بھی ممکن بن جاتا ہے۔''

''یہ تو بہت اندر کی بات ہے شمشیر خان! یہ کس نے تمہیں بتائی؟''

''ادے! اب لوگوں کا دین و ایمان، دولت و روپے بن چکے ہیں۔ دولت کی خاطر کیا نہیں ہو رہا اب۔ لوگ ضمیر بیچ ڈالتے ہیں، ایمان کا سودا کر لیتے ہیں، ملکی راز فروخت کر دیے جاتے ہیں، وطن کی سلامتی داؤ پر لگا دی جاتی ہے۔ پھر یہ تو بہت چھوٹی باتیں ہیں۔ روپیہ ہر ایک کو خرید سکتا ہے۔''

''لیکن دنیا میں ابھی کچھ غیرتمند اور رشتوں سے محبت کرنے والے، روپوں کو ٹھوکر مار کر ماں بہنوں کو حرمت و تقدس کا ملبوس پہنانے والے زندہ ہیں۔'' معاً شمروز خان پُرطیش انداز میں گرجتا ہوا اندر داخل ہوا۔

''شمروز! کب آئے تم؟'' گل جاناں چونک کر گویا ہوئیں۔

''اس وقت جب آپ اپنے اس دولت کے پجاری و بے غیرت بیٹے کے ساتھ مل کر شرمناک پروگرام بنا رہی تھیں۔''

''شہروز خان! زبان سنبھال کر بات کرو۔''

شمشیر خان نے فوراً ہولسٹر سے پستول نکال لیا تھا۔

''زبان تو تمہاری کاٹنے کو دل چاہ رہا ہے میرا۔ غیرت مند ہوتے تو بہن کے متعلق اتنے لغو الفاظ استعمال کرنے سے قبل ہی شرم سے مر گئے ہوتے۔''

شمشیر جذبات و انا کی کا دوسرا نام تھا۔ جسے بچپن سے ہی اس قدر توجہ اور محبت ملی تھی کہ وہ خودسری و خود غرضی کی مثال بن کر رہ گیا تھا۔

وہ جو اپنے عمل کو سراہے جانے اور بلا تنقید منوانے کا عادی ہو چکا تھا۔

شہروز خان کی کھری و سچی باتیں اسے شرمسار کرنے کے بجائے طیش دلا گئی تھیں۔ اس نے حسب عادت پستول کا فائر شہروز پر کرنا چاہا تھا۔ جسے گل جاناں نے ہاتھ مار کر گولی چلنے سے قبل ہی اس کے ہاتھ سے دور پھینک دیا تھا۔

''اس بدذات لڑکی کی خاطر کیا بھائی بھائی آپس میں لڑو گے؟'' گل جاناں ان دونوں کو آپس میں گتھم گتھا دیکھ کر چیخیں۔

''یہ آگ آپ ہی کی لگائی ہوئی ہے چھوٹی اوے، سوتیلے، سگے کا زہر آپ نے ہی اس کی رگوں میں بھرا ہے۔ جو آج یہ اپنی غیرت کو اپنے ہی ہاتھوں نیلام کر رہا ہے۔'' شہروز خان نے شمشیر خان کو زوردار دھکا دے کر خود سے دور کیا تھا۔

''کیا ہو رہا ہے یہ؟ کیا تماشا لگا رکھا ہے تم لوگوں نے؟''

اسی دم گل جاناں کی چیخ و پکار سن کر شہباز خان اندر داخل ہوتے ہوئے بپھرے طوفان کی مانند بے قابو شمشیر خان کے دونوں بازو مضبوطی سے پکڑ کر گرج کر بولے۔

''چھوڑ دو مجھے بابا جان! میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ اس نے مجھ پر ہاتھ اٹھایا ہے۔''

''دیکھ رہے ہیں بابا جان! یہ آپ کی تربیت ہے۔ یہ بڑوں کی عزت خاک میں ملا سکتا ہے لیکن کوئی بڑا اس کی زیادتی پر اسے چھو بھی نہیں سکتا۔ بیڑا لیکن، یہ بڑا سمجھتا کس کو ہے؟ یہ وہ ہے جس کے نزدیک نہ باپ بڑا نہ بھیا۔ سب سے بڑا روپیہ۔ یہ دولت کو، روپے کو، ظاہری شان و شوکت کو سب سے بڑا مانتا ہے۔ ان کی خاطر...... یہ بہن کو رسوائیوں کی قبر میں دفن کر سکتا ہے۔'' شہروز خان کا غصہ بتدریج بڑھ رہا تھا۔

''بابا جان...... بابا جان! مجھے چھوڑ دیں، میں اس کی زبان بھی بند کر دوں گا اور سانس بھی۔ سمجھتا کیا ہے خود کو۔''

''ہوا کیا ہے؟ مجھے معلوم تو ہو۔''

''اس یہاں سے لے جائیں خان! خدا کے واسطے لے جائیں، ورنہ کوئی انہونی ہو جائے گی۔'' گل جاناں نے دونوں بیٹوں کی آنکھوں میں اترتے خون کو دیکھ کر روتے ہوئے کہا۔

شہباز خان بھی ان کی حالت سے ان کی ذہنی کیفیت کا اندازہ لگا چکے تھے۔ وہ شمشیر خان کو زبردستی وہاں سے لے گئے۔

''بچے! ذرا تسلی سے بیٹھ کر بات تو سن...... تجھے کیا معلوم کہ وہ بد......''

''ادے! بس، اس سے آگے ایک لفظ نہیں بولیں گی آپ...... ورنہ میرے دل میں جو آپ کی عزت ہے وہ بھی گم نہ ہو جائے۔ حد ہے سنگدلی اور بے حسی کی، ادے آپ کو ترس نہیں آتا، اس سادہ مزاج اور عظیم عورت پر، جو اپنی ملکیت، اپنی بادشاہت آپ کو دے کر بہت خاموشی و شرافت سے اس گھر کے ایک کونے میں فالتو سامان کی حیثیت سے رہ رہی ہیں اور آپ ان کی جگہ حکمرانی کر رہی ہیں۔ وہ اپنی حیثیت و مرتبہ استعمال کرنے کے بجائے، آپ کی خدمت کر رہی ہیں اور آپ بدلے میں انہیں کیا دے رہی ہیں؟ ظلم و زیادتیاں، آنسو و آہیں، آپ کے دل میں ذرا بھی اللہ کا خوف نہیں ہے؟ اس کڑے امتحان میں جب شمشیر خان کے گناہ کی سزا وہ شاہ بھگت رہی ہے ان کو تسلی دلاسے دینے کے بجائے ان کے ہمیشہ کے لیے حواس گم ہو جانے کی پلاننگ کر رہی ہیں؟ سٹاور پیہ حس کے روتے روتے آنسوؤں کے نشان رخساروں پر ٹھہر گئے ہیں جسے بہن کی فکر نے بے حال کر رکھا ہے، تو ماں کی حالت نے بے حواس، اس مظلوم دکھی لڑکی کے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھنے کے بجائے اسے زندہ درگور کرنے کے خواب دیکھ رہی ہیں۔ کیسی ماں ہیں آپ؟ خود دوسرے کی اولاد کا دکھ نہیں سمجھتی ہیں اور نہ ہی عورت ہو کر عورت کے درد کو محسوس کر رہی ہیں۔''

''اس عورت کے دکھ کو سمجھوں گی، جو میری اولاد کو میرے ہی خلاف بھڑکا رہی ہے۔ کسی بیٹی نے بھی بھائی کو ماں کے خلاف بھڑکایا ہے؟''

گل جاناں ہٹ دھرم وضدی عورت تھیں۔ وہ بھلا کس طرح بیٹے کے سامنے ہتھیار ڈال دیتیں۔

''مجھے کسی کو بھڑکانے سکھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ سب اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے میں نے اور کانوں سے سنا ہے۔'' وہ اپنی بات مکمل کر کے کمرے سے چلا گیا۔

''میں ذرا بازار تک جا رہی ہوں، اگر کچھ منگوانا ہو تو ابھی بتا دیں۔'' فرحت آپا نے چادر اوڑھ کر باسکٹ ہاتھ میں پکڑتے ہوئے کائنات سے استفسار کیا۔

''ابھی بہت وقت پڑا ہے آپا، چلی جایئے گا بعد میں۔''

''بعد میں کب؟ یہاں کے وقت کا تو آپ کو معلوم ہی ہے۔ شام سے ہی اندھیرا پھیلنے لگتا ہے اور بازار بھی جلدی بند ہو جاتے ہیں۔''

''اچھا..... اگر آپ جلدی فارغ ہو جائیں تو پھر شمشیر خان کی طرف چلتے ہیں۔''

شمشیر خان کے نام پر آپا نے چونک کر اس کی جانب دیکھا۔

''کیوں؟ کوئی کام ہے؟'' ان کی جہاندیدہ نگاہوں نے بہت باریک بینی سے اس کے چہرے کو ٹٹولا تھا اور اس کے چہرے پر چھائے گلال پوشیدہ نہیں رہے تھے۔

''ہاں مریضوں کی تعداد دن بدن بڑھتی جا رہی ہے۔ ہمیں مزید اسٹاف اور جگہ کی ضرورت ہے۔ اگر ہمیں جگہ مل جائے تو بہت سہولت مل جائے گی، اس سلسلے میں خان ہی ہماری مدد کر سکتے ہیں۔''

''نہیں بیٹے! اب اس کی ضرورت نہیں رہے گی۔ میں بہت جلد آپ کے فرض سے سبکدوش ہونا چاہتا ہوں۔ شام میں کچھ لوگ آ رہے ہیں آپ کو دیکھنے۔ اچھے لوگ ہیں۔ لڑکا انجینئر ہے، ایک بہن، ماں اور باپ ہیں۔ مختصر گھرانہ ہے، وہ بہت جلد شادی کرنا چاہتے ہیں۔''

حیات خان اندر آ کر نرم لہجے میں تمام تفصیل بتا رہے تھے۔

''لیکن..... انکل..... اتنی جلدی..... آپ نے مجھ سے پوچھا بھی نہیں۔''

''ہمارے ہاں بیٹیوں سے پوچھ کر شادی کرنے کا رواج نہیں ہے اور آپ کا کیا خیال ہے؟ میں آپ کے لیے، آپ کے مستقبل کے لیے کوئی غلط راہ منتخب کروں گا؟ مجھے آپ کی بہتری، آپ سے زیادہ عزیز ہے۔''

''میں نے یہ نہیں کہا انکل! مگر میں اتنی جلدی ایسا کوئی فیصلہ قبول نہیں کر سکتی۔''

''کیوں؟ تم میری بیٹی نہیں ہو اس لیے میرے فیصلے کو نہیں مانو گی، یا تم بھی اپنے باپ کے نقشِ قدم پر چل کر اسی وقت کو دہراؤ گی۔''

''انکل! آپ میری بات سمجھنے کی کوشش کریں۔'' کائنات آہستگی سے بولی۔

''نہیں..... میں کچھ سننا نہیں چاہتا۔ شام میں تیار رہنا۔'' وہ غصے میں بھاگتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔ حیات خان خاموش فرحت آپا سے مخاطب ہوئے۔

''میں عزت دار آدمی ہوں آپا، اس کے باپ نے اپنی مرضی سے شادی کی اور ساری عمر کے لیے برادری سے علیحدہ ہو کر رہا، وہ مرد تھا یہ پابندی برداشت کر گیا مگر یہ لڑکی ہے کبھی بھی برداشت نہیں کر پائے گی۔''

''جانتی ہوں بھائی صاحب! میں اسے سمجھانے کی کوشش کروں گی۔''

''شمشیر خان کی روز بروز بڑھتی ہوئی کرم نوازیاں مجھے کسی صورت ہضم نہیں ہو رہی ہیں۔ ان عنایتوں کے پیچھے مجھے کوئی طوفان گرد اڑاتا اپنی عزت و غیرت کی جانب بڑھتا نظر آ رہا ہے۔ قبل اس کے کہ میں اپنی عزت سمیت اس طوفان میں غرق ہو جاؤں میں اس راہ کو ہی ختم کر ڈالتا ہوں۔''

☆☆☆

ضبط غم کتنا ہی کاری ہو مگر

صبر اپنی آبرو کھونے نہ دے

آفتوں میں بھی یقیں کی پختگی

حوصلوں کو منہدم ہونے نہ دے

اس کے اندر باہر حبس ہی حبس تھا

آگ ہی آگ برس رہی تھی

ناکامی کے انگارے اس کی رگ رگ میں چیخ رہے تھے

اتنی شدید کھولن، از حد شدید تر جلن، گویا اس کی ہر سانس میں شعلوں کی لپک تھی۔ خاصے سرد موسم میں وہ کھلے صحن میں پتھریلے سخت یخ فرش پر برہنہ پاؤں، برہنہ سر بیٹھی تھی۔

کچھ دیر قبل ہی تو روزی خان نے خبر اکر دی تھی کہ صارم زندہ ہے اور گاؤں میں اس کی صحت یابی پر جشن منایا جا رہا ہے۔ صارم کے زندہ بچ جانے کی خبر نے اس کے اندر باہر غصے و ناکامی کی ایسی آگ بھڑکائی تھی کہ وہ چپل اور چادر سے بے نیاز صحن میں آ کر بیٹھ گئی۔ اسے گھر سے بے گھر کرنے والا، اپنے گھر زندہ سلامت پہنچ چکا تھا۔ وہ اپنوں سے نزدیک ہو کر بھی کتنی دور تھی۔ وہ اپنوں کے درمیان مسرتوں کے جشن منا رہا تھا، وہ بے گناہ ہوتے ہوئے بھی نامراد و محروم تھی۔ وہ خطاکار ہونے کے باوجود بھی شادمانیوں کے جھولوں میں جھول رہا تھا۔

یہ سب کیا ہے؟

میری بدنصیبی؟

یا اس کی خوش بختی؟

تقدیر میرے ساتھ کونسا کھیل کھیل رہی ہے؟

کیا خطا ہے میری؟

لڑکی ہونے کی سزا؟ یا ایک جاہل و پست ذہنیت رکھنے والے گھرانے میں پیدا ہونے کی خطا..... جو کچھ بھی ہے۔ انسان اپنی پیدائش پر قدرت نہیں رکھتا۔ وہ اپنے رب کی منشا سے ہی کسی آشیانے میں قدم رکھتا ہے۔

''آپ رو رہی ہو بیٹی!'' روزی خان کمرے سے باہر آئے تو اسے روتے دیکھ کر نزدیک چلے آئے اور گرم چادر اس کے سر پر ڈال کر

استفسار کرنے لگے۔

''مجھے دربدر کرنے والا خود زندگی سے لطف اٹھا رہا ہے بابا! میرے ساتھ کیسا انصاف ہے یہ؟''

آنسو کے شفاف قطرے اس کے سرخ رخساروں سے پھسل رہے تھے۔

''ایسا نہیں کہتے بیٹی! ظالم کی رسی دراز ضرور ہوتی ہے مگر ایک حد سے باہر وہ گز نہیں سکتا۔ آپ اللہ سے اچھی امید رکھو، وہ لوگوں کی امیدیں کبھی نہیں توڑتا۔ اس کے ہاں دیر تو ہے پر اندھیر نہیں ہے۔''

''اے...... کیوں روتی ہے؟ تیرے بابا نے کچھ کہا ہے تجھے؟''

کمرے سے نکل کر صابرہ باہر آئی اور ورشا کو روتے دیکھ کر تڑپ کر اس کی طرف بڑھتے ہوئے بول رہی تھی، ساتھ ہی قریب بیٹھے رودزی خان کو ناراضگی سے گھور بھی رہی تھی۔

''نہیں اماں، بابا کیا کہیں گے۔ بس ایسے ہی دل بھر آیا تھا۔'' وہ چہرہ صاف کرتی ہوئی ڈھیرے سے مسکرائی تاکہ صابرہ کو تسلی مل جائے۔

''آنسو ایسے ہی تو آنکھوں میں نہیں آتے بیٹی! جب کسی دکھ کی چھری محبتوں بھرے دل کو چاک کرتی ہے تو دل کا خون آنکھوں سے آنسو بن کر بہنے لگتا ہے۔''

''جب تم مجھ سے بچھڑ گئی تھیں نا تو میں بھی یوں ہی خون کے آنسو رویا کرتی تھی۔ جدائی بڑی بری چیز ہوتی ہے لیکن تو کیوں روتی ہے؟ اب ہم جدا تھوڑی ہوں گے۔'' صابرہ نے بہت شفقت سے اسے گلے لگالیا۔

''اچھا نیک بخت! اب نہیں روئے گی۔ تو پیچھا چھوڑ دے۔''

''تیرے لیے چائے بنا کر لاؤں؟ بہت شوق سے پیتی ہے نا تو۔''

''نہیں اماں! میں خود بنالوں گی۔'' اس نے ان کا ہاتھ پکڑ کر بٹھاتے ہوئے کہا۔

''نہیں، تو چولہے کے پاس بیٹھی ہوئی اچھی نہیں لگتی۔ تجھے اللہ نے شہزادیوں جیسا رنگ و روپ دے کر کہاں اس جھونپڑے میں پیدا کر دیا ہے۔ تجھے تو محلوں میں پیدا ہونا چاہیے تھا۔''

''ایسا کیوں سوچتی ہو اماں! محلوں میں پیدا ہونے سے کوئی تقدیریں نہیں بدل جایا کرتیں۔''

''تو بیٹھ میں چائے بنا کر لاتی ہوں، میٹھا کم رکھوں گی، پتی اور دودھ زیادہ ڈالوں گی۔ تجھے ایسی ہی چائے پسند ہے نا۔ اب تو مجھے بنانی آگئی ہے۔ بس ابھی بنا کر لاتی ہوں فٹافٹ پھر آج تجھے وادی کی سیر کروا کر لاؤں گی۔ کب سے گھر میں بند رہتی ہے۔'' وہ مگن سی وہاں سے چلی گئیں۔

''بیٹی! باہر نہیں جانا۔ صابرہ کو میں سمجھا دوں گا، اگر وہ پھر بھی اصرار کرے تو تم منع کر دینا۔ چھوٹے خان کے آدمیوں کا کوئی بھروسا نہیں، کہیں بھی آجائیں پھر......''

''نہیں بابا! میں اب باہر جاؤں گی۔ ایک ہفتے سے زیادہ ہو گیا ہے بھلا کب تک میں یوں چھپ کر رہ سکتی ہوں، اور سچ پوچھیں تو میں اس پردے

کو خود توڑ دینا چاہتی ہوں۔" اس کے بھیگے لہجے میں افسردگی و یاسیت تھی۔

"نہیں، نہیں بیٹی، ایسا نہیں سوچو، زندگی اللہ کی امانت ہے۔ اس کی حفاظت کرنی چاہیے۔ چھوٹے خان کے تیور اچھے نہیں ہیں۔" روزی خان اس کا عزم سن کر از حد پریشان ہو اٹھا تھا۔ جب سے ورشا نے مکمل بات ان کو بتائی تھی۔ تب سے وہ بڑے محتاط انداز میں شمشیر خان اور شہباز خان پر نظر رکھتا تھا۔ اور اس نے محسوس کیا تھا کہ حویلی کے اندر کوئی ہلچل ضرور ہے۔

شہباز خان کے پاس ان کے پرانے با اعتماد ملازموں کی آمد و رفت رہتی تھی۔

شمشیر خان اپنی گاڑی میں دونوں ملازموں کے ساتھ زیادہ تر باہر ہی رہتا تھا۔ وہ لوگ خاموشی سے ورشا کو تلاش کر رہے تھے اور اب اس کا یوں باہر نکلنا گویا اپنی شامت کو آواز دینے کے مترادف تھا۔

"میں اس خوف سے اب چھٹکارا چاہتی ہوں۔ اگر جسے کی سانسوں کی گنتی ختم ہوتے پر ہے تو سانسوں کی تعداد کوئی نہیں بڑھا سکتا۔ اگر میری سانسیں باقی ہیں بابا تو ہزار شمشیر خان بھی مل جائیں تو میں نہیں مر سکتی۔ پہاڑ سے گر کر زندہ رہنا ممکن ہے۔ لیکن نگاہوں سے گر کر زندگی موت سے بھی زیادہ اذیت ناک و ناقابل برداشت ہے۔"

"بیٹی! سوچ لو۔"

"سوچا صرف ایک بار جاتا ہے۔ زیادہ سوچنے سے کام سنورتے نہیں بگڑتے ہیں۔ زندہ رہتے ہوئے بھی میں مُردوں کی طرح اپنوں سے ملنے سے ترس رہی ہوں۔ مجھے ایسی تشنہ زندگی سے محبت بھی نہیں ہے۔"

☆☆☆

"کب تک یہ زمینوں، غلوں کے حساب کتاب کرتے رہیں گے؟ کچھ خیال بیٹی کا بھی ہے کہ نہیں؟" گلباز خان جو بہت انہماک سے رجسٹر کھولے کھاتوں میں گم تھا۔ بیوی کی کراری و پاٹ دار آواز سن کر چونک اٹھے۔

"خیریت.....؟ کیا ہوا ہماری بیٹی کو؟ صبح تک تو ٹھیک ٹھاک تھی۔"

"ابھی بھی ٹھیک ٹھاک ہے لیکن کب تک اسے صبح و شام دیکھتے رہیں گے؟" وہ بیڈ پر جھٹکے سے بیٹھتے ہوئے استفسار کرنے لگیں۔

"کیا پہیلیاں بجھوا رہی ہو؟ سیدھی بات کرو۔"

"صارم خان شہر سے پڑھ کر آ چکا ہے۔ اب کس بات کی دیر ہے؟ بابا جانی اور بی بی کس بات کی خاموشی اختیار کیے ہوئے ہیں؟ کب رسم ادا کریں گی؟"

"گل، میں نے تمہیں پہلے بھی کہا تھا کہ صارم خان کی مرضی کے مطابق سب کچھ ہوگا۔ اگر وہ ہاں کہتا ہے تو ٹھیک ورنہ اس پر کوئی زبردستی نہیں ہے۔"

"ارے واہ..... وہ کس طرح انکار کر سکتا ہے۔ بچپن سے اس کے کان میں ہم یہ بات ڈال چکے ہیں کہ زرگون ہی اس کی شریک حیات

بنے گی، اب کس طرح وہ منع کر سکتا ہے۔'' وہ تیز و تند لہجے میں گویا ہوئیں۔

''سنو..... میری بیٹی کوئی بوجھ نہیں ہے اور نہ ہی کوئی ایسا ناقابل برداشت وجود کہ جس کو میں زبردستی ڈھول کی طرح کسی کی مرضی کے بغیر اس کے گلے میں ڈال دوں؟'' گلباز خان کے سخت لہجے میں غصہ و قطعیت تھی۔

''یہ کس طرح ہو سکتا ہے خان! وہ انکار نہیں کر سکتا، اسے شادی ہماری بیٹی سے ہی کرنی ہوگی، ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔''

''کیا اچھا نہیں ہوگا؟ کیا کرو گی؟ کیوں ایک بات کو رٹتی ہو بار بار تم، اچھی طرح سے جانتی ہو، صارم خان کو میں نے چچا بن کر نہیں باپ سے بڑھ کر چاہا ہے۔ اپنے سب بچوں سے عزیز ہے مجھے وہ۔''

''آپ ایک بار تو اس سے بات کر کے دیکھیں، وہ آپ کی بات نہیں ٹالے گا۔'' میاں کو غصے میں دیکھ کر انہوں نے ہوشیاری سے پہلو بدلا اور لہجے میں نرمی کے ساتھ کچھ بیویوں والی مخصوص لگاوٹ کا اظہار کر کے بولیں۔

''تم ضدی بہت ہو۔ تمہاری ہٹ دھرمی مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ کچھ عرصہ قبل بی بی جان نے صارم سے یہی خواہش ظاہر کی تھی۔ میں اتفاقاً اس کے پاس جا رہا تھا لیکن جب میں نے انہیں صارم سے یہ بات کرتے دیکھا تو میں مصلحتاً دروازے کے پاس پردے کے پیچھے رک گیا کہ کہیں مجھے سامنے دیکھ کر وہ جھجک کر کھل کر اپنی رائے کا اظہار نہ کر سکے۔ اس نے بی بی جان سے کہا تھا کہ وہ برادری سے باہر شادی کرے گا۔''

''کیوں کرے گا وہ برادری سے باہر شادی؟ ہماری لڑکیوں میں کیا کیڑے پڑ گئے ہیں۔ غیر برادری میں کون سی حور پری اس کا انتظار کر رہی ہے؟ ارے آپ بھی اچھے باپ ہیں؟ اس نمک حرام نے بیٹی کو ٹھکرا دیا اور آپ ابھی بھی اسے اپنی اولاد پر ترجیح دے رہے ہیں؟ دیکھو تو سہی اس احسان فراموش کی بات...... ہمارے احسانوں، ہماری پرورش کا یہ صلہ دیا ہے اس طوطا چشم نے.....؟''

وہ زور زور سے بولنے لگی تھیں۔ دروازے کے پیچھے کھڑی باتیں سنتی زرگون کا بھی برا حال تھا۔

''خاموش رہو! بدبخت عورت! تم جیسی عورتوں کی خود غرضی و مطلب پرستی ہی سگی محبتوں کو نفرت میں بدلنے کا انتظام کرتی ہے۔'' وہ دھاڑ کر گویا ہوئے۔

''آپ صبر کر سکتے ہو پر میں کس طرح اپنی بیٹی کے ارمانوں کو جلتا دیکھوں؟'' انہوں نے آنسو بطور ہتھیار استعمال کرنا شروع کر دیئے تھے۔

''بیٹی کا اس قصے سے کیا تعلق!'' ان کے لہجے میں استعجاب تھا۔

''وہ بچپن سے اسے چاہتی آ رہی ہے۔ اب کس طرح وہ برداشت کرے گی۔''

''تم بھی احمق ہو اور تمہاری بیٹی بھی۔ اسے تعلیم ہم نے اس لیے نہیں دلوائی ہے کہ وہ عام ناسمجھ و جاہل لڑکیوں کی طرح ایسے خواب دیکھے۔ سمجھا دینا اسے، آج کے بعد اس کے لبوں پر صارم کا نام اس انداز میں نہیں آنا چاہیے۔ بے شک خلاف رواج ہم نے اپنے بچوں کو وہ سب کچھ حاصل کرنے دیا ہے جو صدیوں سے اس قبیلے کا شعار نہ رہا تھا لیکن بابا جانی غلامی و جہالت کو سخت ناپسند کرتے ہیں، اس لیے ہمارے ہاں کی لڑکیوں نے بھی لڑکوں کی طرح آزادی سے تعلیم حاصل کی ہے۔ اپنی مرضی سے زندگی گزار رہی ہیں لیکن آزادی اور بے غیرتی میں اتنا ہی فرق ہے جتنا رات اور دن

میں ہے۔ زرگون نے کوئی ایسا قدم اٹھایا جس سے میری عزت وحمیت پر داغ لگا تو سمجھ لینا، میرے اندر کا صدیوں پرانا روایت پسند انسان جاگ اٹھے گا۔ جو اپنی آن پر جان قربان کرنا فخر سمجھتا ہے۔“

ان کے لہجے میں حاکمیت وسفا کی تھی۔ چہرہ آگ کی طرح دھک اٹھا تھا۔

☆☆☆

کائنات نے کمرے میں آتے ہی وارڈ روب سے کپڑے نکال کر سوٹ کیس میں بھرنا شروع کر دیئے تھے۔ اس کے وہم وگمان میں نہ تھا کہ وہ اس طرح اچانک، اس کی رائے لیے بغیر اس کی زندگی کا اہم ترین فیصلہ کر ڈالیں گے۔ مزید ستم یہ کہ وہ کچھ سننے کو تیار بھی نہ تھے۔ مکمل آمرانہ انداز تھا ان کا۔

بے لچک،

ٹھوس۔

جیسے کوئی چٹان اپنی جگہ مکمل استحقاق سے براجمان ہو۔

اس نے اس چٹان سے ٹکرانے سے بہتر اس جگہ کو چھوڑ کر جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

”یہ کہاں جانے کی تیاری کر رہی ہیں آپ!“ آپا فرحت اندر داخل ہوئیں تو اسے سامان سمیٹتے دیکھ کر وہ اچنبھے سے دریافت کرنے لگیں۔

”میں اب ایک پل بھی ٹھہرنا نہیں چاہتی یہاں پر، آپ بھی اپنا سامان پیک کیجیے۔ ہم جا رہے ہیں یہ جگہ چھوڑ کر۔“ وہ ڈریسنگ ٹیبل سے سامان سمیٹ کر بیگ میں بھرتے حکمیہ لہجے میں بولی۔

”مگر یہ کس طرح ممکن ہے؟ بھائی صاحب نے مجھے گھر کی صفائی کا حکم دیا ہے۔ خود بازار چلے گئے اور آپ یہاں سے جانے کی تیاری کر رہی ہیں؟“

”آپا! میرے ساتھ جو ہو رہا ہے وہ درست سمجھتی ہیں آپ؟“

”میری بات سنیں، یہاں بیٹھیں ذرا تسلی سے۔“ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر صوفے پر بیٹھتے ہوئے نرمایت سے گویا ہوئیں۔

”بھائی صاحب، بہت اچھے انسان ہیں۔ عورت کتنی قابل ہو جائے، ہزاروں ڈگریاں حاصل کر لے مگر رہتی عورت ہی ہے۔“

”آپا! اس وقت کیا فضول سا فلسفہ شروع کر دیا ہے آپ نے؟ حیات انکل کی اچھائی سے میں نے کب انکار کیا ہے؟ لیکن جو انہوں نے فیصلہ سنایا ہے وہ میں نہیں مان سکتی۔“

”یہ اچھی بات نہیں ہے آپ کی، مجھے بھائی صاحب کا فیصلہ بروقت اور درست لگ رہا ہے۔ شمشیر خان کی بڑھتی ہوئی مہربانیوں سے مجھے بھی خوف آنے لگا ہے۔“

”آپا! آپ نے خوامخواہ اس شریف وعزت دار بندے کو رسوا کر رکھا ہے۔ میں اس کے خلاف ایک لفظ سننے کی روادار نہیں ہوں عجیب

دستور ہیں اس جہان کے۔"

"میں جانتی ہوں، آپ بہت آگے بڑھ چکی ہیں لیکن بتادوں وہ ایک بھنورا صفت انسان ہے اور بھنوروں کی فطرت میں کلی کلی، پھول پھول منڈلانے کی ہر جائی عادت ہوتی ہے۔ ان کی محبت کی عمر اتنی ہی ہوتی ہے جیسے ایک پھول کھلنے میں تو خاصا وقت لگتا ہے مگر مرجھا کتنی جلد جاتا ہے۔ بس ..... اتنا قلیل عرصہ ہوتا ہے ان بھنوروں کی چاہت کا بھی، کیوں سراب پر بھروسا کرتی ہیں؟"

فرحت آپا نے کہا جو اس کے جذبات واحساسات کے تمام رنگوں سے واقف تھیں۔

وہ شمشیر خان کی محبت میں ڈوب چکی ہے۔ اس بات کا احساس بہت پہلے انہیں ہو چکا تھا۔ اب اس کی اس جلد بازی، ایک حد تک محسوس کی جانے والی خود سری نے اس کے محسوسات کو حقیقت کا رنگ دے دیا تھا۔ وہ بہت آگے بڑھ چکی تھی۔

"بس ..... آپا ..... میں اس وقت کچھ سننے کے موڈ میں نہیں ہوں۔"

اس نے قطعی لہجے میں فیصلہ سنا دیا تھا۔

☆☆☆

گلابی نازک ریشم کی کڑھائی والی فراک اور شلوار میں ملبوس سر پہ نیلا چادر نما دوپٹہ جس پر فراک کی ہم رنگ کڑھائی تھی سر پر ڈالے وہ صابرہ کے ساتھ گھر سے نکل آئی تھی۔ باہر کا منظر بہت سہانا تھا۔ چار سو سبزہ ہی سبزہ تھا۔ جنگلی پھولوں کی مہک طبیعت کا بوجھل پن زائل کر رہی تھی۔ پہاڑوں کی کوکھ سے پھوٹتے جھرنے ماحول میں طلسماتی حسن پھیلا رہے تھے۔ صابرہ بڑے جوش وخروش سے اس کا ہاتھ پکڑے اونچے نیچے راستوں پر چل رہی تھی۔ ساتھ ہی اس کی زبان بھی بڑی روانی سے چل رہی تھی۔ وہ نہ معلوم کس دور کے قصے اسے سنا رہی تھی۔ ورشا کچھ سمجھ نہیں پا رہی تھی، محض غائب دماغی سے ہوں ہاں کر رہی تھی۔ اس کے اندر اضطراب و بے چینی لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جا رہی تھی۔

روزی خان نے اسے روکنے کی ہر ممکن کوشش کی تھی۔ لیکن وہ اب بیزار ہو چکی تھی۔ ان دو ہفتوں میں اس قدر ذہنی و دماغی اضطراب سے گزری تھی کہ خوف، فکر، ڈر بے معنی سا ہو کر رہ گیا تھا۔

موت کا خوف، ہر فکر اور ڈر کا باعث بنتا ہے۔

اگر انسان موت کو قبول کر لیتا ہے تو پھر ہر خوف، پریشانی وغم سے آزاد ہو جاتا ہے۔ وہ بھی سمجھ رہی تھی کہ اس کا ہر اٹھتا قدم اسے موت سے قریب کر رہا ہے۔

اور اس آنے والے لمحوں کے انتظار نے اس کے اندر اضطراب و بے چینی پھیلا دی تھی۔

"بیٹی! کیا ہوا؟ جواب کیوں نہیں دے رہی؟" صابرہ جو اس سے کچھ پوچھ رہی تھیں اسے خاموش وغیر متوجہ دیکھ کر حیرانگی سے بولیں۔

"میں نے سنا نہیں اماں، بتاؤ نا کیا بول رہی تھیں؟"

"میں کہہ رہی تھی۔ یہاں سے کچھ دور غائب شاہ بابا کا مزار ہے۔ وہاں چل کر چادر چڑھا آتے ہیں پھولوں کی، جب تم گم ہوئی تھیں نا تو

میں نے منت مانی تھی۔"

"عورتوں کا مزارات پر جانا جائز نہیں ہے۔ یہ بات آپ کو کسی نے نہیں بتائی؟"

"میں اندر نہیں جاتی، بس باہر سے ہی دعا مانگ لیتی ہوں۔"

"یہ نام کیسا ہے اماں لغائب شاہ بابا؟" اس نے پہاڑ کے قریب لگے درخت سے امرود توڑ کر پانی سے دھوتے ہوئے حیرانگی سے استفسار کیا۔

"یہ ایک واقعہ ہے۔ جو ہمارے بڑے یہاں کے متعلق بتایا کرتے تھے۔" صابرہ جھک کر جھرنے سے پانی پیتی ہوئی گویا تھیں۔

"کیسا واقعہ اماں؟" وہ امرود کھاتی ہوئی ان کے قریب ہی بیٹھ گئی۔

"یہ اس وقت کی بات ہے جب میرے دادا چھوٹے تھے اور دادا کی ماں بھی زندہ تھیں۔ جب بہت اچھا وقت تھا۔ سادے لوگ تھے، خالص محبتیں تھیں۔ بجلی کہیں بھی نہیں آئی تھی۔ غریب کسان کی جھونپڑی ہو یا سرداروں کے محل، سب جگہ تیل کے چراغ جلا کرتے تھے۔ کچھ دنوں سے گاؤں میں عصر کے بعد سے بہت اچھی مہک ہر جگہ پھیل جاتی جو رات کے آخری پہر تک محسوس ہوتی..... پھر یہ مہک آہستہ آہستہ بڑھتی گئی۔ لوگوں نے ایک دوسرے سے ذکر کیا تو سب نے یہی کہا، ان کے گھروں میں بھی ایسی مہک آتی ہے۔ پھر کچھ لوگوں نے ایک چراغ کو ہوا میں اس طرح لہراتے ہوئے دیکھا جیسے کوئی چراغ کو ہاتھ میں لے کر چلتا جا رہا ہو۔ چلنے والا نظر نہیں آتا تھا۔ وہ چراغ ایک جگہ جا کر خود بخود رک جاتا اور اسے رکھنے والا نظر نہیں آتا۔"

"یہ تو خاصی پراسرار سی بات لگ رہی ہے اور ناقابلِ یقین بھی۔"

وہ جو خاصی دلچسپی سے سن رہی تھی۔ ان کے خاموش ہوتے ہی بے یقینی سے بولی۔

"ہاں بیٹا! یہاں تو ایسی داستانیں بہت ہیں۔ ہماری ماں تو ہمیں ایسے ایسے قصے سناتی تھیں کہ تم تو سرے سے یقین ہی نہیں کرو گی۔" اس واقعے سے اس کی عدم دلچسپی محسوس کر کے وہ خاموش ہو گئی تھیں۔ ورشا نے بھی اصرار نہ کیا کہ وہ بات مکمل کریں۔

وہ پھر عام انداز میں باتیں کرتی آگے بڑھنے لگیں۔

☆☆☆

یہ عجب فصلِ فراق ہے
کہ نہ لب پہ حرفِ طلب کوئی
نہ اداسیوں کا سبب کوئی
نہ ہجوم درد سکے شوق میں
کوئی زخم اب سکے ہرا ہوا
نہ کماں بدست عدو ہوئے
نہ ملامتِ صفِ دشمناں

نہ یہ دل کسی سے خفا ہوا

کوئی تار اپنے لباس کا

نہ ہوا نے ہم سے طلب کیا

نہ رہ گزار وفا بچھی

نہ دیا جلانے کی آرزو

سبے چارہ غم دو جہاں

نہ مسیح کوئی نہ چارہ گر

نہ کسی خیال کی جستجو

نہ خلش کسی کے وصال کی

نہ تھکن رہ مسہ وصال کی

نہ دماغ رنجِ بتاں

نہ تلاشِ لشکرِ ناصحاں

وہی ایک حال ہے ضبط کا

وہی ایک چال ہے دہر کی

وہی ایک رنگ ہے شوق کا

وہی ایک رسم ہے شہر کی

نہ نظر میں خوف ہے رات کا

نہ فضا میں دن کا ہراکنا ہے

بے عرضِ حالِ سخن وراں

وہی ہم سخن ہے رفیقِ جاں

وہی ہم سخن جسے دل کہیں

وہ تو یوں بھی کب کا اداس ہے

"کن سوچوں میں گم رہتے ہو صارم خان!"

وہ جو سوچ کے مہیب جنگلوں میں بھٹک رہا تھا۔ بی بی جان کی آواز سن کر چونک کر سیدھا ہو بیٹھا۔ وہ نماز سے فارغ ہو کر اس کے قریب

آ بیٹھی تھیں۔

''کچھ نہیں بی بی جان! یہ ٹانگ کا زخم ٹھیک ہو تو باہر نکلوں۔''
اس نے ان کی گود میں سر رکھتے ہوئے اکتائے لہجے میں کہا۔

''ان شاء اللہ تعالیٰ، جلد ٹھیک ہو جائے گا۔'' انہوں نے شفقت سے اس کی پیشانی چومی۔

''بابا جانی کہاں ہیں۔ صبح سے نظر ہی نہیں آئے؟''

''معلوم نہیں، کن چکروں میں آج کل لگے ہوئے ہیں، گلباز بھی باپ کے ساتھ ہی ہے۔''

''گلریز کہیں گیا ہوا ہے کیا؟ جو نظر نہیں آرہا۔''

''معلوم نہیں بچے! اندر ہی اندر یہ لوگ کیا کر رہے ہیں؟ گلریز بھی صبح سے ان کے ساتھ ہی ہے کہیں لے کر گئے ہیں دو اسے۔''

''بی بی جان میں جا رہا ہوں۔ میرا جانا ضروری ہے۔'' وہ ایک دم ہی بیڈ سے نیچے اترنے لگا تھا۔ بابا جانی اتنی جلدی اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کی سعی کریں گے۔ بے شک ان کا ارادہ صلح کرنے کا تھا۔ وہ اپنی ملنسار طبیعت کی باعث فضول لڑائی جھگڑے پسند نہیں کرتے تھے لیکن شہباز خان کے متعلق جو اسے بتایا گیا تھا وہ کبھی بھی اس صلح و امن کی پیشکش قبول نہیں کرے گا۔

اس سے بعید نہ تھا کہ وہ جوشِ انتقام میں کچھ بھی کر ڈالنے کو تیار ہو جاتا۔ گلریز کو یقیناً بابا جانی زبردستی ساتھ لے کر گئے ہوں گے۔ لیکن جذباتی و جلد باز وہ از حد تھا۔ وہ کوئی بات برداشت کرنے کے بجائے وہاں لڑنے کو تیار ہو جائے گا۔

ایسے میں اس کا وہاں جانا ضروری تھا۔ نہ معلوم کیوں اور کس مصلحت کے تحت بابا جانی اسے وہاں لے کر نہیں گئے تھے اور جاتے وقت مطلع بھی نہ کیا تھا۔

''کہاں جا رہے ہو؟ کیا ہوا اس قدر پریشان کیوں ہو گئے ہو؟''
''بی بی جان مجھے روکیے مت۔ میں جلد آ رہا ہوں۔''

اس نے عجلت میں کہتے ہوئے اسٹک اٹھائی، جس کے سہارے وہ آج کل چل رہا تھا۔

ابھی اس نے قدم بھی نہیں بڑھائے تھے کہ بے تحاشہ بھاگتی ہوئی گل زیبا اندر آئی تھیں ان کے پیچھے فرزگون اور چھوٹی بھابھی بھی خاصی متوحش سی اندر داخل ہوئی تھیں۔

''الٰہی خیر! ارے کیا ہوا؟'' بی بی جان نے دل کر سینہ پکڑا تھا۔

''بی بی جان، ہم لٹ گئے، برباد ہو گئے..... ہمارا.....''

''کیا ہوا ہے؟ جلدی بتاؤ؟'' صارم سنجیدگی سے بولا تھا۔

''بابا جان اور گلباز خان، گلریز خان کو ساتھ لے کر گئے ہیں۔ دشمن قبیلے کے سردار کی لڑکی سے.....'' ان کی پاٹ دار آواز پورے کمرے

میں گونج اٹھی۔

''یہ کیا کہہ رہی ہو زیبا! کس نے کہا یہ.....؟'' بی بی جان نے آگے بڑھ کر کہا۔

''یہ مت پوچھیں مجھ سے میرے بھی کچھ خاص لوگ ہیں اس حویلی میں۔ جو میرے خلاف ہونے والی سازشیں مجھے بتاتے رہتے ہیں۔ کتنی معصوم بن رہی ہو، جیسے کچھ معلوم ہی نہیں؟''

''دماغ خراب ہوگیا ہے آپ کا کس انداز میں بات کر رہی ہیں آپ بی بی جان سے؟'' صارم ان کا انداز برداشت نہ کر پایا تو سرد لہجے میں بولا۔

''ارے دماغ تو میرا اب درست ہوا ہے۔ کتنی بے وقوف تھی میں، جو تم لوگوں کو اپنا سمجھا ہونہہ کیا صلہ ملا مجھے؟ تم نے میری محبت کا یہ صلہ دیا کہ میری بیٹی کو اپنانے سے انکار کر دیا۔ ذرا بھی لحاظ و مروت نہیں دکھائی تم نے اور آج تو حد ہوگئی..... میرے بیٹے کو، میری مرضی جانے بغیر دشمنوں کی بیٹی سے بیاہنے پہنچ گئے۔ ایسے ہوتے ہیں اپنے؟ میرے سارے ارمان، خواہشیں، تمنائیں، خاک میں ملا دیں۔''

انہوں نے چیکوں پہکوں رونا شروع کر دیا۔

''بلا غرض محبتیں کبھی دکھ نہیں دیتیں۔ آپ نے اپنی محبتوں میں غرض شامل کر لی اور آج ہمیں مورد الزام ٹھہرا رہی ہیں۔ اللہ گواہ ہے میں نے ہمیشہ آپ کا احترام کیا اور ماں کی طرح سمجھا ہے۔''

''ارے رہنے دو.....سب جانتی ہوں..... اگر اس گھر میں میرے بیٹے کی بیوی میری مرضی کے خلاف آ گئی تو کبھی اسے بسنے نہیں دوں گی اور اس حویلی کی بھی اینٹ سے اینٹ بجا دوں گی۔ میں بہت بری عورت ہوں..... ابھی میرا اصلی روپ دیکھا نہیں تم لوگوں نے۔''

وہ لہراتے بل کھاتے وجود کو لے کر کمرے سے چلی گئی تھیں اور پیچھے زرگون خانم بھی، اس کے تیور بھی ماں کی طرح ہی تیکھے تھے۔

''بی بی جان! خیال نہیں کریں۔ بھابھی غصے میں ہیں۔ اس لیے انہیں خود بھی نہیں معلوم کہ وہ کیا بول رہی ہیں۔ بعد میں خود آ کیں گی معافی مانگنے۔''

چھوٹی بہو نے جوان کی گم صم حالت دیکھی تو ملائمت سے سمجھانے لگیں۔

''نہیں..... مجھے کچھ نہیں ہوا۔ مجھے تنہا چھوڑ دو۔''

بی بی جان جو بڑی بہو کی سفاکیت، بدلحاظ فطرت سے اس حد تک واقف تھیں، آج ان کی زبان کے شعلوں نے جھلسا کر رکھ دیا تھا۔ کیونکہ وہ از حد بدتمیز و خود غرض عورت ہیں۔ ایسی حریص عورت جس کا ہر قدم صرف اور صرف اپنے مفاد کی جانب اٹھتا ہے۔ ان کی بدکلامی اور بدظنی نے انہیں چکرا کر رکھ دیا تھا۔ دوسرے انہوں نے جو انکشاف کیا تھا وہ کسی دھماکے سے کم نہ تھا۔ چھوٹی بہو دھیرے دھیرے ان کا سر دبانے لگی۔ صارم کمرے سے نکل گیا۔

☆☆☆

''ڈاکٹر صاحبہ! کہیں جا رہی ہیں آپ؟'' شمشیر خان جیپ سے اتر کر اس کے نزدیک چلا آیا۔ کائنات سوٹ کیس ہاتھ میں پکڑے سڑک کے کنارے چل رہی تھی۔ ساتھ اس کے فرحت آپا بیگ اٹھائے چل رہی تھیں۔

''جی...... جی میں کراچی جا رہی ہوں۔'' کائنات نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیوں......؟ کوئی کام ہے کیا؟'' شمشیر نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''ہمیشہ کے لیے جا رہی ہوں۔''

''ہمیشہ کے لیے؟ کیوں......؟ کوئی شکایت ہو گئی؟''

''آپ سے کیا شکایت؟ انکل میری شادی کرنا چاہ رہے ہیں۔'' وہ ٹھہر ٹھہر کر کہہ رہی تھی۔

''اور آپ، کرنا نہیں چاہتیں۔ یہی بات ہے نا؟ جائیے واپس آپ! میں حیات خان سے بات کروں گا۔ میری مرضی کے بغیر وہ کچھ نہیں کر سکتے۔''

''آپ کس طرح منع کر سکتے ہیں انکل کو؟'' کائنات نے حیرانگی سے کہا۔

''آپ دیکھ لیجیے گا۔ کس طرح منع کرتے ہیں ہم انہیں۔''

اس کے لہجے میں رعونت و پختگی تھی۔ ساتھ ہی ایسی قطعیت کہ کائنات نے مزید کچھ نہیں کہا۔ فرحت آپا کھول کر رہ گئی تھیں۔ وہی ہوا جس کا ان کو خوف تھا۔

''میرا انتظار کرنا۔ میں جلد آؤں گا۔'' شمشیر نے اس کا ہاتھ پکڑ کر آہستگی سے کہا تھا۔

اس کی آنکھیں

اس کا چہرہ

اس کے ہاتھوں کے لمس نے وہ اقرار محبت کر لیا تھا جس کی وہ منتظر تھی۔

اس نے بھی بے قراری سے اس کی سرخ آنکھوں میں لمحے بھر کو جھانکا تھا۔ وہاں جذبات و چاہت کے اتنے رنگ تھے کہ اس نے نگاہیں جھکالی تھیں۔ یہ سب فرحت آپا سے مخفی رہا تھا کیوں کہ وہ آگے چل رہی تھیں۔ کائنات نے اسے خدا حافظ کہتے ہوئے آگے قدم بڑھا دیے تھے۔ کیوں کہ گھر سے وہ دور نہیں تھیں۔

شمشیر خان ان کے نگاہوں سے اوجھل ہونے کے بعد گاڑی میں بیٹھ گیا اور صمد خان نے گاڑی چلا دی تھی۔ کائنات کو دیکھ کر جو اس کے چہرے پر سرور چھایا تھا وہ غائب ہو گیا تھا۔ وہی پتھریلا پن اس پر چھا گیا تھا۔ ''خان جی! کہیں ایسا تو نہیں کہ چھوٹی بی بی واپس کراچی چلی گئی ہوں۔ یہاں ہم نے ہر جگہ دیکھا ہے وہ کہیں نہیں ہے۔''

''نہیں سمندر خان! وہ یہیں کہیں ہے۔ وہ کراچی نہیں گئی۔ معلومات کروائی ہیں میں نے۔''

''تو پھر کہاں جا سکتی ہیں؟''

''خان۔۔۔! آج کل روزی خان گھر میں بہت سامان لے کر جاتا ہے۔ میں نے اس سے معلوم کیا تھا اس نے مجھے کچھ ایسے قصوں میں الجھایا کہ میں دوبارہ اس سے پوچھنا بھول گیا۔

اب یاد آ رہا ہے مجھے اور آج کل اس کی پاگل بیوی بھی باہر نظر نہیں آتی۔''

''کب کی بات ہے؟ پہلے کیوں نہیں بتایا تو نے۔۔۔؟'' شمشیر خان دھاڑ کر بولا۔

''خان میرے کو ابھی یاد آیا ہے۔'' صمد نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا

''چل۔۔۔ گاڑی اس کے گھر کی طرف ٹرن کر۔'' اس کا حکم پاتے ہی صمد خان نے گاڑی دوڑانا شروع کر دی تھی۔ روزی خان کے گھر کے دروازے پر تالا لگا دیکھ کر شمشیر خان نے روزی خان کو موٹی موٹی گالیوں سے اس کی غیر موجودگی میں بھی نوازا تھا۔

''خان! وہ سامنے گلابی پھولوں کے جھنڈ میں کوئی بیٹھی نظر آ رہی ہے۔'' سمندر خان نے اپنی عقابی نگاہوں سے خاصے فاصلے پر بھی بالکل درست دیکھا تھا۔

''ایک عورت بھی ہے۔ ارے یہ تو روزی خان کی بیوی ہے۔ اور وہ؟ ہاں، وہی ہے۔ مل گئی، ہاہاہا۔۔۔ کب تک چھپ سکتی تھی؟ شمشیر خان سے کوئی چھپا ہے آج تک؟''

شمشیر خان نے ورشا کو پہچان کر فاتحانہ انداز میں کہا تھا۔

لینڈ کروزر بہت تیزی سے اس جانب بڑھ رہی تھی۔

☆☆☆

''کیا ہوا؟ جیپ کیوں رک گئی؟''

شاہ افضل خان ایک دم جیپ رک جانے کی وجہ دریافت کرنے لگے۔

''ہم بال بال بچ گئے بابا جانی! اگر چند سیکنڈ بعد یہ تو وہ گرتا تو ہم گاڑی سمیت پس گئے ہوتے۔'' گلباز خان نے سڑک کے درمیان میں پڑے بھاری بھرکم چٹانی پتھر کی طرف اشارہ کیا۔ جو ابھی گرا تھا۔

اوہ، اللہ کا بڑا احسان ہے۔ میری آنکھ لگ گئی تھی۔ اس لیے میں نے محسوس نہیں کیا۔

''چلو آؤ گلریز خان اسے ہٹانے میں میری مدد کرو۔''

گلباز خان گلریز سے مخاطب ہوئے جو خاموشی سے بیٹھا ہوا تھا۔

☆☆☆

تو وہ بہت بھاری تھا۔ جسے ہٹانے میں انہیں خاصا وقت صرف کرنا پڑا تھا۔ راستہ صاف ہونے کے بعد گاڑی پھر اپنی منزل کی جانب گامزن ہو چکی تھی۔

شاہ افضل خان اور گلباز خان کی کبھی کبھی کی جانے والی گفتگو ماحول میں چھائے جامد پراسرار سناٹے کو لمحوں کے لیے توڑ دیتی۔ پھر ایک پر ہیبت خاموشی چھا جاتی۔ گاڑی طور خان ڈرائیو کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ گلباز خان بیٹھے تھے۔ پیچھے کی سیٹوں پر افضل خان اور گلریز خان بیٹھے تھے۔

''کچھ بولو بچے۔ کیوں اس قدر خفا خفا نظر آ رہے ہو؟''

بڑے خان نے بڑا سپاٹ چہرہ لیے از حد خاموش بیٹھے گلریز خان سے مخاطب ہو کر کہا۔

''کیا بولوں ......؟ کچھ بولنے کے لیے بچا ہی کیا ہے بابا جانی۔''
اس کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں۔ دھیمے لہجے میں تنفر و خفگی کی تلخی تھی۔

''رہنے دیجیے بابا جانی۔ اس وقت اسے اس کے حال پر چھوڑ دیں۔ یہ ابھی اپنے ہوش و حواس میں نہیں ہے۔'' گلباز خان نے رخ موڑ کر بیٹے کو تنبیہی نگاہوں سے گھورتے ہوئے باپ سے کہا۔ طور خان ان کی موجودگی میں بہت مودب محتاط انداز میں ڈرائیونگ کر رہا تھا۔

''مجھے احساس ہے میرے بچے، جو کچھ میں تمہارے ساتھ کرنے جا رہا ہوں، ایک طرح سے تمہارے ساتھ ظلم و زیادتی ہی ہے۔ لیکن بچے! اگر سیلاب کی آمد سے پہلے احتیاطی تدابیر اختیار کر لی جائیں یا اجتماعی مفاد کی خاطر انفرادی قربانی دے دی جائے تو یہ ''ظلم'' عدل اور ''زیادتی'' عظمت بن جاتی ہے میرے بچے، سمجھ رہے ہو نا میری بات؟''
''پہل ہم نے نہیں کی پھر کیوں ہم بزدلوں کی طرح .....''

''گل ...... ریز ...... خان! زبان کو لگام دو۔'' اس کی بات قطع کر کے ایک دم گلباز خان دہاڑ کر بولے تھے۔ انہوں نے آج تک اپنی کسی بات سے اختلاف نہیں سنا تھا۔ پھر بیٹے کی سرکشی دو دھیمے بادب لہجے میں کی گئی گستاخی کس طرح برداشت کرتے۔

''گل باز خان! مت طیش میں آیا کرو، اتنی جلد، کہنے دو اسے جو یہ کہنا چاہتا ہے۔''

''نہیں بابا جانی! جس کی جرات اس کے باپ نے آج تک نہیں کی، وہ یہ کس طرح کر سکتا ہے۔ میں اس کی زبان قطع کرنا خوب جانتا ہوں۔''

''چھوڑ دو خاناں! تمہارا وقت گزر گیا بچے، جو گزر جاتا ہے، کبھی پلٹ کر نہیں آتا، یہ وقت، یہ دوران بچوں کا ہے۔ جو مصلحت نہیں سمجھتے ہیں۔ مفاہمت کرنا ان کا شیوہ نہیں ہے۔ جو گہرائی کو نہیں سطح کو پسند کرتے ہیں۔''

''جب ہی تو سطحی و گھٹیا ذہنیت ہے ان لوگوں کی۔ ہونہہ، جو گہرائی میں جانا پسند نہیں کرتے، وہ تا حیات عقل و دانشمندی کے گوہر نایاب سے محروم رہتے ہیں۔ پھر ان کی زندگی یوں ہی مرنے مارنے میں گزرتی ہے۔''

گلباز خان کا غصہ کسی طور پر کم نہیں ہو رہا تھا۔ وہ گلریز خان کو مسلسل گھور رہے تھے۔ جو سر جھکائے ہونٹ دانتوں میں کاٹ رہا تھا۔ بڑے خان کی مداخلت نے انہیں خاموش کیا تھا۔

موسم خاصا کہر آلود تھا۔ دوپہر کے اس وقت میں بھی شام کا احساس ہو رہا تھا۔ جس سے ٹھنڈک محسوس ہو رہی تھی۔

راستہ ابھی کچھ باقی تھا کہ گاڑی ایک دم دھماکوں کی زد میں آ کر لہرانے لگی۔

بڑے خان جو کچھ دیر قبل نیند کے جھونکوں کی زد میں تھے ایک دم ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔ گاڑی بری طرح لہرا رہی تھی۔ ایک طرف پہاڑوں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ دوسری طرف گہری کھائیوں کے لامحدود دائرے تھے۔

☆☆☆

''اماں! کیا ہوا؟ خاموش کیوں ہو گئی ہو؟''

ورشا نے یکدم خاموش، گم صم صابرہ پر نظر ڈال کر کہا جو بات کرتے کرتے یکلخت چپ ہو گئی تھی۔

''کیا بات کروں بیٹی! تجھے میری کوئی بات ہی سمجھ نہیں آتی۔ پہلے تو...... تو ایسی نہیں تھی۔''

''کیسی اماں؟ کیا ہوا مجھے؟'' اس نے چونک کر ان کے کمزور چہرے کو دیکھا۔

''پتہ نہیں؟ مجھے کبھی کبھی ایسا کیوں لگتا ہے جیسے میں پاگل ہو گئی ہوں۔'' ان کے کھوئے کھوئے انداز میں الجھن و سراسیمگی چھائی ہوئی تھی۔

گردش وقت سے بجھی آنکھوں میں ایک یاسیت و بے چارگی تھی۔ وہ ورشا کو دیکھ رہی تھی۔ یک ٹک، بغیر پلکیں جھپکے جیسے پہلی مرتبہ دیکھ رہی ہو۔

''نہیں...... نہیں اماں! آپ پاگل نہیں ہیں۔'' ورشا نے اپنائیت سے کہا۔ ''جن دلوں میں محبت کے چشمے پھوٹتے ہوں، آنکھوں میں مروت و خلوص کے چراغ روشن رہتے ہوں، جو سراپا ایثار، وفا، شفقت ہوں، ایسے لوگ پاگل نہیں ہوتے اماں، نہیں ہوتے۔''

''ایک بات بتاؤں تجھے، کبھی کبھی مجھے ایسا لگتا ہے، جیسے......''

انہوں نے بہت گہری نگاہ اس پر ڈالتے ہوئے تذبذب سے کہا۔

''تو...... میری گلفشاں نہیں ہے۔''

''اماں! کیا کہہ رہی ہیں آپ؟''

''ہاں...... جبھی تو میں کہہ رہی ہوں کہ میں پاگل ہو گئی ہوں۔ ارے تو برا مان گئی؟ چھوڑ میں تو ایسے ہی کہہ رہی تھی، چل آگے چلتے ہیں۔ دوپہر ڈھلنے کو ہے پھر اندھیرا پھیل جائے گا تو تیرا بابا فکر مند ہو جائے گا۔''

وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھنا ہی چاہتی تھی کہ سامنے دور سے آتی ہوئی لینڈ کروزر دیکھ کر چونک گئی۔ ورشا ایک دم ہی حواس باختہ ہو کر اٹھی تھی۔

موت سے پہلے موت آنے کا خوف ہر ذی شعور کو مضطرب و خوفزدہ کر ڈالتا ہے۔

وہ جو موت کو گلے لگانے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ پوری رفتار سے اس طرف آتی گاڑی کو دیکھ کر سراسیمگی سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ قریب آتی گاڑی ایک جھٹکے سے رکی تھی۔

ہاتھ میں بندوق لیے شمشیر خان بڑے غیض و غضب کے انداز میں باہر آیا تھا۔

''لالہ.....'' ورشا کے ہونٹوں سے بے اختیار نکلا تھا۔

اس کی نگاہوں میں ایسی تپش تھی جس کے آگے الاؤ بھی سرد محسوس ہوں۔ چہرے پر ایسی خونخواری اور سفاکی چھائی ہوئی تھی کہ اس کے ساتھ ساتھ صابرہ بھی کانپ اٹھی تھی۔ وہ ورشا کا ہاتھ پکڑ کر خوفزدہ انداز میں اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

''ہاں..... میں! کیا سمجھی تھی؟ ہمارے چہروں پر سیاہی مل کر ہم سے بچ جائے گی؟'' اس نے آگے بڑھ کر ورشا کے بال چادر سمیت مضبوطی سے پکڑ لیے تھے۔ اس کی اس وحشی حرکت پر صابرہ بپھرے ہوئے انداز میں شمشیر خان کے بازو سے لپٹ گئی اور ساتھ ہی چیخنے لگی۔

''لالہ..... اسے کچھ نہ کہو..... یہ بے قصور ہے.....'' ورشا نے اسے صابرہ کو جھٹکے سے دور پھینکتے دیکھ کر کہا۔ شمشیر خان نے پوری طاقت سے اس کے رخسار پر تھپڑ دے مارا تھا۔

''خاموش..... تیری ناپاک زبان پر میرا نام بھی نہیں آنا چاہیے۔''

اس نے گالی دیتے ہوئے ورشا کے دوسرا تھپڑ بھی مارا جس کی ضرب اتنی شدید تھی کہ اس کے منہ سے خون کا فوارہ سا پھوٹ پڑا تھا۔

''کیوں مارتا ہے؟ کیوں مارتا ہے میری بچی کو؟ میں تجھے جان سے ماردوں گی۔ کمینے..... بے غیرت۔'' صابرہ زمین سے اٹھ کر غصے سے چیختی ہوئی اس کی طرف بڑھی تھی۔ شمشیر خان نے اس بار بھرپور لات قریب آتی صابرہ کے ماری تھی۔ جو پوری طاقت سے اس کی پسلیوں پر لگی تھی۔ صابرہ جس کی حالت دیمک خوردہ لکڑی کی مانند تھی شمشیر خان جیسے توانا وحشی سانڈ جیسی طاقت رکھنے والے وجود کی ایک طاقتور لات کی تکلیف وہ کیسے برداشت کرپاتی۔ ایک اذیت ناک چیخ مار کر وہ پیچھے گری تھی اور کچھ دیر تڑپ کر ساکت ہوگئی تھی۔

اسے اس طرح زمین پر گرتے دیکھ کر ورشا بری طرح اس کی گرفت سے نکلنے کو مچلنے لگی۔

''لالہ..... تم ابھی تک ایسے ہی ہو۔ ظالم، سفاک، بے رحم، کیا بگاڑا ہے اس مظلوم عورت نے تمہارا؟'' منہ سے بہتے خون، چہرے پر پھیلتی جلن، اور کسی فولادی شکنجے میں پھنسے بالوں کی اذیت وتکلیف سے زیادہ صابرہ کے اس طرح گرنے نے اسے تڑپا کر رکھ دیا تھا۔

''خاموش..... اگر ایک لفظ اور کہا تو زبان کھینچ لوں گا، بدذات..... اس لیے گئی تھی تو پڑھنے؟ یہی سیکھنے گئی تھی کہ ہماری عزت، شان و شوکت، رعب ودبدبہ سب کو نیلام کرنے کا پلان بنایا تھا تو نے؟ یہی سیکھنے گئی تھی؟ اس قبیلے کی لڑکیوں کو اس طرح جہالت کے اندھیروں سے نکالے گی۔ انہیں ایسی راہیں دکھائے گی؟''

اس نے ایک زوردار جھٹکے سے بال پکڑ کر اسے دھکا دیا تھا۔

ورشا کا سر پتھر سے ٹکرایا تھا۔ درد سے اس کی جان سی نکلنے لگی، مگر اس نے ضبط وبرداشت کا دامن نہیں چھوڑا، چکراتے سر کو پکڑ کر رہ گئی۔

''میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ کیا سمجھتی ہے مجھے؟ کیا سوچ کر بھاگی تھی؟''

''ایسی بات نہیں ہے۔ پہلے میری بات تو سن لو۔'' وہ اسے رائفل سیدھی کرتے دیکھ کر التجائیہ انداز میں گویا ہوئی۔

''نہیں..... مجھے کچھ نہیں سننا، میں تیری صورت دیکھنے، تیری آواز سننے کا بھی روادار نہیں ہوں۔'' شمشیر خان کے لہجے میں حقیقی کڑواہٹ

دنفرت تھی۔

''مجھے معلوم ہے..... یہ کوئی نئی بات نہیں ہے مگر اس طرح نہیں مروں گی کہ مرنے کے بعد دعاؤں سے بھی محروم ہو جاؤں۔ میں بے قصور ہوں، جو کچھ بھی ہوا اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے۔''

''بس..... بس میں کوئی فالتو بکواس سننے کے موڈ میں نہیں ہوں۔''

''میں موت سے نہیں ڈرتی۔ اس لیے کہ میں گناہ گار نہیں ہوں، اور لالہ..... میں اس طرح بدنامی و رسوائی کی سیاہی اپنے کردار پر لگوا کر ہرگز نہیں مروں گی۔'' اسے اپنے فیصلے پر اٹل دیکھ کر اس کے اندر کی ورشا دوبارہ سے بیدار ہونے لگی۔

''مرنا تو تجھے ہر حال میں ہے بے غیرت لڑکی۔''

''اس طرح نہیں لالہ! میں اپنی ماں کے شفاف آنچل پر مکروہ چھینٹے لگا کر نہیں مروں گی۔ جب تک میں اصل حقیقت نہیں بتاتی..... اس وقت تک تم تو کیا موت کا فرشتہ بھی مجھے نہیں مار سکتا۔'' اس کا پرعزم لہجہ تند رو بے خوف تھا۔

شمشیر خان کچھ دیر تک قہر آلود و نفرت انگیز نگاہوں سے اس کی جانب دیکھتا رہا۔

''اگر تم میں کچھ غیرت باقی ہے۔ بابا جان کی عزت کا تھوڑا بھی احساس باقی ہے تو مجھے گھر لے چلو۔''

''وہاں کوئی تیرا منہ دیکھنے کو بھی راضی نہیں ہے۔ تجھ کو اسی دن بھلا دیا تھا۔ جب تو گھر سے بھاگی تھی۔''

''لالہ! ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔ میں کہیں نہیں گئی تھی۔''

''پھر پندرہ دن سے اپنے کس باپ کے گھر تھی؟''

''لالہ! شرم کرو کچھ!'' شمشیر خان کے استہزائیہ انداز نے اسے انگاروں پر لا پٹخا تھا۔

''شرم میں کروں میں؟ ہاں، گھر سے بھاگے تو؟ ہماری عزت پر رسوائی کی کالک پھیلائے تو؟ گھر سے ہفتوں غائب رہے تو؟ پھر شرم میں کروں؟'' شمشیر خان نے جنونی انداز میں آگے بڑھ کر اس کے چہرے پر تھپڑ برسانے شروع کر دیئے۔

سکندر خان اور صمد خان کو وہ ادھر ہی چھوڑ کر آ گیا تھا۔ جانتا تھا اپنی فطرت کو ورشا کو دیکھ کر خود پر قابو نہ پا سکے گا۔ ملازموں کے سامنے اسے یہ گوارہ نہیں تھا۔

''چل تیری یہ آخری آرزو بھی پوری کر دیتا ہوں۔ پھانسی کے مجرم کی آخری خواہش کا احترام ہماری روایت بھی ہے لیکن بتا دوں، تیری ماں کے سامنے ہی تجھے چھری سے ذبح کروں گا۔ میرا ہاتھ کوئی روک نہیں سکتا۔''

وہ بے دردی سے اس کے بال پکڑ کر کھینچتا ہوا گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔

☆☆☆

''یہ دھماکے کیسے ہیں طورخان!'' جیپ بڑی جدوجہد کے بعد رکی تو بابا جانی نے گھبرا کر دریافت کیا۔ وہ چاروں گاڑی سے باہر آ گئے تھے۔

''ٹائر پھٹ گئے ہیں بابا جانی! ان کے دھماکے تھے وہ۔'' گلباز خان نے جواب دیا۔

''اوہو.....ہم جتنی جلدی کرنا چاہ رہے ہیں، اتنا ہی وقت لگ رہا ہے۔''

''ہوسکتا ہے بابا جانی! جو آپ چاہ رہے ہیں وہ قدرت نہ چاہ رہی ہو۔'' گلریز خان نے دھیمے لہجے میں خاصی گہری بات کہی تھی۔

''چپ رہو تم، آئے بڑے قدرت کے اشارے سمجھنے والے۔'' گلباز نے فوراً اسے ڈپٹا تھا۔

''گلباز خان! اس قدر پابندیاں نہیں لگاتے، ورنہ بغاوت کا خطرہ بڑھ جاتا ہے۔'' وہ آہستگی سے گویا ہوئے۔

''کوئی آپ کے سامنے بولے، اس انداز میں، میں برداشت نہیں کرسکتا۔''

''بڑے خان! ٹائر دونوں خراب ہو گئے ہیں۔ ہمارے پاس ایک موجود ہے دوسرا لانا ہوگا۔'' طورخان آکر مؤدبانہ لہجے میں مخاطب ہوا۔

''کہاں سے لاؤ گے؟ کتنی دیر لگے گی؟''

''آدھا گھنٹہ لگے گا خان، آگے موڑ پہ مارکیٹ ہے وہاں سے۔''

''اچھا.....ہم انتظار کر لیتے ہیں جب تک۔''

طورخان کے جانے کے بعد انہوں نے فلاسک سے چائے نکال کر پی۔ گلریز وہیں پتھر پر خاموش بیٹھ گیا تھا۔ بابا جانی اور گلباز خان آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے۔ معاً دور سے سڑک پر آتی سرخ کار کو دیکھ کر گلریز کھڑا ہو گیا تھا۔

چند لمحوں میں کار وہیں آکر رک گئی تھی۔ اور اس میں سے اسٹک کے سہارے نکلتے صارم کو دیکھ کر وہ دونوں بھی اٹھ گئے تھے۔

''تھینکس گاڈ! آپ لوگ مل گئے۔'' صارم گہری سانس لے کر بولا۔

''تم، کیوں آئے ہو؟ اور گاڑی ڈرائیو کرنے کا ابھی ڈاکٹر نے منع کیا ہے۔'' گلریز خان فکرمندی سے اس کے قریب آکر گویا ہوئے۔

''یہ کیا بچگانہ حرکت ہے صارم خان! ابھی تمہاری ٹانگ کے زخم گہرے ہیں اور تم کار چلا کر اتنی دور آ گئے ہو۔'' گلباز کا لہجہ تہمائشی تھا۔

''میں آپ لوگوں کی دوری برداشت نہیں کرسکتا، آکا جان! میں نے اپنے باپ کو نہیں دیکھا، لیکن آپ نے اور بابا جانی نے مجھے یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ میں باپ اور ماں کی گھنی چھاؤں سے محروم ہوں۔'' وہ ان کے سینے سے لگ گیا تھا۔

''کیا ہوا ہے خانان؟ کیوں پریشان ہو؟ یہاں کا ٹھکانہ کس نے بتایا؟'' شاہ افضل خان بھی متفکر سے اس کے قریب چلے آئے تھے۔

''بابا جانی! آپ جس دشمن کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانے جا رہے ہیں۔ ان کی فطرت سے اچھی طرح واقف ہونے کے باوجود آپ کا یہ اقدام قبیلے میں ایک جانے کن طوفان سے آئے گا اس کے متعلق سوچا ہے آپ نے؟''

''اب تم سے ہمیں عقل سیکھنی پڑے گی؟ یعنی ہم بچے ہیں ابھی؟''

''گستاخی معاف بابا جانی! میرا مقصد آپ کی توہین یا دل آزاری ہرگز نہیں ہے۔ آپ میری بات سمجھنے کی کوشش کریں، جو آپ کرنے جا

رہے ہیں اس کے لیے اتنی جلد بازی کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمیں بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا ہوگا۔''

''نیک عمل کرنے میں بدبخت دیر کیا کرتے ہیں بچے!'' بابا جانی نے نرمی سے کہا۔

''یہ کوئی چھوٹا، سادہ مسئلہ نہیں ہے۔ یہاں کئی جیتی جاگتی زندگیوں کا سوال ہے۔ اتنی زندگیاں موت کی آغوش میں پہنچ چکی ہیں۔ ان کے باوجود بابا جانی آپ اس شخص کی فطرت و ذہنیت کو نہ سمجھ سکے؟ آپ کا مطلب ہے، آپ جا کر اسے رشتے داری جوڑنے کا پیغام دیں گے، اور وہ مان جائے گا۔''

صارم کے مخاطب افضل خان اور گلباز خان تھے۔

''جو کہنا چاہ رہے ہو، وہ صاف کہو۔'' گلباز خان نے کہا۔

''اکا جان! شاید سبریز کی جدائی نے آپ لوگوں پر ایسا اثر ڈالا ہے کہ آپ لوگ وقتی طور پر حد درجہ خوفزدہ ہو گئے ہیں کہ بلا سوچے سمجھے دشمن کے ڈیرے پر جا رہے ہیں۔ وہ دور سے ہی گولیاں چلا دے گا۔''

''میں بھی یہی سمجھا رہا ہوں۔ بلکہ سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ لیکن میری کوئی سننے کو تیار ہی نہیں ہے۔'' باپ اور دادا کو خاموش دیکھ کر گلریز نے آگے بڑھ کر کہا۔

''حویلی چلیں بابا جانی! وہاں بیٹھ کر ذرا اطمینان سے سوچیں گے، ہر کام کا ایک طریقہ کار ہوتا ہے اور ان معاملوں میں تو بار بار سوچنا پڑتا ہے۔''

''گلباز خان! تمہارا کیا مشورہ ہے؟ ہم تو گومگو کی کیفیت میں گرفتار ہو گئے ہیں۔ صارم کی بات بھی درست لگ رہی ہے، لیکن ہمارا دل اب دماغ کے مشورے نہیں مانتا۔'' انہوں نے عجیب کشمکش کے انداز میں گلباز خان کو مخاطب کیا۔

''میں صرف آپ کی منشا پر چلنے کا عادی ہوں بابا جانی۔''

''ایک باپ کے لیے اس سے بڑی مسرت کیا ہوگی بچے، کہ اس کی اولاد تا حیات سعادت مند فرمانبردار رہے مگر خان! اب باپ کی انگلی پکڑ کر چلنا چھوڑ دو۔ اپنی مرضی اپنی خواہش پر بھی چلنا سیکھو۔''

''جی، خوب درست فرمایا آپ نے۔ انہوں نے کی تو ہے اپنی مرضی پوری، چلے تو ہیں یہ اپنی خواہش کی شاہراہ پر، کیا ملا؟ کیا حاصل کیا؟ ایک بے قصور کو بستر پر ڈال دیا اور ہمارے لیے پریشانیوں و دوسوں کے کانٹوں سے وجود لہولہان کر ڈالا۔ مجھے ایسی مرضی، ایسی خواہش نہیں چاہیے۔'' انہوں نے قہر آلود نگاہوں سے گلریز خان کو گھورتے ہوئے کہا۔

''میں اپنی غلطی پر از حد نادم ہوں بابا جان! آپ مجھے معاف کیوں نہیں کر دیتے؟'' گلریز نے ہاتھ جوڑتے ہوئے شرمندہ لہجے میں کہا۔

''کیا ہوگا؟ کیا ہوگا تمہاری معافی تمہاری ندامت سے؟''

''اکا جان! پلیز اگر کوئی اپنی غلطی پر پشیمان ہے تو آپ اسے معاف کر دیں۔ غلطی پر نادم ہونا اعلیٰ ظرف لوگوں کی سرشت ہوتی ہے اور معاف کر دینا معتبر لوگوں کا شیوہ ہوتا ہے۔'' جان نے کہا۔

''فی الحال تو حویلی چلو وہاں جا کر فیصلہ کریں گے کہ کیا کرنا ہے؟''

بابا جانی بغور صارم کا چہرہ دیکھ رہے تھے جو تکلیف کی شدت سے سرخ پڑتا جا رہا تھا۔ لیکن وہ بالکل ظاہر نہیں کر رہا تھا۔ اس کا حوصلہ، عزم دیکھ کر انہیں محسوس ہو گیا کہ انہیں آگے بڑھنے نہیں دے گا۔ وہ شروع سے ہی اپنی منوانے کا عادی رہا تھا۔ اور ٹھنڈے دماغ سے اس کی باتیں سننے کے بعد انہیں بھی محسوس ہوا کہ وہ جو کرنے جا رہے ہیں وہ ایک لحاظ سے جذباتی و خطرناک اقدام ہے۔

''بابا جانی! حویلی واپس چل رہے ہیں؟'' گلباز خان نے حیرانگی سے دریافت کیا۔

''ہوں...... بعض اوقات چھوٹے بھی بڑی دانشمندی کی بات کر جاتے ہیں۔ ہم حویلی جا کر سوچیں گے پھر فیصلہ کریں گے۔''

☆☆☆

کائنات اور فرحت آپا گھر میں داخل ہوئیں تو یہ دیکھ کر مطمئن ہو گئیں کہ حیات خان ابھی واپس لوٹے نہیں تھے۔ وہ ان کی غیر موجودگی میں گھر سے نکل آئی تھیں۔

فرحت آپا نے اسے روکنے اور سمجھانے کی بہت کوشش کی کہ ابھی وہ حیات خان کا انتظار کر لیں۔ ان کی واپسی کے بعد ان کی موجودگی میں گھر سے جانا درست ہو گا۔ لیکن کائنات اپنے پروپوزل کا سن کر ان سے اس حد تک بدگمان ہو گئی کہ اس نے فوراً ہی سامان پیک کر کے کراچی جانے کی ٹھان لی تھی۔ مجبوراً انہیں بھی اس کا ساتھ دینا پڑا تھا۔

''اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے بی بی، بھائی صاحب ابھی واپس نہیں لوٹے ہیں۔'' فرحت آپا جلدی جلدی سامان بیگ سے نکال کر ان کے ٹھکانوں پر از سر نو طریقے سے رکھتے ہوئے تشکرانہ انداز میں اس سے مخاطب ہوئیں۔

''ہوں۔'' کائنات نے اس طرح مختصر جواب دیا، گویا وہ اس وقت ماحول سے، کمرے کی فضا سے کہیں اور پہنچی ہوئی ہو۔ فرحت آپا نے اس کی طرف رخ کیا، وہ آنکھیں بند کیے کیے شاید تصور جاناں میں مستغرق تھی۔ ہونٹوں پر دھیمی دھیمی گداز سی مسکراہٹ تھی۔

وہ چند ساعت اس کی جانب پر سوچ انداز میں دیکھتی رہی تھیں۔

''مجھے شمشیر خان کا اس طرح حق جتانا کچھ بہتر محسوس نہیں ہوا۔''

''کیوں آپا! مجھے تو بہت اپنائیت و تحفظ کا احساس ہوا ہے۔''

''خوب کہی آپ نے بھی، ایک غیر مرد اس طرح حق جتانے کا ہم پر کیا اختیار رکھتا ہے؟ یہ کھلی غنڈہ گردی ہے۔''

''آپ خوامخواہ ان سے بدگمان رہتی ہیں۔ حق کوئی کسی کو اپنا سمجھتا ہے تو ہی جتاتا ہے۔ ورنہ آج کل تو سگے رشتے بھی اپنی غرض پر صرف اپنی من مانی کرتے ہیں۔ صرف اپنے حقوق کی اولیت اور اہمیت سمجھتے ہیں۔ دوسروں کے حق سے قطعی بے خبر و بے فکر۔''

اس کے لہجے میں طنز و تنفر کی بھرپور آمیزش تھی۔

فرحت آپا اس کے بدلتے تیور اور لہجے کی تلخی و تندی سے اس کی ہٹ دھرمی پہچان کر خاموش ہو گئیں۔

''وہ لوگ کسی وجہ سے نہیں آ رہے آپا! آپ مہمانوں کے لیے کوئی اہتمام مت کیجئے گا۔'' وہ سامان سیٹ کرنے کے بعد کچن کا رخ کر رہی

تھی۔ جب حیات خان نے آکر اطلاع بہم پہنچائی۔

''کیوں بھائی صاحب! خیریت تو ہے نا؟ اچانک کیا بات ہو گئی؟''

وہ حقیقتاً پریشان ہو گئیں ان لوگوں کے نہ آنے کا سن کر۔

''ان کے رشتے داروں میں سے کسی کے ہاں کوئی حادثہ ہو گیا ہے۔ وہ لوگ فوراً چلے گئے ہیں۔ ملازم آیا تھا میرے پاس پیغام پہنچانے۔''

''بھائی صاحب! چائے بنانے جا رہی ہوں، دوں آپ کو ایک کپ؟''

''ہاں، دے دینا، اب تو مجھے بھی عادت سی ہو گئی ہے۔''

وہ خوشدلی سے کہتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔

وادی نے شب کی تاریکی کی دبیز چادر اوڑھ لی تھی۔

برفیلی چوٹیوں سے آتی سرکش ہواؤں کے جھکڑوں نے سردی کو بام عروج پر پہنچا دیا تھا۔ ماحول پر ایک پر ہول، پراسرار سناٹا چھایا ہوا تھا۔ وحشت در وحشت کا عالم تھا، بڑی طرح دھڑکتے دل، لرزتے کانپتے وجود کو سنبھالے سخاویہ اماں کے قریب بیٹھی ان کا سر دبانے میں مصروف تھی۔

''کیا ہو رہا ہے؟ ادے سو گئیں؟'' پردہ کھسکا کر شمروز نے اندر داخل ہوتے ہوئے استفسار کیا۔

''جی لالہ! آپ کی کھلائی ہوئی گولی نے اب اثر کیا ہے۔''

''تمہیں کیا ہوا؟ چہرہ کیوں زرد ہو رہا ہے؟''

شمروز نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے فکرمندی سے پوچھا، وہ جو تنہائی کے باعث اپنے دل کا غبار دل میں ہی چھپائے بیٹھی تھی۔ بھائی کے ہمدرد و مہربان لہجے میں وہ ضبط کھو بیٹھی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''سخاویہ! کیا ہوا؟ چھوٹی ادے نے کچھ کہا ہے؟ بتاؤ تو سہی کیا ہوا؟''

''لالہ! میرا دل بہت گھبرا رہا ہے۔ ایسا لگ رہا ہے جیسے کچھ ہونے والا ہے۔'' اپنے سر پر رکھے اس کے ہاتھ کو پکڑ کر وہ وحشت زدہ انداز میں گویا ہوئی۔ ''رات میں نے خواب بھی بہت ڈراؤنے دیکھے ہیں۔''

''ہشت...... بیوقوف، ابھی بھی خوابوں کی دنیا میں رہتی ہو، خوابوں پر یقین نہیں رکھتے، وہ دور گزر گیا ہر وقت کمرے میں بند رہتی ہو، جب دل و دماغ کو تازہ ہوا نہیں ملے گی تو طبیعت تو گھبرائے گی۔ چلو میں تمہیں باہر لے کر چلتا ہوں۔ باغ میں ٹھنڈی و تازہ ہوا میں ٹہلو گی تو طبیعت ایک دم فریش ہو جائے گی۔ ساری وحشت، خوف، گھبراہٹ دور ہو جائے گی۔ آؤ چلو۔ اندھیرا ہے باہر میں باغ کے بلب آن کروا دوں گا اگر تم کہو تو؟''

''نہیں لالہ، ادے سو رہی ہیں، کتنے دنوں بعد تو گہری نیند سوئی ہیں۔ اور شمشیر لالہ پسند نہیں کرتے گھر کی عورتوں کا باغ میں گھومنا۔''

''ادے کی فکر مت کرو، نیند کی گولی کے زیر اثر سو رہی ہیں۔ صبح تک سوتی رہیں گی، اور شمشیر خان سے میں خود بات کر لوں گا، اس وقت وہ گھر میں نہیں ہے۔ اگر آ بھی گیا تو خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم اپنے بڑے بھائی کے ساتھ جا رہی ہو۔'' شمروز خان پہلے ہی انہیں بڑے و شفیق بھائی کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ اب اصل صورتحال جاننے کے بعد وہ ماں اور شمشیر خان سے از حد بدگمان و بدظن ہو چکا تھا۔ اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ اب مزید شمشیر خان کو من مانی نہیں کرنے دے گا۔

''لالہ! درشانا ایسا نہیں کر سکتی نا؟ وہ مزاج کی تیز ضرور ہے مگر کردار اس کا مضبوط ہے۔ اس کے بارے میں جو کہا جا رہا ہے وہ غلط اور جھوٹ لگتا ہے لالہ!''

اس نے سوتیلی کے جھکتے پھولوں کے قریب بیٹھتے ہوئے یاسیت زدہ لہجے میں استفسار کیا۔

''ہاں، بالکل مجھے اپنی بہنوں کی پاک دامنی و شفاف کردار پر اسی طرح ہی یقین و اعتماد ہے جس طرح اللہ کی ذات پر بھروسہ و ایمان

رکھتا ہوں۔ بے شک اسے دیکھا نہیں ہے لیکن اپنی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب محسوس کیا ہے، اور تم دونوں تو بچپن سے میری نگاہوں کے سامنے شعور کی منزل پر پہنچی ہو، بھلا میں اپنی بہنوں کے مزاج و اخلاق کو نہیں سمجھوں گا۔"

شمروز نے پیار بھری چپت دھیرے سے اس کے سر پر لگاتے ہوئے اپنائیت سے کہا۔

"میں کبھی سوچتی ہوں اگر آپ اور بڑے لالہ ہم سے محبت نہ کرتے تو ہم تو بہت پہلے مر جاتے۔" اس کی آواز پھر آنسو غالب آنے لگے۔

"سخاویہ! میں تمہیں اس لیے باہر نہیں لایا کہ تم رونے بیٹھ جاؤ پھر سے۔"

"لالہ! ماحول اور موسم کا احساس دل کی آسودگی و طمانیت کے تابع ہوتا ہے۔ یہاں آ کر میری ظاہری گھٹن وحشت کچھ کم ہوئی ہے مگر میرے اندر سکون و قرار جب ہی ہوگا جب تک ورشا کے متعلق پتہ نہیں چلے گا۔" اس نے چادر کے پلو سے آنسو صاف کرتے ہوئے آزردگی سے کہا۔

"میں صبح ہی حویلی سے نکلوں گا، اصل صورتحال معلوم کرنے کے لیے۔ شمشیر خان کی ہٹ دھرمی و من مانی بڑھتی جا رہی ہے۔ اگر اب بھی اسے اس کی مرضی پر چھوڑ دیا تو بہت نقصان ہو جائے گا۔ ایک ناقابل تلافی نقصان، جس کا خمیازہ کئی نسلوں کو بھگتنا پڑے گا۔"

"لالہ! اندر چلیں۔ یہاں ٹھنڈ بڑھتی جا رہی ہے۔"

"ہوں..... چلو..... لیکن وعدہ کرو، اب روؤ گی نہیں۔"

"جس شے پر میرا کوئی اختیار نہیں ہے، اس کے متعلق میں بے اختیار ہوں۔ رونا اور ہنسنا بے اختیاری عمل ہیں اور میں کس طرح آپ سے وعدہ کر لوں۔" اس نے خاصے بے بس لہجے میں کہا۔

"اچھا وعدہ نہیں، لیکن کوشش ضرور کرنا۔" وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اندر کی جانب بڑھتا ہوا سمجھا رہا تھا۔

معاً گیٹ کھلا اور شمشیر کی جیپ طوفان کی سی رفتار سے اندر داخل ہوئی اور خوفناک چرچراہٹ کے بعد جیپ رکی تھی۔

شمشیر خان کی جیپ دیکھ کر سخاویہ کے حواس گم ہونے لگے۔ شمروز خان نے بھی چونک کر مڑ کر دیکھا تھا۔

شمشیر خان برق رفتاری سے جیپ سے اتر کر پچھلی سیٹ کے دروازے کی طرف بڑھا۔ دروازہ کھول کر نہایت بے دردی سے ورشا کے بال پکڑ کر نیچے گھسیٹا تھا۔ باوجود ضبط کے ورشا کے ہونٹوں سے گھٹی گھٹی اذیت بھری کراہ نکلی تھی۔

"شمشیر خان انسان بنو، کیا ہو رہا ہے یہ؟ چھوڑو۔" شمروز چند لمحے ناسمجھ انداز میں دیکھتا رہا تھا پھر جب اس نے ورشا کو بری طرح بالوں سے پکڑ کر شمشیر خان کو لیے جاتے دیکھا تو وہ صورتحال سمجھا تھا۔

"میرے راستے میں مت آنا شمروز خان، ورنہ چیونٹی کی طرح مسل دوں گا۔" وہ غضبناک انداز میں دہاڑا تھا۔

"تم ورشا کو چھوڑ دو، ورنہ میں تمہارا لحاظ نہیں کروں گا۔"

شمروز خان نے اس کے ہاتھ کی گرفت ورشا کے بالوں سے ہٹاتے ہوئے غصے سے چیخ کر کہا۔ اس کی گرفت سے آزاد ہوتے ہی ورشا شمروز خان کے سینے سے لگ کر رونے لگی۔ سخاویہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے ورشا کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر ناقہم سے تاثرات تھے۔

''میری راہ میں مت آؤ شمروز خان، میں تمہیں بار بار سمجھا رہا ہوں۔''

''اندر جاؤ تم! تم ہوتے کون ہو۔ اس کو اس طرح سے گھسیٹ کر جانوروں کی طرح اندر لے جانے والے؟ شرافت سے تو تم نے رشتہ توڑا ہی تھا۔ اب انسانیت سے بھی دور ہو گئے ہو۔ میں تمہیں اب من مانی نہیں کرنے دوں گا۔''

''شمروز خان، شمروز خان، تم میرے حوصلے اور ضبط کا امتحان مت لیا کرو، اور اس بے غیرت لڑکی کی حمایت مت کرو۔ جانتے نہیں اس نے کیا کیا ہے؟ ہماری حمیت و ناموس کا جنازہ نکال دیا ہے۔ اس نے پھر بھی تم۔''

''سب جانتا ہوں۔ مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش مت کرو'' وہ نرمیوں سے چور ورشا کو بازو کے گھیرے میں لے کر آگے بڑھتا ہوا بولا۔

''یہ اس گھر کی دہلیز ناپاک قدموں سے عبور نہیں کر سکتی۔''

شمشیر خان گرجتا ہوا اس کی طرف بڑھا تھا۔ اس کی آنکھوں سے خون سا چھلکنے لگا تھا اور بھاری بھاری لہجے میں بادلوں کی سی گھن گرج تھی۔

شادیہ فضا میں آنے والے طوفان کی گرد دیکھ کر اندر کی جانب سرپٹ دوڑی تھی۔ اور لمحے بھر میں شہباز خان کو بلا کر وہاں لے آئی۔ جہاں وہ ایک دوسرے کے مقابلے کھڑے کینہ توز نگاہوں سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔

ورشا بے ہوش ہو کر شمروز خان کے بازو کے حلقے میں لٹک رہی تھی۔

شمشیر خان نے یکدم جیکٹ کی اندرونی جیب سے پستول نکال لیا۔

''شمشیر خان! دماغ خراب ہو گیا ہے تمہارا؟'' شہباز خان اس کے ہاتھ سے پستول چھیننے کی کوشش کرتے ہوئے دہاڑے۔

''نہیں بابا جان! درمیان میں مت آؤ۔'' وہ بری طرح بپھرے لہجے میں چیخا۔

''شمروز خان! تم اندر جاؤ'' وہ بپھرے ہوئے شمشیر خان کو بازوؤں میں جکڑتے ہوئے تحکمانہ لہجے میں اس سے مخاطب ہوئے۔

''نہیں بابا جان! اسے اپنی طاقت پر بہت گھمنڈ ہے دیکھتا ہوں میں یہ کیا کرتا ہے؟''

''میں ابھی زندہ ہوں، اور اپنی زندگی میں تم لوگوں کو آپس میں دست و گریبان نہیں ہونے دوں گا۔ چلو اندر جاؤ، جاؤ۔'' شہباز خان غیظ و غضب کے عالم میں گویا ہوئے۔

شمروز خان جو باپ کے مقابل آنے کا کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا خاموشی سے اندر ورشا کو اٹھا کر چلا گیا۔

شہباز خان، شمشیر خان کو سمجھا رہے تھے۔

☆☆☆

''میں زیادہ وقت ضائع کرنے کے حق میں نہیں ہوں گلباز خان، ایک ہفتہ بہت ہوتا ہے سوچ بچار کے لیے۔ قبل اس کے کہ ہمارا راستہ روکا جائے ہمیں دانشمندی سے قدم اٹھا دینا چاہیے۔''

ان کی مخصوص بیٹھک میں اس وقت حویلی کے تمام مکین موجود تھے۔ ماسوائے ینگ پارٹی کے۔ صارم اور گلریز اصل معاملے میں بنیاد

ہونے کی وجہ سے اندر موجود تھے۔ ورنہ انہیں بھی اس میٹنگ میں شامل ہونے کی اجازت نہ ہوتی۔

''بہتر بابا جانی! جو آپ مناسب سمجھیں وہ کریں ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔'' گلباز خان نے کھڑے ہو کر احترام سے کہا۔

''بڑے خان! میں کچھ کہنا چاہوں گی؟'' معاً بی بی جان کی نحیف مگر فیصلہ کن آواز گونجی۔

''ہاں۔۔۔ کہو۔۔۔ کیا کہنا چاہتی ہو؟''

شاہ افضل کے لیے یہ حیران کن بات تھی۔

''خان! آپ نے اپنی مرضی اور اختیار لامحدود حد تک وسیع کر لیا ہے آپ نے قبیلے کی فرسودہ اور جاہلانہ رسوم و رواج کو تاراج کیا ہے۔ مگر ایک رسم کو ابھی تک اپنے ہاتھ کا عصا بنا کر پکڑ رکھا ہے۔ میری خواہش ہے، آج اس رسم کو بھی دوسری رسموں کی طرح ختم کر کے نئی رسم کی بنیاد رکھیں تا کہ ہمارے بچوں کے دلوں میں ہمارا احترام اور عزت آخری دم تک برقرار رہے۔''

بی بی جان کے لہجے میں اس گھاؤ کی کسک تھی جو گلباز خان کی بیوی نے اپنی زبان سے لگائے تھے۔ وہاں بیٹھے تمام لوگ بی بی جان کے جھریوں بھرے چہرے کو بغور دیکھ رہے تھے۔ گویا ان کے چہرے سے ان کے سپاٹ لہجے میں کہے گئے لفظوں کے معنی اخذ کر سکیں۔

صارم جو ابھی تک تائی کی بدکلامی و بدتمیزی نہیں بھلا پایا تھا۔ بی بی جان کے لہجے نے اس کے اندر آگ سی دہکا ڈالی تھی۔ وہاں موجود گل زیبا کے چہرے پر بھی ایک رنگ آ کر گزر گیا تھا۔

''جو کچھ بھی کہنا ہے، صاف لفظوں میں بیان کرو شیریں گل!''

''بڑے خان، ہم اپنے بچوں کی شادی بیاہ کے فیصلے خود کرتے آئے ہیں۔ لیکن اب وقت بدل گیا ہے اور ہر بدلتا وقت اپنے اندر بہت نمایاں تبدیلیاں لے کر آتا ہے۔ وقت کا تقاضا اور آگہی کا اصول بھی یہی ہے کہ ہم بدلتے وقت کے ساتھ خود کو بھی بدلیں۔ اپنے بچوں کو اپنے فیصلے کرنے کا حق ملنا چاہیے۔'' بی بی جان کا لہجہ بے لچک و ٹھوس تھا۔

''آپ کی باتیں بچوں کو بغاوت پر اکسا رہی ہیں۔ کیا آپ کو معلوم ہے آپ کیا کہہ رہی ہیں؟'' بابا جانی کا لہجہ سرد و ترش تھا۔

''میں بغاوت پر اکسا نہیں رہی، بلکہ قبل اس کے کہ بغاوت اس در و دیوار کے اندر سر اٹھائے میں ہمیشہ کے لیے اس کا سر کچل دینا چاہتی ہوں۔''

''پھر پھیر کے گرداب میں بات کو الجھانے سے اس کی اصلیت مسخ ہو کر رہ جاتی ہے۔ بہتر یہی ہے کہ شیریں گل! جو اصل بات ہے وہ سیدھی طرح بتا دی جائے۔ ہمارے گھر میں کون باغی پیدا ہو گیا ہے؟ کس کی بغاوت کا خوف آپ کو مضطرب کر گیا ہے جو آپ پریشان ہو گئی ہیں؟''

''کیسی بی بی جان! آپ کی موجودگی میں ہمارے فیصلے کس میں کرنے کی جرأت ہو سکتی ہے؟ رب کریم آپ کا اور بابا جانی کا سایہ ہمارے سروں پر ہمیشہ قائم رکھے۔'' گلباز خان کھڑے ہو کر دلگرفتہ لہجے میں گویا ہوئے۔

''ہمیشہ قائم رہنے والی ذات تو صرف اور صرف اللہ کی ہے بیٹے! انسانی جسم تو خاک میں مل کر خاک بننے کے لیے ہے۔ کتنا جی سکتا ہے

بندہ؟ پچاس سال، ستر سال، سو سال یا اس سے چند سال مزید، کب تک موت سے بھاگے گا کوئی؟ آخر کار جانا اندھیری کوٹھری میں ہی ہے۔ جہاں نہ ہوا ہے، نہ پانی ہے اور نہ ہی دنیاوی عیش و نشاط کا کوئی سامان، وہاں صرف اعمال کی روشنی ہے۔ نیکیوں کی بہار، عبادت کے گل و گلزار، میں زندگی کی اس منزل پر پہنچ چکی ہوں جس کے آگے اب تمام راستے بند ہو چکے ہیں۔ ہواؤں کی زد پر رکھا وہ ٹمٹماتا چراغ ہوں جس کی مدھم لو کو سرکش ہوا کا کوئی زور آور جھونکا گل کر سکتا ہے۔ اس مقام پر میں کوئی بوجھ، کوئی بے انصافی اور کسی کا حق اپنے سینے پر رکھ کر نہیں جا سکتی۔ اس لیے آج میں یہ اعلان کرتی ہوں، میں اپنے تمام اختیارات بڑی بہو کو سونپتی ہوں۔"

"بی بی جان! یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟" گلباز خان، صارم، نگریز اور شاہ گل سراسیمہ سے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ دوسری خواتین کے چہروں پر بھی تحیر جاگا تھا۔ جس میں دکھ و تکلیف کی چھاپ تھی۔ جبکہ برعکس اس کے گل زیبا کا چہرہ گھر درا سپاٹ تھا جیسے وہ ماحول سے لاتعلق ہوں، البتہ ان کی نگاہوں سے مسرت و طمانیت جھلک رہی تھی۔ گویا وہ اسی فیصلے کی دلی طور پر منتظر تھیں۔

"بیٹھ جاؤ بچو، میں فیصلے بہت کم کرتی ہوں اور کبھی کرتی ہوں تو اس میں کسی کی مداخلت پسند نہیں کرتی۔ تم لوگوں کو بھی میرا فیصلہ ماننا ہوگا۔"

ان کے لہجے میں کچھ ایسی ہی بات تھی کہ وہ ہونٹ بھینچ کر اپنی جگہ دوبارہ بیٹھ گئے۔

"ادھر آؤ گل زیبا!" انہوں نے بڑی بہو کی طرف اشارہ کیا تو وہ اٹھ کر خاموشی سے ان کے قریب جا کر کھڑی ہو گئیں۔" شاہ افضل خان نے یکلخت خاموشی اختیار کر لی تھی۔ ان جہاندیدہ نگاہوں نے وہ سمجھ لیا تھا جو بی بی جان چھپا گئی تھیں۔ ماحول میں گمبھیر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

بی بی جان نے کھڑے ہو کر اپنے گلے میں پڑا اصلی ہیروں سے جڑا خوبصورت و قدرے وزنی لاکٹ گل زیبا کے گلے میں ڈالتے ہوئے کہا۔

"یہ وہ ہار ہے، جو نسلوں سے ہماری خاندانی بہوؤں کے گلوں کی زینت بنتا رہا ہے۔ بظاہر یہ ایک قیمتی و نایاب زیور ہے لیکن درحقیقت یہ ایک ایسا عہد، ایک ایسی زنجیر ہے جو پابند کر ڈالتی ہے۔ ذاتی مفاد، ذاتی خواہش، سب فنا ہو جاتے ہیں۔ ہماری مسرتیں، خواہشیں، خواب، ہمارا ہنسنا، رونا، جینا، مرنا، ہمارا ہر اٹھتا قدم، ہر گزرتی سانس، اپنے بزرگوں کی عزت و احترام اور چھوٹوں کی تعلیم و تربیت و شفقت و فلاح و بہبود کے لیے وقف ہو جاتی ہے۔ ہماری زندگی ہماری نہیں، ہم سے وابستہ لوگوں کی امانت بن جاتی ہے۔ آج سے تم اس گھر کی سربراہ ہو، تمام سیاہ و سفید کی مالک، مجھے امید ہے تم میرے انتخاب و اعتبار کو ٹھیس نہیں لگنے دو گی۔"

بی بی جان نے تمام گوداموں، کمروں اور تجوریوں کی چابیوں کا گچھا انہیں پکڑانے کے بعد سیاہ گرم کڑھائی والی شال اوڑھاتے ہوئے گلوگیر لہجے میں کہا۔

گل زیبا نے جوں ہاں کچھ نہ کہا۔ بڑی مضبوطی سے چابیوں کو تھاما تھا۔

"بچو! مجھے امید ہے، بڑی بہو کو کبھی شکایت کا موقع نہیں دو گے۔ میری آخری خواہش ہے۔" باوجود ضبط ان کے آنسو رخساروں پر پھسل گئے۔ وہ سب ہی آگے بڑھے تھے۔ صارم نے تیزی سے انہیں بازوؤں میں بھر لیا تھا۔ ان پر جو بیت رہی تھی ان کے زیادہ قریب ہونے کی وجہ سے وہ بخوبی سمجھ رہا تھا۔ بڑی نرمی سے اس نے ان کے آنسو صاف کیے تھے۔

"آپ کہیے بی بی جان! آخری کیوں؟ آپ کہیں تو سہی لاکھوں خواہشیں پوری کروں گا آپ کی۔"

"لاکھوں نہیں..... صرف ایک خواہش ہے بچے!"

"آپ بولیے تو سہی؟"

"اس لڑکی سے شادی کر لو۔" انہوں نے گویا دھماکہ کیا تھا۔

"بی بی جان! وہ لڑکی؟"

"ہاں۔ وہ لڑکی مظلوم اور بے گناہ ہے اور مظلوم کی آہ اور بددعا سے بچنا چاہیے۔ یہ شعلوں کی طرح آسمانوں پر پہنچتی ہے۔ اور قبل اس کے کہ کسی کی بددعا میرے آشیانے کی طرف بڑھے، میں دعاؤں کے چمن کھلانا چاہتی ہوں۔" بی بی جان اس کا چہرہ ہاتھوں میں تھامتے ہوئے بولیں۔

"لیکن بی بی جان، بابا جانی نے گلریز خان کا انتخاب کیا ہے۔" وہ متذبذب لہجے میں گویا تھا۔

"تمہارے بابا جانی کا انتخاب غلط ہے۔ گلریز خان بچپن سے ہی اپنے ماما کی بیٹی سے منسوب ہے۔ ہمارے یہاں رشتے پر رشتہ نہیں ہوتا۔"

"بی بی جان! اگر آپ مجھ سے خفا ہیں تو میں دشمن کی بیٹی بیاہ کر لاؤں گا۔ آپ کی خاطر میں ہزاروں ایسے رشتے توڑ سکتا ہوں۔"

گلریز خان ان کے قدموں میں گر کر رو پڑا۔

"اٹھو..... اٹھو گلریز خان! کیوں مجھے گنہگار کرتے ہو۔ میں تم سے ناراض نہیں ہوں۔ تم مجھے صارم کی طرح عزیز ہو۔"

انہوں نے اسے بھی گلے لگا لیا تھا۔

"کہو صارم خان! گل شیریں کی خواہش کی تکمیل کرو گے یا انکار؟"

بابا جانی اٹھ کر اس کے قریب چلے آئے تو اس نے سنجیدگی سے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔ اس وقت کوئی جذبہ کوئی خواہش زیر اثر نہ تھی دل میں خاموشی تھی۔

"ہم آج ہی کچھ معتبر لوگوں کو پیغام دے کر بھیجتے ہیں۔"

☆☆☆

ہجر	کے	سمندر	میں
آرزوؤں	کی	کشتی	ہے
آنسوؤں	کی	بجلی	میں
خواہشوں	کی	بستی	ہے
ایسے	سخت	موسم	میں
جانے	کیسی	جلدی	ہے

دھیرے دھیرے تیرتا ہے
وصل کا گھڑا کچا
دور اس کنارے پہ
ایک شمع جلتی ہے
شمع جو محبت کی
جستجو میں پلتی ہے
قطرہ قطرہ وہ خوں ہے
داستان جس میں صرف
ایک ہی تو ہستی ہے
دل میں جو پنپتی ہے
زندگی کی مستی ہے

وادی رات کے اندھیرے میں گم تھی۔ ایک سرد سکوت، روح کو متوحش کر دینے والا سناٹا اور ویرانی اپنے سیاہ پروں کو پھیلائے ہوئے ماحول پر محیط تھا۔

کھیتوں کے سبزے اور پھولوں کی خوابیدگی سے گہری پرتاثیر مہک و پراسراریت پھیلی ہوئی تھی۔ فضا میں برف کی سفیدی و ٹھنڈک، رگوں میں جمتی محسوس ہو رہی تھی۔

حویلی کے اندر مدھم روشنی میں دو وجود سسکیوں کی زد میں کانپ رہے تھے۔ خاموش و سیاہ یک ساعتوں میں کبھی کبھی بے قرار و بے اختیاری آنسوؤں سے بھیگی ہوئی آہ نکل جاتی تو...... وہ گھبرا کر ہونٹوں پہ چادر رکھ دیتی تھیں۔ گویا آواز کمرے سے باہر گئی تو ناقابل معافی جرم سرزد ہو جائے گا۔

''ادے! اس طرح کب تک گھٹ گھٹ کر روئیں گے ہم؟ جا کر بابا جان سے بات تو کرو کہ وہ ہمیں ایک نظر درشا کو دیکھنے دیں۔ نہ معلوم ظالموں نے کیا حال کیا ہوگا اس کا؟ چھوٹی ادے تو اس کے بے ہوش ہونے کے باوجود بالوں سے پکڑ کر گھسیٹتی ہوئی اندر لے کر گئی تھیں۔ بابا جان نے زبردستی قسمیں دے کر شہروز لالہ کو شہر بھیج دیا ہے۔'' شاد بیہ نے منت بھرے لہجے میں ماں سے التجا کی جو پہلے ہی دہرے عذاب میں مبتلا تھیں۔ خاوند کی زیادتیوں اور سوکن کے ظلم حد سے سوا ہو گئے تھے۔ ستم بالائے ستم انہیں بیٹی کی ایک جھلک دیکھنے کی اجازت نہیں تھی۔ شہباز خان اس کی شکل دیکھنے کے روادار نہ تھے۔ گل جاناں کی منت وسماجت کر کے وہ ہار گئی تھیں۔ مگر وہ اس وقت مکمل حیوانیت کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ دھکے دے کر انہیں وہاں سے نکال کر دروازہ اس نے بند کر لیا تھا۔

''میں کیا کر سکتی ہوں؟ میں بہت لاچار و بے بس عورت ہوں۔'' انہوں نے بری طرح روتے ہوئے کہا۔

"ہمارے حق کے لیے لڑ نہیں سکتی تھیں تو ہم بیٹیوں کو جنم ہی کیوں دیا؟"

"حق؟ یہ اندھیر نگری ہے۔ یہاں حق کے لیے لڑنے والے کا انجام دیکھ رہی ہو نا؟ پہلے اس سے گھر کے اپنے جدا ہوئے تھے۔ اب زندگی سے اسے جدا کیا جا رہا ہے۔ یہ دنیا ظالموں اور لٹیروں سے بھری ہوئی ہے۔ یہاں جو شیطانی دماغ رکھتا ہے، مکروفریب، جھوٹ دغا، خود غرضی شر پسندی، جس کی سرشت میں کوٹ کوٹ کر شامل کی گئی ہو، وہ یہاں کا سکندر ہوتا ہے۔ ہم جیسے سادہ مزاج وضابر لوگ آخری دم تک بوجھ کی طرح گھسیٹے جاتے ہیں۔ گھٹ گھٹ کر مرتے ہیں۔"

"ادے! میں جا رہی ہوں۔ اپنی بہن کو ایک چھت کے نیچے بے یار و مددگار نہیں چھوڑ سکتی، میں جا رہی ہوں، اس کے پاس۔"

سجادیہ بے قراری ہو کر ایک دم اٹھی تھی۔ مگر گل خانم نے اسے پکڑ لیا۔

"نہیں۔ ایسا کوئی قدم نہیں اٹھاؤ، جس سے میں تمہیں بھی کھو دوں، میرے پاس زندہ رہنے کا کوئی تو سہارا باقی رہے۔"

"نہیں ادے! اس طرح رو رو کر، سسک سسک کر زندہ رہنے سے بہتر ہے مر جائیں۔ ذلت کی طویل زندگی سے عزت کی ایک دن کی موت بہتر ہے۔ مجھے مت روکو، ادے مجھے ورشا کے پاس جانے دو۔"

وہ بری طرح تڑپ اٹھی تھی۔

شہباز خان اپنے کمرے میں بستر پر دراز سوچوں میں گم تھے جبکہ گل جاناں قریب بیٹھی ہوئیں مسلسل ان کو بھڑکانے میں مصروف تھیں۔

"خان! جواب نہیں دیا میری بات کا؟" انہیں ہنوز خاموش دیکھ کر وہ بولیں۔

"ہوں، کیا کہہ رہی ہو؟"

"واہ بھئی واہ۔ یہاں بات ختم ہو گئی، اور آپ پوچھ رہے ہو کیا؟"

"گل جاناں! اس وقت میرا دماغ ٹھکانے پر نہیں ہے۔ بہتر ہوگا اگر نہ بات کرو تو۔" وہ خشک لہجے میں گویا ہوئے۔

"ہاں، ہاں جانتی ہوں میں، سمجھ رہی ہوں میں، جس باپ کی بیٹی کے سیاہ کرتوت ہوں اس کے دل پر کیسی قیامت ٹوٹی ہے۔ ارے، اسی وجہ سے تو میں بھی پریشان ہوں۔ آج گھر والے واقف ہوئے کل سارا گاؤں جان جائے گا۔ اف۔۔۔ کیا عزت رہ جائے گی ہماری، سرداری، قبیلے کی آن سب خاک میں مل جائے گی۔"

"گل جاناں! بس۔۔۔۔ خاموش رہو، اچھی طرح جانتی ہو جھوٹ اور سچ پھر بھی۔" ضبط کے باوجود وہ اپنے لہجے پر قابو نہ پا سکے تھے۔

"بھول جائیں سچ اور جھوٹ کو، سچ پر ہم یقین کر لیں گے، مگر لوگ جنہوں نے ولیوں کو نہیں بخشا، ہم کو معاف کر دیں گے؟ میں کہتی ہوں خاموشی سے اسے یہاں سے نکال کر کہیں ایسی جگہ چھوڑ آؤ جہاں وہ خود ہی بھوک پیاس سے مر جائے۔"

ان کے لہجے میں بلا کی سفاکیت دبی رکھی تھی۔

"نہیں، ایسا نہیں کر سکتا ہوں۔ جیسا بھی ہوں باپ ہوں اس کا۔"

''اوہ، بیٹی کے لیے محبت جاگی بھی کب، جب وہ اس قابل رہی نہیں۔'' وہ استہزائیہ انداز میں غرائیں۔

''زبان کو لگام دو گل!''

''اب نہیں، اب گل جاناں کی زبان کو کوئی لگام نہیں ڈال سکتا۔ مجھے اس لڑکی کو زندہ نہیں رکھنا، یہ میرا فیصلہ ہے۔''

''تم میرے مقابل آ رہی ہو؟'' وہ گرجے۔

''جو سمجھیں، مجھے کوئی خوف نہیں ہے۔'' انہوں نے ہٹ دھرمی سے کہا۔

''پیر کی جوتی کو ذرا ڈھیل دو تو وہ سر پر آ ٹھہرتی ہے۔ شاید تمہیں بھی اس قدر ڈھیل مل گئی ہے لیکن یاد رکھنا، جو جوتی کاٹنے لگتی ہے وہ گھر کی نہیں کباڑ خانے کی زینت بنتی ہے۔''

''خان! میرے اچھے خان! اس بدذات کے لیے کیوں اپنی ہنستی مسکراتی زندگی میں زہر گھول رہے ہیں۔ آپ اچھی طرح جانتے ہیں، یہ معاملہ میرا اور آپ کا نہیں ہے، بلکہ شمشیر خان کا ہے، اور اس کے معاملے میں کوئی نہیں بول سکتا، یہ ہم دونوں کو ہی بخوبی معلوم ہے۔ پھر کیوں ہم اپنے دل خراب کریں۔''

شمشیر خان کا حوالہ لے کر بہت چالاکی سے انہوں نے بات بدل ڈالی تھی۔ جس کا نتیجہ خاطر خواہ نکلا تھا۔ شہباز خان بیٹے کی فطرت سے واقف ہونے کی وجہ سے خاموش ہو گئے تھے۔

☆☆☆

''ورشا!'' ٹھنڈے فرش پر بت کی مانند بیٹھی ورشا کو گل داد نے پکارا۔ اس کی سوجی ہوئی آنکھیں، الجھے بال، چہرے پر جا بجا چوٹوں اور نیل کے نشان اس امر کی گواہی تھے کہ گل جاناں کے دل کی تمام حسرتیں نیل و زخموں کی صورت میں اس کے چہرے اور جسم پر در آئی تھیں۔

شمشیر خان کی مضبوط بھاری انگلیوں کے نشان اس کے زخمی رخساروں پر ثبت ہو کر رہ گئے تھے۔ وہ اردگرد سے بے نیاز دیوار سے ٹیک لگائے آنکھیں بند کیے بیٹھی تھی۔ گل داد کے بار بار پکارنے پر بھی اس نے آنکھیں نہیں کھولیں تو وہ گھبرا کر قریب چلے آئے اور اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر پکارنے لگے۔

''ورشے...... ورشا! مجھ سے ناراض ہو بیٹا؟''

''لالہ......!'' آنکھیں کھولتے ہی آنسو اس کی آنکھوں سے جھر جھر بہنے لگے۔ وہ روتی ہوئی ان کے سینے سے لگ گئی۔

''میں بے قصور ہوں لالہ! میں نے ایسا کچھ نہیں کیا، جس سے بابا کی، اس قبیلے کی بدنامی ہو۔''

''ہاں مجھے یقین ہے۔ میری بہن ایسا ہرگز نہیں کر سکتی۔ چلو اٹھو تمہیں بڑی ادے کے پاس لے کر چلوں وہ رات بھر روتی رہی ہیں۔ سجاد یہ بھی تم سے ملنے کو بے چین ہے۔'' وہ اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر بولے۔

''میرے لیے سارے رشتے ختم ہو گئے، میں جیتے جی مر گئی ہوں سب کے لیے۔''

''نہیں، ایسے نہیں کہتے، کسی کے کہنے سے رشتے نہیں ٹوٹ جاتے، خون کے رشتے کبھی ناپائیدار نہیں ہوتے۔'' نزل بھابی جو ابھی اندر داخل ہوئی تھیں، اسے سینے سے لگاتی ہوئی گلوگیر لہجے میں بولیں اور اسے اسی انداز میں لیے ہوئے اس کوٹھڑی سے باہر لے آئیں۔ جو اس کے لیے قید خانہ تھا۔ گل داد نے اپنی گرم چادر اس کے سر پر ڈال دی تھی۔

حالات نے اسے اس قدر بے حس کر ڈالا تھا کہ بلا کی سردی میں بھی وہ بغیر گرم شال و سوئٹر سردی سے بے نیاز تھی۔

''ارے! یہ کیا؟ کہاں لے جا رہے ہو اسے؟ کس کی اجازت سے کوٹھری سے نکالا ہے اس بدذات کو؟'' گل جاناں جو ناشتے سے فارغ ہو کر کمرے سے نکل رہی تھیں، ورشا کو ان کے ہمراہ دیکھ کر غصے سے استفسار کرنے لگیں۔

''میں نے نکالا ہے اسے وہاں سے۔'' گل داد نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

''کیوں؟ جانتے نہیں ہو اس نے کیا کیا ہے؟''

''جی، جو آپ جانتی ہیں وہ میں بھی جانتا ہوں۔'' گل داد کا لہجہ ذومعنی تھا۔

''گل داد! اس بدفطرت لڑکی کی خاطر مجھ سے زبان چلا رہا ہے؟'' انہوں نے آنکھیں دکھاتے ہوئے چیخ کر کہا۔

''میں آپ کی شان میں کوئی گستاخی نہیں کرنا چاہتا اد ے! آپ راستے سے ہٹ جائیں، ورنہ یاد رکھیے ظلم حد سے بڑھتا ہے تو مٹ جاتا ہے۔'' گل داد ورشا کا ہاتھ پکڑ کر ان کے سامنے سے گزر گیا۔ پیچھے نزل بھی۔

گل جاناں غصے میں تنتناتی ہوئی شہباز خان کے پاس پہنچ گئیں۔

''میرا دماغ مت کھاؤ گل! اپنی اولاد پر اختیار نہیں رکھتی ہو تو مجھے دھونس مت دکھاؤ۔'' انہوں نے سرد و سپاٹ لہجے میں کہا۔

قبل اس کے کہ کوئی بات ہوتی ملازمہ اجازت لے کر اندر آئی۔

''خان جی! برابر کے گاؤں سے کچھ لوگ آئے ہیں۔'' اس نے مؤدب لہجے میں اطلاع دی۔

''برابر کے گاؤں سے؟ شاہ افضل خان کے گاؤں سے؟'' وہ ایک دم کھڑے ہو کر گرجے تھے۔

''جی خان! چوکیدار نے انہیں اندر نہیں داخل ہونے دیا ہے۔ وہ کہہ رہے ہیں ہم صلح و امن کا پیغام لے کر آئے ہیں۔''

''کیسی صلح؟ کیسا امن؟ اب صرف جنگ ہوگی جنگ۔ تو جا کر ان لوگوں کو بیٹھک میں بٹھا۔'' گل جاناں کا اشارہ پاتے ہی ملازمہ چلی گئی۔

''یہ کیا کہہ رہی ہو؟ دماغ خراب ہو گیا ہے تمہارا؟'' شہباز ولی خان از حد مشتعل تھے اس لمحے۔

''ٹھنڈے دماغ سے غور کرو خان! میرا دل کہتا ہے وہاں سے کوئی اچھی خبر ہے۔ پہلے سن تو لو کیا بات ہے؟ کیا پیغام لائے ہیں وہ لوگ۔ جو گڑ سے مر رہا ہو اسے زہر سے کیوں ماریں؟ پہلے جا کر ان کی بات سن لیں۔'' گل جاناں کے چالاک و حریص ذہن نے لمحے بھر میں کامیاب منصوبہ بنا ڈالا تھا۔

شہباز ولی خان چند لمحے کچھ سوچتے رہے پھر اپنا وائٹ کڑکڑاتا ہوا اونچا شملہ سر پر باندھ کر بڑے شاہانہ انداز میں بیٹھک کی طرف

بڑھے ۔گل جاناں بھی بلی کی سی چال چلتی ہوئی مردانہ بیٹھک سے ملحقہ کمرے میں آگئیں۔ اور اندرونی بند دروازے سے چپک کر وہاں ہونے والی گفتگو سننے لگیں۔ جہاں رسمی علیک سلیک کے بعد اس طرف سے آنے والے لوگوں میں سے ایک اپنی آمد کا مدعا بیان کر رہا تھا۔

''شہباز ولی خان! سردار افضل شاہ خان نے دوستی کا پیغام بھیجا ہے۔ ان کا پیغام ہے پچھلی تمام دشمنی بھلا کر دوستی اور امن و خیر سگالی کو اپنائیں۔ اس کے لیے وہ آپ سے نئے رشتے استوار کر کے دوستی کو مضبوط اور پائیدار بنانا چاہتے ہیں۔'' فتح خان بولے جو شاہ افضل خان کے دوست اور سگے خالہ زاد تھے۔ انہیں قبیلے میں بزرگ کی حیثیت حاصل تھی۔ کافی صلاح مشورے کے بعد یہ طے پایا تھا کہ وہ پیامبر بن کر جائیں گے۔ ساتھ ان کے صارم اور گلباز بھی تھے۔

فتح خان نے اپنا مدعا بہت نرمی و خوش کلامی سے بیان کر ڈالا تھا۔

''اس کے پوتوں نے جو گھناؤنی حرکت کی ہے۔ اس کے باوجود بھی وہ ہم سے دوستی و امن کی توقع رکھتا ہے؟'' شہباز خان کا گھن گرج لہجہ کمرے میں گونج اٹھا۔

''ابتدا تمہاری طرف سے ہوتی رہی ہے شہباز خان۔ یہ مت بھولو، شاہ قبیلے والے تمہارے بیٹے کی ہر من مانی اور سرکشی کو فراخدلی سے معاف کرتے رہے ہیں۔'' گلباز خان نے جواب دیا۔

''لیکن جو حرکت انہوں نے کی ہے۔ وہ معاف کرنے والی نہیں ہے۔ شاہ افضل خان سے کہہ دینا شہباز ولی خان اپنی روایات و اصولوں کے خلاف گھر آئے بدترین دشمن کو زندہ واپس بھیج رہا ہے۔ ورنہ خدا کی قسم، دل تو کر رہا ہے تمہاری کھالوں میں بھس بھروا کر اسے بھیجوں۔'' غم و غصے سے ان کا رواں رواں کانپ رہا تھا۔

''اگر تمہارے غصے کی آگ، دشمنی کی انتہا یہاں ختم ہوتی ہے تو ہم تیار ہیں لیکن تمہیں دشمنی ختم کرنی ہوگی۔'' غصے سے سرخ پڑتے صارم خان کو وہ نگاہوں سے پرسکون رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے بہت ملائمت و شیریں لہجے میں ان سے مخاطب ہوئے۔

''مجھے نہیں کرنی دوستی، میری طرف سے اعلان جنگ ہے۔''

''سوچ سمجھ کر فیصلہ کرو شہباز خان! اس وقت تم جذباتی ہو رہے ہو۔ اندر جا کر گھر والوں سے مشورہ کرو، کچھ سوچو، سمجھو پھر جواب دینا۔ جب تک ہم یہاں انتظار کرتے ہیں۔ تم اطمینان سے فیصلہ کرو۔ ہمیں جانے کی کوئی جلدی نہیں۔''

شہباز خان نے قہر آلود نگاہ ان تینوں پر ڈالی اور وہاں سے چلے گئے۔

''بابا جان! آپ نے اس کی بکواس کیوں سنی؟'' صارم اس کے باہر نکلتے ہی سرد مہری سے فتح خان سے مخاطب ہوا۔

''بیٹے! یہ بال تجربے سے سفید ہوئے ہیں۔ کب کس وقت کونسی گوٹ پھینکنی ہے، اس سے واقف ہوں اگر ایک حماقت کا تاج پہن کر بے وقوفی کی حکمرانی کر رہا ہو تو اسے داد نہیں دی جاتی، نہ ہی اس کی وزارت قبول کی جاتی ہے۔ اس کی حماقتوں میں پھنس کر ہم شاہ قبیلے کے لوگوں کو موت میں نہیں دھکیل سکتے۔''

''بابا جان! کیا ہم چوڑیاں پہن کر بیٹھ جائیں گے؟ مزہ نہ چکھا دیں گے ان بزدلوں کو، جو شیر کی کھال میں گیدڑ ہیں۔''

''کیا ہوگا پھر؟ گھر ویران اور قبرستان آباد ہو جائیں گے۔ پہلے کیا کم خون بہا ہے؟ کم معصوم جانیں خاک نشین ہوئی ہیں؟''

''صارم خان! تمہیں بی بی جان نے حکم دے کر بھیجا تھا کہ تم خاموش رہو گے۔'' آکا جان نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر آہستگی سے سمجھایا۔

☆☆☆

''کیا ہوا ہے؟ کیا کہہ رہی ہو؟ مجھے لگتا ہے تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔'' شہباز خان جھنجلا کر گل جاناں سے مخاطب ہوئے۔

''میں بالکل درست کہہ رہی ہوں بڑے خان! میری بات سمجھو تو سہی۔ ورشا کو اب کوئی نہیں اپنائے گا۔ تم اس کا رشتہ دے دو اور بدلے میں سرمئی پہاڑوں والی زمین اپنے نام لکھوا لو، کیوں ہے نہ سمجھداری کی بات۔ یعنی سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔''

گل جاناں جو تمام تر باتیں سن چکی تھیں انہوں نے فوراً ہی منصوبہ تیار کر لیا۔

''یہ...... یہ کس طرح ممکن ہے گل؟'' وہ ہکا بکا رہ گئے۔

''اب تو اصل وقت آیا ہے۔ اپنی بات منوانے کا۔ اگر وہ یہ شرط مانتے ہیں تو رشتہ دے دینا۔ ورنہ اعلان جنگ ہے۔''

''لیکن بچے؟ بچے نہیں مانیں گے۔'' وہ گویا مان گئے تھے۔

''سب مان جاتے ہیں۔ مان جائیں گے سب ہی۔ پہلے تم ان سے بات کر کے آؤ۔'' گل جاناں نے خوشی خوشی انہیں وہاں دھکیلا۔

ان کی شرط سن کر تینوں ہی حیران رہ گئے تھے۔

''نہیں آپ کی یہ شرط قبول نہیں کی جائے گی۔'' صارم خان کھڑے ہو کر سخت و فیصلہ کن لہجے میں بولا تھا۔

''تو پھر اعلان جنگ ہے ہماری طرف سے۔'' جواباً وہ بھی غرائے تھے۔

''صارم خان! خاموش رہو ہم تمہیں بزرگ بنا کر نہیں لائے۔'' آکا جان نے صارم کو ڈانٹا تھا۔

''گستاخی معاف آکا جان! میں کسی صورت، سرمئی پہاڑوں والی زمین کا کبھی سودا نہیں کروں گا۔ جس کی خاطر ببریز خان کی جان گئی، اس کا سودا میں کبھی نہیں کروں گا۔ ہاں اگر یہ اپنی بیٹی کا سودا ہی کرنا چاہتے ہیں تو اس کے وزن کے بدلے میں سونا اور روپیہ دینے کو تیار ہوں، مگر زمین نہیں۔''

''کیا تم سونا اور روپیہ دو گے؟'' شہباز خان کے اندر مسرت کے پھلجھڑیاں سی چھوٹنے لگیں۔ یہی چال دراصل پیچھے یہاں کی باتیں سنتی ہوئی گل جاناں کا تھا۔ کیونکہ وہ سب زمین سے بہت زیادہ تھا۔

''ہاں شہباز خان! بتاؤ اپنی بچی کا وزن، ہم سونا منگواتے ہیں، اور یہ بلینک چیک ہے جتنی چاہو رقم لے سکتے ہو۔''

''لیکن نکاح اور رخصتی ابھی اسی وقت ہوگی۔'' آکا جان نے اٹل لہجے میں کہا۔

☆☆☆

''ٹھیک ہے خان! نکاح اور رخصتی ابھی ہوگی، لیکن مال بھی ابھی دینا ہوگا، یعنی اس ہاتھ دیتے ہیں، اس ہاتھ لیتے ہیں۔'' صارم کی بات کے جواب میں انہوں نے مطمئن لہجے میں جواب دیا۔

''اس بات کی فکر مت کرو۔ شہباز خان! ہماری زبان سچی ہے جو قول ہم نے دیا ہے، وہ ضرور پورا ہوگا۔ تم جب تک نکاح ورخصتی کی تیاری کرو، تب تک پیسہ اور سونا پہنچ جائے گا۔'' انہوں نے پُروقار لہجے میں کہا۔

گل باز خان نے باہر موجود طور خان کو بابا جانی کے پاس بھیج دیا۔

ان سے موبائل پر وہ پہلے ہی صورتِ حال پر بات چیت کر چکے تھے۔

بابا جانی نے صارم خان کے فیصلے کو سراہا تھا اور طور خان کے ہاتھ سونا اور پیسہ بھیجنے کا آرڈر دیا تھا۔

طور خان جلد ہی سب کچھ لے کر واپس آ گیا۔

☆☆☆

''تجھے کہا تھا نہ بچے جس راستے پر تم نے قدم بڑھائے ہیں وہ راستہ روشنیوں کی جانب نہیں جاتا بلکہ ذلت ورسوائیوں کے اندھیروں میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیتا ہے۔'' گل خانم نے زخموں سے چور، تکالیف سے نڈھال ورشا کو اپنے سینے سے لگاتے ہوئے بے تحاشہ آنسوؤں کے درمیان کہا۔

کتنے ہی لمحے وہ ان کے ممتا بھرے لمس کی ٹھنڈک محسوس کرتی ان کے سینے سے لگی رہی۔ وقت جیسے اس سے تھم گیا تھا۔

وہ نوزائیدہ بچے کی مانند ہر پریشانی وفکر سے بے نیاز ماں کی پرسکون چھاؤں میں تھی۔ ماضی کی سختیاں، تلخیاں، حال کی تمام مشکلات اور اذیتیں اور آنے والے وقت کے ظالم وخوفناک پنجوں سے انجان بنی وہ اس وقت ماں کی آغوش میں تھی۔

روح کے تمام داغ

جسم کے سارے زخم

سسکتی ہوئی خودداری

ماں کے وجود نے جیسے سارے کانٹے ایک ایک کر کے چن لیے تھے۔

اس کا وجود ایک دم ہلکا ہو گیا، روئی کے گالے کی مانند شفاف و ہلکا پھلکا۔

ہوا کے سبک جھونکے کی مانند نیلے گگن پر تیرتا ہوا۔

شریر ہواؤں کی زد پر ادھر سے ادھر، ادھر سے ادھر ڈولتا ہوا۔

الاؤ کی طرح بھڑکتے، دھکتے ذہن پر یکدم ہی فرحت انگیز پھوارسی پڑنے لگی۔

اس نے سوجی ہوئی آنکھیں بمشکل کھول کر دیکھا۔

وہ مہربان، ممتا بھرا چہرہ ابھی بھی اشکبار تھا۔

بہت پیار سے وہ اپنے ایک ہاتھ سے اس کے چہرے کو سہلا رہی تھیں۔

دوسرا ہاتھ بہت نرمی سے اس کے گرد آلود، الجھے بالوں میں دھیرے دھیرے چلتا ہوا اس کی تمام تھکن اپنی پوروں میں سمیٹ کر اسے سکون دے رہا تھا۔

ستارہ یہ تندہی سے اس کے پیر دبا رہی تھی۔

وہ ایک کٹھن سفر طے کر کے اپنے گھر اپنے لوگوں میں آئی تھی۔

وہ آج ماں اور بہن کے درمیان تھی، ان کی چاہتیں سمیٹ رہی تھی۔ ان کو وہ عزیز اور پیاری اتنی ہی اب بھی تھی، جتنی یہاں سے جانے سے پہلے تھی۔ ان کی نظروں میں اس کے لیے پیار اور محبت کا سمندر موجزن تھا۔ یہ احساس اتنا طمانیت و آسودگی سے بھرپور تھا کہ وہ نیند کی وادی میں گم ہو گئی۔

☆☆☆

''ان سرمئی پہاڑ والوں کے پاس کتنا مال و زر ہے؟ مجھے یقین نہیں آ رہا کہ یہ سونا اصلی ہے؟ نوٹ تو میں پہچانتی ہوں کہ سو فیصد اصلی ہیں۔'' گل جاناں بڑے نوٹوں کی ڈھیروں گڈیوں کو اٹھا اٹھا کر سیف میں منتقل کرتی ہوئی پر مسرت لہجے میں گویا تھیں۔

ان کے پر مسرت چہرے پر خوبصورت مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔

مسرت و سرشاری ان کے انگ انگ سے پھوٹ رہی تھی۔

یہ تو ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ جس کو کھوٹا سکہ سمجھتی رہی تھیں ایک دن ان کے لیے خزانے کی کنجی ثابت ہو گی۔

ان کی حریصانہ اور زر پرست ذہنیت عروج پر تھی۔

''کم تو ہمیں بھی نہیں ملا تھا مگر یہاں سب ہی رنگین مزاج تھے۔''

''کچھ کہا ہے مجھ سے؟'' شہباز خان کی بڑبڑاہٹ ان کے کانوں تک پہنچی تو انہوں نے سیف کو لاک کرتے ہوئے پلٹ کر استفسار کیا۔

''نہیں... ثقافت اپنا کام نمٹاؤ، جا کر وہاں سمجھاؤ، وہ لوگ جلدی کر رہے ہیں۔'' شہباز خان ماضی کے کسی ورق کو اپنے ذہن کی کتاب سے پلٹتے ہوئے بولے۔

☆☆☆

فضا بہت خوابناک و دلکش تھی۔ ہر سمت پھول ہی پھول مہک رہے تھے۔ ہلکی ہلکی پھوار من میں عجیب ترنگ و سرمستی پھیلا رہی تھی۔

وہ تتلی کی مانند پنکھ پھیلائے ڈال، ڈال، پھول، پھول منڈلا رہی تھی۔

کس قدر فرحت انگیز و مسرور کیفیت تھی۔

ہواؤں کے دوش پر آوارہ بادل کے ٹکڑے کی مانند محو گردش تھی۔

معاً اس کے جسم کو زوردار جھٹکا لگا۔ خوابناک فضا میں یکلخت ہی آگ بھڑک اٹھی، گل و گلزار یکدم ہی آتش فشاں بن گئے۔

خراماں خراماں چلتی ہوا میں آتش ٹپکنے لگی۔

رم جھم پڑتی پھوار میں انگاروں کی بارش ہونے لگی۔

جس دگلشن تھی ہر جگہ، ہر سو شعلے ناچ رہے تھے۔

آگ برس رہی تھی اور اس کا وجود شعلوں سے بھڑکتے الاؤ کی سمت بڑھ رہا تھا۔ از حد سرعت سے، کسی کٹی پتنگ کی مانند...... وہ الاؤ کی جانب بڑھتی جا رہی تھی، گرتی جا رہی تھی، خود کو سنبھالنے کی بچانے کی وہ ہر ممکن کوشش کر رہی تھی۔ مگر بے سود، لاحاصل جستجو اور قبل اس کے کہ وہ اس الاؤ میں گر کر بھسم ہوتی کسی مہربان ہاتھوں نے اس کے وجود کو سنبھال لیا تھا۔

اس کا چہرہ پسینے سے تر تھا۔ سانس خوب چل رہی تھی۔ آنکھیں ابھی بھی خواب کی دہشت کے زیر اثر باہم پیوست تھیں۔

ان مہربان، نرم و اپنائیت بخشتے ہاتھوں کو اس نے ابھی بھی شدت سے تھام رکھا تھا۔ حالانکہ کانوں میں کچھ نامانوس سا شور گونج رہا تھا۔

''تم...... آخر چاہتی کیا ہو؟''

''وہی جو تم سگی ماں ہو کر نہیں چاہ رہی ہو۔'' سخت و کھردری آواز اس کے کانوں میں گونجی تو وہ خواب کے ساگر سے بیداری کے کنارے پر گر رہی تھی۔

''سگی ماں ہوں، اس لیے بیٹی کو دشمن کے حوالے نہیں کروں گی۔''

''دشمن؟ یہ تم کہہ رہی ہو۔''

''گل جاناں! چلی جاؤ یہاں سے، میرے صبر کا امتحان مت لو، میں نے بہت خاموشی اختیار کر رکھی تھی، کبھی اپنے حق کے لیے میں نے آواز نہیں اٹھائی، تمہاری ہر جا و بے جا باتوں کے آگے سر تسلیم خم کیا ہے۔ مگر آج، بیٹی کی خاطر میں کوئی جبر و زیادتی برداشت نہیں کروں گی، چلی جاؤ، کوئی نکاح وکاح نہیں ہو رہا۔'' بیٹی کو زخم زخم دیکھ کر گل خانم کی برسوں کی بند زبان اس لمحے کھل گئی تھی۔ وہ غیض و غضب سے گویا ہوئی تھیں۔

''ہوش کے ناخن لو گل! تم بیٹی کی طرفداری نہیں، موت کا سامان کر رہی ہو۔ اچھی طرح جانتی ہو، شمشیر خان اسے زندہ نہیں چھوڑے گا، یا اگر چہ بچ بھی گئی تو گھر میں نہیں رہ سکتی۔ اور پھر کوئی اسے اپنائے گا بھی نہیں، آج کل کے وقت میں ''عزت دار'' لڑکیاں بیٹھی بوڑھی ہو رہی ہیں۔ اس ''جیسی'' سے کون شادی کرے گا؟ یہ تو احسان مانو ان لوگوں کا جو ابھی بھول کو چپ کر جا رہے ہیں ورنہ......''

''گل جاناں!'' وہ چیخ پڑیں۔

''میرا منہ بند کروانے سے حقیقت چھپ نہیں جائے گی، ہو ہفتہ گھر سے رات دن لاپتہ رہنے والی لڑکی کھی ہا عصمت واپس پلٹ سکتی ہے؟''

''خدا کے واسطے! گل جاناں، خاموش ہو جاؤ۔ مت زخموں پر نمک چھڑکو، کہیں ایسا نہ ہو میرے دکھی دل سے کوئی آہ نکل جائے۔''

گل خانم، دُرشا کو سینے سے لگا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

ورشا جو جاگ گئی تھی ساکت نگاہوں سے گل جاناں کے بگڑے چہرے کو دیکھ رہی تھی۔

''ارے، نکلے آہ..... ایک بار نہیں ہزار نکلے۔ لگ گئی اس ڈائن کو، بربادہوگئی یہ جو اس گھر کی خوشیوں، عزت کو نگل گئی۔''

وہ بلند آواز میں سینہ پیٹتے ہوئے چیخیں۔

''چھوڑ دو، میں بھی تمہارے ساتھ جذباتی اور بیوقوف بن رہی ہوں۔ سوچو..... ہمت سے کام لو، اچھا جاؤ..... آخر ہم کیا کریں.....؟ وہاں حجرے میں شاہ قبیلے والے بیٹھے انتظار کر رہے ہیں۔ یہ ان کا بڑا پن ہے جو وہ لڑکی نکاح کر کے عزت سے لے کر جا رہے ہیں اور سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے ان کے دل میں کوئی کھوٹ بھی نہیں لگتا، وہ ورشے کو کوئی دکھ نہیں دیں گے۔''

گل جاناں نے صورت حال بگڑتے دیکھ کر ہوشیاری سے چاپلوسی دھلاوٹ کا پینترا بدلا تھا اور ان کی یہ چال کامیاب رہی تھی۔ جو لوگ شفاف دل اور پر خلوص فطرت رکھتے ہیں وہ مار سے نہیں ''پیار'' سے بازی جیت کر بھی ہار قبول کر لیتے ہیں۔ نفرتوں، عداوتوں کے سوداگر لحاتی مسرتیں حاصل کر کے ابدی عذاب خرید تے ہیں، محبتوں کے پیامبر دونوں جہاں میں کامیاب ہوتے ہیں۔

گل خانم جو پیار و محبت، سخاوت و خلوص کی مٹی سے بنی تھیں، خوب سمجھ رہی تھیں، گل جاناں کے چاپلوسانہ رویے کو، پھر بھی انہوں نے خاموشی سے بت بنی ورشا سے نکاح نامے پر سائن کروا لیے تھے۔

وہ جو شخص (اس وقت) سانس لیتا وجود تھی ڈاپنے ہر دعوے، عہد، اپنے سے غافل ماں کی التجاؤں، آنسوؤں، سسکیوں تلے ملتے وجود کو نگاہوں میں سموئے اس شخص کی زندگی کی ساتھی بن گئی۔ جس کی پرچھائیں سے بھی بچ کر چلنا فخر سمجھتی تھی، جس کے ذکر سے اسے نفرت تھی، اس کا نام بھی سننا اسے ناگوار گزرتا تھا۔ آج تاحیات اس کے نام سے منسوب ہوگئی تھی۔

''ادے! آج میں نے آپ کے دودھ کا قرض چکا دیا ہے۔ روز محشر میں آپ کی قرض دار نہیں ہوں گی..... میں نے بچپن سے آج تک آپ کو دکھ ہی دکھ دیے ہیں۔ مجھے معاف کر دیجیے گا۔ اب شاید ہم خوابوں میں ہی ملیں گے۔'' ورشا نے بند ہوتی آنکھوں کو بمشکل کھولتے ہوئے کہا۔

صدمے، صدمے نے اس کو حقیر پتھر کی مانند ریزہ ریزہ کر کے رکھ دیا تھا۔ پھر یہ صدمہ سب سے بھاری تھا کہ وہ اس شخص کی ملکیت بن گئی تھی، جس نے کبھی بہت فخر و غرور سے دعویٰ کیا تھا کہ وہ اسے حاصل کر کے دکھائے گا۔ اپنا نام اس کے نام کے ساتھ ضرور جوڑے گا۔ اسے اپنائے گا۔

آج وہ جیت چکا تھا۔ وہ ہمیشہ کی طرح آج بھی نامراد اور تہی داماں رہی تھی۔ قسمت بھی وقت کی طرح مطلب پرست ثابت ہوئی تھی، ہمیشہ ان لوگوں کا ساتھ دیتی ہے جو چالباز و فریبی ہوتے ہیں۔ جنہیں اپنی طاقت پر گھمنڈ اور زور آوری پر غرور ہوتا ہے۔ کمزور اور حالات کی چکی میں پسے لوگوں کو یہ بھی زچ کرتی ہے۔

''صارم خان آفریدی! تم مجھے کبھی نہیں جیت سکو گے۔ کبھی نہیں۔''

''ورشا! میری جان، مجھے معاف کر دینا۔ میں بہت بدنصیب ماں ہوں۔ میں نے تمہیں جنم تو دیا مگر وہ تحفظ نہیں دیا جو ایک ماں دیتی ہے۔''

''ارے! یہ بے ہوش ہوگئی ہے۔'' سجادیہ نے بہتے آنسوؤں سے اس کی پیشانی چومی۔

''رہنے دو نا یہ بے ہوشی میں رخصت ہو، یہی بہتر ہے۔''

☆☆☆

دروازے پر دستک بھرپور انداز میں ہوئی تھی۔

''آہ.....! مجھے لگ رہا ہے بی، ہو نہ ہو یہ اسی سرخ آنکھوں والے کی دستک ہے۔ اس کمبخت کے ہاتھ میں ہی بلا کی طاقت ہے۔''

سبزی کاٹتی فرحت آپا خوفزدہ لہجے میں قریب بیٹھی کائنات سے مخاطب ہوئیں۔

''آپ جا کر دیکھیں تو سہی، بنا دیکھے ہی شروع ہو جاتی ہیں۔''

وہ جس انداز میں شمشیر خان کا ذکر کرتی تھی وہ اسے چڑا کر رکھ دیتا تھا۔

''میرا دل گواہی دے رہا ہے۔ وہی ہے آدم خور بلاؤ۔''

''میں جا رہی ہوں۔ خود دروازہ کھول دوں گی۔ آپ یوں ہی اس شریف آدمی کو نئے نئے خطاب دیتی رہیئے گا۔ باہر کوئی مریض ہوگا۔''

وہ برش نیچے رکھ کر جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''اچھا، اچھا بیٹھی رہو آپ میں دیکھ رہی ہوں۔'' اس کا موڈ آف دیکھ کر وہ دروازہ کھولنے چلی آئیں۔

''ارے کون ہے؟ کھول رہے ہیں دروازہ، کیا اماں باوا نے دستک دینا بھی نہیں سکھایا؟ ایسے دروازہ بجایا جا رہا ہے جیسے سارے علاقے کے کتے پیچھے لگے ہوں یا دروازہ توڑنے کی قسم کھا کر آئے ہو بھیا؟''

حسب عادت قدموں سے تیز ان کی زبان چل رہی تھی۔

لحظہ بہ لحظہ دستک بڑھتی جا رہی تھی۔

''ارے، کون بدحواس ہے بابا! آ رہی ہوں۔ کوئی مستقل مزاج بندہ ہے بلکہ مشتعل مزاج بندہ، جسے دم بھر کو صبر نہیں۔ آپ؟'' دروازہ کھولتے ہی سامنے کھڑے شمشیر خان کو دیکھ کر مارے گھبراہٹ اور بوکھلاہٹ کے ان کا منہ لیٹر بکس کی طرح کھل گیا، آنکھیں حلقوں سے ابھر آئیں۔

''ڈاکٹر کو بلاؤ۔'' شمشیر خان جو دروازہ دیر سے کھولنے پر از حد مشتعل ہو گیا تھا ان کی خوفزدہ صورت دیکھ کر اس نے ڈانٹنے کا پروگرام موقوف کر کے سخت لہجے میں حکم دیا۔ اور وہ لمحے بھر میں پستول سے نکلی گولی سے بھی تیز رفتار میں اندر دوڑی تھیں۔

''یا اللہ خیر، کون ہے آپا؟'' کائنات گھبرا کر بولی۔

''وہی ہے، جس کا میرا دل گواہی دے رہا تھا۔ اب کیا ہوگا؟ حیات بھائی گھر میں نہیں۔'' وہ تشویش زدہ لہجے میں گویا ہوئیں۔

''اوہو..... آپ اس قدر پریشان کیوں ہو جاتی ہیں؟ وہ انسان ہے کوئی درندہ تو نہیں ہے۔'' کائنات کے چہرے پر بہار کے تمام رنگ دہکنے لگے۔

''بعض انسان درندہ صفت طبیعت پاتے ہیں اور جب وہ درندگی پر اترتے ہیں تو درندوں سے زیادہ بربریت وظلم پھیلاتے ہیں۔''

''آپ اپنے خدشے اپنے پاس رکھیے۔ کافی اور ساتھ کچھ مزے دار اسنیکس تیار کر کے جلدی سے لائیں۔'' بالکل اجنبیت ولاتعلقی سے وہ اس وقت ان سے مخاطب ہوئی۔ آئینے کے سامنے اس کے ہاتھ سرعت سے محوِ حرکت تھے۔ پانچ منٹ میں ڈارک لپ اسٹک اور بلش آن سے اس کا چہرہ شگفتہ لگنے لگا تھا۔ کانوں اور گلے کو نازک سی جیولری سے مزین کرنے کے بعد مسحور کن پرفیوم کا اسپرے کرنے سے فارغ ہو کر چادر اوڑھ کر وہ شمشیر خان سے ملنے ڈرائنگ روم میں آ گئی۔

''کیسے ہیں آپ؟'' سلام کے بعد وہ ان کے مقابل صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

''کیسا نظر آ رہا ہوں؟'' خلافِ مزاج اس نے مسکرا کر دھیمے لہجے میں الٹا سوال کر ڈالا۔ اسے سامنے دیکھ کر اس کی دہکتی آنکھوں میں محسوس کی جانے والی ٹھنڈک سی اتر آئی تھی۔ تنے ہوئے اعصاب کسی سحر انگیز کیفیت کے باعث نشاط آور کیف سے پرسکون ہونے لگے۔ نگاہوں میں، لہجے میں سرور آمیز خمار چھانے لگا تھا۔

بے اختیار،

بے خود

وہ اس کی سمت کھنچنے لگا تھا۔ کائنات اس کی زندگی میں آنے والی پہلی لڑکی نہیں تھی۔ تیس سالہ زندگی میں اس کے پہلو میں بے شمار لڑکیاں آئی تھیں۔ کچھ اس کی دولت پر ریجھ کر اس کی آغوش میں گری تھیں اور کچھ لڑکیوں کو اس نے جبراً حاصل کیا تھا۔ جن میں سے کچھ رو دھو کر اس کے خوف سے خاموش ہو گئی تھیں، جن کی شادیاں اس نے خود گاؤں کے ان مردوں سے کروا دی تھیں جو اس کی حویلی میں ملازم تھے۔

ان میں سے کچھ لڑکیاں گلفشاں روزمی خان کی بیٹی کی طرح ضدی اور ہٹ دھرم تھیں جو عصمت کی بربادی کے بعد اس کے کسی بہلاوے، کسی حرافے سے شادی کرنے پر راضی نہیں ہوتی تھیں۔ گاؤں والوں کو اس کی اصلیت بتانے کے درپے ہو جاتی تھیں۔ ایسی بہادر و پرعزم لڑکیوں کو وہ خاموشی سے گلے دبا کر موت کی آغوش میں پہنچا دیا کرتا تھا جن کی لاشیں کبھی کھائیوں یا پہاڑوں سے ملتیں تو حادثہ سمجھا جاتا تھا۔

کائنات واحد لڑکی تھی جس کی طرف اٹھنے والی اس کی نگاہیں احترام سے بوجھل ہوتی تھیں۔ اس کے لیے دل میں کبھی بھی کوئی سفلی جذبہ نہیں جاگا تھا۔

بلکہ اسے دیکھ کر اس کے اندر ایک سرور کی کیفیت چھانے لگتی تھی۔

اسے بار بار دیکھنے اور دیکھتے رہنے کی تڑپ دل میں جاگنے لگی تھی۔

آج بھی درشا کو چھوٹی ادے کے حوالے کرنے کے بعد وہ ہاتھ لینے کے بعد سیدھا یہاں چلا آیا تھا اور اسے سامنے دیکھ کر ساری تھکن و پژمردگی دور ہو گئی تھی۔

''ویری اسمارٹ، ویری چارمنگ!'' وہ دلکشی سے مسکرائی تھی۔

''ریئلی؟''اس نے جھک کر مسکراتی نگاہوں سے پوچھا۔

''آف کورس، میں جھوٹ کیوں بولوں گی۔''

''تھینکس فار دا کمپلی منٹ۔ آج پہلی بار مجھے اپنی تعریف اچھی لگی۔''

''اوہ۔۔۔ مجھ سے پہلے بھی کسی نے آپ کی تعریف کی ہے؟'' کائنات نے مصنوعی خفگی سے کہا۔

''جانے دیجیے! اگر نام گنوا دیے تو آپ برا مان جائیں گی۔''

شمشیر خان مسکراتا ہوا شوخی سے گویا ہوا۔ اس کے مسکراتے لب، مسرت سے کھلتا چہرہ، جذبے و شوخیاں لٹاتی مخمور نگاہیں، اگر کوئی دوسرا دیکھ لیتا تو یقین نہیں کرتا، یہ وہی جابر اور ظالم شمشیر خان ہے جو انسانی خون سے کھیلتا ہے۔

''میں کیوں برا مانوں گی؟ میرا آپ سے کیا تعلق؟'' اس نے آہستہ سے کہا۔

''آج آپ سے تعلق ہی تو جوڑنے آئے ہیں۔ نیا اور مضبوط رشتہ استوار کرنے۔''

''کیا۔۔۔۔ کیا۔۔۔۔ کہہ رہے ہیں آپ؟'' اس کا دل بری طرح دھڑکنے لگا۔

''حیات خان سے شادی کی بات کرنے آیا ہوں۔''

''لیکن۔۔۔۔ اتنی جلدی؟ انکل گھر پر نہیں۔''

''آپ بتا رہی تھیں وہ جلد از جلد آپ کی شادی کرنا چاہتے ہیں۔ میں بھی جلدی چاہتا ہوں۔ اب فاصلے برداشت نہیں ہوں گے۔'' اس نے جذباتی لہجے میں کہا۔

کائنات از حد بولڈ ہونے کے باوجود حیا سے سمٹ کر رہ گئی۔

''آپا ابھی تک کافی نہیں لائیں، میں دیکھ کر آتی ہوں۔'' اس کی نگاہوں کی وارفتگی اسے بوکھلا رہی تھی۔ خیالوں میں اس نے بار بار اس کے ساتھ تنہا وقت گزارا تھا لیکن اس وقت تمام حوصلے و اعتماد بھاپ بن کر اڑ گیا تھا۔

وہ اس لمحے اس کی نگاہوں سے چھپ جانا چاہتی تھی۔

''مجھے کافی کی نہیں، تمہاری ضرورت ہے۔'' شمشیر خان نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا اسی لمحے حیات خان اندر داخل ہوئے تھے۔ شمشیر خان کے ہاتھ اس کا ہاتھ دیکھ کر ان کا خون غیرت سے کھول اٹھا اور قبل اس کے کہ وہ جوش غیرت میں کوئی انتہائی رویہ اختیار کرتے کائنات ہاتھ چھڑا کر سرعت سے اندر کمرے میں غائب ہو گئی جبکہ شمشیر خان کے انداز میں کوئی سر مو فرق نہیں آیا تھا۔ وہ ویسے ہی پرسکون انداز میں انہیں دیکھ رہا تھا۔

''چھوٹے خان! بے شک آپ یہاں کے قبیلے کے سردار کے بیٹے ہیں۔ یہاں کے زمین و پہاڑوں کے آپ مالک ہیں، لیکن یہاں شریفوں کے گھر بسنے والی بہن، بیٹیاں آپ کی ملکیت میں شمار نہیں ہوتیں کہ جب دل چاہے آپ بے دھڑک اس طرح گھروں میں گھس کر اپنی من مانی کرتے رہیں۔''

وہ پرطیش انداز میں شمشیر خان سے مخاطب ہوئے تھے۔

''خوش قسمت ہو حیات خان! جو اتنا کچھ کہنے کے باوجود زندہ کھڑے ہو۔ ورنہ شمشیر خان کے آگے گردن اٹھانے والا دوسری سانس نہیں لے سکتا۔''

''مجھے میرے ہی گھر میں دھمکی مت دو خان! تم بھی یہاں زندہ اس لیے نظر آرہے ہو کہ میرا سکہ کھوٹا نکلا، ورنہ خدا کی قسم میں موت سے نہیں ڈرتا۔ ذلت کی زندگی پر عزت کی موت کو فوقیت دینا شریف انسان کے لیے سعادت ہے۔''

''انکل..... پلیز، آپ غلط مت سمجھیں۔ یہ یہاں کسی غلط مقصد سے نہیں آئے ہیں۔'' کائنات جو پردے کے پیچھے کھڑی ان کی گفتگو سن رہی تھی۔ بات حد سے بڑھتی دیکھ کر تیزی سے اندر داخل ہو کر حیات خان کے قریب جا کر عاجزی سے بولی۔

''تم؟ تم میرے سامنے مت آؤ، میرے وقار، میرے اعتماد کو تم نے ریزہ ریزہ کر ڈالا ہے۔ بہتر یہی ہوگا کہ تم میرے سامنے سے دفع ہو جاؤ۔''

''میں زیادہ باتیں سننے کا عادی نہیں ہوں حیات خان، تمہارے لیے بھی بہتر یہی ہوگا کہ میری بات سنو، میں تمہاری بھتیجی سے شادی کرنا چاہتا ہوں، ابھی اور اسی وقت اور تمہیں یہ بات اچھی طرح معلوم ہے جو میں کہتا ہوں وہ کر کے بھی دکھاتا ہوں، اگر تم نے روایتی پن دکھانے کی کوشش کی تو میں تمہاری لاش سے گزر کر بھی شادی کروں گا۔'' شمشیر خان نے سخت و مضبوط لہجے میں کہا۔

''شمشیر خان.....'' حیات خان کی جنونی وغصے سے بری حالت تھی۔

''انکل! میں بھی یہی چاہتی ہوں۔ پلیز، آپ انکار مت کیجیے گا۔'' کائنات نے بھی شرم و لحاظ بالائے طاق رکھ کر فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

''اگر میں انکار کر دوں تو.....؟'' حیات خان کے اندر ٹوٹ پھوٹ مچ گئی۔

''پھر میں کورٹ سے رجوع کروں گی۔ میں بالغ ہوں، عقل و شعور رکھتی ہوں۔ اپنی مرضی کا ساتھ سلیکٹ کرنے کا پورا حق ہے مجھے۔''

اس وقت وہ بالکل باغی و بدلحاظ ہو گئی تھی۔ ان کی محبت، چاہت، شفقت کو اس نے حقارت سے راہ میں پڑے پتھر کی طرح ٹھوکر ماری تھی۔

حیات خان صدمے اور افسوس کے مارے پھر کچھ نہ بول سکے۔ ان کی عزت نفس اور خودداری پر ایسی کاری ضرب لگی تھی کہ وہ اندر ہی اندر کچی دیوار کی مانند ڈھے گئے۔

☆☆☆

واپسی پر شام کے گلابی بہانے سمٹ کر رات کی پر اسرار تاریکی میں بدل گئے تھے۔ ہر سمت پھیلی برف ماحول میں عجیب سی اسرار یت پھیلا رہی تھی۔

طور خان گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا۔ پچھلی نشستوں پر اکاجان اور فتح خان کے ہمراہ وہ بیٹھی تھی۔ ہوش و حواس سے عاری، جسے وہ آج اپنے نام سے لے آیا تھا۔ بلکہ خرید لایا تھا۔

طور خان کے برابر میں وہ بظاہر آنکھیں موندے بیٹھا تھا۔ لیکن اس کے اندر بہت شور و غل مچا ہوا تھا۔ سبرینہ خان کو کھو کر اسے پایا تھا۔ جسے پا کر دل سے تمام خواہشوں کے گل مرجھا گئے تھے۔ چاہتوں کی تتلیاں بے رنگ ہو کر بدصورتی کا لبادہ اوڑھ چکی تھیں۔

منزل آج خود بخود سامنے آن کھڑی ہوئی تھی۔مگر شدتوں کی تمام راہیں مسدود ہو چکی تھیں۔

دل کے تمام تقاضے۔

تمناؤں کے جگنو چراغ کی مانند بجھ گئے تھے۔

اگر یہ سب اس طرح نہیں ہوتا، جس طرح ہوا ہے تو وہ بے حساب مسرور ہوتا۔

آج کی شب اس کی زیست کی مسرتوں اور شادمانیوں سے بھرپور یادگار شب ہوتی۔

''بچے! نیچے اترنا۔کن خیالوں میں گم ہو؟''

گلباز خان کی شوخ اور مسکراتی آواز اسے خیالوں کی دنیا سے باہر لائی۔

اس نے چونک کر خفیف انداز میں دیکھا۔فتح خان کے سہارے وہ گیٹ کے اندر پہنچ چکی تھی۔گلباز خان کی معنی خیز مسکراہٹ کے جواب میں اس کے لبوں پر مدھم سی خاصی بجھی ہوئی، سرگوارسی مسکراہٹ ابھر کر معدوم ہوئی تھی۔

''شاید میں سو گیا تھا۔''

''ا..... اچھا! جا کہاں رہے ہو؟'' اندر چلو، بی بی جان، بابا جانی اندر انتظار کر رہے ہوں گے۔'' وہ اسے آگے بڑھتے دیکھ کر استعجابیہ لہجے میں بولے۔

''اکا جان! بابا جانی کی خواہش میں نے پوری کر دی ہے اب مجھے پلیز روکیے گا مت۔میرا دل و دماغ اس وقت میرے اختیار سے باہر ہے۔'' اس کے لہجے کی یاسیت، لفظوں کی ٹوٹ پھوٹ، چہرے پر پھیلا حزن و ملال، سبز آنکھوں میں چمکتی نمی نے انہیں باور کروا دیا کہ وہ اس وقت سبریز خان کو پوری شدت سے یاد کر رہا ہے۔

''بہتر، لیکن جلدی آ جانا، یہ جو کچھ ہوا، عجلت و سادگی سے ہوا، مگر وہ لڑکی اب تمہاری ذمے داری و عزت ہے۔تمہیں اسے وہی مقام و عزت دینی ہوگی جو ہمارے ہاں شریک حیات کو دی جاتی ہے۔جو کچھ بھی ہوا اس میں اس کا کوئی قصور نہیں ہے۔'' گل باز خان نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے ملائمت و اپنائیت سے سمجھایا۔

''درست کہا آپ نے۔'' اس نے اپنی پلاسٹر چڑھی ٹانگ اور ہاتھ میں پکڑی اسٹک کو دیکھتے ہوئے بہت دھیمے سے کہا۔

''جلدی آ جانا۔'' گلباز خان اس کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے گیٹ کی طرف بڑھ گئے جبکہ وہ قبرستان کی سمت بڑھنے لگا۔

جس دلہن کو ارمانوں و چاؤ سے بیاہ کر لایا جاتا ہے۔

اس کا استقبال بھی بڑے جوش و خروش اور شاندار طریقے سے کیا جاتا ہے۔

وہ کسی ایسے جذبے کے ساتھ یہاں نہیں لائی گئی تھی۔

سو اس کا استقبال بھی گمبھیر خاموشی، تاریک سرد مہری نے کیا۔

نہ معلوم کب وہ اس کمرے میں پہنچائی گئی تھی جو بیش قیمت قالینوں، ریشمی بھاری پردوں اور اعلیٰ فرنیچر اور نادر ڈیکوریشن پیسز و پینٹنگ سے آراستہ بے حد خوبصورت تھا۔ اس کی نگاہوں نے لمحے بھر میں کمرے کا جائزہ لیا تھا۔

''چھوٹی دلہن! دلہن کو ہوش آ گیا ہے۔ بڑی دلہن کو بلاؤ، تا کہ وہ آ کر دلہن کا منہ میٹھا کروائیں۔ کوئی رسم نہیں ہوئی، ایک اس رسم کو تو کر لیں۔''

اس نے چونک کر دیکھا، سرخ و سپید نازک سے وجود والی وہ خاصی ضعیف خاتون اسے آنکھیں کھولتے دیکھ کر قریب بیٹھی لڑکی سے مخاطب ہوئی تھیں۔

''بچی! گھبراؤ نہیں۔ ہم تمہارے اپنے ہیں۔ منہ ہاتھ دھولو۔ بڑی بہو تمہارا منہ میٹھا کروا دیں تو کھانا کھانا، بھوک لگ رہی ہوگی۔''

بہت اپنائیت سے انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تھا۔

اس نے سر جھکا لیا۔ زخموں میں ٹیسیں پھر اٹھنے لگی تھیں۔

ڈھیروں آنسوؤں کی برسات اس کے دل میں ہونے لگی، ماں اور بہن سے جدائی کی شدت سے سلگنے لگی۔ کتنا کم...... از حد مختصر ساتھ تھا ان کا۔

''جب میں نے کہہ دیا میں اس ڈائن کی صورت دیکھنا نہیں چاہتی، جس نے میری بیٹی کی سیج پر قبضہ کیا ہے پھر بار بار کیوں مجھے پریشان کیا جا رہا ہے۔'' کمرے کے کھلے دروازے سے باہر کسی عورت کے چیخنے کی آواز آنے لگی۔

اس کے سوئے ہوئے حواس بیدار ہونے لگے۔ جبکہ وہ ہمدرد خاتون ایک دم پریشان سی ہو گئیں۔

''بھابی جان! آہستہ بولیں۔ اندر آواز جائے گی۔'' رات کے گمبھیر سناٹے میں التجائیہ انداز میں کہا گیا یہ فقرہ بھی اندر صاف سنا گیا۔

''ارے آواز جاتی ہے تو جائے۔ میں ڈرتی نہیں ہوں کسی سے اور نہ ہی پرواہ ہے مجھے رتی بھر بھی۔ واہ بھئی واہ، خوب صلہ ملا ہمیں۔''

وہ کڑک اور گرج دار آواز خاصی دیر تک سنائی دیتی رہی۔ اس کے حواس پوری طرح بیدار ہو چکے تھے۔ وہ لڑکی خاموشی سے اندر آ گئی۔

ورشا نے آنکھیں بند کر لیں، اسے یقین ہو گیا گل جاناں جیسی ہستی یہاں بھی موجود ہے اور نہ معلوم کن جابر و ظالم ہستیوں سے سامنا ہوگا؟

''میری عزت، وقعت، حیثیت کچھ بھی تو نہیں رہی۔

اب اس ظالم بھیڑیے کی مکاری تلے روندی گئی۔ کتنا گھٹیا اور رذیل پلان بنایا ہے۔ اس شیطان فطرت نے، پہلے اغوا، پھر ترس کی صورت میں شادی کا منصوبہ اب اپنی ضد اور ہٹ دھرمی کے بعد مجھ پر تسلط جمانے کی سعی کرے گا۔''

اس کے خیالوں کا سلسلہ ان معمر خاتون کی شفقت بھری آواز نے توڑا۔ جو اسے مٹھائی کھلانا چاہ رہی تھیں۔ لیکن وہ اس وقت جس غم و غصے اور اہانت کی آگ میں جل رہی تھی اس کے دھوئیں میں اسے کچھ بھی اچھا محسوس نہیں ہو رہا تھا۔

وہ لڑکی جسے چھوٹی بہو کے نام سے مخاطب کیا گیا تھا۔ اس نے بھی از حد اصرار کیا کہ وہ مٹھائی نہ سہی، وہاں موجود کھانے اور پھل کھا لے مگر وہ

اس وقت بھری ہوئی تھی۔ ان کی مشفق شکلیں، پرخلوص مسکراہٹیں، چاہ بھرے انداز سب بناوٹی اور دھوکہ لگ رہے تھے۔ اس نے کچھ بھی نہیں کھایا۔

''رہنے دیں بی بی جان! صارم خود آ کر کھلائے گا۔'' اس کی شوخ آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی تھی۔ اس کے اندر تنفر کی لہر دوڑ گئی تھی۔

''ٹھیک ہے لیکن یہ سوٹ اسے ضرور پہنا دینا اور یہ زیور بھی۔ آہ بڑے ارمان تھے میرے دل میں صارم کی دلہن کے لیے، اس کی بارات لے جانے کے مگر تقدیر دل کے ارمانوں کی کب پروا کرتی ہے؟ اسے جو کرنا ہوتا ہے وہ کر کے رہتی ہے۔ مجھے گلہ نہیں ہے کسی سے..... یہ بھی اللہ کا احسان ہے میں نے اپنی زندگی میں یہ چاند چہرہ دیکھ لیا۔ دل میں لگی سالوں پرانی آگ آج کچھ سرد ہوئی ہے۔ اللہ جوڑی سلامت رکھے۔ سدا خوش و خرم رہیں۔'' وہ اپنی نم آنکھیں صاف کرتی ہوئیں اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ ورشا آنکھیں بند کیے یوں ہی نیم دراز تھی۔ بی بی جان کے جانے کے بعد چھوٹی بھابی بہت بے تکلفی سے اس کے قریب بیٹھی تھیں اور اس کا ہاتھ پکڑ کر بولیں۔

''مجھے معلوم ہے، تم جاگ رہی ہو، دیکھو تم یہاں جیسے آئیں، جس طرح لائی گئیں، اس سے ہمیں کوئی سروکار نہیں ہے۔ ہمیں یہ خوشی ہے کہ تم صارم کی بیوی بن کر اس گھر میں آئی ہو اور صارم کے حوالے سے ہمیں اتنی ہی عزیز ہو جتنا وہ ہمیں ہے۔ اٹھو باتیں بعد میں ہوں گی، رات ہو گئی ہے۔ نہا کر یہ کپڑے بدلو، پھر میں تمہیں تیار کروں گی۔'' اس نے قریب بیٹھ کر دھیمے لہجے میں کہا۔

''میں صارم کی کزن بھی ہوں اور اس کے کزن کی بیوی بھی۔ یعنی میں اسکی پھوپھو کی بیٹی ہوں اور میرے شوہر اس کے چچا کے بیٹے ہیں۔ میرا نام رانی گل ہے۔ لیکن مجھے سب چھوٹے گل بھابو کہتے ہیں۔ تم بھی یہی کہنا، چلو اٹھو نا کپڑے بدلو، صارم آتا ہو گا۔ وہ بہت رومانٹک بندہ ہے۔ بنی سنوری بیوی پسند کرے گا وہ۔'' رانی گل نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھانا چاہا تو ہاتھ پر لگے زخموں سے اس کا ہاتھ ٹکرایا۔ ورشا کی سسکی نکل گئی۔

''پلیز، مجھے ڈسٹرب نہیں کریں۔'' اس نے ہاتھ چھڑاتے ہوئے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''اوہ، تم زخمی ہو، آہ، تمہارے تو دونوں ہاتھ زخمی ہیں۔'' اس نے آستین پلٹ کر دیکھا تو زخم کلائی اندر تک تھے۔

ورشا نے چادر مضبوطی سے لپیٹ لی تھی۔ مبادا شمشیر خان کی ٹھوکروں اور گل جاناں کے ہنٹروں سے ادھڑی ہوئی کھال اسے نظر آ جائے۔

''آپ کی بڑی مہربانی ہو گی، یہاں سے یہ سب ہٹا لیں اور مجھے سونے دیں۔'' اس نے بیڈ پر رکھے زیورات کے ڈبے اور بھاری بھر کم سوٹ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اس کے لہجے میں کچھ ایسی ہی قطعیت و سرد مہری تھی۔ رانی گل نے مزید کچھ نہیں کہا۔ زیورات اور سوٹ اٹھا کر ڈریسنگ روم میں رکھ کر کمرے سے نکل گئی۔ پھر پانچ منٹ بعد ہاتھ میں بھاپ اڑاتا مگ اور ٹیبلیٹ لیے داخل ہوئی۔ اس بار اس نے اس کی ایک بھی نہیں سنی زبردستی کافی کے ساتھ ٹیبلیٹ کھلائی تھی۔ تاکہ اس سے درد میں کچھ افاقہ ہو۔

☆☆☆

شام کے سائے پر

عکس پڑا تنہائی کا

یادوں کی پڑی پھوار

اور برس رہی بوند بوند

کبھی اندر تک دکھ برس گیا

کبھی خوشیوں کی پڑی پھوار

یہ یادیں ہی تو ہیں

جو رلاتی اور ہنساتی ہیں

اور یاد کراتی ہیں

قبرستان سے وہ واپس لوٹا تو بابا جانی کو بے چینی سے اپنا منتظر پایا۔

''صد شکر تم آ گئے ورنہ میں ابھی تمہیں ڈھونڈنے کے لیے نکلنے والا تھا۔ ایک ذمے داری، ایک فرض کا بوجھ اپنے کاندھے پر ڈالنے کے باوجود حقیقت سے فرار کہاں کی دانشمندی ہے بچے؟''

اس کے کمرے میں قدم رکھتے ہی وہ سخت فہمائشی لہجے میں گویا ہوئے۔

''بابا جانی! جو آپ چاہتے تھے، جو آپ کا حکم تھا، وہ میں نے مان کر آپ کے وقار کو بلند کیا ہے۔ حالانکہ یہ موقع بالکل بھی اس صورتحال کا موافق نہ تھا۔'' وہ ان کے قریب آ کر از حد سنجیدگی سے بولا تھا۔

''مجھے فخر ہے تم پر میرے بچے تم نے میرا اعتماد، میرا مان، میرا فخر بلند ترین کر ڈالا ہے۔ میری برسوں پرانی آرزو آج پوری ہوئی ہے۔''

بابا جانی نے اس کی پیشانی چوم کر پر مسرت لہجے میں کہا تو وہ تاسف اور حیرانگی سے انہیں دیکھ کر رہ گیا۔

''گستاخی معاف بابا جانی! ہم گھاٹے میں رہے ہیں۔ جیت ہماری نہیں، ان کی ہوئی ہے۔''

''کس طرح؟ وضاحت تو کرو۔'' وہ مبہم سا مسکرائے۔

''اوہ... اسرار یز خان کی جدائی وہ عظیم نقصان ہے، جس کی تلافی کبھی نہیں ہو سکتی۔'' اس نے بے حد رنجیدگی سے آہ بھر کر کہا۔ ''پھر بھی آپ نے اس کی موت بلکہ قتل کا بدلہ یا قصاص لینے کی بجائے اس قبیلے کی لڑکی کو اس خاندان کی عزت بنایا اور ان کی بھاری قیمت ادا کر کے، آپ مجھے بتائیں یہ دانشمندی ہے؟''

''ہاں، اس لیے جو میں نے ابھی کیا ہے وہ تم سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے اور نہ ہی ابھی وہ وقت آیا ہے کہ میں تمہیں سمجھاؤں، لیکن یہ بات ذہن سے نکال دینا کہ ہمیں شکست ہوئی ہے، دشمنوں کی بیٹی گھر آ گئی ہے اور یہ شکست نہیں فتح ہے۔''

''ہونہہ، جو جانور اور انسان میں تمیز نہیں رکھتا، ایسے آدمی سے کسی اچھائی و بہتری کی امید ہی عبث ہے۔ جس شخص نے سونے کے سکوں اور نوٹوں کی گڈیوں کی خاطر اپنی آن، عزت، غیرت، انا اور خودداری بیچ ڈالی ہو، ایسے گھٹیا اور زر پرست بندے سے کسی خیر کی توقع رکھنا فضول ہے۔ زیادہ پیسے کی ہوس میں جیسے کوئی لالچی اپنے پالتو جانور فروخت کر ڈالتا ہے اس طرح، اس بے حمیت شخص نے اپنی بیٹی کو فروخت کر ڈالا تھا...... میں ایسے شخص سے دوستی تو کجا دشمنی کرنا بھی غیرت اور مردانگی کے خلاف سمجھتا ہوں۔ باحمیت، بہادر اور خوددار دشمن ہو تو دشمنی کا بھی لطف آتا ہے۔ ایسے لالچی اور بدفطرت لوگوں سے تو میں ہاتھ ملانا بھی پسند نہیں کرتا۔''

''درست ہے۔ جو تمہارے دل میں آئے وہ کرو۔ مگر اس لڑکی کے ساتھ تم ایسا کوئی رویہ اختیار نہیں کرو گے جس میں اس کی دل شکنی اور ہتک کا کوئی پہلو نکلتا ہو، وہ لڑکی ہمیں عزیز ہو گئی ہے۔'' انہوں نے بارعب پرتحکم لہجے میں کہا۔

صارم نے کوئی جواب نہیں دیا۔ لیکن اس کے چہرے کے تاثرات سپاٹ تھے۔

''ہم جانتے ہیں بچے، تم یہ سب اتنی جلدی قبول نہیں کر پا رہے ہو، اور یہ کوئی انوکھی اور نہ تسلیم کرنے والی بات نہیں، یہ ایک معمولی سا حادثہ سمجھ لو کہ تم کل تک تنہا اور آزاد تھے، دوسرے فرد کی ذمے داری کا بوجھ تم پر نہیں تھا، مگر آج تم آزاد نہیں رہے، تم ذمے دار ہو گئے ہو۔ جو کہ ہر مرد کو ہونا پڑتا ہے۔ گھر چلانے کی ذمے داری اٹھانی پڑتی ہے۔ ہاں اس امر کا مجھے افسوس رہے گا کہ تمہارے ساتھ یہ سب بہت جلدی بازی میں ہوا، روایتی انداز، رسم و رواج سے مختلف ہے۔''

مجھے اس بات کا غم نہیں ہے۔ مجھے صرف سبریز خان کا دکھ ہے۔'' وہ ان کی بات قطع کر کے بھرائے لہجے میں بولا۔

''کب تک سوگ مناؤ گے؟ کیا چاہتے ہو؟ آج سبریز خان کی جدائی کا زخم نہیں بھرا کل، گلریز خان کی جدائی کا زخم دل پر کھاتے؟ اور پھر زخموں کا لامحدود سلسلہ چل نکلتا، جو شاید دونوں قبیلوں میں سے ایک کی بربادی پر ختم ہوتا۔''

انہوں نے اس کی نم آنکھوں کو اپنی چادر سے صاف کرتے ہوئے ملائمت سے سمجھایا۔

''جا کر آرام کرو، ایک ہفتہ بعد ولیمہ کریں گے۔ اور دل کے سارے ارمان اور خواہشیں پوری ہوں گی، جاؤ جا کر آرام کرو۔''

انہوں نے اس کے شانے تھپتھپاتے ہوئے محبت سے کہا اور اپنے کمرے کی سمت بڑھنے لگے۔ صارم کے چہرے پر چھائی افسردگی کو جان کر نظر انداز کیا تھا۔

''بابا جانی پلیز! جو کچھ آج ہوا، وہ آپ کی مرضی سے ہوا لیکن اب جو ہو گا اس میں میری بھی منشا ہو گی، فی الحال ایک ہفتہ یا ایک ماہ، میں کوئی خوشی منانے کی خواہش نہیں رکھتا۔ آپ پلیز اب خاموش رہیے گا۔'' اس نے مضبوط و اٹل لہجے میں کہا۔

''کیا اس حویلی کے در و دیوار کبھی مسرتوں کے رنگ نہیں دیکھیں گے؟ کیا اس آنگن میں موت کے نوحے پڑھے جاتے رہیں گے؟ ہم خوشیوں اور خواہشوں کی چاہ سے دستبردار ہو گئے ہیں؟''

''اگر آپ نے زبردستی کی بابا جانی تو میں گھر چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔'' اس کے انداز میں بیگانگی و ضد کا عنصر غالب تھا۔

اپنی بات کہہ کر وہ رکا نہیں، تیز تیز قدموں سے چلا گیا۔ شاہ افضل خان جو اس کی سرشت سے واقف تھے بخوبی محسوس کر رہے تھے کہ وہ اس وقت جذبات کے کس بحر اذیت میں غوطہ زن ہے۔ اس کی شخصیت کا بکھراپن، لہجے کا الجھاؤ، شکستہ چال سے ظاہر تھا وہ اس وقت ہیریز خان کی جدائی کے دکھ سے ٹوٹا بکھرا ہوا ہے۔ انہوں نے فیصلہ کیا وہ کچھ عرصے تک خاموشی اختیار رکھیں گے۔

 ☆☆☆

ایک دریا ہے سوچوں کا

ایک ندی سبھ یادوں کی

مجھے وحشتوں کے پانی سے

بغیر بھیگے نکلنا ہے

ایک صدیوں کی مسافت ہے

مجھے لہولہان جسم کی تھکن کو بھول کر

نئے منظروں کی تلاش میں نکلنا ہے

کہ کچھ وادیوں کی تلاش ہے

سات سمندر پار چلنا ہے

کیا پتہ پھر کہاں بھول جاؤں میں

مجھ کو کس جگہ پر رکنا ہے

بہت لمبا سفر ہے راستے ہیں اجنبی

ڈر ہے کہ بھٹک نہ جاؤں میں کہیں

"ارے نوشے میاں! ذرا تیز تیز قدموں سے آؤ یہ چیونٹی کی رفتار سے کیوں آ رہے ہو؟" رانی گل جو خاصی دیر سے اس کی آمد کی منتظر تھی۔ اسے سوچوں میں گم آہستہ آہستہ آتے دیکھ کر شوخی سے چہک کر بولی۔

"آپ کا خیال ہے مجھے اڑ کر آنا چاہیے؟" اب سوز چیلنج کرتا ہوا بولا۔

"ہاں..... تو کیوں نہیں کوئی انہونی نہیں ہوگی۔"

"آپ کے لیے بے شک نہیں ہوگی۔ کیونکہ لالا آپ کو لینے کے لیے تیرتے ہوئے گئے تھے۔ اس دن ابر رحمت کے تمام شاورز، نل، اسپیڈ سے کھل گئے تھے۔ سڑکیں بھی دریا بن گئی تھیں۔ لالا کو باراتیوں سمیت تیر کر جانا پڑا تھا۔"

"ہاہاہا..... تیر کر جانے کے باوجود ان کا حلیہ بہت شاندار اور بہتر تھا تم سے..... کم از کم حلیہ تو درست کرلو۔"

''بھابو جانی! مرد کا حلیہ نہیں جیب دیکھی جاتی ہے۔ سو ہماری جیب خاصی بھرپور، شاندار اور وزنی ہے۔ اس لیے برائے مہربانی فضول کی چوکیداری چھوڑیے اور جا کر آرام کیجیے۔''

وہ اسے اپنے کمرے کے دروازے پر ڈٹا دیکھ کر عاجزانہ انداز میں بولا۔

''ایسے ہی تھوڑی؟ پہلے کچھ جیب یہاں ہلکی کرو پھر اندر جاؤ گے۔'' رانی گل نے اپنی پھیلی ہوئی ہتھیلی کی طرف اشارہ کرکے کہا۔

''یہ لیجیے اور پلیز راستہ چھوڑ دیجیے۔'' اس نے جیب سے والٹ نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے کہا۔

''او..... ہو! اتنی جلدی ہے اندر جانے کی؟''

''بھابو! سارے دن کا تھکا ہوا ہوں، کچھ خیال کیجیے۔''

''اچھا، جاؤ یاد کرو گے میری سخاوت، لیکن میری بات سنو۔'' اس نے چند بڑے نوٹ والٹ سے نکال کر والٹ اسے واپس کرتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔

''وہ شدید زخمی ہے۔ اسے ڈسٹرب نہیں کرنا۔ اس نے کچھ کھایا بھی نہیں ہے۔ خیال رکھنا۔''

''جی بہتر کوئی اور حکم؟'' اس کے لہجے میں فطری شوخی عود کر آئی۔

''میں نے اسے نیند کی ٹیبلیٹ دیدی ہے تاکہ اس کے زخموں کی تکلیف کچھ کم ہو۔ اسے تب تک وہ خود بیدار نہ ہو سوتے رہنے دینا۔''

''واہ! بہت خوب! زخموں پر ڈریسنگ کی جاتی ہے یا سلایا جاتا ہے؟'' وہ بے ساختہ مسکرا اٹھا۔

''ڈریسنگ والا کام تم کرتے ہوئے اچھے لگو گے۔'' جواباً انہوں نے اس بے ساختگی سے کہا تھا کہ وہ لمحے بھر کو جھینپ کر رہ گیا۔

''سویرے آئی تھیں؟'' یکلخت اس کے لہجے میں سنجیدگی عود کر آئی۔

''نہیں بی بی جان نے بلوایا تھا۔ مگر تم جانتے ہو ان کی عادت، زرگون بھی اس وقت پاگل بنی ہوئی تھی۔ جب سے تم گئے تھے، اسے دیکھ کر بھابی کا مزاج مزید بگڑا ہوا تھا۔ گھر میں جو اس وقت اس قدر سکون پھیلا ہوا ہے یہ سب تمہارے لالا کی چالاکی کی وجہ سے ہے۔ وہ جانتے تھے کہ یہ ماں بیٹی ضرور کوئی نہ کوئی فساد کھڑا کریں گی۔ اس لیے ان کے کہنے پر میں نے گاجر کے حلوے میں نیند کی گولیاں ڈال کر انہیں کھلا دی ہیں۔''

''ایسا کب تک چل سکتا ہے؟ وہ غلط فہمی کا شکار رہی ہیں میری طرف سے۔''

''کل کی فکر میں آج کیوں برباد کر رہے ہو، جاؤ شب بخیر۔''

وہ مسکراتی ہوئی وہاں سے چلی گئیں اور وہ دروازہ کھول کر اندر آ گیا۔

کمرے میں نیلگوں خواب ناک دھیما اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔

ہیٹر آن ہونے کے باعث لطیف سی گرماہٹ میں تازہ رکھے گلاب کے پھولوں کی مہکار سے فضا میں ایک انوکھی سرشار کر دینے والی کیف آور نشاط آمیز کیفیت تھی۔ جو خود سے بیگانہ و رسیے خود کر ڈالے۔

اس نے طویل سانس لے کر مہکاروں کو اپنے اندر جذب کیا۔ پھر حسب عادت دروازہ لاک کرنے کے بعد سینڈل سے پیروں کو آزاد کیا۔ جیکٹ اتار کر صوفے پر اچھالی۔ بالوں میں ہاتھ پھیرتا ہوا اپنے کمرے میں اچانک در آنے والی اس تبدیلی کو بغور دیکھنے لگا۔ جس نے آ کر اس کے بیڈ روم پر قبضہ کر ڈالا تھا۔

نیلے ریشمی بیڈ کور پر گلابی کمبل میں سر تا پا دراز وہ بے خبر سو رہی تھی۔

وہ خود سر د مغرور حسینہ جس نے اپنے سحر طراز حسن کی تجلیوں سے اسے خاکستر کیا تھا۔ وہی دہکتے رخساروں اور مہکتے گیسوؤں والی اپسرا، جس کے بے تحاشہ حسن نے اسے ایک ہی نظر میں گھائل کر ڈالا تھا۔ جس نے قدم قدم پر اسے تڑپایا اور جلایا تھا۔ اس کی چاہت، جذبوں، سچے عشق کی بار بار توہین کی تھی۔

اس کے پیار کو ٹھوکر ماری تھی۔ ہر گام پر ٹھکرایا تھا۔

اب وہ مکمل طور پر اس کی تھی۔

اس کی ذاتی ملکیت۔

اس کی زر خرید ہستی۔

وہ اسے اب چھو سکتا تھا، اپنے عشق کی شدتوں، وحشتوں کا احساس دلا سکتا تھا۔

اب وہ اس کی مکمل دسترس میں تھی۔

اس کی قربتیں وہ اپنے نام وقف کروا چکا تھا۔

لیکن..... وہ اب ملی بھی تو جذبے برف بن گئے تھے۔

خواہشوں کے چراغوں کی راکھ فضا میں بکھر کر گم ہو چکی تھی۔

آرزوؤں کے تمام کنول مرجھا کر کیچڑ بن گئے تھے۔

وہ نائٹ سوٹ بدل کر ڈریسنگ روم سے باہر آیا تو اس نے نیند میں کروٹ بدلی تھی۔ جس سے اس کا گلاب چہرہ کمبل سے باہر آیا تھا۔ اس کے سرخ رخساروں سے جھلکتی زردیاں، بند آنکھوں پر سایہ فگن دراز پلکوں کی سیاہ رنگت خاصی نمایاں تھی۔ اونچی ستواں خوبصورت سی ناک پر کسی چوٹ سے پیدا ہونے والا نیل تھا۔ گلابی ہونٹوں سے نیچے گہرے زخم تھے، جیسے کسی جوتے کی نوک گڑھ کر رہ گئی ہو۔ بائیں رخسار اور پیشانی پر بھی ایسے ہی زخموں سے سرخی مائل نشانات تھے۔

جائزہ لینے کے بعد اس نے اس انداز میں شانے اچکائے جیسے اسے اس کی کوئی پروا نہ ہو۔ اسٹک وہ بیڈ کے سہارے کھڑی کر کے لیٹ گیا۔ کمبل کا ایک حصہ اس نے خود پر ڈالا تھا۔ بے اختیار اس کا شانہ ورشا کے بازو سے ٹکرایا تھا۔ نہ معلوم اس کا شانہ ٹکرانے سے ذرا سی تکلف کا احساس تھا یا اس کے مردانہ پر حدت لمس کی حدت اس کی خود آنکھ کھل گئی تھی اور نگاہیں سیدھی از حد قریب دراز صارم کی سرخ و سرد نگاہوں سے ٹکرائی تھیں۔

ایک لمحہ لگا تھا اسے نیند سے دامن چھڑانے میں۔

''تم!'' وہ اس طرح بدک کر پیچھے ہوئی جیسے ہو انسان نہیں کسی موذی جانور کے پہلو میں ہو۔''

ہاں میں۔ اتنی پریشان کیوں ہو رہی ہو؟ نکاح نامے پر سائن کرتے وقت میرا نام نہیں سنا تھا؟'' اس نے استہزائیہ انداز میں جواب دیا تھا۔'' جا کہاں رہی ہو؟ میرے بیڈ پر تسلط قائم کر کے مجھ سے دور بھاگ رہی ہو۔''

اس نے بیڈ سے اترتی درشا کا بازو پکڑ کر کھینچا تھا۔ درد کی شدت برداشت کرتی وہ بے توازن ہو کر اس پر گری تھی۔ مستزاد اس نے بازو کا گھیرا ڈال کر اسے بے بس کر ڈالا۔

''چھوڑ دو مجھے، نفرت ہے مجھے تم سے...... شدید نفرت۔''

''میں نے بھی کسی محبت کے جذبے کے تحت تمہیں قبول نہیں کیا ہے۔''

صارم دور ہوتا ہوا غصے سے گویا ہوا تھا۔

''محبت...... تم جیسے لوگ ایسے جذبوں کی مہک سے بھی نا آشنا رہتے ہیں، حیت کرنے والوں کو مرنا پڑتا ہے، جلنا پڑتا ہے پروانوں کی طرح......''

''پروانوں کو دیکھتی ہو، شمع کو نہیں...... جو خود بھی قطرہ قطرہ جلتی ہے، پگھلتی ہے یو نو...... شمع جلتی ہی پروانے کے لیے ہے۔''

اس کا لہجہ بے حد ٹھوس و جذبات سے عاری تھا وہ یونیورسٹی والے شوخ و کھلنڈرے صارم سے بالکل مختلف تھا سنجیدگی و سنگدلی رویے میں موجود تھی۔

''اینی ویز''...... نہ تم شمع ہو اور نہ میں پروانہ، جو کچھ بھی ہوا جس طرح ہمارا تعلق قائم ہوا اس میں سراسر بابا جانی کی حکمت عملی ہے اور یہ میری سرشت میں موجود نہیں ہے کہ میں بابا جانی کی کسی خواہش و بی بی جان کے کسی حکم سے سرتابی کر جاؤں...... تم میرے سے منسوب یہاں موجود ہو...... یہ سب اُن کی کاوش ہے اس میں میرا کوئی ارادہ و تمنا شامل نہیں ہے۔''

''میں کیسے یقین کر لوں، تم نے مجھے حاصل کرنے کے لیے پہلے مجھے اغوا کروایا پھر اپنے فریب پر پردہ ڈالنے کے لیے ہمدردی کا ڈھونگ رچایا اور اب بہادری دکھانے......''

''میری سب سے بڑی بہادری یہ ہے کہ میں تمہیں فتح کر کے لے آیا ہوں۔ مجھے تمہاری طلب نہیں ہے۔ تم جیسی دھوکے باز، بے حس لڑکی قربتوں کے حسین لمحات کی ساتھی نہیں بن سکتی۔ سمجھیں تم؟ تم اس گھمنڈ میں رہنا کہ میں نفس کے ہی بکر ورلمحے کی گرفت میں آکر میں تم سے اظہار محبت کروں گا۔

اس کا یہ روپ اس قدر بے لچک، ٹھوس اور مضبوط تھا کہ درشا ہکا بکا اس کی طرف دیکھتی رہ گئی۔

''میری باتیں کان کھول کر سن لو آج سے تمہارا شہباز خان سے، اس سے وابستہ ہر رشتے سے زندگی بھر کے لیے ناتا ٹوٹ چکا ہے۔ آج سے تم ان کے لیے مرگئی اور وہ لوگ تمہارے لیے، کبھی غلطی سے وہاں سے کوئی تعلق تم نے دکھایا تو دیکھ لینا، تمہارا کیا انجام کروں گا۔ یہاں بابا

جاتی ہیں، بی بی جان ہیں، ان کی خدمت تمہیں کرنی ہے یہاں رہنے والے سب لوگوں سے تمہارا رویہ بہترین ہونا چاہیے۔ اگر اپنی زبان کی سلامتی چاہتی ہو تو اس کا استعمال برائے نام ہی کرو تو تمہارے لیے بہتر ہے ورنہ......"

ساری ہدایات دے کر وہ ٹیبل لیمپ آف کر کے کروٹ بدل کر لیٹ گیا۔

اس کے اندر خودداری وانا کی نہ بجھنے والی آگ جل اٹھی۔

صارم کے چتک آمیز جملے، توہین وذلت بھرا سلوک مستزاد اس پر یہ احساس کہ وہ خریدی گئی تھی۔ کسی جانور یا بے جان اشیاء کی طرح۔ اس احساس نے اسے بالکل ہی حقیر و بے وقعت کر ڈالا تھا۔ اس کی نگاہ میں زخموں سے زیادہ تکلیف اس کے اندر احساس کے زخموں پر ہو رہی تھی۔

انسان کتنا بھی حوصلہ مند بن جائے۔

وہ تقدیر کے وار سے نہیں بچ سکتا۔

بھاگتی، دوڑتی، سیاعتوں کو نہیں پکڑ سکتا۔ یہیں آ کر انسان بے بس ہو جاتا ہے۔ ایسا ہی ان کے ساتھ ہوا تھا۔ اس نے جس شخص سے بے حد نفرت کی تھی، آج اس کے نام سے "منسوب" اس کے بیڈ روم میں اس کے قریب بیٹھی گھور اندھیرے میں اپنے اندر بڑھتی ہوئی آگ سے نبرد آزما تھی۔ صارم کی نگاہوں میں اس سے وابستہ لوگوں کی نگاہوں میں اس کا کیا مقام ہوگا؟ سوچ رہی تھی۔

صارم نے لفظوں کے خنجر سے اس کی انا و وقار کو مجروح کر ڈالا تھا۔

اس کے گھر والے بھی اسے کوئی اچھا معتبر مقام کیوں دیں گے؟

"ورشا! قبل اس کے کہ ذلت و تحقیر بھری صبح طلوع ہو اپنے آپ کو فنا کر ڈالو، مٹا دو خود کو، تم اب خود مختار نہیں خریدی ہوئی کنیز ہو۔"

وہ خود سے مخاطب ہوئی تھی۔ اور آہستہ آہستہ بیڈ سے نیچے اترنے لگی۔ زخموں سے اٹھنے والی ٹیسوں کی وہ عادی ہو گئی تھی یا خود کو اس نے پتھر کر لیا تھا۔ کمرے میں مہکا مہکا اندھیرا تھا۔ وہ شاید مکمل تاریکی میں سونے کا عادی تھا اس لیے ٹیبل لیمپ بھی آف کر کے سویا تھا۔

اس کی آنکھیں اندھیرے سے مانوس ہو گئی تھیں اس لیے اسے اب اندھیرے میں بھی دھندلا دھندلا نظر آنے لگا تھا۔

وہ غم وغصے، انا کی ایسی آگ میں جل رہی تھی کہ سوچنے سمجھنے کی سب حسیں گویا مفلوج ہو کر رہ گئی تھیں۔

وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی آتش دان کی طرف بڑھ رہی تھی۔ جہاں الیکٹرک ہیٹر رکھا ہوا تھا۔ دبیز قالین کے باعث اس کے قدموں کی آہٹیں بھی نہیں ابھری تھیں۔ اس نے خاموشی سے ہیٹر آف کر کے ہولڈر سے اس کا پلگ نکالا۔ چند لمحے کھڑی وہ ساکت نگاہوں سے الیکٹرک بورڈ کو دیکھتی رہی۔ موت کا فیصلہ کر لیا تھا۔ آخری وقت میں اپنے تو یاد آتے ہیں۔

اس کی نگاہوں میں بھی وہ چند مہربان چہرے گھوم رہے تھے جن سے زندگی میں واسطہ رہا تھا اور جو اب ہمیشہ کے لیے اس سے چھوٹ رہے تھے۔ بچھڑ رہے تھے۔ بے تحاشہ بہتے آنسوؤں کے درمیان اس نے ہولڈر کا بٹن آن کر کے دونوں انگلیاں سوراخوں کی طرف بڑھا دی تھی۔

دوسرے لمحے اس کے جسم کو زوردار جھٹکا لگا تھا۔ اس کی دردناک چیخ خاموشی کو چیرتی تاریک ماحول میں گونج اٹھی۔

☆☆☆

کیا خبر اس کے تعاقب میں ہوں کتنی سوچیں

اپنا انداز تو اوروں سے جدا رکھنا تھا

چاندنی بند کواڑوں میں کہاں اترے گی

اک دریچہ تو بھرے گھر میں کھلا رکھنا تھا

''اسٹوپڈ.....ایڈیٹ، خودکشی کرنے چلی تھیں لیکن یاد رکھو میری نگاہیں ہر لمحہ، ہر ساعت، ہر گھڑی تمہاری نگرانی کرتی رہیں گی۔ پہلی اور آخری بار معاف کر رہا ہوں۔ آئندہ ایسی کوئی حماقت کرنے سے پہلے ہزار بار سوچ لینا۔''

صارم جو اس سے ایسی ہی کسی حرکت کی توقع رکھتا تھا، وہ بیڈ پر آنکھوں پر ہاتھ رکھے اس کی ایک ایک حرکت پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ اور آخر کار اس نے اس کی توقع کے مطابق خودکشی کا اذیت ناک پروگرام ترتیب دے ڈالا تھا۔ اگر وہ فوراً ہی دبے قدموں سے چل کر اس تک پہنچ کر عین موقع پر اسے کھینچ کر دور نہ اچھال دیتا تو شاید وہ شکست کھا بیٹھتا۔

''میں اپنی مرضی سے جی نہیں سکتی، اپنی مرضی سے مرنے کا اختیار مت چھینو مجھ سے۔''

صارم کے اچانک اچھالنے اور اپنی ناکامی کے شدید احساس نے اسے روہانسا کر ڈالا تھا۔

''تمہارے سارے اختیارات میں خرید چکا ہوں، تمہاری ایک ایک سانس کو میں خرید چکا ہوں لہٰذا آئندہ خیال رکھنا۔''

اس نے اس کی بھیگی بھیگی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے تمسخرانہ لہجے میں کہا۔

☆☆☆

روتے، سسکتے رات کے آخری پہر سخاویہ کی آنکھ لگی تھی۔

ورشا کا ملنا، پھر یوں بچھڑنا، کچھ اس طرح ہوا تھا کہ دل کی بے قراریاں، روح کی بے چینیاں مضطرب تھیں۔ بالکل اس طرح جیسے کسی بھیانک خواب کی تعبیر بھی بھیانک ہو۔ جیسے کوئی جسم اذیت سہہ کر بھی روح کا ساتھ نہ چھوڑے۔

اس کا جدا ہونا بھی کچھ ایسی ہی اذیت و کرب سے دوچار کر گیا تھا کہ زندگی و موت بے معنی ہو کر رہ گئی تھی۔

''سخاویہ! اٹھو، فجر کی نماز کا وقت نکلا جا رہا ہے۔ جلدی سے وضو کر کے نماز ادا کرو، ورنہ قضا ہو جائے گی جو اچھی بات نہیں ہے۔'' ادے کی رنجیدہ لیکن کچھ حد تک پرسکون آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی تو وہ پھر پور انداز میں چونک کر تیزی سے اٹھ بیٹھی تھی۔

دائیں جانب بیڈ سے دور اپنی مخصوص چوکی پر، نماز سے فارغ ہو کر قرآن پاک کی تلاوت کی تیاری کرتی ہوئی ماں کو قدرے بہتر حالت میں دیکھ کر اسے خوشگوار سی حیرت ہوئی تھی۔ کل تک وہ بغیر سہارے کے ایک قدم بھی نہیں بڑھا سکتی تھی۔

''ادے..... ادے! آپ ٹھیک ہو گئیں؟ آج خود آپ نے بغیر سہارے کے وضو کیا، نماز ادا کی، مجھے بہت خوشی ہو رہی ہے۔ بہت خوشی۔''

مسرت و دکھ کے ملے جلے تاثر پر وہ ان کے گھٹنوں پر سر رکھ کر رو دی۔

''اولاد کے دکھ سے بڑا دکھ کوئی نہیں ہوتا ماں کے لیے، اولاد کے حوالے سے ملنے والی طمانیت آسودگی و قرار کے مقابل کسی کا پلڑا بھاری نہیں ہو سکتا، ورشا کی طرف سے ملنے والی پریشانیوں نے مجھے بیمار کر ڈالا تھا۔ اس کی جانب سے اب میں بے فکر ہوں، تو رات بھر میں تندرست ہو گئی ہوں۔ اولاد سے وابستہ رشتے بھی اہمیتوں سے واقف کرواتے ہیں۔'' سجادیہ کے آنسو صاف کرتے ہوئے انہوں نے دلار سے کہا۔

''آپ، ورشا کی طرف سے مطمئن کیوں ہیں؟ جبکہ مجھے رات بھر اس کے خیال سے نیند نہیں آئی کہ نہ معلوم وہاں اس کے ساتھ کیا سلوک ہو گا؟ وہ لوگ ایک قاتل کی بہن کو کس طرح برداشت کر سکیں گے؟''

''وہاں خلوص اور مروت کی فصل اگتی ہے۔ درگزر، فراخ دلی، بڑے ظرف و بلند حوصلے رکھنے والے لوگ ہیں وہاں، جو دشمن کو بھی گلے لگانا فخر سمجھتے ہیں۔ سچی محبتیں زندہ ہیں وہاں، وہ لوگ میری بچی کو محبت دیں گے۔ مجھے بھروسہ ہے۔ گل جاناں یا تمہارے بابا کے آگے یہ بات نہ نکلے کہ شہروز نے ہمیں سب بتایا ہے جو حقیقت ہے۔''

''جی میں دھیان رکھوں گی لیکن مجھے خوف محسوس ہو رہا ہے یہ سوچ کر کہ جب بڑے لالا اور شہروز لالا کو ورشا کا معلوم ہو گا تو پھر کیا ہو گا؟''

''میں سمجھاؤں گی انہیں، ماں باپ سے بدتمیزی و گستاخی گناہ ہوتی ہے، کیوں ہماری خاطر وہ اپنی عاقبت خراب کریں۔ میرے اور میری بیٹیوں کے نصیب میں جو لکھا ہے وہ تو ہر حال میں پورا ہو کر رہے گا۔ کیوں سوتیلے رشتوں کی خاطر اپنے دلوں میں فرق ڈالیں۔ جو نصیب میں لکھا ہوتا ہے وہ ہو کر رہتا ہے۔''

☆☆☆

دروازہ نہ معلوم کب سے پیٹا جا رہا تھا۔ نیند سے بوجھل آنکھیں اس نے بمشکل کھول کر اس نامانوس شور کو سنا تھا۔ جس نے گہری نیند سے اسے بیدار کر ڈالا تھا۔

ورشا نے گھبرا کر اس کی طرف دیکھا تھا جو اس سے کچھ فاصلے پر بے خبر سو رہا تھا۔ اتنی پرسکون و گہری نیند کہ باہر سے بجتے دروازے کا بے تحاشہ شور بھی اس کی نیند میں کوئی خلل پیدا نہ کر سکا تھا۔ دوسری جانب جو کوئی بھی تھا وہ دروازہ نہ کھلنے کی صورت میں دروازہ توڑ ڈالنے کا تہیہ کر چکا تھا۔ یعنی دونوں جانب ضد و ہٹ دھرمی تھی۔ وہ کشمکش و پیچ میں مبتلا تھی کبھی دروازہ دیکھتی اور کبھی صارم کی گہری نیند کو۔ خود اٹھ کر دروازہ کھولنے میں وہ جھجک محسوس کر رہی تھی۔

''سنیں؟ باہر کوئی ہے؟'' باہر سے بڑھتے شور سے گھبرا کر اس نے اسے متوجہ کرنا چاہا مگر اس پر مطلق اثر نہ ہوا۔

''اٹھیں نا، باہر کوئی ہے۔'' اس نے ہمت کر کے اس کا بازو زور سے جھنجھوڑا۔

''کیا ہے؟ سونے دو یار!'' اس نے بند آنکھوں سے جواب دیا۔

''باہر کوئی ہے۔'' اس کے بے پروائی سے کروٹ بدلتے دیکھ کر وہ شاکی ہو کر بولی۔

''جو کوئی بھی ہے، بور ہو کر چلا جائے گا اگر تمہیں ہمدردی محسوس ہو رہی ہے تو خود اٹھ کر دروازہ کھول دو۔ مجھے سونے دو۔'' اس نے سبے

پرواانداز میں کہتے ہوئے کمبل منہ تک تان لیا۔

''مجھے کیوں تمہارے گھر والوں سے ہمدردی ہونے لگی۔ ہونہہ! میری طرف سے دستک دینے والا مر ہی کیوں نہ جائے۔ میں کیوں دروازہ کھولوں؟'' اس نے کبیدگی سے سوچا اور کانوں میں انگلیاں ڈال کر بیٹھ گئی۔

کچھ دیر تک دروازے پر زور دار توڑ دستک ہوتی رہی، آخر کار باہر والا ڈھیٹ اندر والے ''ڈھیٹ'' سے شکست کھا کر چلا گیا تھا۔ شور ختم ہوتے ہی کمرے میں چھایا سکون وحدت اسے بھلا محسوس ہوا۔ کانوں سے انگلیاں نکال کر وہ کچھ دیر کسی بے معنی سی سوچ میں گم رہی۔ رات میں صارم نے اسے ٹیبلٹس کھلائی تھیں۔ جس سے اسے اب اپنا آپ بہتر لگ رہا تھا۔ زخموں میں ٹیسیں و تکلیف بالکل محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ سر کا بھاری پن بھی غائب تھا۔ اس نے مزید لیٹنے کا ارادہ ترک کر کے باتھ کا رخ کیا تھا۔

چہرہ دھونے کے بعد اس نے جیسے ہی آستین فولڈ کی، اس کی نگاہ ڈریسنگ پر پڑی یکلم ہی اس کے اندر ہلچل سی مچ گئی۔ رات کو اس نے اس کے زخموں پر ڈریسنگ کرنے کے لیے کہا تو اس نے سختی سے انکار کر دیا تھا۔

اس نے دھک دھک کرتے دل کے ساتھ کانپتے ہاتھوں سے اپنے زخموں کا معائنہ کیا اور ہر زخم پر نفاست و مہارت سے کی گئی ڈریسنگ دیکھ کر وہ لمحے بھر کو سن ہو کر رہ گئی۔ اندر کہیں حشر برپا ہو کر رہ گیا تھا۔

ورشا گویا آگ میں کھولتی ہوئی باتھ روم سے باہر آئی تھی۔

جسے وہ کمبل میں سرتاپا دراز چھوڑ کر گئی تھی وہ اس کی جانب پشت کیے انٹر کام پر خاصی ناگواری سے کسی سے مخاطب تھا۔ وہ رک کر اس کی پشت گھورنے لگی۔

''میں نے آپ سے کہا بھی تھا، جلد نہیں اٹھایئے گا پھر بھی آپ نے نیند خراب کروا دی ہے۔ سمجھ گیا تھا، مورے سے بولیں، سمجھائیں اسے میں ایسی فضول حرکتیں قطعی برداشت نہیں کروں گا۔'' بہت خراب موڈ کے ساتھ اس نے انٹر کام آف کیا تھا۔ ''خیریت؟ تم کیوں اسٹیچو بنی کھڑی ہو؟'' رخ پھیرنے پر اسے دیکھ کر وہ بولا۔

''میں... میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی تم! اتنی جلدی اپنی اصلیت ظاہر کر دو گے۔ تمہارے قول و فعل میں اتنا تضاد ہو گا؟''

اس کے لہجے، آنکھوں سے شرارے نکل رہے تھے۔ صارم دم بخود رہ گیا۔

''میں سیدھا اور کھرا بندہ ہوں۔ سیدھی و کھری بات کہتا ہوں اور سننا پسند کرتا ہوں، وضاحت کرو، سیدھے طریقے سے کیا ہوا ہے؟''

وہ اپنی طرز سے لیٹا ہوا بے تاثر انداز میں گویا ہوا تھا۔

اوہ گاڈ! اپنے منہ سے کس طرح میں روبرو وہ بات کہہ سکتی ہوں؟ کیا کہوں؟ کس طرح اپنی بے حجابی کا حساب لوں؟ اپنے احساسات کو اظہار گویائی کی طاقت کس طرح دوں؟

''کیا ہوا؟ مجھ پر کیا فرد جرم عائد کرنے کا پلان بنا رہی ہو؟'' اسے شش و پنج میں مبتلا دیکھ کر وہ چڑانے والے لہجے میں بولا۔

"تم..... تمہیں میری قربت نہیں چاہیے تھی؟ تم مجھے اس قابل نہیں سمجھتے تو پھر..... پھر کیوں مجھے ٹیبلٹ کھلا کر میری مدہوشی سے فائدہ اٹھایا اگر....."

"شٹ اپ، تم حد سے گزر رہی ہو۔"

جواباً وہ بھی گرج اٹھا تھا۔ تیزی سے گردش کرتے خون سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

"تم نے ہمت کیسے کی میرے زخموں پر مرہم رکھنے کی"

"رسی جل گئی، بل نہیں گیا۔ تم اس بات پر اکڑ دکھا رہی ہو، بلکہ الزام لگا رہی ہو میں نے تمہارے زخموں پر ڈریسنگ کر دی، اس لیے مجھے لوز کریکٹر سمجھ رہی ہو؟"

"کیا حق تھا آپ کو میری بے خبری میں ڈریسنگ کرنے کا؟"

"حق؟ اب سارے حق میرے پاس منتقل ہو چکے ہیں تمہارے، یہ بات کتنے دن میں ازبر کرو گی تم۔ تمہارا بگڑا مزاج اور تیکھے جتون دیکھ کر تو مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو رہا ہے۔ مجھے تمہارے زخموں پر مرہم لگانے کے بجائے نمک چھڑکنا چاہیے تھا۔ تم کسی ہمدردی کی مستحق نہیں ہو۔"

وہ چند لمحے اس کے چہرے کو خشمگیں نگاہوں سے گھورتا رہا۔

"کسی خوش گمانی میں نہیں رہنا۔" وہ اٹھ کر اسکے مقابل چلا آیا تھا۔ "مذہبی، معاشرتی، اخلاقی سب تقاضے نبھا کر تمہیں یہاں لایا ہوں۔ کوئی چور راستہ نہیں اپنایا ہے میں نے، جو چوری سے تمہیں حاصل کروں گا۔"

اس کے لہجے میں، آنکھوں میں نہ معلوم کیسی وحشت تھی کہ وہ نگاہ نہ اٹھا سکی۔

صارم کچھ دیر اسے گھورنے کے بعد باتھ کی طرف بڑھ گیا۔

وہ چادر میں لپٹی صوفے پر بیٹھ گئی۔

زندگی عجیب موڑ پر آ کر ساکت محسوس ہو رہی تھی۔ بھلا ایسی بھی کوئی زندگی جیتا ہے جسے اپنے آپ پر کوئی اختیار، کوئی مرضی کا حق نہ ہو؟

کتنی سرعت سے وقت گزرتا ہے اور انسان کو لمحوں میں کیا سے کیا بنا ڈالتا ہے۔ کل تک وہ جس شخص کی موت کی دعائیں مانگ رہی تھی، آج اسی کے نام سے منسوب اس کی خوابگاہ میں بیٹھی تھی۔

انسان جس راہ سے فرار چاہتا ہے، وہی راہ اس کے لیے وقف کر دی جاتی ہے۔ اس پر چلتے چلتے پاؤں لڑکھڑائیں یا جسم زخم زخم ہو جائے گا اس امر سے تقدیر کو کوئی دلچسپی و تشویش نہیں ہوتی۔

روزی خان اور اس کی بیوی نہ معلوم کیسے ہوں گے؟ شمشیر لالا نے انہیں زندہ چھوڑا بھی ہوگا یا، مجھے پناہ دینے کی سزا میں ابدی نیند سلا دیا ہوگا۔ کتنے مخلص و بے غرض محبت کرنے والے لوگ ہیں وہ۔ جنہوں نے بغیر کسی لالچ و غرض کے مجھے گھر میں پناہ دی۔ بیٹی کی طرح خیال رکھا، محبت دی۔ شاید دنیا ایسے ہی لوگوں کی وجہ سے قائم ہے۔ ورنہ شیطان صفت و مطلب پرست و خود غرض، ریاکاروں سے جہان بھرا پڑا ہے۔

ورشا سوچوں میں گم تھی، صارم کو باتھ روم سے برآمد ہوتے دیکھ کر وہ سنبھل کر بیٹھ گئی۔ دائیں ہاتھ میں اسٹک، بائیں ہاتھ سے ٹاول سے گیلے بالوں کو رگڑتا ہوا وہ سیٹی پر کوئی شوخ دھن گنگناتا ہوا آ کر اس کے نزدیک بیٹھ گیا۔

اس کے باتھ گاؤن سے نکلتی کلون کی مہک نے فوراً ہی اسے احاطے میں لے لیا تھا۔ شاید کئی دنوں بعد اس نے شیو کیا تھا جس سے اس کا چہرہ بہت وجیہہ و تر و تازہ لگ رہا تھا۔ آنکھوں میں وہی البلا سی چمک تھی، چہرے پر جیت کا نشہ سرخی بن کر پھیلا ہوا تھا۔ سرخی مائل ہونٹوں پر چھائی مسکراہٹ میں طاقت و گھمنڈ کا احساس نمایاں تھا۔

''کیا نامحرموں کی طرح چوری چوری دیکھ رہی ہو؟ شوہر ہوں تمہارا آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھو۔'' وہ ایک نمبر کا کایاں شخص تھا، اس کی نگاہ محسوس کر چکے گویا ہوا۔ وہ کچھ نہیں بولی اس کی طرف سے رخ پھیر کر بیٹھ گئی۔

نفس کو آنچ پہ اور وہ بھی عمر بھر رکھنا
بڑا محال ہے ہستی کو معتبر رکھنا.....

صارم نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے شوخی سے شعر پڑھا تھا۔

''پلیز..... میں تنہائی چاہتی ہوں۔'' اس کی قربت، نگاہوں کی تپش، ہونٹوں پر تمسخرانہ مسکراہٹ اسے کوفت و جھنجلاہٹ میں مبتلا کر رہی تھی۔

''تنہائی؟ اب مزید کتنی تنہائی چاہتی ہو؟ ہمارے سوا یہاں اور کون ہے؟''

''نہیں بالکل تنہائی چاہتی ہوں، تنہا رہنا چاہتی ہوں۔''

''یہ ممکن نہیں ہے۔ میرے گھر کا یہ ماحول نہیں ہے۔ یہاں سب مل جل کر، ایک دوسرے کے دکھ، سکھ میں شریک رہتے ہیں۔''

''اپنے گھر کے طور طریقے مجھے سمجھانے کی کوشش مت کریں۔'' وہ ایک دم ہی بھڑک کر کھڑی ہوگئی اور ناگواری سے بولی۔

''کیوں.....؟'' اس کا مزاج بھی یکدم سرد ہوا۔

''اس گھر سے، یہاں کے رہنے والوں سے مجھے کوئی دلچسپی وانسیت نہیں ہے۔ اور نہ ہی میں ان سے کوئی تعلق رکھنا چاہتی ہوں۔''

''تعلق تمہارا ان سے قائم ہوگیا ہے، جس ساعت تم نے میرے ساتھ تعلق بندھنے کا اقرار کیا تھا۔ اسی ساعت خود بخود مجھ سے وابستہ تعلق، تم سے منسلک ہو چکے تھے۔''

''تمہارے ساتھ تعلق میں نے کوئی دل سے نہیں قبول کیا ہے۔ جب میں اس تعلق کو کوئی اہمیت نہیں دیتی تو.....''

''خاموش رہو۔ تمہارے ساتھ گزرے مختصر سے وقت میں ہی مجھے احساس ہوگیا۔ تم نہایت بدتمیز وخودسر لڑکی ہو۔ بلکہ از حد زبان دراز و بے مروت بھی ہو۔ میرا نام بھی صارم خان آفریدی ہے۔ میں ضد بہت کم کرتا ہوں مگر جب ضد پر اترتا ہوں تو بڑوں بڑوں کے دماغ ٹھکانے پر لگا دیتا ہوں۔ صرف چند یوم کی مہلت دے رہا ہوں تمہیں، پھر تم وہی کروگی جو میں چاہوں گا۔'' وہ پر عزم و سرد لہجے میں کہتا ہوا اٹھ کر بال بنانے لگا۔

☆☆☆

مجھے تم سے محبت ہے

ہاں تم سے ہی محبت ہے
محبت بھی ستاروں سی

گلوں سی آبشاروں سی

صبح دم کھلتے پھولوں کی مہک جیسی

نگر و نگر پھرنے والی دیوانی تتلی سی

گلوں کی چاہ میں پھرنے والے آوارہ بھنورے سی

مجھے تم سے محبت ہے!
کناروں سے نکلتی ہوئی لہروں کے پانی سی

بدلتے موسموں کی خوبصورتی، روانی سی

ستاروں سی چاندنی سی

کسی پاگل چکوری سی

مجھے تم سے محبت ہے
سرتال کے رقص پہ بجتے ہوئے سنگیت پریکی سی

کسی آزاد پنچھی کے پنکھوں سے اڑانوں سی

رنگیلی موسموں کے پھولوں سی اور نظاروں سی

مجھے تم سے محبت ہے

رم جھم پیار برساتی ساون کی بارش سی

آسمان پر رنگ بکھراتی دھنک رنگوں کے جیسی سی

کسی دلہن کے جوڑے پر سجے جھلمل ستاروں سی

کسی نازک کلائی میں چھنکتی چوڑیوں سی!

مجھے تم سے محبت ہے!!

کائنات نے شاکنگ پنک خوبصورت کڑھائی والا سوٹ زیب تن کیا تھا ساتھ اس کے سچے موتیوں کا جڑاؤ نیکلس سیٹ پہننے کے بعد اس نے چہرے پر ڈارک میک اپ کیا تھا۔ اس کی چمکتی آنکھوں میں چاہت خمار بن کر چھائی ہوئی تھی۔ چہرہ مسرتوں سے سرشار دمک رہا تھا۔ ہونٹوں

پر بڑی خوبصورت و آسودگی بھری مسکراہٹ تھی، اسے شمشیر خان کی زندگی میں داخل ہوئے دو دن گزر چکے تھے۔ اس کے ساتھ گزرے ہر دن کی ایک ایک ساعت اسے از حد عزیز و پیاری تھی۔

شمشیر خان ..... اس کی زندگی میں آنے والا پہلا مرد!

جس نے حیات میں گل و گلزار کھلا ڈالے تھے۔

اس کے آنے سے قبل کیا تھی زندگی.....؟

خشک.....

بے رنگ.....

بے نور.....

سیاہ سلیٹ کی مانند، وہ بہار بن کر میری بے کیف و بے سرور زندگی میں آیا۔ رنگ، روشنی، خوشبوؤں سے میرے انگ انگ کو مہکا ڈالا تھا۔ وہ ملا ہے تو زندگی طویل تر ہونے کی دعائیں ہر لمحہ میرے ہونٹوں پر رہنے لگی ہیں۔ اس کی چاہت، اس کی رفاقت، اس کی سنگت میں مجھے محسوس ہوا، زندگی کس قدر حسین و منور ہے۔

''کیا سوچا جا رہا ہے؟ خاصی گہری سوچ ہے۔'' معاً پیچھے سے آکر شمشیر خان نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر معنی خیزی سے پوچھا۔

''آپ کے علاوہ کسی اور کی طرف میری سوچ جا سکتی ہے؟''

''ہمیں کیا معلوم؟ ویسے بھی سنا ہے عورت تو وہ پہیلی ہے جسے کوئی بوجھ نہیں پایا ہے۔'' وہ مسکرا کر بولا۔

''نہیں، میں ایک عام سی عورت ہوں، عام سی خواہشات ہیں۔ عام سی سوچیں ہیں اور عام سے ہی خواب ہیں میرے۔

''یہ آم اور انار کی باتیں ہم پھر کرتے رہیں گے، پہلے پیکنگ مکمل کرو، فلائٹ کا ٹائم ہونے والا ہے۔'' اس کا بازو چھوڑ کر وہ عجلت بھرے انداز میں گویا ہوا۔

''پیکنگ میں نے کر لی ہے، اور تیار بھی ہو گئی ہوں، اگر..... آپ اجازت دیں تو میں انکل اور آپا فرحت سے مل آؤں۔'' اس نے ہچکچاتے ہوئے منت بھرے لہجے میں اس سے کہا۔

''اگر تمہارا دل ان سے ملنے کو چاہ رہا ہے تو تم جا سکتی ہو۔'' خلاف امید اس نے اجازت دے دی تو خوشی سے جھوم اٹھی۔

''آپ..... آپ ناراض تو نہیں ہیں؟''

''ارے نہیں بھئی، تم تو میری جان ہو اور اپنی جان سے ناراض ہو کر کیا جان سے ہاتھ دھونے ہیں۔'' شمشیر خان گویا یکدم ہی بدل کر رہ گیا تھا۔

شمشیر خان کے حکم پر سکندر خان اسے انکل کے گھر لے آیا تھا۔ کیوں کہ اس سے نکاح کے بعد وہ اسے اپنے ڈیرے پر لے گیا تھا۔

''آپا..... آپا۔'' گھر میں پھیلے سناٹوں میں اس کی آواز گونج اٹھی۔

اندر کمرے سے وہ برآمد ہوئی تھیں۔ ان کی متورم آنکھیں، ستا ہوا چہرہ اس بات کی گواہی تھا کہ وہ گزشتہ دو دن سے روتی رہی ہیں۔

اسے سامنے دیکھ کر وہ خود پر قابو نہ پاسکیں۔ ساری ناراضگی، کدورت، وبدگمانی آنسوؤں میں بہہ گئی۔ کافی دیر اسے سینے سے لگائے کھڑی رہیں۔

''آپا! آپ تو اس قدر جذباتی ہو رہی ہیں جیسے ہم دو دن بعد نہیں، دو صدی بعد آپ سے مل رہی ہوں۔'' وہ جو مسرتوں کے بحر بیکراں میں ان دنوں غرق تھی ان کی محبتیں، ان کی جدائی کو قطعی محسوس نہ کرسکی تھی۔

''مجھے تو ایسا ہی لگا پی۔ جیسے آپ سے بچھڑے صدیاں گزر گئی ہوں۔''

''انکل کہاں ہیں؟''

''وہ تو جی پرسوں سے ہی گھر میں نہیں آئے، مسجد میں رہ رہے ہیں۔ میں بھی کل صبح کی گاڑی سے چلی جاؤں گی۔ کراچی جا کر کہیں ملازمت تلاش کروں گی...... اس طرح کیسے زندگی گزر سکتی ہے؟''

''آپ کیوں جا رہی ہیں آپا؟ یہاں رہیے آپ کو ملازمت کی کیا ضرورت ہے؟ انکل کو زمینوں سے اچھی آمدنی ہو جاتی ہے۔ آپ آرام سے رہ سکتی ہیں یہاں پر۔ انکل کو ہر کام وقت پر تیار مل جائے گا، آپ کو گھر اور ملازمت دونوں، کیوں یہاں سے جا رہی ہیں؟''

وہ ان کے برابر بیٹھی ہوئی حیرانگی سے استفسار کرنے لگی۔

''آپ یہاں موجود تھیں تو بات دوسری تھی۔ میں تنہا کس طرح بھائی حیات کے ساتھ رہ سکتی ہوں؟ لوگ نے اچھے، نیک لوگوں کو نہیں چھوڑا، بہتان تراشی سے۔ پھر بھلا ہم تو گناہ گار بندے ہیں۔ بے شک ہمارے دل صاف ہیں، لیکن لوگ اپنی نظر اور اپنی فطرت کے مطابق دیکھنے اور سوچنے کے عادی ہیں۔ ہم بہن بھائی کے پاک وصاف رشتے کو وہ اپنی آلودہ زبانوں وگندی نگاہوں سے بے اعتبار کر ڈالیں گے۔ جو مجھے قطعی منظور نہیں۔ بھائی حیات بھی اسی وجہ سے گھر میں نہیں آئے ہیں۔''

''اچھا...... کراچی جا کر ایڈریس بھیجیے گا۔ میں اور شمشیر آج ہنی مون کے لئے یورپ جا رہے ہیں۔ میں نے سوچا مل کر آجاؤں، شاید انکل کا غصہ اتر چکا ہو۔''

فرحت آپا نے اس کے چہرے پر ملامت آمیز نگاہ ڈالی جو وہ کر کے گئی تھی۔

اسے ذرا برابر بھی اپنے طرز عمل پر ندامت یا ملال تک نہ تھا۔

حیات خان کی محبت، اعتماد اور عزت وغیرت سب اپنی آرزوؤں کے قدموں تلے روند کر چلی گئی تھی۔ شمشیر خان اس کا اقرار سنتے ہی چار آدمی اور نکاح خواں کو لے کر آگیا تھا اور گھنٹے بھر میں وہ ہنستی مسکراتی اس کے سنگ روانہ ہوگئی تھی۔ اس سے چند دنوں کی ملاقاتیں ان کے سالوں کی محبت پر حاوی ہوگئی تھیں۔ شمشیر خان کی چاہ میں وہ سب فراموش کر بیٹھی تھی۔

حیات خان کو ایک گہری چپ لگ گئی تھی۔ اس کا باغی رویہ اور ہٹ دھرمی دیکھ کر انہوں نے ہتھیار ڈال دیئے تھے کہ چڑھتے دریا پر بندھ

باندھنا حماقت تھی۔ مرحوم بھائی کی محبت تھی، خیال تھا کہ اس کی من مانی کے باوجود انہوں نے اس پر گھر کے دروازے بند نہیں کیے تھے۔ اس سے رشتہ قائم رکھا تھا۔

کائنات وہ دن اس کی پرجوش بھرپور محبت کی چھاؤں میں مگن، اس کی قربت، اس کے پیار کے ہر ہر انداز کو، انمول موتیوں کو سمیٹتی رہی۔

اپنی خوش بختی، اپنی محبت پر مسرور وشاداں ہوتی رہی کہ ان انوکھے ورنگ بھرے دنوں میں کسی تیسرے فرد کے متعلق سوچنے کا وقت ہی نہ تھا۔

ادھر انہوں نے ہر لمحہ اسے سچی خوشیاں ملنے، سدا سہاگن رہنے کی اس کے لیے دعائیں مانگی تھیں۔ اس کی یاد میں اشک بے اختیار ہی آنکھوں سے پھسلنے لگتے۔ وہ آج آئی تھی، بالکل ہی اجنبیت و بیگانگی بھرے انداز میں۔

''آپ بے فکر ہو کر جائیے گا۔ بھائی صاحب کا غصہ اتر جائے گا۔ انگلی سے ناخن کبھی جدا نہیں ہوتے، وقتی طور پر دوریوں میں تبدیلی آجاتی ہے۔''

''ہاں..... میں نے بھی سوچا تھا۔'' اس نے بے پروائی سے شانے اُچکائے۔

''خان نے اپنے گھر والوں سے آپ کو ملوایا؟ وہاں لے کر گئے وہ آپ کو؟''

''ابھی نہیں ہنی مون ٹرپ سے واپس آ کر وہ مجھے اپنے گھر والوں سے ملوائیں گے۔ ابھی وہ کوئی بدمزگی نہیں چاہتے۔''

''بھائی صاحب کو خان کی یہی بات ناگوار گزری ہے۔ پورے قبیلے کے سردار کا بیٹا اپنے چار ملازموں کے ساتھ آ کر آپ کو نکاح کر کے لے گیا۔ ان کی حویلی میں کیا رشتوں کی کمی تھی؟ پھر منع بھی ہمیں کر دیا کہ باہر کسی کو معلوم نہ ہو۔ بس ان کے اس مشکوک طرزِ عمل نے بھائی صاحب کے علاوہ میرا دل بھی ڈرتا ہے۔ کہیں کوئی نیت میں کھوٹ ہی نہ ہو۔'' آخر کار انہوں نے وہ بات کہہ ڈالی جس کا انہیں ڈر تھا۔

''ایسی کوئی بات نہیں ہے آپا! وہ شادی جلدی کرنا چاہ رہے تھے۔ اس لیے انہوں نے گھر والوں کو بھی آگاہ نہیں کیا، واپسی میں آ کر سب درست کرلیں گے۔ آپ فکرمند مت ہوں، وہ مجھ سے دھوکہ نہیں کریں گے۔ وہ ایسے نہیں ہیں اگر انہیں مجھ سے دھوکہ کرنا ہوتا تو میرے حوالے اپنا تمام بینک اکاؤنٹ نہ کرتے۔'' کائنات نے ہنستے ہوئے پراعتماد لہجے میں تسلی دی تھی۔

''رب کرے ایسا ہی ہو۔ آپ ہمیشہ سکھی و آباد رہو۔''

''میں چلتی ہوں آپا!''

''ارے ایسے ہی نہیں جانے دوں گی۔ ابھی چائے بنا کر لاتی ہوں۔''

''نہیں آپا! دیر ہو رہی ہے۔''

''ابھی لائی دیر نہیں ہو گی۔'' وہ پھرتی سے کچن کی جانب بڑھی تھیں۔

☆☆☆

''دلہن بی بی! آپ کیا کھاؤ گی رات کھانے میں، بی بی جان کا حکم ہے۔ آپ جو بولیں گی وہ پکا دوں گی۔''

ورشا بال بنا رہی تھی ملازمہ نے آ کر دریافت کیا۔

''کچھ نہیں۔''

''ایسا کب تک چلے گا دلہن بی بی! آپ کچھ کھاتی نہیں ہو۔ بی بی جان کو بہت فکر رہتی ہے آپ کی طرف سے۔''

''اپنی بی بی جان کو بولو، اپنی فکر و ہمدردی اپنے پاس رکھیں۔ مجھے ضرورت نہیں ہے۔ جاؤ یہاں سے۔'' اس نے خاصی بدمزاجی و چڑچڑے پن کا مظاہرہ کیا۔ ملازمہ جو مزید اصرار کرنے کا ارادہ رکھتی تھی، اس کے بگڑے تیور دیکھ کر خاموشی سے چلی گئی۔ وہ خاموشی سے بال سلجھاتی رہی۔

گزشتہ چار روز سے اس کے یہاں اتنے ناز نخرے اٹھائے جا رہے تھے کہ کبھی اس نے تصور بھی نہیں کیا تھا کہ وہ اتنی معتبر عزیز سمجھی جائے گی۔

لیکن بعض اوقات وقت سیدھی چال چلتا ہے تو بندہ اس کی مخالف سمت چلنا شروع کر دیتا ہے۔ وہ جن حالات میں اور جس طرح یہاں لائی گئی تھی اس کے دل میں صارم کی طرف سے بدگمانی و بے اعتمادی کا بیج پہلے سے ہی موجود تھا۔ جو اب بڑھتے بڑھتے گھنے درخت کی صورت اختیار کر گیا تھا۔ اس کو یہی غلط فہمی و غلط گمانی ابھی بھی تھی کہ صارم نے اسے اغواء کروایا، اس کی وجہ سے وہ گھر بدر ہوئی اور اسی کی وجہ سے گھر والوں کی نگاہوں میں غیر معتبر ٹھہرائی گئی تھی اور گھر سے کسی ناگوار بوجھ کی طرح پھینکی گئی تھی۔ جس شخص کی طرف سے دل بدگمان و بداعتمادی کا شکار ہو جائے پھر اس کے حوالے سے ہر شے زیرِ عتاب آ جاتی ہے۔ کتنی پرخلوص مروتیں، پر احساس چاہتیں بھی دل کے شیشے پر چھائے اس کثیف غبار کو صاف نہیں کر سکتیں۔

یہی اس کے ساتھ ہو رہا تھا۔ صارم کی ذات، اور اس کی ذات کے حوالے سے ملنے والے کسی رشتے، پیار، مروت، لحاظ کسی کو بھی کوئی اہمیت دینے کو تیار نہ تھی۔ ان کی تمام محبت، اپنائیت اسے دھوکہ و بناوٹ لگتی تھی جبکہ وہ اتنے اعلیٰ ظرف و کشادہ دل لوگ تھے کہ اس کی پیشانی پر پڑتی ناگواری کی شکنیں، لبوں پر خاموشی کے قفل، ہر انداز و جنبش سے عیاں ہونے والی نفرت و سرد مہری کو نظر انداز کر کے اپنی محبت و پیار کے ساگر اس پر لٹا رہے تھے۔ علاوہ دو وجود کے جو اس کی جھلک دیکھنے کے روادار نہ تھے۔

بڑی بھابی، جو اس کی موجودگی میں کمرے میں قدم رکھنا پسند نہیں کرتی تھیں۔

زرگون خانم گو کہ اس کے تعاقب میں رہا کرتی تھی مگر اس نے محسوس کیا تھا کہ اسے غیر محسوس انداز میں اس سے ملنے نہیں دیا جاتا تھا۔ البتہ اس کی چیختی چلاتی آواز اس کی سماعتوں سے ٹکراتی رہتی تھی۔

لیکن اس نے کمال بے اعتنائی سے کبھی غور کرنا گوارہ نہیں کیا تھا۔

زخم اس کے ٹھیک ہو گئے تھے۔ اس شب کے بعد سے صارم نے دوبارہ ڈریسنگ کرنے کی کوشش نہ کی تھی اور نہ ہی اس نے اسے موقع دیا تھا۔

آج کل ویسے بھی ان کے درمیان خاموشی و سرد مہری کی دیوار حائل تھی۔

ورشا کی زبان درازی و گھر والوں سے بیگانہ و تلخ رویے نے اس کو ہرٹ کیا تھا۔ ابھی بھی ملازمہ سے اس کی گفتگو سن کر اسے سخت طیش آیا تھا۔ ملازمہ سے اس نے کہہ دیا تھا، بی بی جان سے کہہ دیں جو کھانا بنے گا وہ کھا سکے گی۔ وہ کمرے میں داخل ہوا تو اس کا مزاج از حد بگڑا ہوا تھا۔

وہ ایک باضمیر اور روشن خیال مرد تھا۔ اس کا مزاج، تیور، گستاخ لب و لہجہ یہ سوچ کر درگزر کرتا رہا تھا کہ خود بھی اس اچانک در آنے والی تبدیلیٔ حیات کو وہ قبول نہ کر سکا تھا، دو ماہ کے عرصے میں سیکے بعد دیگر حادثات اس کی زندگی میں ہوئے تھے۔

سبریز سے جدائی.....

ورشا سے ملن

دونوں باتیں ہی ایسی تھیں کہ وہ کشمکش و پیچ میں پھنس کر رہ گیا۔

لیکن اس وقت ورشا کے لہجے میں بی بی جان کے لیے جو تحقیر و گستاخی تھی اس نے اس کے سراپا میں انگارے سے دہکا دیئے تھے۔

''ادھر آؤ'' صارم نے بیڈ پر دراز ہو کر اسے پکارا، جو اسکی کمرے میں موجودگی نظرانداز کیے بالوں میں کلپ لگا رہی تھی۔

''سنا نہیں تم نے؟'' اس کی غراہٹ سن کر وہ چونکی تھی۔ لیکن نہ کوئی جواب دیا نہ ہی اپنی جگہ سے اٹھی تھی۔

''ورشا! مجھے وحشی بننے پر مجبور مت کرو، ورنہ پناہ مانگو گی۔''

''حیرت ہے! آپ ابھی بھی خود کو انسان سمجھتے ہیں؟''

''حیرت نہیں مجھے فخر ہے۔ میرے اندر ابھی انسانیت اور انسان زندہ ہے۔''

''ہونہہ.....'' ورشا کی ہٹ دھرمی نے اسے سلگا ڈالا، وہ خونخوار نگاہوں سے اسے گھورنے لگا۔ اور شاید اس کی نگاہوں کی تپش اسے کچھ یاد کرا گئی۔ وہ آہستگی سے اٹھ کر بیڈ سے کچھ فاصلے پر کھڑی ہو گئی تھی۔

''تمہیں بی بی جان کی بات ماننی چاہیے۔''

''سوری، میں ایسا کام نہیں کروں گی۔'' وہ قطعیت سے جھلا کر بولی۔

''تم کرو گی، اور ضرور کرو گی، تم ہو کیا؟ خود کو سمجھتی کیا ہو؟''

''میں گو کچھ بھی ہوں، مگر کنیز نہیں ہوں آپ کی۔''

''کنیز ہو تم! سونے اور رنگین نوٹوں کے عوض خریدی ہوئی ملازمہ، میرے بڑوں کی شرافت و حمیت نے تمہیں ایک معتبر رشتہ دے ڈالا ہے۔ ورنہ تمہارا گھٹیا اور ذلیل خاندان بیٹیوں کی دلالی کرتا ہے۔''

''صارم..... خان!''

''شٹ اپ، میں نے تمہیں پہلے ہی سمجھا دیا تھا کہ..... میری نگاہوں میں تمہاری کوئی وقعت و اہمیت نہیں رہی ہے۔ آئندہ سوچ سمجھ کر میرے اور دوسرے لوگوں کے متعلق یہ الفاظ نکالنا، خصوصاً بی بی جان اور چاچا جانی کی شان میں کوئی نازیبا لفظ کہنے سے پہلے ہزار بار سوچ لینا۔''

اس کے منہ سے لفظ نہیں گولیاں نکل رہی تھیں۔

اس سے اس کی نگاہوں میں کس قدر نفرت و تحقیر تھی۔

بھرپور بیگانگی و بے وقعتی، جیسے وہ کوئی انسان نہیں، خریدی ہوئی بے زبان بکری ہو؟ بلکہ از حد ارزاں و حقیر شے۔

جسے وہ جب چاہے ایک ٹھوکر مار کر دور پھینک دے۔

پہلی بار اسے اپنی بے مائیگی و بے حیثیت ہونے کا احساس ہوا۔ وہ بت بنی کھڑی کی کھڑی رہ گئی تھی۔

اور نہ معلوم وہ کب تک زبان کی دھار سے اس کی روح پر زخم لگا تا رہتا کہ سعاانٹر کام کی بیل نے اس کی زبان کو بریک لگائے تھے۔

''امید ہے تمہارے دماغ نے کام کرنا شروع کر دیا ہوگا؟''

وہ خشمگین نگاہوں سے دیکھتا ہوا، سرد لہجے میں کہتا اسٹک کے سہارے کمرے سے نکل گیا۔ وہ جو اتنی دیر سے صبر و ضبط کی تصویر بنی کھڑی تھی۔ اس کے جاتے ہی پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

درست کہا ہے کسی سیانے نے کہ ہاتھ کی مار کے گھاؤ بھر جاتے ہیں، مگر زبان سے لگنے والے زخم تا حیات رستے ہیں۔

صارم کے بے رحم، سفاک و سنگدل لفظوں نے لمحے بھر میں اس کے اندر کے عزم و حوصلوں کو پانی میں نمک کی طرح بہا ڈالا تھا۔

بھلا اس کی کیا حیثیت تھی؟

جو وہ اس سے انتقام لیتی۔ اس کے اپنوں نے اسے بے زبان جانور کی طرح فروخت کر کے اس کی انا، خودداری، عزت نفس کا احساس سب کچھ ہی تو فنا کر ڈالا تھا۔

اب وہ کیا تھی؟

زر خرید لونڈی!

خدمت گزار کنیز!

چلتا پھرتا مجسمہ!

جس کا کام صرف اور صرف آقا کی خوشنودی حاصل کرنا ہوتا ہے۔

ہر احساس سے بے بہرہ مالک کے حکم کی تعمیل کرنا ہوتا ہے۔

کون کہتا ہے؟ عورت کی تجارت بند ہو گئی ہے۔

عورت ہر دور میں فروخت ہوتی ہے۔

کہیں رشتوں کو قائم رکھنے کے جرم کے لیے۔

تو کبھی محبتوں کے فریب میں پھنس کر۔

یا پھر اس طرح کہ اپنی پرورش سود سمیت وصول کرتے ہیں۔

حوا کی بیٹی کو نہ معلوم کب امان ملے گی؟

☆☆☆

کیا کہہ رہے تھے تمہارے دوست؟'' وہ جو کراچی سے باسط اور آفتاب کی کال سن کر ابھی بیٹھا تھا، انہیں اس نے فرضی حادثہ بتایا تھا کہ اس میں سبریزہ خان کا انتقال ہو جانے کی وجہ سے شادی نہ ہو گی۔

انہیں بھی اس خبر نے ساکت کر دیا تھا جبکہ اس کے اندر از سر نو سبریزہ کی جدائی کا درد بیدار ہو چکا تھا۔ اس کی یاد کی شدت کو وہ مشکل سے کم کر پایا تھا۔ وہی بیقراری پھر جاگ اٹھی تھی اور وہ بے کل سا بیٹھا سوچ رہا تھا کہ بابا جانی کی آواز اسے سوچوں کے صحرا سے کھینچ لائی۔

''سبریزہ کی شادی کی مبارکباد دے رہے تھے۔'' اس نے کرب سے آنکھیں بند کرتے ہوئے آہستگی سے کہا۔

''تم نے اپنی شادی کی مبارکباد وصول نہیں کی؟'' دل تو ان کا بھی اندر سے رو اٹھا تھا مگر ہمیشہ کی طرح اس دفعہ بھی، انہوں نے برداشت و حوصلہ مندی سے کام لیا۔

''پلیز بابا جانی! میں بہت ڈسٹرب ہوں اس وقت۔''

''کیوں؟ کیا ہوا ہے؟'' ان کی نگاہوں میں فکر مندی جھلکنے لگی۔

''کچھ نہیں...... بابا جانی کچھ بھی نہیں۔''

''میں نے انتظام کر دیا ہے۔ تم کچھ عرصے کے لیے دلہن کو لے کر کہیں پرسکون جگہ گھوم پھر آؤ۔ اس طرح تمہارا دل بھی بہل جائے گا۔ دونوں ساتھ رہو گے تو تنہائی میں ایک دوسرے کو سمجھنے کا بہترین موقع ملے گا۔ ہم چاہتے ہیں، ہماری چھوٹی بہو کو کوئی تکلیف و پریشانی نہ ہو۔ وہ ہمیں بہت عزیز ہے۔ بہت پیاری ہے۔''

''آپ اپنی بے لوث و بے غرض محبتیں اس طرح مت کسی پر لٹایا کریں۔ ہر کوئی اس قابل نہیں ہوتا۔'' صارم کی نگاہوں میں ورشا کا رویہ گھوم گیا۔ ابھی تو وہ اسے بے نقط سنا کر آیا تھا۔ جس کا اسے کوئی ملال و افسوس بھی نہ تھا۔

''کون کس قابل ہے؟ یہ ہم اچھی طرح جانتے ہیں بچے؟ کل تمہارا پلاسٹر کھل جائے گا۔ اسی ہفتے سے تم جانے کی تیاری کر لینا۔ زریں گل بتا رہی تھی وہ کچھ کھا پی نہیں رہی ہے۔''

''وہ کچھ کھا پی نہیں رہی تو زندہ کس طرح ہے اب تک؟'' انہیں متفکر و پریشان دیکھ کر وہ بے ساختہ مسکرا کر بولا تھا۔

''مذاق میں مت ٹالو بات کو خان! اگر ایسی بات ہے تو یہ ہمارے لیے شرم و ذلت کا مقام ہے کہ ہم پیٹ بھر کر سوئیں اور وہ بچی جو پہلے ہی غموں سے نڈھال ہے اور اپنوں کی غلطیوں کا خمیازہ بھگت رہی ہے۔ اسے مزید بھوک کی آزمائش سے بھی گزرنا پڑے۔''

''بابا جانی! اس پر یہاں کوئی ظلم نہیں کر رہا نہ ہی بھوکا اسے رکھا جا رہا ہے۔ وہ خود ہی ایسا بیگانگی بھرا رویہ اختیار کیے ہوئے ہے، تو ہمارا کوئی قصور نہیں ہے۔'' وہ جو اس کے رویے سے پہلے ہی تپا ہوا تھا اب ان کو بھی اس کی طرفداری کرتے دیکھ کر بری طرح کھول اٹھا تھا۔

اس کے اس انداز کو انہوں نے بغور دیکھا پھر مبہم سا مسکرا کر گویا ہوئے۔

''صارم خان! عورت کانچ سے بھی زیادہ نازک و حساس ہے اور پتھر سے زیادہ سخت و بے مہر بھی۔ یہ مرد کا کام ہوتا ہے کہ وہ اسے کس

انداز میں سنوارتا ہے۔''

''مجھے اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں ابھی اس کے متعلق کچھ سوچنا بھی نہیں چاہتا میں تھک کر رہ گیا ہوں۔'' اس کے لہجے میں عجیب جھنجلاہٹ دبے پاؤں در آئی تھی۔

''یہ کیا بات ہوئی؟ تم کیا بول رہے ہو بچے؟''

بابا جانی نے بہت باریک بینی سے اس کا جائزہ لیا تھا۔ لائٹ اسکائی کلر شلوار سوٹ پر ہم رنگ واسکٹ میں ملبوس، براؤن گھنے بالوں کو سلیقے سے سنوارے، وجیہہ چہرے پر تازگی تھی۔ لیکن اس کی سبز آنکھوں میں ہر دم موجود رہنے والی وہ چمک جو اسے سب سے منفرد بناتی تھی، ہونٹوں پر چھائی رہنے والی شوخ مسکراہٹ غائب تھی۔ وہ جو اپنی باتوں اور حرکتوں سے روتے ہوئے لوگوں کو ہنسا دیتا تھا۔ آج خود ان چہروں کی نمائندگی کر رہا تھا جن سے اسے چڑ رہی تھی۔

''صارم! میرے بچے! کیا میرے فیصلے نے تمہیں ڈسٹرب کر دیا ہے؟ تم اس فیصلے سے خوش نہیں ہو؟'' ان کے لہجے میں لرزش تھی۔

''اب...... اس سوال کا جواز کیا ہے؟''

''یعنی، ہمارا فیصلہ غلط تھا۔ ہم نے اپنی خود غرضی میں تمہارا مستقبل خراب کر دیا۔''

''خود غرضی؟ کیا مطلب بابا جانی؟'' وہ چونک کر گویا ہوا۔

''کچھ نہیں، پہلے ہماری بہو کو اس گھر سے دور باہر کی دنیا دکھا کر لاؤ، پھر فرصت سے تم سے بات کریں گے۔'' بروقت انہوں نے خود کو سنبھالا تھا۔

''میں کہیں بھی جانے کے موڈ میں نہیں ہوں۔ آپ پروگرام کینسل کر دیں۔''

''تم نے سوچ لیا ہے کہ ہماری ہر بات سے اختلاف کرو گے؟''

اس بار وہ پرطیش و پر رعب لہجے میں مخاطب ہوئے تھے۔

''اگر میں ایسا نافرمان ہوتا تو آپ میری زندگی کا فیصلہ نہیں کر سکتے تھے۔''

''پھر بات کیوں نہیں مان رہے ہو؟''

''میں کراچی جانا چاہتا ہوں اور وہیں بزنس اسٹیبلش کرنا چاہتا ہوں۔ وہ کسی بیار کے سیٹ اپ کے لیے مجھے انتھک محنت اور وقت کی ضرورت ہے۔ اور جب تک میں بزنس اسٹارٹ نہیں کرتا تب تک آپ مجھے ڈسٹرب نہ کریں۔''

☆☆☆

''کب تک پلنگ توڑو گی؟ مہارانی، اٹھ کر اب ہانڈی چولہے کی فکر کرو۔ نوکروں نے پوری حویلی کا بیڑہ غرق کر دیا ہے۔ بس ختم کرو اپنے ڈرامے، بہت ہو گئی، وہ مردار تو دفع ہو گئی، کب تک اس کی وجہ سے بیٹھ کر روٹیاں ٹھونسو گی؟''

صبح گل جاناں کو من پسند ناشتہ نہیں ملا تو وہ غصے سے بل کھاتی خانم گل کے پاس جا پہنچی کہ گھر کے کاموں کی ذمے داری انہوں نے اٹھائی ہوئی تھی۔

پھر وشا کی وجہ سے وہ بیمار ہو کر بستر پر پڑ گئی تھیں۔

سخاویہ ان کی تیمارداری میں مصروف رہتی اور اس طرح ملازماؤں پر نظر رکھنے والی کوئی نہ رہی تو وہ اپنی مرضی سے سیاہ وسفید کرنے لگیں۔

''خبردار، جو میری معصوم اور بے قصور بچی کو کسی غلط نام سے پکارا'' گل خانم کے لہجے میں زخمی شیرنی جیسی للکار تھی۔

''اوہ..... ہو، آج سورج کس سمت سے نکلا ہے؟ یا بیٹی کے دکھ میں تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے؟ جو اس لہجے میں مجھ سے بات کر رہی ہو''

گل جاناں چند لمحات ان کے انداز پر ششدر رہنے کے بعد تیز لہجے میں بولیں۔

''دماغ تو میرا اب درست ہوا ہے گل جاناں، بہت عرصہ میں بیٹیاں پیدا کرنے کے جرم کی سزا بھگت چکی ہوں۔ وہ عمل جو میرے اختیار سے باہر تھا، جس کو سر انجام دینے کے لیے میں بے بس ولاچار تھی۔ اس بے بسی و بے کسی کی بہت سزائیں کاٹ چکی ہوں۔ میری بیٹیاں بھی برداشت کر چکی ہیں۔ اب تمہارے ظلم وستم کا بازار تباہ کر دوں گی۔''

ان کی تیز و تلخ آواز نے گل جاناں کے پتنگے لگا دیئے تھے۔

''تم..... سچ مچ پاگل ہو گئی ہو۔ دماغ خراب ہو گیا ہے تمہارا، اوقات بھول گئی ہو تم اپنی جو میرے آگے بول رہی ہو''

''اوقات.....؟ ہونہہ، اوقات تو میں تمہیں یاد دلاؤں گی تمہاری۔''

''ارے! کیا ہو رہا ہے؟ کیا ہو گیا ہے آپ کو آج؟''

سخاویہ جو خاموشی وحیرانگی سے ماں کا نیا روپ دیکھ رہی تھی، بات بڑھتے دیکھ کر گھبرا کر ان سے مخاطب ہوئی تھی۔

''قتل شمشیر خان نے کیا اور قصاص میں میری بیٹی کو دیا گیا، پھر اس پر گھٹیا الزام لگایا گیا کہ وہ گھر سے فرار ہوئی ہے۔ گل جاناں! اللہ کے قہر سے ڈر، اس کے غضب سے خوف کھا، کیوں اپنی سیاہ کاریوں سے اپنے نامہ اعمال کو سیاہ کر رہی ہے؟ ابھی بھی وقت ہے، توبہ کے دروازے کھلے ہوئے ہیں، قبل اس کے کہ توبہ کا وقت گزر جائے، معافی مانگنے سے معافی نہ ملے۔ توبہ کر لے اللہ سے۔ گناہوں کی معافی طلب کر لے۔ سانس کی نازک ڈوری نہ معلوم کب ٹوٹ جائے؟ کس وقت قضا آ کر دبوچ لے؟ بس مال و زر، رشتے ناتے انسان یہیں چھوڑ جاتا ہے۔ کچھ بھی ساتھ نہیں جاتا سوائے اعمال کے، پھر کیوں تو اپنی جان کو گناہوں سے بھر رہی ہے؟''

گل خانم زیادہ دیر اپنی فطرت پر قابو نہ پا سکیں۔ چند لمحوں بعد ہی اسے خیر کا پیغام دینے لگیں، لیکن جو لوگ خود کو سنوارنے کی خواہش نہیں رکھتے، ان پر کسی کی اچھی باتیں، حق وصداقت کی روشنی بھی ان کا نفس اجالا نہیں کرتی۔ گل جاناں کی حریصانہ لالچی طبیعت نے ان کی کسی بات پر کان نہ دھرا تھا۔ بلکہ وہ گل خانم کو آج پہلی مرتبہ اپنے مقابل دیکھ کر غم وغصے سے بپھر اٹھی تھیں۔

''خوب سمجھتی ہوں میں تجھ جیسی چالاک ومکار عورت کی چالاکیاں ومکاریاں، مگر میں تمہیں نہیں چھوڑوں گی، اگر میری راہ میں آنے کی

کوشش کی تو۔" وہ غصے سے اکڑتی بل کھاتی وہاں سے چلی گئیں۔

"ادے! یہ کیا کیا آپ نے؟ جانتی ہیں چھوٹی ادے کا دماغ کیسا ہے؟" ان کے جانے کے بعد سفاویہ نے پریشان لہجے میں کہا۔

"درست، یہ ہماری ہی غلطی ہوتی ہے جو ہم ایسے بے ضمیر و بے ایمان لوگوں کو سر پر چڑھا لیتے ہیں جو در حقیقت پاؤں کے قریب بٹھانے کے قابل بھی نہیں ہوتے لیکن میں آپ کو کوئی ایسا سمجھوتہ نہیں کروں گی جس سے میری یا میری بیٹیوں کی حق تلفی اور خودداری پر حرف آئے۔"

☆☆☆

آج عجب ہی بات ہوئی۔

تمہاری بے رخی سے

نہ ہی میں نے اپنے

آنسوؤں کے سچے موتی

اپنے آنچل کے پلو سے باندھے

نہ ہی صدیوں سے

کئے خواب آنکھوں نے

تم سے کوئی شکوہ کیا

آج بس یوں لگا

میرا اپنا آپ

کہیں کھو گیا ہے

آس پاس دور تک

صرف اور صرف

گمبھیر، لامحدود

اور گہرا سناٹا ہے

رات کا گہرا سناٹا ماحول پہ طاری ہو چکا تھا۔

جب وہ کمرے میں داخل ہوا گمبھیر خاموشی و نیم اندھیرے نے اس کا سواگت کیا تھا۔ اس نے شوز سائیڈ میں اتارے اور ادرگرد نگاہ ڈالے بغیر ڈریسنگ روم کی سمت بڑھ گیا۔ وہاں سے نائٹ سوٹ میں برآمد ہوا تھا۔ کمرے کی پراسرار خاموشی نے اسے کچھ گڑبڑ کا احساس دلایا تھا۔ آگے بڑھ کر اس نے کھٹ کھٹ کئی بٹن آن کیے اور یکلخت کمرہ تیز دودھیائی روشنیوں سے جگمگا اٹھا۔ اس نے سر اسمگی سے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔

ہر شے سلیقے سے اپنی جگہ موجود تھی۔ بیڈ پر موجود پنک بیڈ کور بے شکن تھا۔

پھر وہ کہاں تھی؟

اس کے اندر کچھ "خطرے" کی گھنٹی بجنے لگی۔

ڈریسنگ روم، باتھ روم اور بیڈ روم اس نے ہر جگہ اسے دیکھ ڈالا۔ مگر وہ کہیں نہیں تھی۔ وال کلاک کی سوئیاں بارہ کے ہندسے پر ہم آغوش تھیں اس کی فراخ پیشانی پر شکنوں کا جال پھیل گیا۔ اضطرابی انداز میں اس نے کئی چکر کمرے کے لگا ڈالے۔

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہاں گئی؟ اور کہاں جا سکتی ہے؟ معاً دبی دبی سسکیوں کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی اور وہ چونک اٹھا۔ سسکیوں کے تعاقب میں اس کی نگاہ بیڈ کے عقب میں جا کر رک گئی۔

بے ساختہ اس کے لبوں سے تشکرانہ طویل سانس خارج ہوئی تھی۔ وہ چلتا ہوا اس طرف آ گیا جو بیڈ اور دیوار کے فاصلے کے درمیان چند فٹ کے فاصلے کی وجہ سے روپوش ہونے کے لیے بہترین جگہ تھی۔ بیڈ کا رائٹ سائیڈ لانگ اور ہیوی ہونے کی وجہ سے بندہ آرام سے چھپ سکتا تھا۔ بے خبری میں کوئی بھی اسے ڈھونڈ نہ پاتا، وہ بے آواز چلتا ہوا اس کے قریب آ کر رک گیا۔

اس کی دگرگوں حالت دیکھ کر لمحے بھر کو اس کے اندر کے اچھے نرم خو، انسانیت سے پیار کرنے والے، اخلاقیات کا جھنڈا بلند رکھنے والے صارم کا دل پسیج گیا۔

اس کے دل پر ملال و شرمندگی کے بادل چھا گئے۔

معاملہ جو بھی رہا ہو..... وہ اپنا ذاتی افتخار، انا و خودداری سب گنوا کر آئی تھی۔ یہ..... وہ جانِ جاناں تھی جس نے پہلی بار محبت کا امرت اسے چکھایا تھا۔

جس کی چاہ میں۔

جس کی طلب میں۔

وہ پروانوں کی طرح راتوں کو بھسم ہوا کرتا تھا۔

جس کی ایک نظر التفات کی خاطر۔

جس بلا خیز کی ایک جھلک کی خاطر.....

دیوانوں کی طرح سرگرداں رہا کرتا تھا۔

بے شک اب بن مانگی دعا کی طرح وہ اسے ملی تو.....

"ورشا....." ورشا۔" ضمیر نے ملامت کی، حواس بھی ذرا ٹھکانے لگے تو اسے اپنے کہے گئے جملوں کی کاٹ و بے رخی کا احساس جاگا تو لہجے میں نرمی و حلاوت خود بخود ہی پیدا ہو گئی۔ خاصی آہستگی سے اس نے اسے پکارا تھا۔

لیکن اس کے کئی بار پکارنے پر بھی اس نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ اسی طرح گھٹنوں میں چہرہ چھپائے رو رہی تھی۔ دھیرے دھیرے ہلتا وجود اس امر کی شہادت تھا کہ وہ دیر سے روتی رہی ہے۔

"بات سنو، یہ کیا حرکت ہے؟ یہاں چھپ کر بیٹھ گئی ہو، میں پاگلوں کی طرح ڈھونڈ رہا ہوں تمہیں۔" اسے چہرہ اوپر کرتے دیکھ کر گویا ہوا۔

"کیوں ڈھونڈنے کی کوشش کی؟ بلکہ زحمت اٹھائی؟ حکم دیا ہوتا، کنیز ہوں آپ کی زرخرید لونڈی ہوں، آپ کے اشارے پر حاضر ہوتی۔" اس کے لہجے میں وہی تنفر و کاٹ تھی۔

صارم اسے تاسف بھری نگاہوں سے دیکھ کر رہ گیا۔

"تم کیوں اپنے لیے نجات کی تمام راہیں مسدود کر رہی ہو؟ کیوں اپنی بدزبانی سے مجھ پر ثابت کر رہی ہو کہ میرا جو رویہ تمہارے ساتھ روا ہے وہ حق بجانب و تمہارے شایان شان ہے۔" اس کا موڈ بگڑنے لگا۔

"میں نے کیا گستاخی کر دی؟" وہ آنسو صاف کرتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"تم...... مجھے گستاخی کرنے پر مجبور کر رہی ہو۔" یکلخت اس کا انداز بدلا تھا۔ ہاتھ بڑھا کر اسے اس نے ہاتھ پکڑ کر خود سے قریب کر لیا۔

ورشا یک دم ہی بوکھلا اٹھی۔

اس کی آنکھوں میں امڈتے خمار آلود جذبات کی سرخیاں۔

اس کے سرد ہاتھوں پر رکھے اس کے گرم و مضبوط ہاتھوں کا لمس۔

وہ لمحے بھر میں تمام تیزی و طراری بھول گئی۔ دل کی دھڑکنیں بے قابو ہونے لگی تھیں۔

"پلیز، اس وقت آنچل نہ چھڑاؤ مجھ سے، میں بہت بکھرا ہوا ہوں، ریزہ ریزہ ہو رہا ہوں۔ اپنی گداز بانہوں میں سمیٹ لو مجھے۔"

اسے دائیں بازو کے گھیرے میں لے کر جذباتی لہجے میں گویا ہوا۔

اس سرد موسم میں بھی ورشا کے مارے گھبراہٹ کے پسینے بہہ نکلے۔ بالکل عجیب وانوکھی کیفیت سے وہ اس وقت دوچار ہو رہی تھی۔ اس کی فولادی گرفت، اس کے سرخی مائل ہونٹوں سے نکلتی گرم گرم سانسوں سے اسے اپنے رخسار دہکتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔

دل کی دھڑکنیں تھم سی رہی تھیں۔

"آج میں یہ سوچنا نہیں چاہتا کہ تم کون ہو؟ میں کون ہوں؟ اس وقت ہمارے احساسات، جذبات صرف یہی چاہتے ہیں کہ ہم سب بھلا کر ایک نئی خوبصورت البیلی حسین زندگی کا آغاز کریں۔ جہاں چاہت کے رنگ روشنی پھیلائے ہمارے منتظر ہیں۔

جس چمن میں محبت کے گلاب مہکتے ہیں۔

وفاؤں کی شمعیں جلتی ہیں۔

خوبصورت پرندے امن کا ترانہ گنگناتے ہوں۔

جہاں فقط محبت ہی محبت......

کیفیت و مستی کے ساگر بہتے ہیں۔

اس نے بہکے بہکے لہجے میں کہتے ہوئے اسے آغوش میں لینے کی کوشش کی۔

اسی لمحے اس نے بھرپور کوشش کرکے اس کی گرفت سے خود کو آزاد کرلیا۔

''صارم خان آفریدی! اتنی جلدی اپنے نفس کے آگے آپ نے سرنگوں کردیا؟ آپ کو تو خود پر فخر تھا، بلکہ بڑا کا غرور و گھمنڈ تھا کہ آپ کو میری طلب نہیں ہے، بہت ناز تھا آپ کو اپنی حمیت و مردانگی پر......''

''شٹ اپ.......ندا'' اس کے حقارت سے ہاتھ جھٹکنے پر وہ دہاڑ اٹھا تھا۔

''چلا کر مجھ پر رعب جمانے کی کوشش مت کرو۔''

چندثانئے تو وہ ساکت و صامت اس کے حسین و طرح کی کاٹ لیے مسکراتے چہرے کو دیکھتا رہا۔ ہر سانس کے ساتھ وہ اپنے سے وابستہ رشتوں کے لیے، ان کی خوشیوں کے لیے، ان کی مسکراہٹوں کی خاطر کوشاں رہا تھا۔

اس کی طرف بڑھنے والا قدم بھی نفس کا تقاضا تو ہرگز نہ تھا۔

بلکہ...... اس کی صلح جو، امن پسند، درگزر کردینے والی طبیعت کا عمل تھا۔ جس کو اس نے کس انداز میں لیا تھا؟

وہ حسین صورت......

سنگ دل و اکثر باز قاتل حسینہ۔

اس نے ثابت کردیا تھا کہ وہ ہرگز سمجھوتہ نہیں کرے گی۔

اس کے اندر یکدم ہی کھولن ہونے لگی۔

نفرت......

رقابت......

ترنگ......

کیف و مستی کو یکلخت آگ بن کر اس کے وجود میں سرایت کرگئی۔

اضطراب......

انتشار......

وحشت......

آگ بن کر اس کی رگ رگ میں لہو بن کر دوڑنے لگی۔

وہ بے احساس و بے ضمیر لڑکی کب اس قابل تھی کہ اس کی رفاقتوں کی ساتھی بنتی۔ اس کے من کی روشنی، اس کے تن پر جگمگاتی۔

اس کے بڑھتے ہوئے ہاتھوں کو جھٹک کر اس نے اس کے خلوص کی ہی توہین نہیں کی تھی۔ بلکہ مردانگی کو بھی چیلنج کیا تھا۔ نفس پر سنگ باری کی تھی۔

"میں اس قدر بے غیرت اور بزدل مرد نہیں ہوں کہ تم سے گالیاں سنوں گا؟ تم میرے نفس پر تابڑ توڑ حملے کرو، میرے کمرے میں، مجھے ہی بے حمیتی و بزدلی کے طعنے دو۔ تمہارا تو میں اب دماغ درست کر دوں گا۔"

اس نے شدید طیش میں بیڈ سے اٹھتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

وہ نفس کا غلام نہیں تھا۔

وہ اسے باوقار طریقوں سے اپنی قربتوں کا شریک بنانے کا عزم کیے ہوئے تھا۔

اسے اس وقت، اس ساعت، اس لمحے کا انتظار تھا جب وہ خود اس کی چاہ میں سرتاپا ڈوب کر، اسے دل و جان سے قبول کر کے اس کی طرف بڑھے۔

''بھول جاؤ وہ دن جب یونیورسٹی میں، میں دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر تمہاری ایک جھلک دیکھنے کے لیے تڑپتا تھا اور تم اکڑتی تھیں اپنے حسن پر۔''

وہ اس کے قریب آ کر غصے سے کہہ رہا تھا۔

''اگر میں چاہتا تمہیں جب بھی بے حد آسانی سے حاصل کر سکتا تھا اور..... چاہوں تو ابھی بھی میرے لیے مشکل نہیں ہے..... مگر صارم خان آفریدی کو پہلے دن سے عورت کی عزت کرنا سکھایا گیا ہے.....''

''اوہ! یہ مجھے بتا رہے ہیں جو تمام رنگین داستانوں سے واقف ہے!''

''میری رنگین داستانوں کی ایک کمٹیشن تھی۔ میرا ضمیر مطمئن ہے کہ میں نے کبھی کوئی لمٹ کراس نہ کی تھی۔'' اس کے لبوں پر جاندار مسکراہٹ در آئی تھی۔

''ہونہہ، مردوں کا طریقہ یہی ہوتا ہے اپنی مرضی کی حدود بنا رکھی ہوتی ہیں جو دل چاہتا ہے وہ کرتے ہیں پھر وقت آنے پر خود کو دودھ سے دھلا ہوا ثابت کرتے ہیں۔'' وہ جلے کٹے انداز میں بولی۔

''کم از کم تم کو یہ الزام سوٹ نہیں کرتا کہ تم کو تو میرے کردار اور میری پارسائی کی شہادت دینی چاہیے کہ تمام حقوق محفوظ رکھنے کے باوجود میں نے کسی حق کا دعوانہ کیا جرأت نہ کی۔ تمہیں تو میرے حوصلے، ہمت وقار کو داد دینی چاہیے۔ تم پر ہر طرح کی سبقت و استطاعت رکھنے کے باوجود میں نے تمہیں ان جذبوں سے چھونا تو درکنار، نگاہ بھر کر دیکھنا بھی گوارہ نہیں کیا ہے۔ کیونکہ نفس کی تابعداری، جذبات کی غلامی تو چوپائے بھی کرتے ہیں۔ میں کم از کم اپنے آپ پر اختیار رکھتا ہوں۔ جبر اور زبردستی کا تو میں قائل ہی نہیں ہوں۔ محبوب کو اس کی چاہ سے چاہنا ہی محبوبیت کی معراج ہے۔ ورنہ انسان اور حیوان میں کیا فرق رہ جائے گا؟''

ورشا نے اس کی گرفت سے آزاد ہوتے چہرہ جھکا کر رونا شروع کر دیا تھا۔ گرگٹ کی طرح رنگ بدلتا یہ شخص اسے پہلی بار دسترب کر چکا تھا۔

کیا تھا وہ؟

شعلہ کہ شبنم؟

کبھی کانٹوں کے راستوں پر گھسیٹتا ہوا۔

کبھی پھولوں کے لالہ زاروں میں مہکاتا ہوا۔

کبھی سنگ باری کر کے زخم زخم کرتا ہوا۔

کبھی زخموں پر مرہم لگاتا مسیحا۔

☆☆☆

تیری چاہت کے بھیگے جنگل میں

میرا من مور بن کے ناچتا ہے

''اوہ......نو......فلائٹ کو بھی اب ہی لیٹ ہونا تھا؟'' کائنات نے جھنجلاتے ہوئے ہاتھ میں پکڑا پرس بیڈ پر اچھالا تھا۔ ابھی موبائل فون پر شمشیر خان کو اطلاع ملی تھی کہ موسم کی خرابی کے باعث فلائٹ دو دن بعد روانہ ہوگی، وہ ایئر پورٹ کی جانب روانہ ہونے کے لیے کمرے سے نکل ہی رہے تھے جب اطلاع ملی تھی۔ شمشیر خان سکون سے آ کر کمرے میں بیٹھ گیا تھا جبکہ وہ بری طرح جھلا گئی تھی۔ کل سے تیاری میں بڑے جوش و خروش سے مگن تھی۔

شمشیر خان، اس کی پہلی محبت......پہلی چاہ......

وہ حسین خواب، جس کی تعبیر بھی حسین ترین تھی۔ جس کو پا کر وہ اپنی خوش بختیوں پر نازاں رہنے لگی تھی۔ جس کو پانے کی خاطر وہ اپنے جان سے زیادہ عزیز رکھنے والے چچا سے بغاوت کر چکی تھی۔ اس کا سنگ پا کر اسے کسی دوسرے رشتے کی تمنا بھی نہ رہی تھی۔ اب زندگی کا ہر لمحہ، گزرتے وقت کی ہر ساعت وہ اس کے ساتھ بتانا چاہتی تھی اور پہلے ہی سفر میں تاخیر نے اس کا موڈ آف کر ڈالا تھا۔

''کیا ہوا جان، یہ موڈ کیوں آف ہو گیا ہے، چہرے کی تمام لائٹس یکدم کیوں فیوز ہو گئی ہیں؟'' شمشیر خان نزدیک آ کر اس کے بکھرے بالوں کو سمیٹتے ہوئے خوشگوار موڈ سے استفسار کرنے لگا۔

''فلائٹ بھی ابھی لیٹ ہونی تھی۔ کل سے کس قدر ایکسائیٹڈ تھی میں، لیکن عین موقعے پر ساری مسرت کافور ہو گئی۔''

''دو دن کی تو بات ہے۔ پھر ہم روانہ ہو جائیں گے۔''

''بس، عجیب سی عادت ہے میری، جو بات دل میں ٹھان لوں، پھر جب تک وہ بات مکمل نہ کر لوں، تب تک مجھ پر جھنجلاہٹ و بیزاری طاری ہو جاتی ہے۔'' اس کے شانے پر سر ٹکاتے ہوئے اس نے اپنی کیفیت بیان کی۔

''گڈ، ویری گڈ خاصی میری ہم خیال ہو۔ میرا مزاج بھی کچھ ایسا ہی ہے، تمہیں دیکھا، پسند آئیں اور حاصل کر لیا۔''

''اوہ حاصل کر لیا'' کائنات نے اس کے بال بکھیرتے ہوئے قہقہہ لگایا۔ ''اس عمل خیر میں صرف آپ کے ہی مزاج کا عمل دخل نہ تھا۔ بلکہ جناب، ہماری بھی مرضی شامل تھی، اگر ایسا نہیں ہوتا تو آپ ہمیں کبھی حاصل نہیں کر سکتے تھے۔'' اس نے شاہانہ لہجے میں کہا۔

''ابھی تم نے میرا اصل رنگ کہاں دیکھا ہے۔ شمشیر خان کے لیے ناممکن بھی ممکن بن جاتا ہے۔''

''کیا مطلب؟'' اس کے چہرے کا بدلتا رنگ اسے چونکا گیا۔ وہ بوکھلا کر بولی۔

''ارے بابا، کچھ نہیں۔ چلو تمہیں جب تک سیف الملوک جھیل کی سیر کرا کر لاتا ہوں۔''

''اوہ، ویری گڈ آئیڈیا۔ سنا ہے وہاں پریاں آتی ہیں اور شاید کسی شہزادے اور کسی پری کی داستان عشق بھی اس جھیل سے منسوب ہے۔ نگاہوں کو مبہوت کردینے والے نظارے قدرتی حسن کے ہیرے موتی وہاں بکھرے ہوئے ہیں۔'' وہ جھوم اٹھی تھی۔

''ہم ایسی داستانوں سے دور ہی رہتے ہیں۔ ایک پری جو ہماری جان بن گئی ہے۔ اس کے حسن کے نظاروں کے آگے ہمیں اب کوئی حسن..... حسن مکمل نہیں لگتا۔'' اس کے آنچ دیتے وجود..... جذبے چھلکاتی نگاہوں میں ایسی کوئی زورآوری ضرور تھی کہ از حد بولڈ کائنات لجا کر رہ گئی۔

''اونہہ، باتیں بنانا کوئی آپ سے سیکھے۔''

اسی دم دروازے پر دستک ہوئی تھی۔ شمشیر اسے چھوڑ کر باہر آیا تو حواس باختہ و پریشان سمندر خان کو کھڑے پایا۔

''بے وقت مداخلت کی معافی چاہتا ہوں خان، لیکن بات ہی کچھ ایسی تھی میں نے وقت ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا۔''

کائنات سے شادی کرنے کے بعد وہ اسے لے کر اس خفیہ کاٹج میں آ گیا تھا جو حال ہی میں اس نے خریدا تھا۔ اور بابا جان اس سے لاعلم تھے۔ وہ شادی کی خبر ان تک پہنچانا نہیں چاہتا تھا۔

سمندر خان اور صمد خان کو اس نے سختی سے منع کر رکھا تھا کہ وہ اس سے کسی طرح بھی رابطہ کرنے کی کوشش نہ کریں اور اس سے لاعلمی کا اظہار کریں۔ سو ان کا سرعت سے بگڑتا موڈ دیکھ کر اس نے فوری وضاحت پیش کی۔

''کیا عذاب پڑ گیا تجھ پر، جلدی بک۔'' وہ تیوری چڑھا کر بولا۔

''سرکار! آپ یہاں سے باہر چلے چلو تو زیادہ بہتر ہوگا۔'' سمندر خان نے نیم وا دروازے کی سمت نظر ڈال کر دھیمے لہجے میں کہا۔

شمشیر خان نے چند لمحے ہونٹ بھینچ کر اس کی سمت دیکھا، اس کے چہرے کے بگڑتے نقوش کسی گہری گڑبڑ کا احساس دلا رہے تھے۔ اس نے دروازہ بند کیا اور اسے لے کر دوسرے کمرے میں آ گیا۔

''غضب ہو گیا ہے، بڑے خان نے ورشانی بی بی کا نکاح شاہ افضل خان کے پوتے سے کر کے انہیں رخصت کر دیا ایک ہفتے پہلے۔''

''دماغ خراب ہو گیا ہے تیرا؟ کیا بکواس کر رہا ہے؟'' پہلے تو اسے یقین ہی نہیں آیا پھر یکلخت اس کی حسیات جاگ اٹھیں تو وہ دھاڑتے ہوئے اس کا گریبان پکڑ کر غضب ناک انداز میں چیخا۔

''میں سچ کہہ رہا ہوں خان، پہلے بھی غلط خبر دی ہے آپ کو؟''

''اتنے دن بعد کیوں خبر دی ہے؟ کہاں مر گیا تھا؟'' بھرپور تھپڑ کھا کر سمندر خان جیسا بھاری بھرکم جسامت کا آدمی لڑکھڑا گیا تھا۔

یکلخت ہی وحشت و جنون اس پر طاری ہو چکا تھا۔ سمندر خان کا انکشاف تھا یا ایک قیامت اس پر ٹوٹ پڑی تھی، اپنے پور پور سے اس نے غم و غصے کی چنگاریاں اڑتی محسوس کیں۔

''خان! آپ کی اجازت سے میں گاؤں سے باہر چلا گیا تھا۔ واپس آتے ہی خبر ملی تو میں سیدھا آپ کے پاس چلا آیا ہوں۔'' سمندر

خان نے سہمے ہوئے لہجے میں وضاحت کی۔

''چل گاڑی نکال۔'' اس نے جھٹکے سے سرمئی چادر کا پلو دائیں شانے پر ڈالتے ہوئے حکم صادر کیا۔

''خان! وہ، مالکن...... تنہا......''

''چوکیدار سے کہہ دے، وہ وزیراں (چوکیدار کی بیوی) کو یہاں چھوڑ دے گا۔''

☆☆☆

فروری کے وسط سے موسم بدلنا شروع ہو گیا تھا۔

مارچ کے اوائل دن تھے، برف نے ہرسو پھیلے اپنے سفید نورانی وجود کو دھیرے دھیرے سمیٹنا شروع کر دیا تھا۔ پہاڑوں، میدانوں، چھتوں اور گلیوں سے برف پگھل کر بہنے لگی تھی۔ برفیلے موسم سے پناہ کی تلاش میں جانے والے رنگ برنگے خوبصورت پروں اور حسین آنکھوں والے پرندے اپنے آشیانوں کی طرف لوٹنا شروع ہو چکے تھے گو کہ سرد ہوا کے جھکڑ ابھی بھی چل رہے تھے لیکن ان میں وہ شدت نہیں رہی تھی جو لہو کو منجمد کر ڈالتی تھی۔

رات کے کسی پہر اس کی آنکھ کھلی تھی۔

صارم اپنے دل کا غبار نکال کر پرسکون ہو کر سو گیا تھا۔

اس کی سمجھ نہیں آ رہا تھا اس شخص کا رویہ۔

پہلے اسے پانے کی جستجو۔

پھر اغوا

اور نکاح کے بعد وہ اس کی دسترس میں تھی تو پھر اس سے گریز اور لاتعلقی کیا معنی رکھتی تھی؟ وہ اس پر کیا ثابت کرنا چاہ رہا تھا؟

یہ وہ سوال تھے، جنھوں نے اسے رات کے کئی پہروں تک بے چین و بے سکون رکھا تھا۔ آخر کار سوچتے سوچتے کسی پہر وہ نیند کی آغوش میں پہنچ چکی تھی۔

جب دل و دماغ انتشار و اضطراب کا شکار ہو تو نیند بھی بھرپور طریقے سے وارد نہیں ہوتی۔ جسم کا نظام سکون و طمانیت کے زیر اثر چلتا ہے۔ اگر کسی عضو میں کوئی تکلیف اور پریشانی ہوتی ہے تو پورا وجود ہی اس کا اثر قبول کرتا ہے اور اس کی بے کلی و اضطراب ہی تھا۔ جو وہ خود بخود اتنی جلدی بیدار ہو گئی تھی۔ چند لمحات تک وہ یونہی بلندی کی سمت آنکھیں کھولے پڑی رہی پھر وال کلاک پر نگاہ پڑی تو احساس ہوا فجر کا وقت ہو رہا ہے۔

نماز کے خیال سے وہ فوراً کمبل سے نکل آئی۔ صارم تکیے سے لپٹ کر محو خواب تھا۔ ورشا وضو کے بعد نماز پڑھنے میں مشغول ہو گئی۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد اسے کمرے میں گھٹن و حبس کا احساس ہونے لگا تو اس نے سامنے کھڑکی سے دبیز پردہ سرکایا تھا۔ رخصت ہوتی رات، بیدار ہوتی صبح کا سنہرا سنہرا اجالا اور اندھیرا دلکش منظر پیش کر رہا تھا۔ یہ کمرے کا پچھلا حصہ تھا۔ حویلی کی حد یہاں سے ختم ہوتی تھی۔ یہاں سے باہر نظر بہت دور تک جاتی تھی۔ اس نے شیشے سے چہرہ ٹکا دیا۔ بلند و بالا پہاڑوں پر بکھری برف ایسی لگ رہی تھی گویا کسی بیوہ کا ملبوس نیم اندھیرے میں نظر آتا ہے۔

سوگوار!

پراسرار!

رنجیدہ!

اداسی و خاموشی کی ردا اوڑھے ہوئے، معاً اس کے شانے پر ہاتھ کا دباؤ پڑا تھا۔ اس نے چونک کر دیکھا۔ صارم اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔ بھرپور مکمل نیند لینے کے بعد اس کی سبز آنکھوں میں خمار آلود سرخی، اس کے وجیہہ چہرے کو مزید پرکشش بنا رہی تھی۔

''تنہا تنہا ہی عبادت کر لی؟ مجھے جگایا نہیں؟ جماعت تو نکل گئی۔ اب مجھے گھر میں ہی نماز ادا کرنی ہوگی۔''

وہ جانتا تھا، اس کی طرف سے کوئی جواب نہیں آئے گا اس لیے اس کے شانے سے ہاتھ ہٹا کر وہ اٹیچڈ باتھ کی سمت بڑھنے لگا۔ رات کی تلخی کا اس کے چہرے و لہجے میں ہلکا سا شائبہ بھی نہ تھا۔ اس کی اس عادت نے اسے متاثر کیا تھا کہ وہ بات ختم کرنے کے بعد پھر کبھی اس ناخوشگوار بات کو زبان پر نہیں لاتا تھا۔ اور موڈ بھی بہتر اور خوشگوار ہوتا تھا۔ ورنہ معمولی معمولی باتوں کو لوگ نہیں بھلاتے اور عرصے تک منہ بنائے رکھتے ہیں۔

''سنیے، میں باہر، میرا مطلب ہے ٹیرس پر جانا چاہتی ہوں۔'' اس نے جھجکتے ہوئے صارم سے اجازت طلب کی۔

''کیوں؟'' اس کی سبز نگاہوں میں استعجاب کے تمام رنگ جگمگانے لگے۔

''میرا یہاں دم گھٹ رہا ہے۔ باہر نکلنے پر پابندی تو نہیں ہے نا؟''

''نہیں، تمہیں یہاں قیدی بنا کر نہیں رکھا گیا۔''

''خریدا تو گیا ہے۔'' بے ساختہ لبوں سے نکلا تھا۔

''جاؤ مگر یہ بات کان کھول کر سن لو، اگر تم کسی احمقانہ اقدام کے متعلق سوچ بیٹھی ہو تو اپنے ہر عمل کی ذمے دار خود ہوگی۔'' اس کی بات نظر انداز کر کے وہ خاصے تحمل و سنجیدگی سے گویا ہوا۔

''تم تسلیم کرو، نہ کرو لیکن اس حویلی کے وارث کی شریک حیات ہونے کی حیثیت سے اس گھر کے چپے چپے پر تمہاری حکمرانی ہے۔ یہاں گھومنے، پھرنے کے لیے تمہیں کسی اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔'' وہ اپنی بات مکمل کر کے باتھ روم میں گھس گیا۔

درشہوار اس کی ہدایات بھولی سمجھی گئی تھی۔ اس کا اشارہ خودکشی کی طرف تھا۔ سیاہ کشمیری کڑھائی والی چادر اوڑھ کر وہ باہر نکل آئی۔ ہیٹر سے گرم شدہ ماحول سے نکل کر اوپر ٹیرس پر کھلی فضا و سرد ہوا کے مست جھونکوں نے لمحے بھر کو اس کے جسم میں کپکپی پیدا کر دی تھی۔ اس نے بے اختیار گرم چادر کو احتیاط سے سر پر اوڑھ کر جسم کے گرد لپیٹا تھا۔ لیکن چہرے سے ٹکراتے سرد جھونکوں نے اس کے خون میں روانی تیز کر دی تھی۔ وہ منہ کھول کر گہرے گہرے سانس لینے لگی۔ اس عمل سے اس کو اپنے اندر کی گھٹن، پژمردگی و بیزاری باہر نکلتی محسوس ہوئی۔ خوشگوار سی طمانیت اس کو اپنے اندر دور تک اترتی محسوس ہوئی۔ آنکھوں سے تمکین پانی کسی احساس کے تحت بہنے لگا۔ اس نے بہتے آنسو ہتھیلیوں سے صاف کیے اور ارد گرد دیکھنے لگی۔

چاروں طرف سبزہ و ہریالی تھی۔ برف پوش پہاڑ تھے۔ جن کی چوٹیاں آسمان کی وسعتوں میں گم تھیں۔ شہتوت و انگور کی بیلیں صاف نظر آ رہی تھیں۔

گاؤں کے پہاڑی پتھروں سے بنے مکانات میں صبح حیات کی چہل پہل شروع ہو چکی تھی۔ کچے مکانوں کے باورچی خانوں میں بنی چمنیوں سے نکلتا سیاہی مائل دھواں کس قدر حیات افروز و دلفریب لگ رہا تھا۔ اب فضا میں جنگلی پھولوں، سبزے کی مہکار کے ساتھ دیسی گھی کے پراٹھوں اور تازہ دم تیار ہوتی چائے کی فرحت بخش خوشبوئیں اسے بھی محسوس ہوئیں۔ وہ کافی دیر تک کبھی ٹہل کر، کبھی بیٹھ کر موسم کی دلکشی محسوس کرتی رہی۔ اسی اثناء میں ملازمہ اسے چائے کا مگ دے کر چلی گئی تھی۔ جو پہلی بار اس نے کسی حیل و حجت کے بغیر ملازمہ سے لے کر پی لی تھی۔

سورج دھیرے دھیرے اپنے مسکن سے برآمد ہو رہا تھا۔ اس کی تابناک روشنی سیاہ رات کی دبیز سیاہی کی نقاب کو چیرتی ہر شے کو منور کر رہی تھی۔

سورج خاصا بلند ہو چکا تھا۔ سبزے پر اس کی روشنی، سنہری شعاعوں کا عکس از حد سندر و دیدہ زیب لگ رہا تھا۔

”صبح بخیر دلہن رانی، آج تو صبح کی سیر ہو رہی ہے۔“ شیریں گل وہاں آ کر مسکرا کر بولی۔ اسے دیکھ کر ورشا کے لبوں پر بھی ویسی ہی مسکراہٹ ابھری تھی۔ خلوص اور وفا کی مٹی سے بنے یہ لوگ کس قدر کشادہ دل و مہربان تھے۔ اس کی ہر زیادتی و بدتمیزی کے جواب میں ان کے خلوص و مروت میں کوئی کمی نہ آئی تھی۔

”کیا سوچنے لگیں؟“ شیریں گل اس کے قریب آ کر استفسار کرنے لگی۔

”کچھ نہیں، بس ایسے ہی کمرے میں گھٹن کا احساس ہوا تو میں یہاں چلی آئی۔“

”گھٹن؟ صارم کی موجودگی میں گھٹن کا احساس؟“

اس کے لہجے میں بناوٹی نہیں اصلی حیرانگی و تعجب تھا۔

”نیچے چلیں، خاصی دیر ہو گئی ہے مجھے یہاں آئے ہوئے۔“ قبل اس کے کہ صارم کے متعلق اس کی گفتگو مزید آگے بڑھتی وہ جلدی سے بولی۔

”ہاں، میں تمہیں بلانے ہی تو آئی تھی۔ تم کھانے پینے کے معاملے میں بہت بے پروا ہو، اس لیے بابا جانی نے حکم دیا ہے آج سے تم ہم سب کے ساتھ کھانا، ناشتہ وغیرہ وغیرہ کیا کرو گی۔“ شیریں گل نے سیڑھیاں اترتے ہوئے کہا۔

”یہ کمرہ کس کا ہے؟“ راہداری میں براؤن لاکڈ دروازے کی طرف اس نے اشارہ کرتے ہوئے استفسار کیا۔ جواب میں شیریں گل کے چہرے پر سایہ سا لہرایا تھا۔

”سبریز خان کا۔“ اس کے لہجے میں محسوس کی جانے والی دکھ کی نمی تھی۔

”کہاں ہیں وہ؟“

”وہاں، جہاں ہم سب کو ایک دن جانا ہے۔“

”اوہ تو، کیا ہوا تھا انہیں؟ وہ تو ینگ تھے۔“

اس کی نگاہوں میں اونچے لمبے خوبرو سے سبریز خان کا سراپا گھومنے لگا جو کراچی میں ایک دن پیراڈائز ی پوائنٹ پر پہاڑ سے پھسل جانے کے بعد اسپتال میں صارم کے ساتھ آیا تھا۔ کئی مرتبہ صارم کے ہمراہ اس نے اسے جامعہ میں بھی دیکھا تھا۔ اس کی موت کا انکشاف اس کے حساس دل کو ملول کر گیا۔

شیریں گل کی آنکھوں میں بھی آنسو چمکنے لگے تھے۔

وہاں سے ڈائننگ روم تک کا فاصلہ پھر خاموشی سے طے ہوا تھا۔

بی بی جان نے بہت پرتپاک طریقے سے اس کا استقبال کیا تھا۔ اس کے سلام کے جواب میں بڑے جوش سے اسے لپٹا کر ماتھا چوما تھا۔ اپنے قریب کرسی پر اسے بٹھایا تھا۔ میز انواع واقسام کی نعمتوں سے بھری ہوئی تھی۔

وہ خاموشی سے بی بی جان کی برابر والی کرسی پر جیسے ہی بیٹھی اس کے برابر میں براجمان گل زیبا ایک جھٹکے سے اٹھی تھیں۔ ساتھ ہی ان کی کڑک، ناگواری و برہمی سے بھرپور آواز وہاں کے پرسکون ماحول میں گونج اٹھی۔

"فوراً اں! ناشتہ میرے کمرے میں لے کر آؤ۔"

"بڑی بہو کیا ہوا اچانک؟"

"اگر آپ چاہتی ہیں کہ کوئی بدمزگی نہ ہو تو خاموشی سے ناشتہ کریں۔" ان کے ترش و تلخ لہجے میں گستاخی کا عنصر نمایاں تھا۔

ملازمہ خاموشی سے ناشتے کے لوازمات ٹرالی میں رکھ کر ان کے پیچھے چلی گئی۔

ماحول میں محسوس کی جانے والی تلخی دھنا تا پھیل گیا۔ وہ تینوں ہی اپنی جگہ پر دم بخود تھیں۔ بی بی جان کو ان سے اس قدر تنگ نظری کی توقع نہ تھی۔ شیریں گل بہت شرمسار سے انداز میں ورشا کے رنگ بدلتے چہرے کو دیکھ رہی تھی۔ جس کی متعجب و ہراساں نگاہیں بار بار کمرے کے دروازے کی سمت اٹھ رہی تھیں۔

"بسم اللہ کرو بچے!" بی بی جان کو جلد ہی خیال آ گیا کہ ورشا محسوس نہ کرے کہ گل زیبا اس کی موجودگی کے باعث گئی تھی۔ مصلحت پسندی سے انہوں نے خود پر قابو پا کر چنے کا سالن اور گرما گرم پوریاں اس کی طرف بڑھاتے ہوئے پرشفقت لہجے میں کہا۔

"وہ میری وجہ سے گئی ہیں؟" بچی نہیں تھی وہ۔ اور نہ ہی اس قدر کند ذہن و نا سمجھ کہ ان کے چہرے پر نفرت، آنکھوں میں اپنے لیے حقارت کے رنگ نہ پہچان سکے اور جس انداز میں وہ اٹھ کر گئی تھیں اسے بیٹھتے دیکھتے ہی ان کی اس ناپسندیدگی نے بہت کچھ اس پر منکشف کر ڈالا تھا۔

اس کی فکر چھوڑو بچے! تم ناشتہ کرو۔ گھر کے مرد جلدی ناشتہ کرنے کے عادی ہیں۔ صرف صارم ہے جو دیر سے ناشتہ کرتا ہے۔ مگر آج اس نے بھی جلد ہی کر لیا ہے۔ کیونکہ وہ ولید اسٹر کھلوانے اپنے بابا کے ساتھ ہسپتال گیا ہے۔" ماحول کے تناؤ کو ختم کرنے کے لیے بی بی جان بے تکان بول رہی تھیں۔ اسے ان کا بولنا بھلا رہا تھا۔ کیونکہ وہ صارم سے، اس کی ذات اس کی تکالیف سے نابلد تھی۔ اسے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ وہ آج اسپتال جائے گا یا ناشتہ کیا یا نہیں؟

☆☆☆

''کیا بات ہے خان؟ بہت سوچوں میں گم رہنے لگے ہو۔''

گل جاناں کلائی میں موجود موٹی موٹی چھم چھم کرتیں طلائی چوڑیوں سے کھیلتی ہوئی شہباز خان سے استفسار کرنے لگیں۔ جو ورشا کی رخصتی بلکہ ''فروخت'' کے بعد سے کچھ مضطرب وا لجھن کا شکار رہنے لگے تھے۔ عجیب بے نام سی بے کلی و بے چینی ان کے سراپا میں سرایت کر گئی تھی۔ ان کے اس طرز عمل کو ان کے دونوں بیٹوں نے سخت ناپسند کیا تھا۔ بڑا بیٹا تو مارے غصے کے بدظن ہو کر اپنی بیوی کو لے کر یہاں سے چلا گیا تھا۔ ان سے چھوٹا شہروز جو دو دن بعد گھر آیا تھا جب اس پر اس بات کا انکشاف ہوا کہ ورشا کو اس گھر سے نکال کر دشمنوں کی امان میں دے دیا گیا ہے پہلے تو وہ شاکڈ رہا پھر گل خانم کی گود میں سر رکھ کر رو دیا۔ اور ان سے ملے بغیر حویلی سے نکل گیا تھا۔

گل جاناں کی کوکھ سے پیدا ہونے والے گل خانم کی گود میں پرورش پانے والے دونوں بھائیوں نے مزاج و دل سوتیلی ماں کے جیسے پایا تھا۔

محبت سے لبریز!

مہربان و نرم خو!

ہمدردی و اپنائیت سے بھرپور!

رشتوں کا خلوص اور راہوں کا درد ان کی ممتا کے لمس سے ہی انہیں ملا تھا۔ پھر کیسے ان کی تڑپ کو محسوس نہ کرتے؟

لازوال و لامحدود محبت کے بحر بیکراں میں وہ ان کی ذات کے طفیل ہی تو غرق ہوئے تھے۔ اس دکھ کی کٹھن گھڑی میں بھلا وہ کس طرح اس دکھیاری ماں کو تنہا چھوڑ سکتے تھے جو بیٹیاں پیدا کرنے کے جرم کی سزا سالوں سے بھگتتی آ رہی تھی۔ دکھ کی اس سنگین گھڑی میں ہی تو اپنے اور پرائے کا احساس ہوتا ہے۔ خوشیوں کی نایاب ساعتوں میں غیر بھی، دشمن بھی ساتھ قہقہے لگانے آ جاتے ہیں۔ لیکن..... جو دل کی پاکیزگی سے اپنا سمجھتے ہیں۔

روح کی گہرائیوں سے چاہتے ہیں

جن کی محبت بے لوث ہوتی ہے

جن کی تڑپ میں دکھاوا نہیں ہوتا

جن کے قلب ریا و فریب کی دھوپ سے محفوظ رہتے ہیں۔

جن کے ضمیر روشن اور ایمان پختہ ہوتے ہیں۔

ان کے قدم راہ حق پر چلنے سے لڑکھڑاتے نہیں۔

برائے کوئی دو مظلومیت کا ساتھ دینے پر انہیں کوئی اندیشہ و فکر دامن گیر نہیں ہوتی۔ ماں اور باپ کے اس سفاک اور بے رحم فیصلے نے انہیں از حد بدظن و دکھی کر دیا تھا کہ شہروز نے ان کی شکلیں دیکھنے سے بھی انکار کر دیا تھا۔ یہی وہ لمحہ تھا جب شہباز خان کو کچھ کچھ اپنے فیصلے کی غلطی کا احساس ہوا تھا جبکہ گل جاناں نے یہی کہا کہ وہ گل خانم کی چڑھائی میں آ کر گھر چھوڑ کر گئے ہیں۔ خود ہی واپس آئیں گے لیکن شہباز خان عمر کے اس دور میں بیٹوں کی جدائی و ناراضگی سے پریشان سے ہو گئے تھے۔

''تمہیں میری کیا پرواہ؟ زر پرست عورت۔ تم اپنے من پسند مشغلوں میں ہی مگن رہو۔'' وہ خاصے چڑچڑے و طنز آمیز لہجے میں گویا ہوئے۔

''خان جی! کیا خطا ہوگئی مجھ سے؟''

''چھوڑو اب۔ ساٹھ سال کی عمر میں سولہ سالہ لڑکی کی طرح اٹھلانا۔ سخت زہر لگتا ہے تمہارا بازاری عورتوں کی طرح ناز و ادا دکھلانا۔''

ان کے اندر کی تپش نے زبان کا سہارا لیا تو گل جاناں زیر عتاب آ گئیں۔

''کس بات پر اس قدر غصہ کھا رہے ہو خان۔ کوئی وجہ بھی تو ہو؟''

عورت کسی بھی طبقے، کسی بھی خطے سے تعلق رکھتی ہو عمر کے معاملے میں تب ہی حساس و محتاط ہو جاتی ہیں گو کہ وہ خود کو اس قدر اپ ٹو ڈیٹ رکھنے کی عادی تھیں کہ عمر کے ساٹھ سال عبور کرنے کے باوجود ینگ و اسمارٹ دکھائی دیتی تھیں اس وقت محبوب شوہر کے منہ سے عمر کا طعنہ انہیں بازاری عورت کی گالی سے بھی بڑھ کر لگا تھا۔ مستزاد اس پر ان کا حد درجہ چراغ پا ہونا۔

''تم جیسی عورت میں نے پہلی بار دیکھی ہے گل جاناں۔ جوان اولاد جو بڑھاپے کی لاٹھی ہوتی ہے حویلی چھوڑ کر جا چکی ہے اور تمہیں رتی بھر بھی پریشانی و پروا نہیں ہے۔''

''ایسی نافرمان و ناہنجار اولاد کی پروا کرتی ہے میری جوتی۔ ہونہہ! ان دونوں سیاہ بختوں نے کب مجھے ماں سمجھا ہے؟ کب میری پروا کی ہے۔ وہ ڈائن بچپن سے آج تک انہیں میرے خلاف کرتی رہی ہے۔ وہ اس کی سکھائی میں ہیں۔ جو وہ کہتی ہے، وہی وہ کرتے ہیں۔ شکر ہے، شمشیر خان کو اس چڑیل کی گود میں میں نے نہیں ڈالا۔''

''اس تمہارے لاڈلے کی بھی خبر نہیں ہے۔ کہاں غائب ہے ایک ہفتے سے؟''

''ان کا غصہ اس پر اتارنے کی کوشش نہیں کرو خان، وہ دونوں بھی کب تک دور رہ سکتے ہیں۔ ہماری یاد نہیں آئے گی لیکن اس حویلی کے عیش و آرام کی یاد تو بے کل رکھے گی انہیں۔ آج نہیں تو کل یہاں آئیں گے خود ہی۔ محلوں میں رہنے والے صرف محلوں میں ہی گزارہ کرتے ہیں۔''

''نہ معلوم کیوں مجھے ایسا ہی لگتا ہے جیسے ہم نے شاہ قبیلے والوں سے یہ سودا کر کے کچھ اچھا نہیں کیا۔ میرے دل میں ایک عجیب سی گرہ پڑ گئی ہے۔'' شہباز خان تاسف سے ہاتھ ملتے ہوئے پریشان کن لہجے میں گویا ہوئے۔

''کیسی گرہ؟ آپ فضول سوچیں ہیں بڑے خان۔ ہم نے جو بھی کیا درست کیا ہے۔ آپ کیوں بلاوجہ پریشان ہوتے ہیں۔ بلکہ میں تو سوچ رہی ہوں سجاد کے بھی اب ہاتھ پیلے کر دیتے ہیں۔ مغیث کی ماں کو میں پیغام بھجوا دوں گی۔''

''خاموش رہو۔ شہروز کی مرضی نہیں ہے وہاں پر، اس نے مغیث کو بیوی بچوں کے ہمراہ کئی بار کراچی میں دیکھا ہے۔''

''اس نے شادی کر لی تو کیا ہوا۔ کئی شادیاں کرنا تو یہاں کے مردوں کا مشغلہ رہا ہے۔ اس نے شادی کر لی تو کوئی انہونی بات نہیں ہوئی، آپ نے بھی تو دوسری شادی کی یا نہیں۔''

"وہ تو وقت اور تھا۔ اب جتنا وقت گزرتا جا رہا ہے اتنی ہی تیزی سے خیالات و اذہان بھی تبدیل ہو رہے ہیں اور فی الحال میں ان کی غیر موجودگی میں ورشا کے متعلق فیصلہ کر کے الجھن کا شکار ہو گیا ہوں۔ مزید الجھنوں سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ و طاقت نہیں ہے اب۔" انہوں نے مسہری پر نیم دراز ہوتے ہوئے تھکن زدہ لہجے میں کہا۔

"یہ سب اس جادوگرنی کے جادو کا کمال ہے۔ نہ معلوم کیا سحر پڑھتی ہے کہ ہر کسی کو اپنا بنا لیتی ہے۔ ماں، سگی ماں ہو کر میں ان سے اپنی نہیں منوا سکتی۔"

"اپنے اندر وہ اوصاف و وقار پیدا کرو۔" شہباز خان گویا آج انہیں طنز کی مار مارنے پر کمربستہ تھے۔

تعریف و توصیف کے پھول ہر کوئی اپنا حق سمجھ کر فخر و افتخار سے سمیٹ لیتا ہے۔ ذاتی خامیوں و نفس کی شر پسندیوں پر اعتراض کسی کو گوارہ نہیں ہوتا۔ اس معاملے میں سچ زہر سے زیادہ کڑوا، خنجر سے کاری محسوس ہوتا ہے۔

گل جاناں جو میاں کو انگلیوں کے اشاروں پر چلانے کی عادی تھیں اس وقت زبان کی ترشی، لہجے کی کڑواہٹ، آنکھوں کی برہمی وہ قطعی برداشت نہیں کر پا رہی تھیں۔ در پردہ گل خانم کی تعریف ان کی زبان سے، انہیں بھسم کرنے کے لیے کافی تھی۔ ابھی تلملا کر وہ کچھ کہنا ہی چاہ رہی تھیں کہ دروازے کو بھرپور ٹھوکر سے وا کیا گیا تھا۔ بھاری لکڑی کا بلیک و براؤن شیڈ والا منقش دروازہ پوری طاقت سے دیوار سے ٹکرا کر کمرے میں دھماکہ سا کر گیا تھا۔

گل جاناں اور شہباز خان اپنی اپنی جگہ پر بے اختیار اچھل پڑے تھے۔

"یہ کیا طریقہ ہے گھر میں داخل ہونے کا؟" اندر داخل ہوتے شمشیر خان سے شہباز خان نے تیز لہجے میں کہا۔

"ورشا کہاں ہے؟" اس نے اس کا سوال نظر انداز کر کے ان سے بھی زیادہ تیز و سرد لہجے میں سوال کیا۔

"تم پوچھنے والے کون ہوتے ہو؟"

"میں جو پوچھ رہا ہوں۔ اس کا جواب چاہیے مجھے۔"

"شمشیر خان! باپ سے کس لہجے میں بات کر رہے ہو؟" گل جاناں اس کی آنکھوں میں ناچتی درندگی و سفاکیت دیکھ کر دہل کر بولیں۔

"تمہاری گود میں پرورش پائی ہے اس نے، تمہاری تربیت بول رہی ہے اس کے لہجے میں۔" شہباز خان نے ایک اور طنز کا تیر پھینکا تھا۔

"میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے بابا جانی!"

"تمہارے پاس گھر میں ٹھہرنے کا وقت کب ہوتا ہے بچے تمہیں گھر اور گھر والوں کی سنگت سے زیادہ عزیز، رنگ برنگی و ذلیل و گھٹیا عورتوں کی قربت پسند ہے۔ جن کے سنگ رہ کر تمہیں نہ دن کا معلوم ہوتا ہے اور نہ رات کی فکر، اور نہ ہی یہ احساس کہ گھر میں بھی کوئی تمہارا منتظر ہے یا نہیں، اب آ کر وقت کا احساس دلا رہے ہو ہمیں۔" اس کا گستاخ رویہ لحاظ ردیہ انہیں پہلی مرتبہ مشتعل کر گیا تھا۔

"منتظر؟ ارے اس گھر میں میری کوئی حیثیت ہے، کوئی کچھ سمجھتا ہے مجھے؟ بہر حال میں اس وقت کسی ایسی الجھن و بحث میں پڑنے نہیں

آیا۔ میں یہ پوچھ رہا تھا، ورشا کہاں ہے؟'' اس کا لہجہ تھوڑا کھڑ و بد لحاظ تھا۔

''ارے بیٹھ تو سہی، میرے بچے، میرے لال، زبردست خوشخبری ہے میرے پاس۔ پہلے یہاں بیٹھ تو سہی۔'' گل جاناں نے آگے بڑھ کر اس کا بازو پکڑتے ہوئے رازدارانہ انداز میں کہا تو وہ ان سے بازو چھڑا کر مسہری سے فاصلے پر رکھی ایزی چیئر پر بیٹھ گیا۔ موڈ اس کا پہلے ہی بگڑا ہوا تھا۔ جلتی پر تیل ڈالنے کا کام شہباز خان کی باتوں نے کیا تھا۔

گل جاناں مسرور سے انداز میں اسے بتا رہی تھیں کہ کس طرح انہوں نے چالاکی سے بلکہ سمجھداری سے ورشا کے وجود سے چھٹکارا پایا اور ساتھ ہی ''لمبا'' ہاتھ بھی مارا تھا۔ وہ ماں تھیں، بخوبی جانتی تھیں وہ مال و زر پر جان لٹانے والا بندہ ہے۔ اور ان کی فطرت بیٹے کو ان کی تربیت و خون سے ورثے میں ملی تھی۔ وہ خوش تھیں کہ ان کی اس عقلمندی کو سراہے گا خوش ہو جائے گا۔

لیکن نتیجہ ان کے گمان کے برعکس نکلا تھا۔ سب سن کر شمشیر خان غم و غصے سے پاگل سا ہو گیا تھا۔ زوردار ٹھوکر قیمتی چینی کے گلدان کو مارتے ہوئے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

''یہ کیا کیا؟ کیا کیا ہے یہ؟ کس نے مشورہ دیا تھا اس طرح اسے ان لوگوں کے حوالے کرنے کا؟''

''بہت سونا لیا ہے میں نے، بہت روپیہ۔''

''چپ..... چپ ہو جاؤ۔'' اس نے میز اٹھا کر اچھالی۔ لمحے بھر میں اس کے شیشے کے ٹکڑے گرین کارپٹ پر بارش کے قطروں کی طرح بکھر گئے۔

''ہوش میں آؤ شمشیر، دماغ خراب ہو گیا ہے تمہارا؟'' شہباز خان نے کسی وحشی کی طرح بے قابو شمشیر خان کو بمشکل دونوں بازوؤں سے پکڑا، گل جاناں اس کی حالت دیکھ کر خوف سے تھر تھر کانپ رہی تھیں۔

''دشمنوں کے حوالے اسے کر دیا۔ میری ناک کٹوا دی۔ مجھے پست کر دیا، میری اجازت کے بغیر ایسا کیوں کیا؟''

''پہلے اپنی حالت پر قابو پاؤ۔ پھر بات کرو، اس کمرے سے نکل کر آوازیں باہر جائیں گی۔ تمہارے خوف سے کسی میں اندر آنے کی ہمت نہیں ہے۔ مگر کان کوئی بند نہیں کرے گا۔ کیوں اپنے ساتھ ہمیں بھی رسوا کرنا چاہتے ہو۔'' بابا جان اسے قابو کرنے کی کوشش میں بری طرح ہانپ رہے تھے۔

''میں نے بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا تھا۔'' گل جاناں آہستگی سے بولیں۔

''سوچ سمجھ کر، ہونہہ، اگر آپ میں سوچنے سمجھنے کی طاقت ہوتی تو بات ہی کیا تھی۔ جس سونے اور روپے کی آپ بات کر رہی ہیں۔ اس سے دوگنا وہ اس سیزن کی فصل سے کما لیں گے۔''

''میں، کیا درست کہہ رہے ہو؟'' گل جاناں پر حیرتوں کا پہاڑ ٹوٹ گیا تھا۔ وہ اپنی دانست میں یہ سودا کر کے پھولے نہ سما رہی تھیں۔

''بابا جان! آپ نے بھی کچھ نہیں سوچا۔ کیا ہو گیا ہے آپ کو؟ کس طرح یہ فیصلہ کر لیا آپ نے؟ میری سمجھ میں نہیں آ رہا۔ آپ نے نہ سوچا، نہ سمجھا جو اس نے کہہ دیا، وہ آپ کرتے چلے گئے۔ قبیلے کی آن، برادری کی حرمت، شملے کی بلندی کسی کا بھی خیال نہیں کیا؟''

اس کے لہجے میں ایسا کچھ ضرور تھا جو شہباز خان جیسے زیرک نگاہ و معاملہ فہم شخص کا سر جھک کر سینے سے جا لگا تھا۔ شمشیر خان کے بس میں ہوتا وہ ابھی حویلی مسمار کر ڈالتا۔ ہر شے کو آگ لگا دیتا۔ خاک کر ڈالتا سب کچھ۔ وہ جو خود کو نا قابل تسخیر سمجھتا تھا۔ اپنوں کے ہاتھوں شکست کھا بیٹھا تھا۔ بہت بلندی سے گرا تھا وہ۔

''آپ کو پہلے بھی کہا تھا بابا جان! عورت کی ناقص عقل پر بھروسہ نہیں کیا کریں۔ عورت صرف گھر میں، گھرداری سنبھالنے کی اہلیت رکھتی ہے۔ دشمنوں کی دانشمندیوں و شرانگیزیوں سے کس طرح مقابلہ کیا جاتا ہے، اس کی سمجھ سے واقف نہیں ہوتی اور سمجھتی ہے خود کو عقل کل کی مانند۔'' اس نے ماں کی جانب دیکھتے ہوئے سخت فہمائشی انداز میں کہا۔

گل جاناں جو اس کی فطرت سے واقف و مزاج آشنا تھیں۔ بہت خاموشی سے اس کی باتیں سن رہی تھیں۔ ویسے بھی انہیں اب اپنی غلطی کا شدت سے احساس ہو رہا تھا۔

''تم بھی گھر سے ایسے نکلتے ہو، گویا دوبارہ گھر میں اب داخل نہیں ہو گے۔ بڑھاپے میں جوان اولاد باپ کے لیے عقل و شعور اور اپاہج پن کا عصا ہوتی ہے۔ تم، درست کہہ رہے ہو، شاید میں بہت بوڑھا و کمزور ہو گیا ہوں جو اس عورت کے پلو سے کسی کنجی کی طرح بندھ کر رہ گیا ہوں۔ اس وقت اس عورت کی حریصانہ طبیعت کے جھانسے میں آ کر بالکل ہی عقل سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔ نہ معلوم کیا ہو گیا تھا مجھے جو میں نے بالکل بھی کچھ سوچنا گوارہ نہیں کیا۔ لیکن میرے اندر اس فیصلے کی غلطی کا احساس مجھے بے کل و بے سکون کیے ہوئے ہے۔'' شہباز خان کے مضطرب احساسات کو گویا شمشیر خان کی زبان مل گئی تھی۔ وہ اس سے وقتی اختلاف بھلا کر اس سے مخاطب ہوئے تھے کیونکہ اس وقت اس کی باتیں انہیں اندر سے جھنجھوڑ گئی تھیں۔

''ارے واہ، یہ آدمی بھی کیسے گرگٹ کی طرح رنگ بدلتے ہیں۔ کل تک میں ایک خوش نصیب و عقلمند عورت تھی، پیار کرنے والی، خیال رکھنے والی ماں سمجھی جاتی تھی، آج ان کو تباہ و برباد کرنے والی میں ہی ہوں؟ واہ بھی واہ۔'' گل جاناں بری طرح کھسیا کر گویا ہوئی تھیں۔

''خاموش رہو، جا کر دیکھو کھانا تیار ہوا یا نہیں۔'' شہباز خان نے خوفناک تیوروں سے انہیں گھورتے ہوئے کہا تو وہ غصے سے وہاں سے نکل گئی تھیں۔ شہباز خان اس کے قریب آ کر بیٹھ گئے۔

''بابا جان، میں اسے چھوڑوں گا نہیں، شکست میں نے کبھی تسلیم نہیں کی۔ کیا نام ہے اس کا؟ آں..... ہاں..... صارم؟'' اس نے گہرے انداز میں کچھ دیر سوچا پھر پرسوچ انداز میں غرایا۔

''جلدی نہیں، جلدی نہیں، اب بہت سوچ سمجھ کر بات کرنی ہو گی۔ ہم غلطی پر غلطی کیے جا رہے ہیں۔'' انہوں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر تیز لہجے میں کہا۔

''نہیں، مجھ سے اب صبر یا انتظار قطعی نہیں ہو گا۔''

☆☆☆

ان جھیل سی گہری آنکھوں میں

اک شام کہیں آباد تو ہو

اس کنارے پل دو پل

اک خواب کا نیلا پھول کھلے

وہ پھول بہادیں لہروں میں

اک روز کبھی ہم شام ڈھلے

اس پھول کے بہتے رنگوں میں

جس وقت لرزتا چاند چلے

اس وقت کہیں ان آنکھوں میں

اس گزرے پل کی یاد تو ہو

پھر چاہے عمر سمندر کی ہر موج پریشاں ہو جائے

پھر چاہے آنکھ دریچے سے

پھر چاہے پھول کے چہرے پر

ہر درد نمایاں ہو جائے

اس جھیل کنارے پل دو پل

وہ روپ نگر آباد تو ہو

وہ اسپتال سے گھر آیا تو خاصا پرسکون و خوش تھا۔

آج کئی ہفتوں بعد وہ پلاسٹر کی قید سے آزاد ہو کر اسٹک کے سہارے کے بجائے اپنے قدموں پر چل کر حویلی کی دہلیز عبور کر کے اندر داخل ہوا تھا۔ حویلی میں جشن کا سماں تھا، بابا جانی اور بی بی جان کی خوشی دیدنی تھی۔ صدقے وخیرات دینے سے ان کے ہاتھ رکتے نہ تھے۔

گلباز خان اس موقعے پر موجود نہیں تھے۔ کسی زرعی مسئلے کے باعث گاؤں سے باہر گئے ہوئے تھے۔ وہ ہوتے تو صارم کے انکار کے باوجود بڑے دھوم دھام سے یادگار فنکشن کا اہتمام کرتے۔ کیونکہ وہ بی بی جان اور بابا جانی کو سختی سے منع کر چکا تھا تو وہ اس موقع پر کبھی نہیں مانتے اس کی کوئی دلیل کوئی جواز۔

آف وائٹ کلف شدہ سوٹ پر بلیک لیدر کی جیکٹ اور جوتوں میں وہ بہت عرصہ بعد شوخی سے مسکراتا کھلکھلاتا تر و تازہ وجیہہ وا سمارٹ لگ رہا تھا۔

بھابھو! اگر آپ گرم گرم کافی اپنے ہاتھوں سے بنا کر پلا دیں تو دعاؤں کی مستحق ہو جائیں گی۔" وہ اس کے قریب آ کر گنگناتا ہوا بولا۔

"صاف کیوں نہیں کہتے تمہیں تنہائی چاہیے۔" وہ اپنی برابر میں بیٹھی وِرشا کی جانب دیکھتے ہوئے معنی خیز لہجے میں شرارت سے بولی تھی۔

''آہ، بندہ اتنا خوش قسمت کہاں ہے۔'' صارم نے کن انکھیوں سے شنیل کے میرون شلوار سوٹ پر شنیل کا ہی ہمرنگ چادر نما دوپٹہ اوڑھے نگاہیں جھکائے بیٹھی ورشا کو دیکھ کر شوخی سے آہ بھری تھی۔ اس کے اس انداز سے ورشا کے چہرے پر گھبراہٹ سے چھا گئی تھی۔ جبکہ رانی گل بھی چونک کر بول اٹھی تھیں۔

''کیا مطلب؟''

''اوہ! مطلب پوچھنے والے لوگ میری ناپسندیدہ لوگوں کی لسٹ میں شامل ہیں۔ لہٰذا اگر آپ کو اس ''لسٹ'' سے بچنا ہے تو برائے کرام اپنی ڈکشنری سے یہ لفظ کھرچ کر پھینک دیجیے۔''

وہ بھی ایک کائیاں تھا، ورشا کے چہرے پر پھیلی گھبراہٹ و سراسیمگی اسے لطف سے دوچار کر گئی تھی۔ بھابھو کی پرتجسس، پراشتیاق نگاہوں کے سوال کو اس نے چالاکی سے موڑا تھا۔ وہ مسکراتی ہوئی کافی بنانے چلی گئیں۔

چائنا روز کی مہک سے فضا معطر و خوش کن تھی۔

ورشا اس کی بے باک و دہکتی نگاہیں اپنے چہرے پر محسوس کر کے سخت نروس ہو رہی تھی۔

لب خاموش تھے۔

نگاہوں کی سرگوشیاں اسے ستانے لگی تھیں۔

وہ خود سر تھی۔

ضدی

نڈر

اسے اپنی بولڈنیس پر از حد ناز تھا۔

جواب ہوا کی زد میں بکھرے پتوں کی طرح بے جان و بے وقعت تھا۔

''چلو، مبارک باد نہیں دو گی مجھے؟'' اس نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے ہاتھ بڑھا کر اس کا گلابی ہاتھ پکڑتے ہوئے خاصی سنجیدگی سے کہا۔ اس کی اس جسارت پر وہ بوکھلا اٹھی تھی۔ سینے میں دل کی رفتار تیز ہو گئی۔ دھڑکنیں یکدم ہی بے اعتدال ہو گئیں۔

لبوں پر مہر خامشی کے باوجود

گزر رہی ہیں جو اندر قیامتیں دیکھو

''ہوں..... تم مجھے مبارکباد کیوں دو گی، تمہارا مشن تو فیل ہو گیا ہے۔ پہلے تم نے مجھے پہاڑ پر سے گرا کر مارنا چاہا تھا، لیکن موت کو بھی معلوم ہے میں بہت ڈھیٹ اور ہٹ دھرم بندہ ہوں۔ اتنی آسانی سے جان نہیں دوں گا۔ سو وہ ایک ''ککّ'' لگا کر چلی گئی کہ بعد میں نمٹنا ہے۔ اور تمہاری خواہش ادھوری رہ گئی ہے بلکہ مراد بر آئی کہ اسٹک کا سہارا لینے پر مجبور ہو گیا تھا، اور آج وہی اصلی حالت میں لوٹ آیا اور تم جو چاہتی تھیں وہ نہ ہو سکا۔''

''آپ کسی پر طنز کرنا گھٹیا بلکہ رذیل حرکت سمجھتے ہیں۔'' ورشا نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے آہستگی سے کہا۔
اس کا ہاتھ بدستور اس کے ہاتھ میں تھا جس کو بڑے استحقاق سے اس نے تھام رکھا تھا۔
''ہاں، لیکن میں اس وقت طنز نہیں کر رہا، سچ بات کر رہا ہوں تم سے براہ راست بات کہنا طنز میں شمار ہوتا ہے۔؟''
''میں کیا جواب دے سکتی ہوں اس بات کا میں جھوٹ نہیں بولتی۔ اس وقت بھی نہیں بولوں گی کہ مجھے اب بھی کوئی پچھتاوا یا افسوس نہیں ہے۔ دنیا کا کوئی بھی مرد چاہے وہ کس قدر با اختیار و با حیثیت کیوں نہ ہو؟ اس کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اپنی من مانی و ہٹ دھرمی، حیثیت و مرتبے کے گھمنڈ میں دوسروں کی پگڑیاں و عزت اپنے قدموں تلے روند ڈالے۔ دوسروں کی حرمت و ناموس کو خاک آلود کر دے۔ کسی کو اس طرح حاصل کرنا محبت نہیں ہے۔ مجھے اس طرح حاصل کر کے آپ مسرور و شاداں ہیں۔ اپنی انا کی سرخروئی و ضد کو جیت کا تاج پہنا کر آپ کو کوئی ندامت و شرمندگی نہیں ہے تو مجھے بھی کوئی افسوس و ملال نہیں ہے۔'' اس کے سپاٹ لہجے میں تلخی و تندی عود کر آئی۔
''درست کہا ہے کسی نے، حسین چہرے کی کھوپڑی میں بھوسا بھرا ہوتا ہے۔ حسن و عقل کی صدا کی دشمنی چل رہی ہے۔'' اس کی مکمل بات سننے کے بعد وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا تھا۔
''ہاتھ چھوڑیں میرا۔'' اس کے قہقہے میں تمسخر محسوس کر کے اسے اپنی سخت بے عزتی محسوس ہوئی تو اس نے ہاتھ چھڑانے کی سعی کی۔
''کیا اجنبیوں کی طرح باتیں کرتی ہو، میرا، میرا کی رٹ چھوڑ دو۔ کوئی علیحدگی نہیں ہے ہم میں، لو تم میرا ہاتھ پکڑ لو، میں تمہیں کہوں گا میرا ہاتھ چھوڑ دو۔'' اس نے ہنستے ہوئے اپنا بھاری ہاتھ اس کی جانب بڑھایا۔
''ہونہہ، آپ تو ویسے بھی ماہر ہیں، ہاتھ پکڑنے اور پکڑانے میں۔''
جامعہ میں گزرے دنوں کے منظر اس کی نگاہوں میں گھومنے لگے جہاں وہ مختلف لڑکیوں کے ساتھ بانہوں میں بانہیں ڈالے، ہاتھوں میں ہاتھ جکڑے نسبتاً تنہا و سنسان گوشوں میں پایا جاتا تھا۔ اور اس کی یہ حرکتیں ہی اسے اس سے بدظن کیے رکھتی تھیں۔ اب بھی بے ساختہ اس کے منہ سے جلے بھنے انداز میں فقرے نکلے تھے۔
''ہمیشہ وہ باتیں یاد رکھنی چاہئیں جو باتیں ہمیں خوشی بخشتی ہوں۔ سکون و راحت فراہم کرتی ہوں، ایسی باتیں کیوں یاد رکھی جائیں جو آپ کو ڈیپریسڈ کر کے ٹینشن میں مبتلا کر دیں۔ آپ کا چین و قرار لوٹ کر ذہنی و شکی بنا ڈالیں۔ بھول کیوں نہیں جاتیں تم، میرا ماضی، حالانکہ میں پروا نہیں کرتا۔ جیسا دیس، ویسا بھیس کے مصداق چلنے کا عادی ہوں میں۔ تم خواہ مخواہ خود کو بھی ٹینشن زدہ رکھتی ہو، اور مجھے بھی ڈیپریسڈ کر دیتی ہو۔'' اس نے اس کے گرد بازو ڈال کر خود سے قریب کرتے ہوئے کہا۔
''اگر میں ایسا کریکٹر رکھتی تو......؟'' اس نے کسمساتے ہوئے ترش ہو کر کہا۔
''تو پھر بھی میں تمہیں قبول کرتا ورشا، محبت عشق سمندر ہے۔ اتنی لامحدود جس کا کوئی کنارا نہیں ہوتا۔ محبت روح کا جذبہ ہے، جسم کی آرزو و خواہش نہیں۔ یہاں عشق کی ضیاء پاشیاں ہیں، ہوس کی تاریکیاں نہیں۔ محبت انسان کو فراخدل و وسعت نگاہ بخشتی ہے۔ مرد گمراہی میں کرتا ہے، عورت

اپنی وفا و محبت کی طاقت سے اسے سیدھے راستے پر لے آتی ہے، اسے اس کے ہر گناہ سمیت قبول کرتی ہے۔ تو کبھی ناسمجھی میں عورت بھی ڈگمگا سکتی ہے۔ ایسی عورت کی ناسمجھی و غلطیوں کو بھلا کر اس کے سر پر اپنی مردانگی و تحفظ کی چادر ڈھانپنا غیور و باحمیت مرد کی پہچان ہے اور میں ایسا کرتا۔''

اس کے سنجیدہ لہجے میں صداقت و پختگی تھی۔

''ہونہہ، کہنے اور کرنے میں اتنا ہی فرق ہے جتنا دن اور رات میں ہے۔''

''تمہیں سمجھانا و یقین دلانا عبث ہے۔ میں نے شکست مان لی۔ لیکن اس قدر بدگمانی و خودسری خطرناک شے ہے۔ تم حالات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ یہ جانو کہ تم کس وجہ سے یہاں ہو؟ دانشمند انسان وہی ہوتا ہے جو اپنے دماغ و شعور کا بروقت استعمال کرتا ہے۔ اس طرح وہ بہت ساری پریشانیوں، ندامتوں سے بچ جاتا ہے۔'' اس کی باتوں نے اس کا شگفتہ مزاج خراب کر ڈالا تھا۔ وہ اٹھ کے دور ہو کر بیٹھ گیا تھا۔

کمرے میں پھر سے خاموشی رقص کرنے لگی تھی۔ ورشا کو اپنے طرز عمل پر قطعی افسوس نہ تھا۔ ایک دم ہی زوردار آواز سے دروازہ کھلا تھا۔ اور زرگون خانم اندر داخل ہوئی تھی۔

''کب تک چھپاؤ گے اس قاتل کی بہن کو مجھ سے؟''

اندر داخل ہوتے ہی وہ چیخ کر صارم سے مخاطب ہوئی تھی۔ جبکہ اس کی کینہ توز نگاہیں ورشا کے حسین و دلکش چہرے پر جمی ہوئی تھیں جو چونک اٹھی تھی۔

''تمہیں تمیز کب آئے گی؟'' صارم تحمل سے گویا ہوا۔

''مر گئے مجھے تمیز سکھانے والے، واہ، یہاں سبریز کے قاتل کی بہن کے ساتھ عیش کیے جا رہے ہیں، مجھ سے تمیز کی بات کی جا رہی ہے؟ یہ محبت ہے تمہاری سبریز خان سے؟ جس کے بغیر تم ایک پل رہنا گوارہ نہیں کرتے تھے، اب اس کے قاتل کی بہن کے ساتھ.....''

''بھابو! بہتر ہوگا، آپ اسے یہاں سے لے جائیں تو.....''

اندر داخل ہوتی حیران و پریشان سی رانی گل اسے وہاں دیکھ کر گھبرا گئی تھی۔ صارم نے ان سے بھاپ اڑاتی کافی کا مگ لیتے ہوئے پرسکون انداز میں کہا۔

''چاچی! تمہیں میرے معاملے میں بولنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آج تو یہ میرے ہاتھ لگی ہے، مجھ سے اسے ایسے چھپایا جا رہا تھا گویا یہ لڑکی نہیں، خزانے کا نقشہ ہے۔ اس گھر کا دستور بھی کتنا عجیب و انوکھا ہے۔ قاتل کی بہن سے بدلہ لینے کے بجائے، اسے سروں پر بٹھایا جا رہا ہے۔ ناز نخرے اٹھائے جا رہے ہیں۔ سب بے غیرت و بے ضمیر ہو گئے ہیں۔ اگر ہوتے غیرت مند اور باحمیت تو اس لڑکی کو اسی وقت قتل کر کے سبریز خان کے برابر میں دفنا دیتے۔''

''پاگل ہو گئی ہو تم تمہیں کوئی چھوٹے بڑے کا لحاظ نہیں ہے، جو منہ میں آ رہا ہے بولے جا رہی ہو بلا سوچے سمجھے۔''

رانی گل نے آگے بڑھ کر اس کے شعلے اگلتے ہونٹوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

اس کے ہونٹوں سے نکلنے والے ایک ایک لفظ نے ورشا کے احساسات وسماعتوں پر جمی برف اس طرح پگھلا ڈالی تھی، گویا تیز آنچ جیسے پتھروں کو پگھلا ڈالے۔ اس کی سماعتوں میں دھماکے ہو رہے تھے، جسم میں سنسنی دوڑ گئی تھی۔

''وہ قاتل کی بہن تھی۔ سبزیز خان کے قاتل کی بہن۔''

رانی گل، بری طرح واویلا کرتی زرگون خانم کو زبردستی گھسیٹ کر لے گئی تھیں۔

''ورشا..... ورشا! کیا ہوا؟'' صارم نے اس کی متوحش آنکھوں میں جھانکتے ہوئے نارمل انداز میں استفسار کیا۔

☆☆☆

''وہ کیا کہہ رہی تھی؟'' اس نے کانپتے لہجے، حیرانگی سے پھٹی نگاہیں اس کے چہرے پر گاڑتے ہوئے سوال کیا تھا۔

''بیٹھو..... پلیز، ٹیک اٹ ایزی ورشے!'' اس وقت وہ اسے بہت معصوم لگی۔ کمسن خوفزدہ بچے کی مانند۔ بے ضرر، تنہا، کسی امان کی تلاش میں سہما ہوا وجود۔ اس نے مگ ٹیبل پر رکھ کر اس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر تسلی آمیز لہجے میں کہا۔

''فار گاڈ سیک! آپ مجھ سے کچھ نہ چھپائیں جو بھی سچ ہے مجھے بتائیں؟''

اس وقت وہ عجیب کیفیت میں تھی۔ صارم کا لہجہ، اس کی قربت، اس کے ہاتھوں میں اپنے ہاتھ، وہ کچھ محسوس ہی نہ کر رہی تھی۔

اس پر ایک جنون سوار تھا۔

ایک وحشت حاوی تھی!

بہت سے لفظ ذہن میں گڈمڈ ہونے لگے تھے۔

''کیا ہوا بچے؟ کیوں پریشان ہو رہے ہو؟''

رانی گل کے ہمراہ بی بی جان گھبرائی، بوکھلائی سی داخل ہوئی تھیں۔

زرگون خانم کو بمشکل اس کے کمرے میں چھوڑ کر وہ بی بی جان کو صورت حال بتا کر اپنے ساتھ لے کر آ گئی تھی۔ ورشا کو اس گھر میں آئے کچھ ہی دن ہوئے تھے۔ اور رانی گل کو وہ خاموش، گم صم رہنے والی بہت پسند آئی تھی۔ وہ اسے بہنوں کی طرح چاہنے لگی تھی۔ اب بھی اس کی ہراساں و پریشان صورت اس سے دیکھی نہ گئی تھی۔ اس لیے وہ بی بی جان کو بلا کر لے آئی تھی۔

''بی بی جان! کوئی بات نہیں ہے۔ آپ پریشان مت ہوں۔'' صارم ان کی طرف بڑھ کر اطمینان سے بولا تھا۔ جبکہ انہوں نے اسے لپٹا لیا تھا۔

''میرا دل گھبرا رہا ہے۔'' یکدم ہی بی بی جان کی آغوش میں اسے پورا کمرہ قریب کھڑا صارم، رانی گل، سب گول گول گھومتے ہوئے محسوس ہونے لگے۔ دل کی رفتار تھی کہ بڑھتی ہی جا رہی تھی۔

چند لمحوں بعد وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو چکی تھی۔

''ارے! یہ تو بے ہوش ہو گئی۔'' بی بی جان پریشان لہجے میں گھبرا کر گویا ہوئیں جبکہ صارم نے اسے قریبی صوفے پر لٹا دیا تھا۔ رانی گل پانی

لیتے کمرے سے باہر گئی تھی۔

''بی بی جان! آپ پریشان مت ہوں۔ کچھ نہیں ہوا اسے۔ ابھی ہوش میں آجائے گی۔''

''پریشان کیوں نہ ہوں؟ اگر یہی گھر کے حالات رہے تو کیا ہوگا؟''

''کچھ بھی نہیں ہوگا، اچھا ہے اسے جلد از جلد صورتحال کی سچائی کا احساس ہو جائے۔ بھلا کب تک یہ سچائی سے بچ سکتی ہے۔''

''تم اسے اپنے ساتھ کراچی لے جاؤ۔ اس طرح یہ بھی سکون سے رہے گی اور گھر میں بھی بدمزگی پیدا نہیں ہوگی۔'' انہوں نے کچھ دیر سوچ کر کہا۔

''نہیں بی بی جان! ابھی نہیں۔ میں ابھی بزنس کے متعلق کچھ کورسز کے سلسلے میں ملک سے باہر جاؤں گا۔ جب تک یہ یہیں رہے گی۔''

''نہیں..... میرے بچے، جب تک بڑی بہو اور زرگون خانم اسے جلا جلا کر مار ڈالیں گی۔''

''سونا آگ میں جل کر ہی کندن بنتا ہے۔ میری طرف سے ان کے دل میں ارمان پورے نہ ہوئے تھے۔ اب میں انہیں مایوس نہیں کرنا چاہتا۔ میری پرورش میں مورے نے بھی کچھ حق ادا کیا تھا اور اس ''حق'' کے حوالے سے ورشا ان کی بہو ہے۔ ساس اور بہو کے درمیان میں نہیں آنا چاہتا۔''

☆☆☆

''بڑے خان! گھر میں کیا تماشا لگا رکھا ہے آپ کی چہیتی نے؟ لگتا ہے جب سے بیٹی نے منہ کالا کیا ہے اس وقت سے اس عورت کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔''

گل خانم، آج کل گاؤں کی بچیوں کو بلا کر دین کی باتیں سمجھانے لگی تھیں۔ ان کو نیک اور اچھی باتوں کا درس دیتیں، نماز ادا کرنے کے فوائد، قضا کرنے کا عذاب اور بھی دوسرے بے شمار ایسے درس تھے کہ جن کی تبلیغ کی اس وقت اشد ضرورت تھی۔

وہ بے حد نرم لہجے میں میٹھے اور اپنائیت بھرے انداز میں بچیوں کو سمجھاتی تھیں۔

کم عرصے میں لڑکیوں کے علاوہ ان کی مائیں بھی وہاں آنے لگی تھیں۔ گل خانم اپنا دکھ ان لمحوں میں بھول جایا کرتی تھیں۔ یہ وقت انہیں اپنی زندگی کا حسین ترین حصہ لگتا تھا۔ اور گل جاناں کو ان کی یہ مصروفیت اور اطمینان و سکون ایک آنکھ نہ بھا رہا تھا۔ پہلے پہل تو انہوں نے حسب عادت ان کو باز رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی مگر وہ اب کہاں ان کو خاطر میں لاتی تھیں۔ ورشا کے ساتھ ہونے والے ظلم نے ان کی ممتا کو نڈر اور مضبوط بنا دیا تھا۔ اب ان سے کسی سمجھوتے پر وہ راضی نہ تھیں۔ گل جاناں کو ان کا یہ مضبوط و بے لچک انداز قطعی نہیں بھا رہا تھا۔ لیکن اس بار وہ بے بس ہو گئی تھیں کہ ان کی ''دانشمندی'' کو شوہر اور بیٹے نے سخت برا کہا تھا اور بڑے دونوں بیٹے احتجاج کے طور پر حویلی چھوڑ کر چلے گئے تھے لیکن وہ اب بھی خود کو غلط کہنے پر راضی نہ تھیں۔

''میں نے کچھ کہا ہے خان، آپ سے۔'' وہ ہنوز انہیں اخبار میں گم دیکھ کر ان کے قریب آکر قدرے طنزیہ و خشک لہجے میں بولیں تھیں۔

''اپنے مسئلے خود نمٹاؤ، میرا دماغ مت چاٹو۔'' وہ غصے میں انہیں جھڑک کر بولے۔

''ارے، آپ تو مجھے اس طرح ڈانٹ رہے ہیں جیسے میں اس حویلی کی مالک نہیں ہوں گھٹیا بھکارن ہوں۔'' وہ جل کر خاک ہو گئیں۔

"سبز قہوہ لے کر آؤ۔" انہوں نے جان چھڑانے والے انداز میں کہا جو گل جاناں بخوبی سمجھ گئی تھیں۔ وہ بڑبڑاتی ہوئی وہاں سے چلی آئیں۔ سامنے سے آتی سخاویہ کو دیکھ کران کا منہ ایسا ہی بن گیا تھا گویا زہر چبا لیا ہو پھر بھی اسے قہوہ بنا کرلانے کا حکم دے کر وہ آگے بڑھنے لگی تھیں کہ گل خانم کی نرم مگر سنجیدہ آواز نے ان کے قدم ساکن کر دیے۔

"نہیں، سخاویہ تم قہوہ نہیں بناؤ گی۔" سخاویہ نے حیرانگی سے ان کی جانب دیکھا تھا۔

"مجھے نہیں اس کے باپ کو طلب ہو رہی ہے۔"

"تم سے کہا گیا ہے۔ لہٰذا تم خود بنا کر لے جاؤ۔"

"واہ..... واہ! ملانی صاحبہ، روز ان جاہل گنوار عورتوں کو بلا کر بڑی کتابیں سناتی ہو؟ بہت دین کی باتیں بتاتی ہو، خاوند مجازی خدا ہوتا ہے۔ خاوند کو خوش رکھنے والی عورت جنت میں جائے گی۔ جو بیوی خاوند کے حکم کو نہیں مانتی اس پر فرشتے لعنت بھیجتے ہیں۔ اللہ ناراض ہو جاتا ہے۔ ان کے واسطے یہ سب کام فرض ہیں؟ تمہاری اولاد اور تم ان باتوں سے آزاد ہو؟"

"نہیں، نہ میں اپنے حقوق و فرائض سے بے بہرہ ہوں اور نہ میری اولاد بے ادب و نافرمان ہے۔ لیکن اس کا باپ اور میرا خاوند مجھے حکم دیتا تو کبھی خواب میں بھی ایسی بات نہیں ہوتی یا تم نے ہمیں اپنا سمجھا ہوتا تو مجال نہیں تھی انکار کی..... لیکن بات یہاں بیوی اور بیٹی کے فرض کی نہیں ایک بے رحم و سنگدل عورت کی ہٹ دھرمی کی ہے۔ تمہارے ہر ظلم، ہر ستم کو میں برداشت کر گئی۔ اپنے اندر کی عورت کو میں نے مار ڈالا تھا مگر افسوس، عورت تو مر گئی لیکن ماں نہ مر سکی۔"

☆☆☆

تین ماہ کا عرصہ بہت سرعت سے گزر رہا تھا۔ اور اس قلیل عرصے میں چند دنوں بعد ہی اسے اپنی جذباتی حماقت و بیوقوفی کا احساس ہر ہر لمحے ہوا تھا۔ اس نے جسے ایک مکمل انسان، انسانیت و شرافت کا پیکر سمجھا تھا، وہ جلد ہی اپنی اصلیت و خباثت پر اتر آیا تھا۔ اس کی ذات کی وہ پستیاں و غلاظتیں اسے متوحش و ہراساں کر گئی تھیں۔ شمشیر خان کی خاطر اس نے باپ سے زیادہ چاہنے والے چچا کو بے عزت کیا تھا۔ ان کی غیرت و محبتوں کو ٹھوکر مار کر چلی آئی تھی۔ اپنے لیے ہر دم فکر مند و چاہنے والی، فرحت آپ کو اس نے اپنا دشمن سمجھ لیا تھا۔ کتنی عاقبت اندیش و قیافہ شناس تھیں وہ۔ انہوں نے کس قدر اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی، کتنی اس کی دیوانگی سے نالاں تھیں، چچا جان نے بھی ہر ممکن کوشش کی تھی کہ وہ شمشیر خان کے سحر سے آزاد ہو جائے لیکن وہ باشعور اور اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود کسی کم عمر لڑکی کی طرح نا سمجھ و احمق بن گئی تھی۔

محبت و بے خودی کا طوفان جذبات میں کچھ اس طرح برپا ہوا تھا کہ وہ وقتی طور پر سب کچھ ہی بھلا بیٹھی تھی۔

اب سب یاد آیا تو وقت گزر چکا تھا۔ بے رحم و بے پروا وقت بھلا کبھی کسی کے لیے رکا ہے؟ طوفان تھم چکا تھا۔ جذبات کی شر انگیزیوں نے اسے ساحل سے دور گرداب میں لا پھنسایا تھا۔ جہاں وہ دھنستی جا رہی تھی۔ ہر سمت اندھیرا تھا۔

وحشتوں کی منہ زوریاں تھیں۔

پچھتاووں کی گرفت۔

آنسوؤں کی روانی جہاں اس کے رخساروں پر مسکن بنا چکی تھی۔

شمشیر خان کی عیاش فطرت، رنگین مزاجی کب تک اس سے مخفی رہ سکتی تھی؟ وہ مرد تھا؟ اخلاق باختہ وبدکردار..... اسے اس کی دلی رنجیدگی و احساسات کی پروا بالکل نہیں تھی اور نہ ہی اس نے اس سے چھپنے یا پوشیدہ رہنے کی سعی کی تھی۔

آج بھی وہ پورے ایک ہفتے بعد آیا تھا۔ اسے دیکھ کر کائنات بپھر اٹھی تھی۔

''میں کہاں گیا تھا؟ کیوں گیا تھا؟ یہ سوال آج تک میری ماں کو مجھ سے پوچھنے کی ہمت نہیں ہوئی، تو دو ٹکے کی عورت! مجھ سے پوچھتی ہے میں کہاں گیا تھا؟'' اس کے استفسار پر وہ غیظ وغضب سے دہاڑا تھا۔

''آپ..... آپ! کس انداز میں بات کر رہے ہیں؟ آپ کی ماں، آپ سے بے پروائی کا مظاہرہ کر سکتی ہیں لیکن میں نہیں، کیونکہ میں بیوی ہوں۔ میرا پرسنٹ، فیوچر آپ سے وابستہ ہے۔'' وہ اس کے حقارت آمیز رویے پر ششدر رہ گئی تھی۔

''اوقات میں رہو اپنی، تم جیسی ہزاروں عورتیں میری زندگی میں آ کر نکل گئیں۔''

''مجھے ان گھٹیا عورتوں کی لسٹ میں شامل کرنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ میں باوقار طریقے سے آپ کی زندگی میں شامل ہوئی ہوں۔ مجھ سے محبت کا دعویٰ تھا آپ کو.....''

''آہاہاہا..... مجھے محبت کا دعویٰ تھا یا تم خود پکے ہوئے پھل کی طرح میری آغوش میں گرنے کو بے قرار تھیں۔ شکر کرو، عادت کے برخلاف تمہیں اپنا نام دیا ہے۔ ورنہ شمشیر خان کے لیے کسی لڑکی کو حاصل کرنا کوئی مشکل کام نہیں ہے اور یہ بھی تمہاری خوش بختی ہے کہ تم ابھی بھی یہاں نظر آ رہی ہو ورنہ شمشیر خان ایک دفعہ کے بعد دوبارہ کسی عورت کو برداشت نہیں کرتا۔ مجھے کلیوں سے عشق ہے پھولوں کو پسند نہیں کرتا۔''

اس کا لہجہ نہایت توہین آمیز وتحقیرانہ تھا۔ کائنات بالکل ساکت ہو گئی تھی۔ اسے اپنے حسن، اس کے عشق پر بہت فخر وغرور تھا۔ وہ کیا کہہ رہا تھا؟ کتنا ذلت آمیز تھا سب۔

''آہ..... اتنی جلدی تو آرٹیفیشل جیولری سے بھی کلر نہیں اڑتا جتنی جلد آپ نے خود پر چڑھایا ہوا مکر وفریب کا لبادہ اتار پھینکا ہے۔'' کچھ دیر بعد وہ خود پر قابو پا کر بولی۔

''مجھے بک بک سننے کی عادت نہیں ہے۔ اگر اس گھر میں رہنا چاہتی ہو تو آنکھیں اور کان بند کر کے رہو ورنہ یہاں سے جا سکتی ہو۔''

''میں اپنی ساری کشتیاں جلا کر اس سمت آئی ہوں خان! اب مجھے یہیں رہنا ہے۔ اپنی بقا، اپنے حقوق کی جنگ لڑنی ہے مجھے..... اور میں نے تمہیں پایا ہے تو کھونے نہیں دوں گی۔''

اس نے بہتے آنسو صاف کر کے ایک عزم سے سوچا تھا۔ جبکہ شمشیر خان بے خبر سو چکا تھا۔

☆☆☆

کسی کو کیا بتائیں ہم کہ
ہم کیسے ہیں ہم ایسے ہیں
جیسے کہ جلا ہوا وجود
جیسے تازہ زخم
جیسے دکھا ہوا دل جو ہوا سے بھی
دکھ جائے اور شبنم سے بھی
جیسے کوئی خالی لوٹائی گئی دعا
جیسے کوئی ہجر کی رات
جس کی کوئی سحر نہ ہو
جیسے کوئی اوگن ہمارا.....!

آگہی ایک عذاب مسلسل ہے۔

کس قدر بے فکر پرسکون زندگی ہوتی ہے۔ جب ہم اس چار حرفی لفظ "آگہی" سے ناآشنا، ناواقف رہتے ہیں۔ وہ بھی کچھ عرصہ قبل خود کو مظلوم وصارم کو ظالم سمجھتی رہی تھی۔

حالات کی ستم ظریفیوں!

وقت کی بے رخیوں!

اور اپنے ہی بھائی کے ظلم کا احساس نہ کر سکی تھی وہ!

آنکھیں، کان، دماغ۔

شعور پر اس نے پہرے بٹھا دیے تھے۔ اپنی انا کی شکست اسے برداشت نہ ہوئی تھی اور نتیجتاً اس زوردار انداز میں زمین بوس ہوئی تھی کہ شیشہ ذات چکنا چور ہو گیا تھا۔ ندامتوں اور شرمندگی نے کہیں کا نہ رکھا تھا۔

کس قدر روشن ضمیر، انصاف پسند، نیک لوگ تھے کہ محض اسے ذلت ورسوائی سے بچانے کی خاطر اپنی گھر کی بہو بنا کر لائے تھے۔ جس گھرانے کی خوشیوں کو ڈسنے والا اس کا بھائی تھا۔ اس نفسا نفسی، خود غرضی و خود پرستی کے دور میں جب سگے بھی رشتے توڑ ڈالتے ہیں۔ خلوص پامال کرتے ہیں، وفا پرستی پر بے رخی و بے ثباتی کو ترجیح دی جاتی ہے۔

ایسے بے مہر و سنگدل وقت میں، وہ انسانیت واخلاقیات کی مشعل ہاتھ میں لیے اس کی طرف بڑھے تھے۔ اسے اپنے سگوں سے بڑھ کر عزت و مان دیا تھا۔

اس ستم گر طوطا چشم وقت میں اس قدر وضعدار، ایثار پسند، رحم دل و معاف کرنے کا بلند حوصلہ و اعلیٰ ظرف رکھنے والے لوگ موجود و سلامت تھے۔

اور شاید ایسے نیک و فرشتہ صفت لوگوں کے بابرکت و پاک باطن کے باعث گناہوں کی دلدل میں غرق، نافرمانیوں کی آلودگی سے سیاہ دنیا، ابھی بھی قائم و دائم تھی۔

بی بی جان اور شیریں گل سے بے حد اصرار کر کے اس نے ساری صورتحال معلوم کرلی تھی۔ صارم اسی دن ان سے ملے بغیر کراچی چلا گیا تھا۔ جہاں سے ایک ہفتے بعد وہ مغربی ممالک کے ٹور پر نکل گیا تھا۔ وہ سنجیدگی سے بزنس اسٹیبلش کرنے کا ارادہ کر چکا تھا۔ اس لیے کچھ اسی سلسلے میں وہ باہر کے ملکوں کے تجارتی رجحان کی چھان بین کے لیے نکل گیا تھا۔ لیکن اسے لگ رہا تھا کہ وہ اس سے دامن بچا کر گیا ہے۔ شاید وہ خفا تھا اس سے۔ اس کی غیر موجودگی اسے اپنی فضول و احمقانہ زیادتیوں اور بد تمیزیوں کا احساس دلاتی رہی اور وہ خود کو کم سے کمتر سمجھنے لگی۔ وہ بد کردار اور چھچھورا شخص جس کو کبھی اس نے قابل اعتنا، نہ جانا تھا اب بہت معتبر و عظیم نظر آنے لگا تھا۔ اور کیوں نہ آتا۔ بہت صبر و تحمل، اعلیٰ ظرفی و بردباری سے اس نے اس کی نفرت، تذلیل و تضحیک، ہتک آمیز گفتگو برداشت کر کے ثبوت دیا تھا کہ وہ بھی اس اعلیٰ و نجیب الطرفین خاندان کا باوقار و باحمیت مرد ہے۔ اپنی دسترس میں آنے والی شے بھی جس کے لیے ممنوع تھی۔

ورشا یکدم ہی از حد احسانوں اور نوازشوں کے زیر بار خود کو سمجھنے لگی تھی۔

ضمیر کا بوجھ، احساسات کی گرانی، اس سے برداشت نہ ہوئی اور بہت خاموشی سے اس نے ہتھیار ڈال دیے تھے۔ گل زیبا اور زرگون کے سامنے۔

اپنے بھائی کے قاتل ہونے کا ازالہ اسے ہی کرنا تھا۔

بے شک وہ لوگ بہت مہربان اور اچھے لوگ تھے۔ لیکن احسان فراموش اور کم ظرف وہ بھی نہ تھی۔ مگر یہ خان کی موت کا ازالہ وہ ہرگز نہ کر سکتی تھی کہ مردے زندہ کرنا ناممکن بات ہے سو ان ماں، بیٹی کی گالیاں، طعنے، کوسنے، بہت خاموشی سے سنتی تھی۔

انا.....

عزت نفس!

خودداری!

ہر جذبے کو اس نے کچل ڈالا تھا۔ اپنا آپ راکھ کر لیا تھا۔

گو کہ بی بی جان، شیریں گل اس کا بہت خیال رکھتی تھیں لیکن ایک ہی حویلی میں رہتے ہوئے دو دن میں کئی مرتبہ ان دونوں سے ٹکراتی تھی اور جواب میں ہر بار ہی وہ دل کی بھڑاس نکالا کرتی تھیں۔

"کیا سوچ رہی ہو بچے؟ چائے پڑی ٹھنڈی ہو جائے گی۔" بی بی جان کی نرم و محبت سے چور آواز اسے خیالوں کی دنیا سے کھینچ لائی تو اس نے گہرا سانس لے کر کپ تھاما۔

''یہ سوچیں ہی تو انسان کے اختیار میں ہوتی ہیں بی بی جان ورنہ انسان بے چارا تو خاصا بے اختیار و بے بس بندہ ہے۔'' اس نے دھیمے سے مسکرا کر کہا۔

''سچ ہے لیکن رب کے ہر کام میں مصلحت ہوتی ہے۔ اگر انسانوں کو سارے اختیارات حاصل ہو جاتے تو دنیا کب کی فنا ہو چکی تھی۔ کسی کو کھانے پر اختیار ملتا، کسی کو پانی پر، کسی کے اختیار میں روزی ہوتی، کسی کے اختیار میں رزق تو بچے، لوگ اپنے بڑائی کے زعم میں ایک دوسرے کو سسکا سسکا کر مار ڈالتے۔''

''بالکل ٹھیک کہا بی بی جان! آپ نے، اب جیسے صارم کے اختیار میں ہے اپنی مرضی کرنا، تو دیکھیں وہ کتنے اطمینان سے دو مہینے سے ہلکوں پھلکوں کی سیر کر رہے ہیں۔ نہ آپ کی اور بابا جانی کی فکر ہے اور نہ ہی گھر اور گھر والی کا خیال ہے۔ ایسا بھی بھلا کوئی کرتا ہے اگر جانا ہی تھا تو ورشا کو بھی ساتھ لے جاتا۔'' گل شیریں ان کے قریب بیٹھتے ہوئے گفتگو میں حصہ لینے لگی۔

''وہ تو ہے سدا کا بے پروا اور بے فکر، لیکن اب ورشے اسے، اس کی ذمہ داری کا احساس دلائے گی کہ وہ اب اپنا لاابالی پن وغیرہ ذمے دار رویہ چھوڑ کر زندگی کے تقاضوں کو سمجھے، نئے بندھن کا احساس کرے۔ وہ اب ایک نئے خاندان کی بنیاد رکھ چکا ہے۔ اس کا یہ رویہ بالکل نہیں چلے گا۔'' انہوں نے مسکراتے ہوئے اپنائیت بھرے پرخلوص لہجے میں ورشا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''یہ تو پھر ہی ہوتا ہو بیگم، بی بی جان کے نیک ارادے۔'' شیریں گل کے شرارتی لہجے پر وہ مسکرا کر رہ گئی۔

☆☆☆

دو چار نہیں مجھ کو فقط ایک بتا دو

انسان جو باہر سے بھی اندر کی طرح ہو!

سمندر خان جو صمد خان کے ساتھ بیٹھ کر بے فکری سے نشے سے بھرے سگریٹ پی رہا تھا۔ اسے ڈیرے پر موجود دیکھ کر وہ بوکھلا کر اٹھ کھڑا ہوا تھا اور ساتھ ہی صمد خان بھی۔

''کیا کان اور زبان سے بالکل ہی چوپٹ ہو گئے ہو دونوں؟''

''بس...... سلام بیگم صاحب، آپ یہاں کیوں آئی ہیں؟''

''تم کون ہوتے ہو یہ سوال مجھ سے پوچھنے والے؟ خان کہاں ہے تمہارا؟''

''وہ...... وہ! وہ بیگم صاحب، خان اندر نہیں ہے۔'' اس کے بگڑے تیور اور جارحانہ انداز دیکھ کر سمندر خان حواس باختہ ہو گیا تھا جبکہ صمد خان اسے سلام کر کے وہاں سے باہر چلا گیا تھا کہ وہ ڈرائیونگ کے فارغ اوقات میں یہاں کی چوکیداری کے فرائض انجام دیتا تھا۔

''جھوٹ نہیں بولو مجھ سے۔ وہ اندر ہی ہے۔'' سمندر خان کی بوکھلاہٹ دو سراسیمگی ہراساں نگاہوں سے اندر کی جانب دیکھنا اسے لمحے بھر میں یاور کروا گیا تھا کہ شمشیر خان اندر ہی ہے۔

"نہیں بیگم صاحب، خان اندر نہیں ہے۔ خان تو ایک ہفتے سے شہر سے باہر گیا ہوا ہے۔" اسے اندر کی جانب قدم بڑھاتے دیکھ کر وہ سرعت سے اس کی راہ میں حائل ہوا تھا۔

"میری راہ سے ہٹ جاؤ۔ یاد رکھنا طوفان سے زیادہ وہ عورت تباہ کن ہوتی ہے جس کے اعتماد کو جھوٹی محبت کے جھانسے میں پامال کیا گیا ہو۔"

کائنات نے غضب ناک نگاہوں سے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ جواب میں وہ گینڈے جیسی جسامت رکھنے والا سمندر خان جس کی بڑی بڑی مونچھیں اور سرخ آنکھیں دیکھ کر لوگ خوف زدہ ہو جایا کرتے تھے، اس کے آگے ہاتھ جوڑ کر گلوگیر لہجے میں التجائیں کرنے لگا۔

"ہماری جان پر رحم کرو بیگم صاحب، صاحب مجھے جان سے مار ڈالے گا، بلکہ زندہ دفن کر دے گا اور آپ کو بھی زندہ نہیں چھوڑے گا۔"

"ہونہہ..... اب زندہ رہنے کی امنگ کس کو ہے۔ فی الحال تم مجھے اندر جانے سے نہیں روک سکتے۔" اس کی بلند آواز وہ وحشت لہجہ سرائے کے خاموش در و دیوار میں گونج اٹھا تھا۔

"کون شور کر رہا ہے؟" اندر سے شمشیر خان دہاڑتا ہوا برآمد ہوا تھا اور کائنات کو سامنے دیکھ کر پہلے تو لمحے بھر کو اسکی سرخ سرخ بہکی نگاہوں میں استعجاب و بے یقینی کی چمک ابھری پھر فوراً اسکی جگہ قہر و طیش نے لے لی۔ سمندر خان کی روح فنا ہو گئی تھی۔

"تم، کس کی اجازت سے گھر سے قدم نکالا ہے تم نے؟"

"جن عورتوں کے شوہر ہفتوں گھر سے بلا اجازت، بغیر بتائے غائب رہتے ہیں، پھر ایسی عورتوں کو کسی کی اجازت کی ضرورت نہیں رہتی۔"

"مجھے بچپن سے ایسی عورتوں سے خار رہا ہے جو تقریروں کی شوقین ہوتی ہیں اور ایسی عورتیں بھی سخت زہر لگتی ہیں جو مرد سے زبان چلاتی ہیں اور ایسی عورت تو میں برداشت بھی نہیں کرتا جو خاوند کی بلا اجازت گھر سے نکل کر اس کا پیچھا کرے۔"

"عیش طبع، بدکردار! ہوس پرست مرد کو عورت کا صرف ایک ہی روپ اچھا لگتا ہے۔ اس کے گناہ آلود نفس کی بھوک مٹاتا وجود، کبھی نہ بجھنے والی ہوس کی آگ کو سرد کرتا وجود، تم جیسا آدمی کیا جانے گا، شرافت، عزت و وقار کیا شے ہے؟ تمہاری دولت و طاقت کے زور پر کھلونا بن جانے والی عورت تمہیں پسند ہے بس۔ اس معاشرے کے اسی فیصد گھٹیا ذہنیت، خود غرض مردوں کی طرح۔"

بہت کم عرصے میں اس کا ہرجائی پن، جھوٹ، فریب اور سب سے زیادہ اس کی رنگین مزاجی و عیاش طبیعت نے کائنات کے اعتماد، اس کی ذات کو اس طرح توڑ کر ریزہ ریزہ کیا تھا کہ وہ اپنی شیشہ ذات کی ایک کرچی بھی سمیٹ نہ پائی تھی۔ فرحت آپا کے اندیشے، چچا جان کے اعتراضات و افکار کے معنی اس کے سامنے اتنی جلدی آشکارا ہو جائیں گے۔ اسے معلوم ہوا تو کھیل ہی ختم ہو گیا تھا۔ وہ پھول پھول منڈلانے والا بھونرا بھلا کب تک اس پر قناعت کر سکتا تھا۔ اس کے آگے گلستان اور بھی تھے۔

لیکن کائنات نے عہد کر لیا تھا وہ اسے مزید گھر خراب کرنے نہیں دے گی۔ بدلے میں چاہے اسے وہ جان سے مار دے مگر وہ اب اس کے مقابلے پر اتر آئی تھی۔

"زبان چلانے کی کوشش آئندہ کی تو زندہ زمین میں گاڑ دوں گا۔ دفع ہو جاؤ یہاں سے۔" اس نے زوردار تھپڑ اس کے بائیں رخسار پر

مارتے ہوئے غضبناک انداز میں کہا۔

''کیا ہوا خان؟ باہر خاصی دیر لگا دی تم نے۔'' اندر سے جھومتی جھامتی ایک عورت نکلی تھی۔ کائنات نے سرخ رخسار پر ہاتھ رکھتے ہوئے نفرت سے ان دونوں کی طرف دیکھا۔ شمشیر خان نے غصے سے اس عورت سے اندر جانے کو کہا تھا۔ وہ فوراً ہی اندر چلی گئی تھی۔

''بیوی کی اس سے زیادہ توہین کیا ہو سکتی ہے کہ شوہر کے پہلو میں دوسری عورت نظر آئے۔ ایک ہفتے سے تمہاری یہ مصروفیات تھیں۔ جس نے تمہیں گھر آنے کا ٹائم ہی نہیں دیا؟ بہر کیف میں اب اس وقت تک اس جگہ سے نہیں جاؤں گی جب تک تم اس گھٹیا عورت کو یہاں سے دفع کر کے گھر نہیں چلو گے۔''

وہ ضدی واٹل لہجے میں بولتی ہوئی وہیں باہر پڑی چارپائی پر اطمینان سے بیٹھ گئی۔

''میں دوسرے دماغ کا بندہ ہوں۔ میں نے کچھ سوچ کر لحاظ کر لیا ہے۔ ورنہ میرا ہاتھ جب چلتا ہے تو رکتا نہیں ہے۔ بہتر یہی ہے کہ تم چلی جاؤ ورنہ......''

''تم کیا سمجھتے ہو میں ایک تھپڑ کھا کر ڈر جاؤں گی؟ اونہہ، عورت کو صرف ایک ڈر ہوتا ہے اور وہ ڈر ہے مرد کی تقسیم کا، اپنے حق کے بٹوارے کا، جو تم ان بازاری وستی گھٹیا عورتوں میں تقسیم کر چکے۔ میرا حق بانٹا جا رہا ہے۔ میری ذات کی نفی ہو گئی۔ میری انا، خودداری، وقار سب مٹ گیا۔ اب مجھے کوئی ڈر نہیں ہے تم مجھے مار دو، جان سے مار دو، زندہ دفن کر دو، مجھے نہ زندگی سے انسیت رہی ہے اور نہ ہی موت سے خوف محسوس ہوتا ہے۔''

اس کے ٹوٹے بکھرے دل کا، اعتماد کا، محبت کا لہو رس رہا تھا۔ آنکھوں میں وحشت، چہرے پر ایسا ہی جنون تھا کہ شمشیر خان نے مزید کچھ نہیں کہا۔ سمندر خان کو اندر موجود عورت کو واپس چھوڑ کر آنے کا حکم دیا اور خود اسے لے کر گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہ سیٹ سے ٹیک لگائے آنکھیں موندے اندر گرتے آنسوؤں پر قابو پانے کی جستجو میں مگن تھی۔ جانتی تھی وہ فاتح نہیں ہے، یہ سب اس نے ملازموں کی وجہ سے کیا ہے کہ ان کے سامنے اس کی بک بک بیٹنے کا روادار نہ تھا۔ دو دن بعد وہ ہوگا اور اس کی رنگ رلیاں ہوں گی۔ ہاں شاید...... وہ اس پر کوئی سخت پہرے لگوا دے گا۔

☆☆☆

''کیسی مکار و چالاک لڑکی ہے۔ آپ کا ہر حکم کتنی سعادت مندی سے مانتی ہے۔ کسی بات پر چوں و چرا نہیں کرتی۔ حد ہوتی ہے بے نیازی و بے غیرتی کی۔ لیکن اس پر تو لگتا ہے ہماری کڑوی سے کڑوی بات کا بھی کوئی اثر نہیں ہوتا۔'' زرگون خانم گل زیبا کے پاس لیٹی ہوئی ورشا کے متعلق استعجابیہ لہجے میں بات چیت کر رہی تھی۔

''میرا حکم مانے گی کیوں نہیں، جانتی ہے پوری حویلی میں میری حکمرانی چلتی ہے۔ ذرا بھی تیزی دکھائی تو چٹیا پکڑ کر باہر نہ کر دوں گی۔'' گل زیبا چھالیہ چباتی ہوئی بڑے فخریہ لہجے میں بولیں۔ بیٹی نے تائید میں گردن ہلائی تھی۔

''مجھے اس کا وجود برداشت نہیں ہوتا مور۔ اسے دیکھ کر مجھے اپنی شکست کا احساس ہوتا ہے۔ صارم کے چھن جانے کا دکھ چھری بن کر میری رگ رگ کو زخمی کر ڈالتا ہے۔''

''اب چھوڑو اس قصے کو، جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ وہ تمہارے نصیب میں ہی نہیں تھا۔ دو ماہ بعد گل رخ انگلینڈ سے آرہا ہے۔ بڑی ادے نے عرصہ دراز سے تمہیں اس کے لیے مانگ رکھا تھا مجھے معلوم تھا صارم مشکل سے ہاں کرے گا کیوں کہ وہ بچپن سے تمہیں بہن کہتا آیا ہے۔ میں نے سوچ لیا تھا اگر یہاں بات نہ بنی تو وہاں معاملہ فٹ ہو جائے گا۔ یہی سوچ کر میں نے ادے کو جواب نہیں دیا تھا۔ اب دیکھ لو...... میری ہوشیاری کام آئی یا نہیں۔''

''تمہاری چالاکی و مکاری کی حکومت اب ختم ہو گئی بیگم صاحبہ! حویلی کی حکمرانی تمہارے بس کی بات نہیں ہے۔'' گلباز خان اندر آتے ہوئے سخت لہجے میں گویا ہوئے تھے۔ انہیں اس طرح اندر آتے دیکھ کر دونوں ماں بیٹی حواس باختہ سی کھڑی ہو گئی تھیں۔

''آ..... آپ کب آئے خان؟''

''میں اندر کمرے میں صبح سے موجود ہوں۔ تمہاری تمام حرکتیں دیکھنے اور باتیں سننے کے لیے۔ آج مجھے محسوس ہو رہا ہے کتنا بدنصیب باپ اور نا اہل شوہر ہوں میں۔'' انہوں نے رنجیدہ و ملول سی نگاہیں بیوی اور گھبرائی گھبرائی سی بیٹی پر ڈالتے ہوئے تاسف سے کہا۔

''چالیس سال کی بے لوث و خلوص بھری رفاقت میں تمہاری اندر کی دوغلی و مفاد پرست عورت سدھر نہ سکی، اتنے عرصہ میں بے غرض محبت کی روشنی سیاہ اندھیروں میں اجالے بکھیر دیتی ہے اور اولاد بھی ان سیاہ اندھیروں کی پروردہ نکلی۔ بیٹے نے مایوس کیا ہی تھا، آج بیٹی کے منہ سے نکلنے والے اس مظلوم لڑکی کے خلاف ایک ایک لفظ نے مجھے از حد ایذا پہنچائی ہے۔''

''بابا جان...... بابا جان...... معاف کر دیں، میں پاگل ہو گئی تھی۔ دماغ خراب ہو گیا تھا میرا۔ مجھے معاف کر دیں۔ آئندہ آپ کو کوئی شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔'' گمراہی کی سیاہی ابھی اس کے اندر تک سرایت نہ کر سکی تھی۔ باپ کی شکستہ حالت نے اسے لمحے بھر میں تڑپا کر رکھ دیا تھا۔ بے اختیار وہ باپ کے آگے ہاتھ جوڑ کر رو پڑی تھی۔

''مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں ہے بچے! افسوس تو تمہاری ماں کی تربیت کا ہے۔''

''بابا جان! آپ فکر مند مت ہوں۔ میں آپ کو اب کبھی شکایت کا موقع نہ دوں گی۔'' زرگون خانم نے باپ سے معافی مانگ کر دل کا بوجھ و شرمندگی دور کر لی تھی۔

گل زیبا کو پہلی بار ندامت و خجالت کے احساسات نے گھیرا تھا۔ وہ لفظوں کو ترتیب دینے لگیں۔

☆☆☆

صارم کو حویلی سے گئے ہوئے چھ ماہ سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا تھا۔

بابا جانی اور بی بی جان کے علاوہ گلباز خان اور دوسرے لوگ بھی پریشان ہو گئے تھے کیونکہ اس نے ان سے بہت کم تعلق رکھا تھا کہ کبھی کبھی اس کا لیٹر آ جایا کرتا کہ وہ خیریت سے ہے اور ہر بار ملک بدلا ہوا ہوتا تھا جس سے اسکے مستقل قیام کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔

خط میں تقریباً سب کے لیے دعا ہوتی، اپنی خیریت بتائی جاتی۔ دوسروں کے لیے دعا سلام ہوتا مگر غافل تھا تو وہ صرف ورشا کی ذات سے کہ اس کا کوئی ذکر ہی نہ ہوتا۔

بی بی جان کو اس کی یہ بے پروائی و لاتعلقی بے سکون کیے ہوئے تھے۔ وہ اکثر اسے دلاسے دیتیں۔ ہر وقت اس کا دل بہلانے کی سعی میں رہتیں کہ وہ اس کی طرف سے فکر مند و پریشان نہ ہو۔ وہ دھیمے سے مسکرا کر الٹا انہیں سمجھانے لگتی، تسلی دینے لگتی اور خود کو خوش ظاہر کرتی۔ لیکن اس کے اندر ایک انجانی کسک جاگ اٹھتی تھی۔ وہ اس کے گریز، اجتناب اور بیگانگی و لاتعلقی کو خوب سمجھ رہی تھی۔ پہلے وہ اس کے مزاج کے موسم بھگت رہا تھا اور اب اس کی باری تھی نہ معلوم کب وہ صبح کا بھولا کس شام کو لوٹ کر آتا؟

ماحول پرسکون ہو گیا تھا۔ گل زیبا اور زرگون خانم کے مزاج ایک دم ہی تبدیل ہو گئے تھے۔ پہلے جیسے وقت بے وقت کے طعنے تشنے، کڑوی کسیلی باتیں اور طنز کے نشتر چلانے انہوں نے بند کر دیے تھے۔ اگر اچھی نہ تھیں تو بری بھی نہ رہی تھیں۔

گلباز خان از حد خیال رکھتے تھے اس کا۔ ان ہفتوں میں انہوں نے اسے اس قدر محبت اور اپنائیت دی تھی کہ کئی بار اس کی آنکھوں میں آنسو آ کر جم سے جاتے۔ اپنوں کی محبت کو ترسی ہوئی وہ ان کی بے غرض محبت کی مقروض ہوتی جا رہی تھی۔

شروع شروع میں جب وہ اس گھر میں آئی تھی تو گلریز خان اس کی صورت دیکھنے کا روادار نہ تھا وہ اس کی پرچھائیں سے بھی نالاں و گریزاں تھا۔

بابا جانی اور گلباز خان کے سامنے اس نے اس سے اپنی غلطی کی معافی مانگی تھی۔ جو جوش انتقام میں اس سے سرزد ہوئی تھی۔ اس نے خود اعتراف کیا تھا کہ اسے صارم نے مزید گناہ کرنے سے بچایا تھا ورنہ وہ اسے اپنے ساتھ لے کر نہ آتا تا اس کے بھروسے وہاں چھوڑ آتا تو وہ اس کے قتل کا منصوبہ تیار کر چکا تھا۔ شمشیر خان سے سریز خان کے قتل کا انتقام لینے کا اور صارم اس کا ارادہ بھانپ گیا تھا۔ تبھی اسے چھوڑ کر وہ نہیں گیا تھا۔ اپنے ساتھ لے کر وہاں سے نکلا تھا اور اس نے شکریہ کے طور پر اسی کو پہاڑ سے دھکا دے کر اس کی جان لینے کی کوشش کی تھی۔ کتنا تضاد تھا دونوں کے جذبات میں۔ گلریز کے اعتراف کے بعد تو وہ اس حد تک شرمندہ ہوئی کہ صارم سے تصور میں بھی سامنا کرنے سے ہچکچانے لگی۔

''بابا جانی! صارم کراچی میں ہے پچھلے ایک ماہ سے۔'' گلباز خان کی اطلاع پر وہ ششدر رہ گئے۔ پھر چند لمحے حیرت زدہ رہنے کے بعد گویا ہوئے۔

''تمہیں کس نے بتایا ہے؟''

''مجھے شک تھا۔ وہ اتنا عرصہ تنہا باہر نہیں رہ سکتا۔ میں نے خفیہ انداز میں تحقیق کروائی تو معلوم ہوا وہ پچھلے ماہ سے کراچی میں اپنے بنگلے میں موجود ہے۔''

''اوہ..... کیا مطلب ہوا اس کی اس حرکت کا؟ وہ ایسا کیوں کر رہا ہے؟''

''صاف ظاہر ہے بابا جانی وہ وِرشا سے یعنی ذمے داری سے بچنا چاہتا ہے۔ شاید ابھی تک وہ بیوی کو قبول نہیں کر سکا ہے۔ اسی لیے اس سے نہ بچنے کی خاطر وہ کراچی آنے کے باوجود نہ یہاں آیا اور نہ ہی اپنے آنے کی اطلاع دی ہے۔''

''ہوں..... '' خاصے متفکر انداز میں انہوں نے ہنکارا بھرا تھا۔

''بابا جانی! میرا خیال ہے ہمیں ورشا کو کراچی بھیج دینا چاہیے۔ میرا خیال ہے یہاں ہم سب لوگوں کے درمیان وہ رہیں گے تو ان کے فاصلے اور دوریاں ختم نہ ہو سکیں گی۔ وہاں تنہا ہوں گے تو کوئی جھجک شاید وہاں ان کی راہ میں حائل نہ ہو اور پھر سب سے زیادہ یہاں کے چپے چپے، گوشے گوشے سے سبریز خان کی یادیں وابستہ ہیں جنہیں فراموش کرنے میں خاصا وقت لگے گا اور اس وقت تک اس کا یہاں سے دور رہنا ہی بہتر و مفید ہے۔'' گلباز خان نے دلائل سے باپ کو صورتحال سمجھائی۔

''مجھے تم پر مکمل بھروسہ ہے خان! میں سمجھتا ہوں تمہارا ہر اٹھتا قدم اس حویلی اور اس کے مکینوں کی بہتری و اچھائی کے لیے اٹھتا ہے۔ تم جو بہتر سمجھو وہ کرو۔ ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ ہم صرف یہ چاہتے ہیں صارم کا گھر بس جائے، وہ اپنے گھر میں شاد و آباد رہے۔'' انہوں نے ان کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے آسودہ و پُر اعتماد لہجے میں کہا۔

☆☆☆

اس بن ویران ہے زندگی

اے کاش!

اسے کوئی کہہ دے

میرے اس دل کی اداس دھڑکنوں کا

پیغام اسے کہہ دے

کہہ دے کوئی اسے جاکر

مجھے تنہائیوں سے نجات دلا دے

اور بالکل ویسی شام میرے نام کر جائے

جس میں خوش ہے وہ خود بھی

فقط میرا اتنا کام کر جائے!

''اوہ کم آن یار، کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ پلیز چینج کرو خود کو، ایک ماہ سے تمہارا سنجیدہ سوچوں میں سراپا دیکھ کر وحشت ہونے لگی ہے۔ یار لگتا ہی نہیں کہ تم وہی صارم ہو، جو دوستوں کو ہنسایا کرتا تھا۔ سنجیدگی اور سوچ جس کے کبھی قریب سے بھی نہیں گزرتی تھی، آج نجانے آخر ماہ بعد تم بالکل ہی چینج ہو کر آئے ہو۔'' بہروز اس کے قریب بیٹھ کر جھنجھلاتے ہوئے لہجے میں بولا۔

''وقت انسان میں بہت ساری تبدیلیاں لے آتا ہے میری جان! اس کا حال سبریز جیسے جاں نثار اور چاہنے والے دوست کی جدائی سے ہوا ہے۔ سنبھلنے میں وقت تو لگتا ہی ہے۔'' افسردہ سے باسط نے سرد آہ بھر کر کہا۔

''زندگی اور موت تو اللہ کے اختیار میں ہوتی ہے یارو! جو لوگ چھوڑ کر چلے جائیں ان کو بھلانا اتنا آسان تو نہیں ہوتا لیکن بھلانا پڑتا ہے۔

کوشش کرو یار، اللہ صبر کرنے والوں کو بہت عزیز رکھتا ہے۔ بہت اجر دیتا ہے۔'' آفتاب نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر محبت سے کہا۔ وہ اس کی یہاں موجودگی کی اطلاع پاتے ہی آ گئے تھے۔ اور روز ان کی محفل جمنے لگی تھی۔

شروع شروع میں ان کے لبوں پر سبریز کی باتیں ہوتی تھیں، وہ سب ہی اس کی جواں موت پر افسردہ تھے۔ انہیں از حد ملال ہوا تھا کہ اپنی اعلیٰ صفات و بہترین اخلاق کی وجہ سے وہ ان لوگوں میں بھی ہر دلعزیز تھا۔ لیکن کب تک وہ ان کی گفتگو کا موضوع بنتا، رفتہ رفتہ اس کی ذات محو ہونے لگی تھی مگر صارم کو اسی طرح گم صم و سنجیدہ کھویا کھویا دیکھ کر انہیں اس کی فکر ہونے لگی تھی۔ ان کی یہی کوشش تھی کہ وہ واپس اپنی دنیا میں لوٹ آئے محض اس کی دلجوئی کی خاطر وہ اکثر و بیشتر اس کے پاس چکر لگا لیتے تھے۔ ورنہ تینوں ہی اپنے کاروبار شروع کر چکے تھے اور کچھ کچھ وقفے سے تینوں کی شادیاں بھی ہو گئی تھیں۔ یہ ان کی از حد بے غرض و سچی محبت کا ثبوت تھا کہ وہ گھریلو اور کاروباری مصروفیات کے باوجود اس کے پاس آتے، اس کا دل بہلانے کی کوششوں میں لگے رہتے تھے۔

''فدا حسین نظر نہیں آ رہا کہیں گیا ہوا ہے؟'' آفتاب نے کچن کے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے استفسار کیا تھا۔

''اس کی ماں کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ صبح اپنے گاؤں گیا ہے۔ خاصا وقت لگ سکتا ہے واپسی میں، اس لیے دو ماہ کی چھٹی لے گیا ہے۔''

''اوکے..... تمہیں کوئی پرابلم نہیں ہوگی، کھانا گھر پر ہی کھایا کرو گے، دیکھنا تمہاری بھابی کیسا لذیذ کھانا بناتی ہے۔ انسان دیر تک انگلیاں چاٹتا رہے۔'' آفتاب نے پُرجوش لہجے میں کہا۔

''کس کی؟ اپنی یا بھابی کی؟'' بہروز آنکھ دبا کر شرارت سے بولا۔

''بکواس نہیں کرو۔'' آفتاب کھسیا کر بولا تو وہ تینوں ہنسنے لگے۔

''نہیں کھانا تم، گھر پر کھاؤ گے، رانی سب سے بہتر کھانا بنانا جانتی ہے۔''

''ہونہہ، رانی سب سے بہتر کھانا بنانا جانتی ہے۔ وہ صرف ایک کام جانتی ہے اور وہ ہے تمہیں الو بنانا بس۔'' آفتاب نے باسط کو چڑ کر جواب دیا تھا۔

''دیکھو..... دیکھو منکی! آگے ایک لفظ بولا تو اچھا نہیں ہوگا۔''

''کیوں لڑ رہے ہو آپس میں، میرے پیارے بھائیو! صارم کی ذمے داری میرے اوپر ہے۔ لہٰذا آپ لوگ ٹرٹر بند کریں۔ صارم اپنی بھابی ثناء کے ہاتھوں کا پکا ہوا کھانا کھایا کرے گا۔'' بہروز نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

''ہاں..... آں کیا بات ہے؟ جس کو اگر ''ٹوائلٹ'' سے عشق کرنا ہے تو وہ ثناء بھابی کے ہاتھ کے بنے اسپیشل کھانے کھائے اور.....''

''اور ٹوائلٹ کے چکر لگائے۔'' باسط کے ساتھ آفتاب کا قہقہہ بھی خاصا بلند تھا۔

''کیا چکر ہے یار یہ؟'' صارم شرمندہ سے بہروز سے مسکرا کر مخاطب ہوا۔

''اس دن یہ دونوں گھر پر تھے۔ ثناء نے کھانے پر روک لیا اور پھر نہ معلوم کس طرح کھانے میں گڑبڑ ہو گئی۔''

''اور اس گڑبڑ نے ہمارے پیٹ میں ایسی گڑبڑ کر دی ہے ہم تینوں ٹوائلٹ کے ہو گئے۔ اس دن سے توبہ کی تھی ہم نے کہ بھوک برداشت کرلیں گے مگر کبھی اس کے گھر کھانا نہیں کھائیں گے۔''

''آفتاب! چھپل نہیں زیادہ، روز روز نہیں ہوتا ایسا۔''

''تم لوگوں کا بہت بہت شکریہ۔ میں کھانا آج کل زیادہ تر گھر سے باہر ہی کھاتا ہوں۔ صبح سے رات تک میرا وقت سائیٹ پر گزرتا ہے۔ فیکٹریز کے اسٹیبلش ہونے تک مجھے ذرا بھی ٹائم نہیں ہے۔ پھر انشاء اللہ ضرور ڈنر کروں گا تینوں کے ہاں۔'' صارم نے معذرت کی تھی۔

''او کے..... تم شادی کب کرو گے؟ یا درشا آفریدی کے فراق میں ابھی بھی مبتلا ہو؟ کیا تمہاری اس سے پھر کبھی ملاقات ہوئی ہے کیونکہ وہ بھی قبائلی تھی۔ سرحد سے ہی اس کا بھی تعلق تھا۔'' بہروز نے اشتیاق بھری نگاہوں سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ان دونوں کی نگاہیں بھی اس کی طرف اٹھ گئی تھیں۔

''بعض لوگ ہمیں اس وقت ملتے ہیں جب ان کا ملنا اور نہ ملنا بے معنی سا ہو جاتا ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی کو حاصل کرنے کے لیے دیوانے ہو جاتے ہیں۔ ہماری تمام جدوجہد، آرزوئیں، زور آوری صرف اور صرف اسے پانے کی سعی میں لگ جاتی ہیں۔ قرار لٹ جاتا ہے، سکون درہم برہم ہو جاتا ہے، دماغ ساتھ چھوڑنے لگتا ہے، زندگی بے رونق و بے مصرف نظر آنے لگتی ہے، اسے اپنی دسترس میں نہ پا کر ذہنی توازن بگڑنے لگتا ہے، بیزاری و زندگی سے مایوسی حد سے سوا ہو جاتی ہے تو پھر اچانک ہی وہ شے آپ کو مشروط طریقے سے ملتی ہے کہ اسے پانے کے لیے آپ کو اپنی عزیز ترین ہستی سے بچھڑنا پڑے تو پھر سب ہی غیر اہم و غیر دلچسپ لگتا ہے۔''

اس کے وجیہہ چہرے پر کچھ ایسی پرسوز، پرحزن کیفیت چھائی ہوئی تھی کہ وہ اس کے سنجیدہ تو لہجے، بکھرے لہجے کی، نا سمجھ آنے والی گفتگو کی، کوئی وضاحت طلب نہ کر سکے۔ وہ بھی کشمکش و پیچ میں مبتلا تھا کہ کس طرح انہیں بتائے کہ وہ جس کے متعلق گفتگو کر رہے ہیں، وہ جو کبھی اس کی حیات ہوا کرتی تھی، جس کے دلکش وجود نے اس کے اندر پہلی بار پیار کی شمع روشن کی تھی۔ وہ جان آرزو جسے پانا زیست کا حاصل ٹھہرا تھا۔

اب اس کی تھی بلکہ اس کی زرخرید تھی۔ کسی نادر ڈیکوریشن کی طرح وہ اسے خرید لایا تھا۔

وہ اس کی بیوی تھی۔

اس کی عزت و غیرت تھی۔

اسے پانے کے لیے جو اسے قربانی دینی پڑی تھی وہ بہت زیادہ تھی۔

شہریار خان سے زیادہ عزیز و محبوب وہ ہرگز نہ تھی۔

وہ انہیں کس طرح بتائے؟ جسے اس نے خوبصورت دعا کی طرح مانگا تھا، وہ نہایت بدصورت بددعا کی طرح اسے وصول ہوئی تھی۔

''میرے خیال میں تم آرام کرو، بہت ڈسٹرب لگ رہے ہو۔ ہم پھر اس موضوع پر بات کریں گے۔'' ان تینوں نے اس کی بدلتی کیفیت کو بغور نوٹ کرکے کہا۔

☆☆☆

''بی بی جان! میں وہاں تنہا نہیں جاؤں گی، آپ کو میرے ساتھ چلنا ہوگا۔''

گل بانو نے اسے تیاری کا حکم دے دیا تھا۔ اسے ان کے ساتھ کل روانہ ہونا تھا۔ وہاں تنہا رہنے کے خیال سے ہی وہ بوکھلائی ہوئی تھی اور اب انہیں راضی کرنے میں لگی ہوئی تھی۔

''نہیں بچے، میں گاؤں کے علاوہ کہیں اور رہ ہی نہیں سکتی۔ مجھے شروع سے گاؤں کے تازہ اور پرسکون ماحول کی عادت رہی ہے۔ ایک بار صارم زبردستی لے گیا تھا مجھے کراچی، اتنا شور و ہنگامہ دیکھ کر میرا دم گھٹنے لگا۔ طبیعت خراب ہوگئی تھی میری، دوسرے دن ہی میں واپس آگئی تھی اور توبہ کرلی تھی کہ کبھی لوٹ کر نہ جاؤں گی وہاں۔'' انہوں نے بال سنوارتے ہوئے اس سے شفقت سے کہا۔

''میں کیا کروں؟ میرے ساتھ جانے کو کوئی بھی راضی نہیں ہے۔''

''تم جاؤ، اپنا گھر بساؤ، آپس میں محبت و لگن پیدا کرو، دیکھو بچے، اینٹوں اور گارے سے چار دیواری اور چھت تو بن جاتی ہے۔ ماربل اور اسٹون سے محل دحویلیاں بھی وجود میں آجاتی ہیں مگر کوئی گھر ہو یا محل، حویلی ہو یا جھونپڑی، عورت کے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔ عورت ایک خاندان کو جنم دیتی ہے۔ ایک نسل کو پروان چڑھاتی ہے۔ وہ خود مٹ جاتی ہے لیکن اپنے گھرانے پر آنچ نہیں آنے دیتی۔ وفاداری اور گھر گرہستی ہر خاندانی اور شریف، باکردار عورت کا شعار ہوتی ہے۔ عورت میں انا ہو مگر بیوی میں اس کی رمق بھی نہ ہونی چاہیے۔ مجھے احساس ہے بچے! صارم نے تمہیں قبول نہیں کیا ہے۔ تمہیں بیوی کا حق نہیں دیا۔ وہ ایسا نہیں ہے، بہت نرم دل اور خوش مزاج ہے۔ سب سے محبت کرتا ہے اور تم جو اتنی پیاری اور خوبصورت ہو، تمہیں کب تک وہ نظر انداز کرسکتا ہے، دیکھنا وہ بہت جلد تمہاری طرف راغب ہوجائے گا، چاہنے لگے گا تم کو۔ مرد کا مزاج موسم سے بھی جلد بدل جاتا ہے۔ پھر وہ بچپن سے ہی حسین و دلکش چیزوں کا شیدائی رہا ہے۔ چاہے وہ حسین نظارے ہوں یا خوبصورت پھول، رنگین تتلیاں ہوں یا کھلکھلاتے بچے، بارش میں بھیگتا سبزہ ہو یا چاندنی راتوں کا فسوں، وہ ہر جگہ حسن ڈھونڈتا ہے۔ وہ پیدائشی حسن پرست ہے۔ گھر کی تکمیل کرنے کے لیے ہر عورت، ہر لڑکی کو کچھ نہ کچھ قربانی دینی ہوتی ہے۔ اپنی خودداری کو دھتکارنا پڑتا ہے، نہ چاہتے ہوئے بھی وہ سب برداشت کرنا پڑتا ہے جو وہ کبھی برداشت کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔ یہ سب کرتے ہوئے بہت غصہ آتا ہے۔ جھنجلاہٹ و بیزاری محسوس ہوتی ہے، بعض اوقات روح تک گھائل ہو جاتی ہے، دل پر داغ لگ جاتے ہیں لیکن عورت کو اس کا حق مل جاتا ہے۔ اس کی ریاضتوں اور تکلیفوں کا صلہ اسے بہت چاہنے والے قدر کرنے والے جیون ساتھی کی صورت میں ملتا ہے۔'' وہ دھیمی پرتاثیر آواز میں اسے سمجھا رہی تھیں۔ وقت کی گردش، حالات کی اونچ نیچ سے بچانا چاہ رہی تھیں۔

''سمجھ رہی ہو نا میری بات ورشے؟'' اسے سر جھکائے خاموش بیٹھے دیکھ کر وہ پوچھنے لگیں۔

''جی..... بی بی جان۔'' اس نے آہستگی سے جواب دیا تھا۔

''میاں بیوی کے رشتے میں کوئی غیریت نہیں ہوتی، پہل کرنے میں ہچکچانا نہیں، عورت چاہے تو پہاڑ کو موم بنادے، پھر وہ تو ایک مرد ہے۔ عورت کی گرم نگاہوں سے بہک جانے والا، وہ بھلا کب تک خود پر جبر کرسکتا ہے۔''

''میں کوشش کروں گی بی بی جان!''

''آہ...... تمہیں دیکھتی ہوں تو گل خانم کی یاد دل میں کسک جگانے لگتی ہے۔'' اس کے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے ان کے منہ سے بے ساختہ نکلا تھا۔

''بی بی جان! آپ...... آپ اوے کو جانتی ہیں؟'' اس نے تحیر زدہ لہجے میں پوچھا۔

''ہاں میں بہت دنوں سے تمہیں یہ حقیقت بتانا چاہ رہی تھی۔ تمہارا باپ کوئی غیر نہیں ہے۔ میرے سگے بھائی کا بیٹا ہے۔ تمہاری ماں گل خانم میری بڑی بہن کی بیٹی ہے۔''

''اوہ، اتنی قریبی رشتے داری، لیکن اوے نے کبھی ذکر نہیں کیا تھا۔ اور بابا جان کا ذکر کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہ بیٹیوں کو کبھی شفقت کی نگاہ سے دیکھنے کے روادار نہ تھے۔ بات کرنا تو انہونی تھی۔ اوے کو اپنے میکے کے بارے میں بتانے کا شاید حکم نہ ہو؟ پھر بی بی جان! ایسی دشمنی کیوں پیدا ہو گئی کہ کبھی کسی کی زبان پر ایک دوسرے کی رفاقت کا ذکر کبھی بھولے سے بھی نہیں آیا۔ اور رشتے کانچ کے برتنوں کی طرح ٹوٹ کر دوبارہ جڑ نہ سکے۔''

''ہم نے بہت کوشش کی بچے، لیکن شہباز خان کی دوسری بیوی نے کچھ ایسی آگ لگائی تھی جو بجھنے کے بجائے بھڑکتی چلی گئی۔ ہماری قوم میں ضد اور انا کو زندگی سے زیادہ عزیز سمجھا جاتا ہے۔ بظاہر بہت بے ضرر چھوٹے نظر آنے والے یہ الفاظ بہت تباہ کن قوت برباد کر دینے والے وجود رکھتے ہیں۔ اسی آگ میں جل کر خاندان کے خاندان اس دنیا سے فنا ہو گئے۔ خوامخواہ سرمئی پہاڑوں والی زمین نے اس ایک قبیلے کے دو ٹکڑے کر دیئے۔ ڈھیروں رشتے مٹی کی کوکھ میں جا سوئے۔ وہ زمین آج بھی موجود قائم و دائم ہے لیکن اس کو پانے کی ہوس میں مبتلا سینکڑوں لوگ چھوڑ گئے اس دنیا کو، اس مٹی کی کوکھ میں مٹی ہو گئے، خواب بن گئے۔ زمینیں یوں ہی سدا رہتی ہیں۔ انسان فنا ہو جاتے ہیں۔''

ان کے پرانے زخم ہرے ہو گئے تھے۔ یادیں آنسو بن کر ان کے جھریوں بھرے چہرے پر بہہ رہی تھیں۔ ورشا بھی ان کے سینے سے لگ کر رونے لگی۔ ان کا دکھ ایک ہی تو تھا۔

''تمہیں اس گھر کی بہو بنانے کا مقصد یہی ہے بچے کہ تم نوجوان نسل کو مل کر اس ٹوٹے بکھرے قبیلے کو پھر اپنی محبتوں سے جوڑنا ہے۔ انہیں ایک کرنا ہے۔ مجھے یقین ہے یہ دو قبیلے جو ایک ہی خون رکھتے ہیں، پھر سے ایک ہو جائیں گے۔ یہ سب تمہارا فرض ہے۔ ایک ایسی ذمے داری جو ہر حال میں تمہیں پوری کرنی ہے۔''

آج پھر تجھ کو سوچنے بیٹھا
آج پھر زندگی اداس سی ہے
میری آنکھوں میں سب منتظر ہیں
میری سوچوں میں تیری خوشبو بھی

یاد میں ایک عجیب بے چینی
یاد میں ایک عجیب سی راحت بھی
یاد خوشبو کا ایک استعارہ ہے
یاد تو عالم جنون بھی ہے
تن مردہ میں جان پڑ جائے
یاد تیری تو اک فسوں بھی ہے

اس نے گہرا سانس لیتے ہوئے کوٹ بیڈ کی طرف اچھالا۔ بوٹ اور سوکس سے پیر آزاد کرنے کے بعد ٹائی اتار کر دور پھینکی تھی، آستینوں کے بعد گریبان کے بٹن کھولتے ہوئے وہ واش روم کی طرف بڑھ گیا۔ کافی دیر تک شاور لینے کے بعد وہ خود کو تازہ دم محسوس کرنے لگا تھا۔

وھاٹ کاٹن کے آرام دہ سوٹ میں وہ واچ مین کی لائی ہوئی چائے پی رہا تھا۔

فدا حسین کے جانے کے بعد اس نے عارضی طور پر خانساماں رکھنا چاہا تو واچ مین نے یہ کہہ کر منع کر دیا تھا کہ وہ چائے، کافی وغیرہ بنانا جانتا ہے اور ہلکے پھلکے کھانے بھی بنا لیا کرے گا۔ کیونکہ سارے دن رات تک وہ مکمل فارغ ہوتا تھا۔ کچن کا کام وہ خود سنبھال لے گا۔

کچن کا کام زیادہ تھا بھی نہیں۔ صبح وہ ناشتہ کر کے گھر سے نکلتا تو رات گئے باہر کھانا کھا کر گھر میں گھستا تھا۔ صارم خان کو بھی کافی، چائے اور رات کو دودھ کا گلاس دینا ہوتا تھا جو وہ بخوبی کر لیا کرتا تھا۔ صارم نے اس کے انکار کے باوجود اس کی سیلری بڑھا دی تھی۔

چائے سے فارغ ہونے کے بعد وہ فارغ بیٹھا ریموٹ ہاتھ میں دبائے ٹی وی کے چینلز بدلتا رہتا۔ گاؤں سے آنے کے بعد اس کی طبیعت عجیب سی بے چینی و اضطراب کا شکار ہو گئی تھی۔ بزنس میں اس نے الیکٹرونکس کے مختلف سامان کو چوز کیا تھا۔ دو ماہ جرمنی، کینیڈا اور جاپان کی عمدہ اور بڑی تجارتی منڈیوں میں جائزے کے دوران اسے خاصے کانٹیکٹ مل گئے تھے۔ کاروباری اعتبار سے اسے اپنا مستقبل بہت روشن نظر آ رہا تھا۔ کراچی آ کر وہ تیزی سے اپنے بزنس میں لگا تھا۔ جان بوجھ کر اس نے خود کو مشین بنا لیا تھا۔ گاؤں میں اپنی وطن واپسی کی خبر اس لیے نہیں دی تھی کہ وہ اسے اس طرح یہاں نہیں چھوڑتے۔ وقتاً فوقتاً اسے چکر وہاں ضرور لگانے پڑتے اور وہ وہاں سے فرار چاہ رہا تھا۔

بے معنی سی نہ سمجھ آنے والی کیفیت نے اسے خود الجھا رکھا تھا۔

نہ معلوم وہ فرار کس سے چاہ رہا تھا؟

سبریز خان کے دکھ سے؟

یا ورشا کی موجودگی سے؟

عجیب متضاد کیفیات میں گھر گیا تھا وہ۔

ورشا کے متعلق سوچنا چاہتا تو لگتا وہ سبریز خان سے بے وفائی کر رہا ہے۔

سبریز خان کو کھوجتا تو فقط یادوں کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔

زندگی کے اس دوراہے پر وہ بری طرح اپ سیٹ ہو کر رہ گیا تھا۔

کس کو چھوڑے؟

کس کو اپنائے؟

سبریز خان کا عکس اس کے ذہن سے وقت ہی دھندلا سکتا تھا۔ فی الوقت تو وہ اس کی یادوں، بیتے لمحوں کی پرچھائیوں سے منہ موڑنا بھی نہیں چاہتا تھا۔

اس کا قبائلی خون ورشا سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں تھا۔ وہ جس طرح بھی اس کی زندگی میں داخل ہوئی تھی بہرکیف اس کے نکاح میں تھی۔ اس کی غیرت و حمیت بن گئی تھی۔ اسے چھوڑنا، مردانگی چھوڑنے کے مترادف تھا۔

"صاحب اوہ بڑے خان ملنے آئے ہیں اور......" شیر خان نے اسے اطلاع دی تھی۔

بالکل غیر متوقع طور پر ان کی آمد نے اسے بوکھلا کر رکھ دیا تھا۔ وہ پھرتی کے ساتھ باہر نکل آیا۔

اکا جان نے ہمیشہ کی طرح اسے بڑی محبت سے سینے سے کافی دیر لگائے رکھا تھا۔ اس کے بالوں پر بوسہ دے کر بہت نارمل انداز میں اس کا حال چال پوچھ رہے تھے۔

"اکا جان! آپ کو کس طرح معلوم ہوا کہ میں آچکا ہوں؟" اس نے کچھ شرمندگی سے پوچھا۔

"بیٹا جان! آپ کیا سمجھتے ہو؟ عقل داڑھ صرف آپ کی نکلی ہے؟ اتنا تو تم خود سے بھی واقف نہیں ہو جس قدر میں آپ کو جانتا ہوں۔"

"ویٹس رائٹ، میں بھول گیا تھا کہ آپ مجھ سے غافل نہیں رہ سکتے، میں چاہتا تھا مکمل سیٹ اپ کے بعد آپ سے رابطہ کروں، جس میں اب زیادہ دن نہیں لگیں گے۔" وہ جھینپا جھینپا سا ان کے خلوص کے آگے وضاحتیں پیش کر رہا تھا۔

"اوکے...... جانتا ہوں تم کتنے کریزی ہو جو ٹھان لو اسے مکمل کیے بغیر سکون سے نہیں بیٹھتے۔ اسی لیے تم نے اپنی صحت تباہ کرلی ہے۔ سنو، یہ صرف تمہارے شوق کے تحت تمہیں پرمیشن ملی ہے کہ تم بزنس کرو...... ورنہ تمہارے پاس اتنا کچھ ہے کہ تاحیات بیٹھ کر کھا سکتے ہو۔" اس کی گرتی صحت اور پژمردگی ان کی نگاہوں سے چھپی نہ رہ سکی۔

"اوہ! میں باتوں میں الجھ گیا، ورشا...... بیٹا ادھر آؤ۔"

"السلام علیکم!" وہ پردے کے پیچھے سے نکل آئی تھی۔ دد جو اکا جان کے انداز پر چونکا تھا۔ اسے سامنے دیکھ کر حیرت و استعجاب سے کھڑا ہو گیا تھا۔

پنک خوبصورت کڑھائی والے سوٹ پر سیاہ پلین لمبی چوڑی چادر کو اچھی طرح لپیٹے وہ اس کے سامنے چہرہ جھکائے کھڑی تھی۔ حسین چہرے پر دلکشی و شگفتگی لوٹ آئی تھی۔ سرخ عارضوں پر جھکی لرزاں سیاہ دراز پلکوں کے خم، ستواں ناک میں دمکتی ڈائمنڈ کی لونگ کا لشکارا۔

وہ سکتے کی کیفیت میں اسے دیکھتا رہا گیا۔ اکا جان نے کھنکار کر اپنی موجودگی کا احساس دلانے کے لیے اس کی محویت کو توڑنا چاہا۔

''برخوردار! کیا پہچان نہیں پا رہے؟ یہ آپ کی وہی زوجہ محترمہ ہیں جن کو آپ پچھلے کئی ماہ سے فراموش کیے تنہا سوچ رہے ہو۔ اب کم از کم سلام کا جواب تو دے دو۔'' انہوں نے بمشکل اپنی مسکراہٹ ضبط کر کے کہا۔

ان کی بات نے اسے خاصا شرمندہ کر ڈالا تھا۔ اس نے آہستگی سے سلام کا جواب دے کر اس سے نظریں چرائی تھیں۔ اس سے پیچھا چھڑانے کے لیے، بلکہ بچنے کے لیے وہ گاؤں سے فرار تھا۔ اس کے ساتھ دو سوٹ کیس اور بیگ ثبوت تھے کہ اس کا قیام یہاں مختصر نہیں ہوگا۔ مستزاد اکا جان کی مسکراتی نگاہیں۔ متبسم لب گواہ تھے کہ وہ اس کی بوکھلاہٹ و پریشانی کو اس مسرت اور خوشگواریت سے تعبیر کر رہے تھے جو ایک محبوب بیوی کو دیکھ کر شوہر کو ہوتی ہے جبکہ اسے نئی پریشانیوں و بے چینیوں نے آن گھیرا تھا۔

''آؤ یہاں بیٹھو بیٹا! یہ تمہارا گھر ہے۔ یہاں تم اپنی مرضی سے حکمرانی کرنا، اگر صارم کی طرف سے کوئی پریشانی ہو تو بلا خوف مجھ سے شکایت کرنا، اس سے ڈرنے کی یا رعب میں آنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔'' اسے صوفے پر بٹھاتے ہوئے انہوں نے نرم خوانداز میں کہا۔

''لیکن اکا جان! یہ یہاں..... تنہا.....''

''تنہا ایک انسان کہلاتا ہے۔ تمہاری موجودگی میں یہ تنہا کیوں ہونے لگی۔''

''میں ابھی بہت بزی ہوں میرے گھر آنے جانے کا کوئی شیڈول نہیں ہے اور یہ بھی یہاں ایڈجسٹ نہیں ہوسکتی۔ میں اسٹیبلشڈ ہو جاؤں گا تو سب کو بلا لوں گا۔''

''گھر آنے جانے کا شیڈول تمہیں ترتیب دینا ہوگا، ورشا اب تمہارے ساتھ رہے گی۔''

''آپ میری بات سمجھنے کی کوشش کریں اکا جان! میں ابھی تنہائی چاہتا ہوں، یکسوئی و طمانیت سے کام مکمل کرنا چاہتا ہوں، مزید کسی کو سپورٹ کرنے کا وقت نہیں ہے مجھے۔ آپ پلیز..... ابھی اسے واپس لے جائیں۔''

بیزاری و اضطراب اس کے چہرے، لہجے سے عیاں تھا۔ ورشا گردن جھکی ہونے کے باوجود اس کے رویے کو پوری طرح محسوس کر رہی تھی۔ لیکن کیا کر سکتی تھی۔ یہ اس کے لیے مکافات عمل تھا۔ کل تک اس کا رویہ و لہجہ اس کے لیے ایسا ہوتا تھا۔

''صارم خان! جو تم نے حرکت کی ہے، ان کی معافی تمہیں اس لیے ملی ہے ورنہ جانتے ہو بابا جانی، اصول و فرائض کے آگے کسی سے بھی مروت برتنے، لحاظ کرنے کے عادی نہیں ہیں۔ آئندہ ایسی کوئی بات کہنے سے پہلے سوچ لینا کہ تمہاری اولین و اہم ذمے داری فی الوقت تمہاری بیوی ہے۔ اس کے بعد دوسری ذمے داریاں ہیں۔'' اس بار انہوں نے خاصے سخت انداز میں اسے سرزنش کی تھی۔ وہ بھی ان سے مزید بحث نہ کر سکا کہ ان کی بات اس کے لیے حکم کا درجہ رکھتی تھی۔

گل ریز خان اسے چھوڑ کر زیادہ نہیں رکے تھے۔ چند گھنٹے بعد شام کی فلائٹ سے چلے گئے تھے۔

صارم اندر کی جانب جا کر غائب ہو گیا تھا اور ایک گھنٹے کے باوجود وہ دوبارہ ادھر نہیں آیا تھا۔ وہ جب سے آئی تھی ایک جگہ ہی بیٹھی رہی تھی۔

صارم کے سرد مہر رویے، لاتعلق انداز و بیگانگی نے اسے مزید ہراساں کر دیا تھا۔ وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ کیا کرے؟ کہاں جائے؟ خاصی

مشکل سچویشن درپیش تھی۔

آٹھ بجے کے قریب وہ اندر کمرے سے کی رنگ انگلی پر گھماتا وہاں آیا تھا۔

بلو جینز، بلیک ٹی شرٹ میں اس کی شخصیت کی تمام تر خوبروئی نمایاں تھی۔

اس کے وجود سے نکلتی ''ڈارک'' کی دل آویز مہک ہر سو پھیل گئی تھی۔

''ڈنر گھر میں کرو گی؟ یا ہوٹل میں کرو گی؟'' بہت عام سے لہجے میں اس نے سوال کیا۔

''بھوک نہیں ہے مجھے۔'' اس نے کھڑے ہو کر کہا۔

''اوہ، تم تو کھڑی ہو گئیں اور نہ میں تو سمجھا تھا تا حیات اسی طرح بیٹھی رہو گی۔'' اس نے تمسخر سے کہا تھا۔ ورشا نے بہت ضبط سے خود کو جواب دینے سے باز رکھا۔

''میرے خیال میں بی بی جان نے اچھی تابعدار، فرمانبردار بیوی کا مکمل سبق پڑھا کر بھیجا ہے؟'' صارم نے آگے بڑھ کر اس کی طرف جھکتے ہوئے اپنے یقین کی تائید چاہی اور قبل اس کے کہ وہ کوئی جواب دیتی۔ لاؤنج کا دروازہ کھول کر بہروز، آفتاب اور باسط اندر آئے تھے۔ ورشا کو صارم کے قریب دیکھ کر ان کی شکلیں، حیرت کی شدت سے بگڑ گئی تھیں۔

☆☆☆

ان کی اچانک اور غیر متوقع آمد نے ورشا کو بوکھلا کر رکھ دیا تھا۔ اپنے شانوں پر رکھے اس کے ہاتھ ہٹا کر، وہ افتاں وخیزاں سی اٹھ کھڑی ہوئی تو صارم جو انہیں دیکھ کر ساکت رہ گیا تھا۔ چند ثانیے تو اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کرے؟ اس نے مصلحت کے تحت ان سے ورشا سے اپنی میرج کا ذکر نہیں کیا تھا۔ ان کے وہم وگمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ ورشا یہاں آ جائے گی۔ اور پھر ان سے اس کا سامنا ہونا ناممکن بات نہیں تھی کہ وہ اس کی تنہائی اور پھر دکھ کی وجہ سے دل بہلانے کے لیے کسی بھی وقت چلے آتے تھے۔ جیسا اس وقت ہوا تھا۔

''کیا ہوا یار! میری وائف اتنی ڈراؤنی شکل نہیں رکھتی کہ تم تینوں مارے خوف کے بت بن کر رہ گئے ہو۔'' لمحے بھر میں خود کو سنبھال کر وہ مسکراتا ہوا ان سے مخاطب ہوا۔ جو ابھی بھی از حد استعجاب سے ٹکر ٹکر ان دونوں کی طرف دیکھ رہے تھے۔

ورشا سر جھکائے کھڑی تھی۔ اس کی نگاہوں میں یونیورسٹی کے دنوں کے وہ مناظر فلم کی طرح چل رہے تھے جب وہ صارم کے ساتھ ساتھ ان تینوں کو بھی خوب بے بھاؤ کی سناتی تھی۔ آج اس شخص کے پہلو میں اس کے حوالے سے کھڑی وہ خود کو ان تینوں کے سامنے زمین میں دھنستا ہوا محسوس کر رہی تھی۔ ندامت، خجالت، شرمساری، شرمندگی ہی شرمندگی تھی۔

''صارم! یہ...... یہ؟''

''لیس اٹ از مائی وائف ورشا صارم آفریدی!'' اس نے آفتاب کی حیرانگی پر مسکرا کر خاصے اطمینان سے جواب دیا جبکہ ورشا کو اس کے لہجے میں تفاخر وفتح مندی کا گھمنڈ وغرور پوری طرح محسوس ہوا۔

''آداب بھابی صاحبہ، پلیز آپ ذرا اپنے دیوروں کی خاطر مدارت کا انتظام کریں۔ اتنے میں ہم اسے 'اپنے طریقے' سے مبارکباد دیتے ہیں۔'' ورشا سے مخاطب ہوتے وقت ان کا لہجہ وانداز خاصا مہذبانہ تھا جبکہ صارم کی جانب اٹھی ہوئی ان کی نگاہوں میں بے حد خونخواری وخفگی تھی۔ ورشا خود کو ان کی موجودگی میں بالکل عجیب محسوس کر رہی تھی۔ اشارہ پاتے ہی وہاں سے نکل گئی۔

اس کے نکلتے ہی کمرے میں گویا بھونچال سا آ گیا۔ وہ تینوں بپھرے ہوئے جذبات کے ساتھ اس کی جانب بڑھے تھے۔ وہ پہلے ہی تیار کھڑا تھا۔ آسانی سے ان کے ہاتھ کہاں آنے والا تھا۔ وہ تینوں غصے سے چیخنے کے ساتھ اسے پکڑنے کی کوشش بھی کر رہے تھے جو پارے کی طرح کمرے میں چکراتا پھر رہا تھا۔

''میری بات تو سنو، پلیز یار!'' وہ بولتا جا رہا تھا۔

''خدا کی قسم! تو ہاتھ آ جا پھر تجھ سے پوچھیں گے۔ یعنی خود شادی کر کے بیٹھا ہوا ہے اور ہمارے پوچھنے پر بھی انکار ہی کر رہا تھا۔'' باسط ہانپتے ہوئے گرجا۔

''پلیز میری بات سنو۔ یہ سب اس طرح نہیں ہوا جس طرح ہونا چاہیے تھا۔ سبزینہ کا قتل کیا گیا تھا اور ورشا کا بھائی شمشیر خان اس کا قاتل ہے۔'' آخر کار اس نے انہیں تھک ہار کر مکمل روداد سنانے کا فیصلہ کر لیا کہ اب سب کچھ مخفی رکھنا حماقت، اور ان جیسے مخلص و بے لوث دوستوں سے بے وفائی کرنے کے مترادف تھا۔

☆☆☆

آنے والے وقت نے ایک مسرت کا الوہی احساس اس کی خالی جھولی میں ڈالا تھا۔

کتنا خوش رنگ احساس وانکشاف تھا۔

چاندنی کرنوں کی طرح روشن روشن۔

نسیم سحر میں چٹخنے والی کلیوں کی طرح پاکیزہ!

بارش کے پہلے قطرے کی طرح لطیف وخوش کن

بہار میں کھلنے والے پہلے پھول کی طرح حسین ودلربا۔

کتنی آسودگی وطمانیت محسوس ہوئی تھی اس کو یہ جان کر کہ وہ ماں بننے والی تھی۔

''ماں، اللہ کے بعد دوسرا مضبوط و دلکش رشتہ۔ عورت کی تکمیل اور ازدواجی زندگی کو باہم جکڑنے والی فولاد سے بھی مضبوط کڑی۔

وہ بہت مسرور وشاداں رہنے لگی۔ اسے یقین تھا کہ اب شمشیر خان اس کی طرف پلٹ آئے گا۔ اس کے بچے کو جنم دے کر وہ اس کھوئے ہوئے شخص کو ہمیشہ کے لیے پالے گی کیونکہ شوہر بیوی کو نظر انداز کرسکتا ہے مگر باپ بچے کو نہیں۔

اس دن وہ خلاف توقع جلدی آ گیا تھا اور موڈ بھی بہت خوشگوار تھا۔

بہت عرصے بعد اس نے، اس نے محبت سے باتیں کی تھیں، اس کے ساتھ وقت گزارا تھا۔ وہ اس کے سنگ رہ کر بہت محتاط و سمجھدار ہوگئی تھی۔ شام اور رات اس نے اپنی خوشی پر بمشکل قابو کیا تھا۔ صبح ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد اس کے شانے پر سر رکھ کر اس نے جب انکشاف کیا تو اس کا ردعمل اس کی سوچ و مسرت کے بالکل متضاد تھا۔

''کیا بکواس کر رہی ہو؟'' وہ اسے ایک طرف جھٹک کر اٹھ کھڑا ہوا اور پرطیش لہجے میں بولا۔

''ب...... بکواس...... ہماری اولاد......''

''شٹ اپ، میں ایسی خرافات نہیں پالا کرتا۔ جلد سے جلد جان چھڑاؤ اس مصیبت سے۔ مجھے کوئی بچہ وچہ نہیں چاہیے۔''

''خرافات، مصیبت، میں آپ کی بیوی ہوں۔ آپ کے ہونے والے بچے کی جائز ماں، گناہ آلود لمحوں کو رنگین بنانے والی سستی وگھٹیا عورت نہیں ہوں جو آپ کے ایسے بیہودہ اور بے ایمان مشورے پر عمل پیرا ہوں گی۔'' وہ صدمے کی کیفیت سے نکلی تو چیخ کر بولی۔ شمشیر کی حقارت بھری نگاہیں، تحقیر آمیز لہجے نے اسے خاک کر ڈالا تھا۔

سہانے خوابوں کی عمر ازحد مختصر ہوتی ہے۔ جو پلکوں کی جنبش سے فوت ہوجاتے ہیں۔ کانچ کے نازک برتن کی طرح ہاتھ سے پھسلے اور چکنا چور ہوکر بکھر جاتے ہیں۔ پانی میں اٹھتے حسین بلبلوں کی طرح جن کا پہلا سانس ہی آخری سانس ہوتا ہے۔ برتن ٹوٹتے ہیں، صدا ابھرتی ہے، ان کا احتجاج سماعتوں کو جھنجوڑ ڈالتا ہے۔

خواب ٹوٹتے ہیں...... دل پکار اٹھتا ہے اور دل کی صدائیں جسم کے ایوانوں میں گونج گونج کر دم توڑ دیتی ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے کسی

اندھے کنوئیں میں کسی اجنبی مسافر کی چیخیں، آہیں، سسکیاں آس پاس ویرانوں میں سننے والا کوئی نہیں ہوتا۔

خوابوں سے بہتر تو وہ برتن بھی بہادر اور جرأت مند و دلیر ہوتے ہیں۔ جو اپنا احتجاج کانوں تک تو پہنچا دیتے..... جن کے ٹوٹنے کا ملال محسوس ہوتا ہے۔

شمشیر خان اس کے رخساروں پر ”زبان درازی“ کی سزائیں ثبت کر کے جا چکا تھا۔ ساتھ ہی حکم بھی کہ وہ اس وجود سے نجات حاصل کرے ورنہ.....

وہ خاوند سمجھ کر اس کے ہر ظلم کو اپنی من مانی کی سزا سمجھ کر قبول کرتی آئی تھی۔

مگر ایک قاتل اپنے بچے کے قاتل کو وہ قبول کرنے کو تیار نہ تھی۔ خوابوں کی طرح ظرف و بلند حوصلہ نہیں رکھتی تھی، یہ دنیا ہمیشہ شور کرنے والوں، اپنا حق چھین کر لینے والوں سے مفاہمت کرتی ہے۔ وہ اپنے بچے کے لیے ضرور آگے جائے گی۔

☆☆☆

نہ معلوم ان چاروں میں اندر کیا کیا مذاکرات ہو رہے تھے۔ پہلے دس پندرہ منٹ تک اندر سے دھڑام، دھڑام ایسی آوازیں آتی رہیں۔ جیسے کوئی اچھل کود ہو رہی ہو۔ اس کے بعد ایک دم ہی سکون چھا گیا تھا۔ ورشا صحن میں اونچے سے چبوترے پر بیٹھ گئی تھی۔ ملازم نے اسے کچن میں کسی کام کو ہاتھ لگانے نہیں دیا تھا (اس کے خیال میں وہ نئی نویلی دلہن تھی) حالانکہ اس کی ظاہری حالت ایسی قطعی نہ تھی کہ وہ دلہن تا ٹپ کی کوئی چیز لگتی۔ شاید اس کی پہلی بار موجودگی سے وہ یہی نتیجہ اخذ کر سکا تھا۔

کھانا اس نے ٹیبل پر لگانے کے بعد اسے اطلاع دی تھی۔ مگر اس نے انکار کر دیا تھا۔

ذہن عجیب سی تھکن و جھنجلاہٹ کا شکار ہو گیا تھا۔

صارم سے دور تھی جب الجھن سوار تھی۔

اب قریب تھی تو بے چینی خلا سے سوا تھی۔

”تمہیں کس نے سزا دی ہے؟“ صارم کی آواز بہت نزدیک سے ابھری تھی۔ اس نے چونک کر دیکھا۔ وہ قریب کھڑا بہت غور سے اس کی جانب ہی دیکھ رہا تھا۔ ”تمہارے یہاں بیٹھنے کا انداز تو ایسا ہی ہے جیسے ٹیچر نے کان سے پکڑ کر کلاس روم سے نکال کر سزا دی ہو۔ تنہائی و خاموشی میں بیٹھنے کی۔“ اس کی سوالیہ نگاہوں کے جواب میں اس نے مسکرا کر وضاحت پیش کی تھی۔

”میں یہاں بیٹھ گئی تھی۔“ اس لمحے اپنی مظلومیت پر اسے خود بھی از حد ترس آیا۔

”چلو..... کھانا کھاؤ۔ پھر آرام کرنا بیڈ روم میں۔“

”مجھے بالکل بھوک نہیں ہے۔ میں صرف آرام کرنا چاہتی ہوں۔“

”اوکے۔ پہلے کچھ کھا تو لو۔“

''پلیز، مجھے قطعی بھوک نہیں ہے۔'' اس بار اس کے لہجے میں لجاجت وقطعیت تھی۔

''او کے.... آؤ....'' اس کا اداس و پژمردہ تھکن زدہ چہرہ دیکھ کر اس نے اندازہ لگایا کہ وہ سچ کہہ رہی ہے۔ اس کی ہمراہی میں وہ فل فرنشڈ بیڈ روم میں داخل ہوئی۔ اے سی کی ٹھنڈک اور ایئر فریشنر کی مسحور کن فضاؤں نے اس کے اعصاب پر اچھا اثر ڈالا تھا۔ وہ چند لمحوں بعد ہی نرم گدے پر بے خبر سو گئی تھی۔

پھر اس کی آنکھ کھلی تو صبح کی پرنور روشنی ہر سو دھیرے دھیرے پھیل رہی تھی۔ وال کلاک کی سوئیاں چھ کے ہندسے پر یکجا تھیں۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ کر بیٹھی تھی۔ گو کہ کمرے میں نیم اندھیرا تھا۔ مگر سامنے کی کارنر والی کھڑکی سے معمولی سا پردہ ہٹنے سے شیشے کے پیچھے کا منظر معمولی سا واضح تھا۔ دائیں جانب ضارم بے خبر سو رہا تھا۔ وائٹ شب خوابی کے ڈریس میں اسکی جانب پشت کیے۔ وہ چند لمحے اس کی جانب دیکھتی رہی۔ اسے اپنی نیند پر حیرانگی ہو رہی تھی کہ وہ کس قدر بے خبری کی نیند سوتی رہی تھی کہ ضارم کب کمرے میں آیا؟ کب سویا؟ بالکل محسوس ہی نہ کر سکی۔ کیونکہ وہ اسے بیڈ روم کے دروازے پر چھوڑ کر باہر سے ہی چلا گیا تھا۔

''اوہ، کیا سوچتا ہوگا؟ میں اس قدر نیند کی رسیا ہوں کہ'' ہشت اپنی طرز سوچ وگفتگو کو بدلو بے وقوف۔ اس نے خود کو سرزنش کی۔ بیگ سے سوٹ نکال کر باتھ روم کی جانب بڑھ گئی۔ نہا کر، بال برش کرنے کے بعد وہ کمرے سے نکل آئی۔ گھوم پھر کر بنگلے کا جائزہ لینے لگی۔ اس بیڈ روم کے علاوہ وہاں دو کمرے اور تھے، ساتھ ہی لاؤنج اور لاؤنج سے ملحقہ ٹیرس تھا۔ ٹیرس کی وائٹ گرل سے لپٹی بوگن ویلیا سبز بہار دکھاتی خوبصورت لگ رہی تھی۔

گولائی میں جاتی ہوئی سرخ کارپٹ سے ڈھکی سیڑھیاں عبور کر کے وہ نیچے چلی آئی۔ نیچے چار بیڈ روم تھے، ایک سٹنگ روم، ٹی وی لاؤنج، لائبریری روم، اور سینٹر میں وسیع وعریض پنک ٹائلز والا امریکن کچن، لاؤنج کے دروازے سے باہر چھوٹا سا صحن تھا اور صحن سے ملحق لان تھا جس کے وسط میں مین گیٹ آویزاں تھا۔

''سلام بیگم صاب!'' ملازم نے چائے کا کپ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے سلام کیا۔

''وعلیکم السلام۔ اندر چائے دی؟ میرا مطلب ہے صاحب کو۔''

''آج چھٹی کا دن ہے، اور چھٹی کا دن صاحب بیڈ ٹی نہیں پیتا، بارہ بجے ناشتہ کرتا ہے۔'' ملازم کی اطلاع اس کے لیے نئی تھی۔ گاؤں میں تو اس کا یہ معمول نہ رہا تھا۔ چند ماہ میں ہی اس نے اپنی روٹین چینج کر لی تھی۔

''اور بھی نہ معلوم کیا کیا چینج آیا ہوگا اس میں؟'' اس کے اندر فکر انگیز خیال ابھا تھا۔ چائے پی کر وہ ٹیبل پر رکھے نیوز پیپر اور سنڈے میگزین کا مطالعہ کرنے لگی۔ دس بجے کے قریب ملازمہ آ گئی تھی۔ اس کی موجودگی نے ملازمہ کو بھی خاصا پر مسرت کیا تھا۔ اپنی نگرانی میں وہ اس سے صفائی کروانے لگی۔

''ہیلو، گڈ مارننگ، پہلے دن ہی کام شروع کر ڈالا؟'' بلیو جینز، ہاف سلولیس، بلو وائٹ ٹی شرٹ میں فریش، سادہ سے حد وجیہہ لگ رہا تھا۔ سنجیدہ موڈ لیے اس کے سامنے کھڑا تھا۔ فضا میں خوشبو پھیل گئی تھی۔

''ایسے ہی بور ہو رہی تھی۔ ملازمہ آئی تو میں نے سوچا اپنی نگرانی میں کام کرواؤں۔'' اس نے کاسنی وسیاہ دوپٹہ درست کرتے ہوئے کہا۔

''بور ہو رہی تھیں، ہونہہ...... یہاں تو آپ کو مستقل ہی بور ہونا پڑے گا کیونکہ میں تو سارا دن بلکہ رات گئے تک باہر رہتا ہوں۔ کاروباری مصروفیات کی وجہ سے، پھر یہاں کس طرح وقت گزارو گی؟'' ناشتہ کی ٹیبل پر اس کی جانب حلوہ پوری کی ڈش بڑھاتا ہوا وہ سنجیدگی سے گویا ہوا۔

''آپ فکر مت کریں، میں خود ہی ایڈجسٹ ہو جاؤں گی۔''

''او کے، ایز یو وش۔'' اسنے سلائس پر بٹر لگاتے ہوئے کہا۔

''رات...... مجھے ایسی نیند آئی تھی کہ ایک بار بھی آنکھ نہیں کھلی اور نہ ہی آپ نے مجھے اٹھایا؟'' اب جبکہ وہ ہتھیار ڈال چکی تھی تو اسے پیش قدمی کرنے میں کوئی عار نہ تھا۔ ایک طویل عرصہ وہ اس کے مزاج و تیوروں کی زد میں رہ چکا تھا۔ اس کی ہر زیادتی و بدتمیزی خندہ پیشانی و فراخدلی سے قبول کی تھی۔ اب باری اس کی تھی۔ اسے بھی وہ سب برداشت کرنا تھا۔ وہ محسوس کر رہی تھی کہ وہ بہت اکھڑا اکھڑا مزاج لیے اسے نظر انداز کر رہا تھا حالانکہ مکمل طور پر اس کی طرف سے غافل نہیں تھا۔ پھر بھی اس کے انداز میں بہت سی تبدیلی آ چکی تھی۔ ورشا بات کرتی تو جواب دیتا ورنہ خاموش بیٹھا اخبار چہرے کے آگے لگا کر چائے کی چسکیاں لیتا رہتا۔

''کیوں اٹھا کر نیند خراب کرتا بلکہ میں خود بے آواز، انداز میں کمرے میں آکر لیٹا تھا کہ نیند خراب نہ ہو تمہاری۔'' لفظ خاصے اپنائیت بھرے تھے مگر لہجہ بالکل سپاٹ و گداز سے مبرا تھا۔ وہ مزید گفتگو جاری نہیں رکھ سکتی تھی۔

☆☆☆

''حد ہوتی ہے آوارہ پن کی بھی! وہ گھر چھوڑ کر چلے گئے، وہ ایسا گھر سے بیزار و بے پرواہ ہے کہ ہفتوں پلٹ کر خبر نہیں لیتا، جب گھر سے کوئی ضرورت پڑتی ہے تب ہی شکل دکھاتا ہے، پھر چھٹی ہفتوں کے حساب سے۔ ایسے کب تک چلے گا۔ اس طرح بیٹھے بیٹھے کھانے، اڑانے سے تو خزانے بھی خالی ہو جاتے ہیں۔''

''وہ منحوس لڑکی جب سے گئی ہے ہمارا سکون و قرار لٹ گیا ہے۔ کوئی نہ کوئی مصیبت نازل ہی رہتی ہے۔'' گل جاناں نے انہیں شدید اشتعال و غضبناک انداز میں دیکھ کر ان کا غصہ دوسری طرف منتقل کرنا چاہا۔

''خاموش رہو تم، بدبخت عورت، یہ سب تمہارے لالچ اور میری ناشکری کا نتیجہ ہے۔ میں تو گناہ گار تھا ہی مگر تم نے میری زندگی میں آکر گناہوں کی ایسی بیماری پھیلائی کہ میں تہہ در تہہ گناہوں کی دلدل میں اترتا چلا گیا۔ بے ضمیر، بے ایمان، بے حس تو تھا ہی، تم نے بے غیرت و بے حمیت بھی بنا ڈالا۔ کتنی بیچ و گھٹیا حرکت کی ہے میں نے، پہلے بیٹیوں کے وجود کو اللہ کا احسان سمجھنے کے بجائے اس رب کی ناشکری و گناہ کا مرتکب بنتا رہا، نہ کبھی بیٹیوں کے لیے شفقت ظاہر کی اور گل خانم کو دکھ دے کر اس کا گنہگار بھی بن گیا۔''

کئی ماہ سے پکتا ہوا لاوا آج پھٹ پڑا تھا۔ شہباز ولی خان جو چٹانی سینہ، پتھریلے احساسات و جذبات رکھتے تھے آخر کار ان کا ضمیر جاگ اٹھا تھا۔ انہیں وہ اپنے تمام ظلم، بے رخی، زیادتیاں، ناروا سلوک سب یاد آ رہے تھے اور بے حمیتی و بے ضمیری کا وہ منظر بھی جب انہوں نے ورشا کو رقم سے

کر فروخت کیا تھا اور اپنی، اپنے قبیلے کی شرافت وافتخار، جاہ وجلال کا جنازہ خود ہی نکال دیا تھا۔ کسی انتہائی بھوکے ولالچی فقیر کی طرح انہوں نے گویا بھیک مانگی تھی اور ان کے اسی غیر دانشمندانہ فیصلے نے انہیں جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا۔ نرم بستر کانٹوں کی سیج بن گیا، آرام، راحت وسکون ناپید ہو کر رہ گئے۔

''چل گیا جادو، کر دیا مجھ سے بدظن اس حرافہ عورت نے، ہائے اللہ! میں کہاں جاؤں؟ اس عمر میں کیسی میری مٹی پلید ہوگئی۔ رات، دن پڑھ پڑھ کر پھونکتی ہے، تسبیح گھماتی ہے، کر دیا جادو کیسی اس کی اور اس کی بیٹیوں کی نظر لگ رہی ہے؟'' گل جاناں ایک دم ہی سینہ کوبی پر اتر آئیں۔

''خاموش...... سچ کہا ہے کسی نے جاہل عورت دماغ کے بجائے زبان کا استعمال کرتی ہے۔ تم جیسی عورتوں کی لوگ کبھی عزت نہیں کرتے۔ میں بھی تمہاری زبان درازی وا پنی عزت کے خوف سے اپنی بیٹیوں اور گل خانم کو فراموش کر بیٹھا تھا مگر اب ایسا نہیں ہوگا، بالکل نہیں ہوگا، میں جا رہا ہوں اللہ سے توبہ کرنے، اپنی بدی و گناہوں کی بخشش طلب کرنے، اب مجھے کوئی نہیں روک سکتا۔''

ایمان کی شمع قلب میں روشن ہو جاتی ہے تو غفلت وبرائی کے اندھیرے یکلخت ہی چھٹ جاتے ہیں، توبہ کے دروازے دا رہتے ہیں۔

رب، اپنے بندوں کی توبہ ومعافی کا منتظر ہے۔

بندہ چل کر اس کی راہ پر جاتا ہے۔

وہ دوڑ کر بندے کی جانب آتا ہے۔

گناہوں کے اندھیرے میں بندہ آخری حد تک کیوں نہ اتر جائے اگر دل میں کہیں معمولی سی بھی ایمان کی کرن موجود ہوتی ہے تو معمولی سی کرن...... بدی کے اندھیروں کو مٹا ڈالتی ہے۔ سچی توبہ اپنے گناہوں پر شرمندگی وندامت اور آئندہ کے لیے توبہ بندے کو رب سے قریب کر ڈالتی ہے اور جو رب سے جڑ گیا، اس سے قریب ہوگیا، وہ نجات پالیتا ہے۔ شہباز خان بھی اپنی گزری زندگی پر اشک بہاتے ہوئے مسجد کی جانب چلے گئے تھے۔

گل جاناں جو دونوں بیٹوں اور بہو کے گھر چھوڑ کر جانے کے بعد وہ اندر سے خود کو خالی وکھوکھلا محسوس کر رہی تھیں اس پر ستم یہ تھا کہ شہباز خان کا رویہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کے ساتھ بدلتا جا رہا تھا۔ وہ گل خانم کی طرف پلٹ رہے تھے۔ ورشا کا نام اکثر وبیشتر ان کی زبان پر رہتا، کبھی حسرت زدہ، کبھی رنجیدہ ان کا انداز ہو جاتا۔ اور ایسے میں گل جاناں انہیں متنفر کرنے کے باوجود بے بس وبے سکون رہنے لگیں۔

''مالکن! باہر ایک لڑکی آئی ہے، وہ آپ سے ملنا چاہتی ہے۔'' وہ سوچوں میں غلطاں تھیں، ملازمہ نے آکر اطلاع دی تو وہ چونک گئیں۔ پھر کچھ سوچ کر اس لڑکی کو آنے کی اجازت دے دی تھی۔

ملازمہ کے ساتھ اندر داخل ہونے والی لڑکی بلیک کی گولڈن پلین جارجٹ میں ملبوس تھی۔ رنگ سفید اور نقوش جاذب نظر تھے۔ بالوں کا ڈھیلا سا جوڑا بندھا تھا، وہ خاصی پروقار اور بااعتماد طریقے سے اندر آئی تھی اور گل جاناں کو سلام کیا تھا۔

''آپ شمشیر خان کی والدہ ہیں؟'' اس نے ان کا مغرور انداز نظر انداز کرکے سلام کے بعد سوال کیا۔ اس بار ان کا رد عمل فوراً ہی تبدیل ہوا۔ بہت غور سے اسے سر سے پاؤں تک جائزہ لیتی ہوئی گویا ہوئیں۔

''ہاں...... تم کون ہو؟ اور کیوں پوچھ رہی ہو؟''

''میں..... شمشیر خان کی بیوی ہوں۔'' کائنات نے آہستگی سے کہتے ہوئے ان کی جانب نگاہیں اٹھا کر کہا۔

''اچھا تم شمشیر خان کی بیوی ہو؟ کیا ثبوت ہے تمہارے پاس؟'' گل جاناں کے لہجے میں بے یقینی و تمسخر تھا۔ بہت کاٹ دار لہجے میں انہوں نے استفسار کیا۔

''ثبوت؟ نکاح کیا ہے اس نے مجھ سے اور وہ باپ بننے والا ہے۔ میں التجا لے کر آپ کے پاس آئی ہوں خدارا، آپ ایک ماں ہیں اور ماں ہونے کا احساس آپ کو ہوگا۔ آپ کا بیٹا اپنی آنے والی نسل کو خود ہی پیدا ہونے سے پہلے قتل کر دینے کے درپے ہے۔ پلیز آپ انہیں سمجھائیں، اس گناہ سے باز رکھنے کی کوشش کریں۔ میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گی۔''

ان کی منت وسماجت کرتے ہوئے بے اختیار اس کے آنسو بہنے لگے تھے۔

''لڑکی قبل اس کے کہ میرا دماغ گھوم جائے اور تجھے ذلیل و رسوا کر کے یہاں سے نکالوں، اگر اپنی عزت پیاری ہے تو خاموشی سے واپس لوٹ جا، ہم خاندانی لوگ ہیں اور خاندانی لوگوں کی بہوئیں معزز لوگوں کی ہمراہی میں سسرال میں قدم رکھتی ہیں جہاں انہیں اور ان کی اولاد کو فخر سے قبول کیا جاتا ہے۔ تجھ جیسی عورتیں میرے بیٹے جیسے شریف، جوان و خوبصورت و دولتمند مرد پر یوں ہی ڈورے ڈالتی ہیں اور دولت و جائیداد ہتھیانے کے لیے.....''

''میں کوئی ایسی ویسی لڑکی نہیں ہوں، بہت اعلیٰ خاندان ہے میرا۔''

''خوب اچھی طرح جانتی ہوں، تجھ جیسی فاحشاؤں کو.....''

''زبان سنبھال کر بات کیجیے آپ! سمجھ کیا رہی ہیں؟''

''ارے چل نکل خوب سمجھتی ہوں۔ تجھ جیسی چلتر باز و حرام خور عورتوں کو، نہ معلوم کس بدمعاش کا گناہ، میرے معصوم و شریف بیٹے کے نام لگا رہی ہے۔ چلی جا یہاں سے ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا اور خبردار جو کبھی یہاں آنے کی کوشش کی۔''

گل جاناں گویا آتش کی طرح بھڑک اٹھی تھیں۔ ان کا انداز اس قدر خونخوار اور جارحانہ تھا کہ صاف محسوس ہو رہا تھا کہ ہو سکتا ہے وہ آگے بڑھ کر اس کی بوٹی بوٹی کر ڈالیں گی۔

''یقین آگیا مجھے کہ تم جیسی عورت نے ہی شمشیر خان جیسے حیوان کو جنم دے کر پرورش کیا ہے۔ میری بات کو آپ نے جھٹلایا ہے، میری توہین و بے عزتی کی ہے، یہ سب میں نے برداشت کیا لیکن یاد رکھئے گا اگر میرے بچے کو کچھ ہوا تو میں آپ کے بچے کو بھی سلامت نہیں رہنے دوں گی۔''

اس کے لہجے میں زخمی ناگن جیسی پھنکار تھی۔ وہ لہو رنگ آنکھوں سے ان کو دیکھتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔

☆☆☆

''آپ ناراض ہیں مجھ سے؟''

''کیوں؟'' صارم نے اس کی جانب سپاٹ نگاہوں سے دیکھا۔ بے بی پنک کلر سوٹ میں ملبوس، نازک سی گولڈ کی جیولری اور لائٹ سے میک اپ میں مرکری لائٹس کی روشنی میں اس کا چاند سا حسن دمک رہا تھا۔

جھکی ہوئی لرزاں پلکیں!

دھیرے دھیرے کانپتا وجود!

گلابی لبوں کو دانتوں سے گھائل کرتی ہوئی وہ از حد نروس و بدحواس لگ رہی تھی۔

''پلیز، مجھے معاف کر دیجیے، میں نے بہت زیادتیاں کی ہیں۔ بے حد بدتمیزیاں روا رکھی ہیں، بہت بے وقوف ہوں میں۔''

اس کے شرمندہ و رنجیدہ لہجے میں کوئی بناوٹ و کھوٹ نہ تھی۔ اس کی بے لوث چاہت، بے غرض محبت، ہمت و استقلال، عظمت و مفاہمت آمیز سلوک نے اس کے اندر سے تمام نفرت اور بغض کو صاف کر دیا تھا۔

اس کی الفت اتنی ہی کھری و پاکیزہ تھی کہ اس جیسی خودسر و ضدی طبیعت رکھنے والی ورشا خود ہی اس کی جانب پیش قدمی کر بیٹھی تھی۔

اس راہ میں نہ اس کی خودداری آڑے آئی اور نہ ہی اس کی انا حائل ہوئی۔ اس نے جان لیا، کہ ایسے نازک و کڑے وقت میں جب اسے اس کے اپنوں کی شفقت، توجہ اور مہربانی کی ضرورت تھی تو ان کے اپنوں نے اس کے ساتھ کیا رویہ اختیار کیا تھا۔ اسے اپنی نرم و گھنی چھاؤں میں پناہ دینے کے بجائے اسے فروخت کر ڈالا تھا۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس کی روح کو سوختہ کر دیا تھا۔ اس کی عصمت و ناموس کو بے غیرتی و بے وقعتی کے سیاہ کفن میں رخصت کر ڈالا تھا۔ ان بے حس و بے احساس لوگوں میں رہ کر وہ بھی تو ایسی ہی بن گئی تھی۔

اگر بی بی جان اور بابا جانی جیسے مخلص و بے ریا لوگوں کی اسے شفقت و اپنائیت نہ ملتی تو وہ نامعلوم کب تک اسی طرح رشتوں اور محبتوں کی چاشنی کے بنا تلخ و سنگلاخ زندگی گزارتی، پتھریلی چٹانوں کی طرح۔

جب اس پر یہ حقیقت آشکار ہوئی تھی کہ اسے صارم نے اغوا نہیں کرایا تھا، بلکہ وہ تو اپنے بھائی کے کیے گئے ظلم کا شکار ہوئی تھی، ایک ایک منظر، ایک ایک لفظ اسے ازبر تو یاد آنے لگا تھا۔

صارم کو اس نے کیا کچھ نہیں کہا تھا۔

کیسے کیسے گھٹیا الزامات اس کی ذات پر لگائے تھے۔

کیسی توہین آمیز گفتگو روا رکھی تھی اس سے۔

اس نے اس کی زندگی بچائی تھی۔

اس کی حفاظت اپنی جان سے بڑھ کر کی تھی۔

وہ اس کی جان کی دشمن بن بیٹھی تھی اور کتنا خوفناک منصوبہ بنایا تھا۔ اس سے انتقام لینے کا اور آخر کار اسے پہاڑ سے گرانے میں کامیاب

ہوئی تھی۔ یہ تو اسے ان لوگوں کے درمیان رہ کر ہی محسوس ہوا کہ وہ ہمہ وقت اپنے بزرگوں کی دعاؤں کے حصار میں رہتا ہے جبھی پہاڑ سے گر کر بھی زندہ سلامت تھا۔

اب اس کی زندگی اس کے لیے اپنی زندگی سے بھی اہم تھی۔

''ہشت، کیا کر رہی ہو؟ دماغ خراب ہو گیا ہے؟ کچھ نہیں کیا تم نے۔'' ضارم نے ان کے بہتے آنسو اپنے ہاتھ سے صاف کرتے ہوئے ملائمت سے کہا۔

''یہ آپ کی اعلیٰ ظرفی ہے یا آپ مجھے سزا دے رہے ہیں؟ فی الحال میں سب برداشت کرنے کی اہل ہوں؟ میں نے جو کچھ بھی کیا وہ لاعلمی میں سرزد ہوا۔ شمشیر لالا نے جو ظلم کیا، اس کا تاوان تو میں جان دے کر بھی نہیں چکا پاؤں گی۔ لیکن آپ جو چاہیں......''

''اوہ، کیا ہو گیا ہے؟ کیوں اس طرح باتیں کر رہی ہو؟ میں نے پہلے بھی کہا تھا اور اب بھی کہہ رہا ہوں کہ کسی کی زیادتی کا بدلہ، دوسرے سے لینا میں قطعی پسند نہیں کرتا، یہ فعل سخت بیوقوفی و غیرت کے تقاضے کے خلاف ہوتا ہے۔ سزا...... سزاوار کو ہی ملنی چاہیے۔ پھر میں کس طرح تم کو سزا دے سکتا ہوں؟'' وہ نیم دراز ہو کر سنجیدگی سے کہنے لگا۔

''پھر آپ کا گریز، الجھا الجھا لاتعلق سا رشتہ! مجھے محسوس ہو رہا ہے جیسے آپ مجھ سے خفا ہیں۔ یا مجھے معاف نہیں کر سکے ہیں۔'' اس نے جھجکتے ہوئے اٹک اٹک کر کہا اور ضارم نے بے حد قریب ہو کر اس کے گلابی گلابی حسین مکھڑے کو بغور دیکھا۔ پھر ایکدم ہی دور ہو کر گویا ہوا۔

''آہ، سمجھ نہیں آتا قسمت کی ستم ظریفی پر ہنسوں؟ یا نصیب کے اس سیاہ مذاق پر آنسو بہاؤں؟ چاہت ہمیں اس وقت کیوں نہیں ملتی جب ہمیں اس کی 'چاہ' ہوتی ہے؟ مسرتیں و رنج مشروط طریقے سے کیوں ملتے ہیں؟ ایک وقت تھا جب میں تمہیں پانے کے لیے جان کی بازی لگانے کو تیار تھا۔ جب تم میری زندگی میں آئیں تو تمام جذبے وشوق فریز ہو گئے۔ خواہشوں کے پھول مرجھا گئے۔

آرزوؤں کی تتلیوں کے رنگ اتر گئے۔ تمناؤں کی کہکشائیں تاریک ہو گئیں۔ امنگیں، جذبات، احساسات، ولولے سب ہی فنا ہو کر رہ گئے۔ تمہارا آنا اور نہ آنا، ملنا اور نہ ملنا، کوئی معنی نہیں رکھتا، میرے اندر اب صرف گہرے سمندروں کی مانند سکوت و تاریکی کا راج ہے۔''

ایک لمحے کو رک کر اس نے اس کے زرد پڑتے چہرے کی جانب بغور دیکھا۔

''میرا مقصد تمہیں دکھ پہنچانا، آزردہ کرنا نہیں ہے۔ میں اپنی کیفیت بیان کر رہا ہوں؟ سبریز خان میری زندگی کا اہم جزو رہا تھا۔ میں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا کہ وہ مجھے چھوڑ کر چلا جائے گا۔ اس کی جدائی نے، اس کے ساتھ گزرے لمحوں نے مجھے بالکل ریزہ ریزہ کر ڈالا ہے اس کو بچھڑے ہوئے چھ سات ماہ گزر گئے۔ میرے دل میں اس کی یادیں ایسی ہی تازہ و جاندار ہیں کہ لگتا ہے ہمارے درمیان کبھی جدائی کی دیوار تعمیر ہی نہیں ہوئی، وہ میری روح کا ایک حصہ ہے۔''

''جو کسی جدوجہد و لگن کے بغیر مل جائے تو وہ اس طرح ہی بے وقعت و ارزاں ہو جاتا ہے، جس طرح میں آپ کو بنا مانگے مل گئی؟''

ورشا نے اس کا کشور پن و بیگانگی دیکھ کر رندھے لہجے میں کہا۔

''ہوں، تم نے مجھے کون سے اشکوں بھرے دل، بچے وکھرے جذبات، بے لوث محبت سے اپنایا ہے؟ملن میں جب غرض و مجبوری شامل ہوجاتی ہے تو ایسا ہی ہوتا ہے۔'' اس بار اس نے خاصے کاٹ دار وطنزیہ لہجے میں کہا تھا۔ اس کا موڈ ایک دم ہی بدل گیا تھا۔

''کیا.....کیا مطلب ہے آپ کا؟'' وہ ٹپٹا کر گویا ہوئی۔

''تم محض مجبوری کی بنا پر مجھے قبول کر رہی ہو ورشا خان، ورنہ جانتا ہوں میں آج بھی وہی آوارہ و ہرجائی شخص ہوں تمہاری نگاہ میں، اپنے بھائی کے گناہوں کا کفارہ ادا کرنا چاہتی ہو، عورت بہت مکار ہوتی ہے۔ پل پل روپ بدلنے میں اس کا کوئی ثانی نہیں ہے۔ کل تک میری پرچھائیں سے گریزاں تھیں، اب میرے پہلو میں مجھے اسیر محبت کرنے کی سعی میں مصروف ہو۔ یہ سب دل سے نہیں ہے۔ یہ صرف لاچاری ہے، سمجھوتہ ہے۔''

''آپ میری انسلٹ کر رہے ہیں۔'' ورشا احتجاجاً بولی۔

''شٹ.....توہین تم میری کر رہی ہو، دھوکہ مجھے دینا چاہتی ہو لیکن یاد رکھو پر خلوص جذبوں کی پذیرائی کرتا ہوں، بے غرض چاہت کا شیدائی ہوں، مجھے جسم سے نہیں، روح سے عشق ہے۔ جسم تو چند نوٹوں کے عوض بھی مل جاتے ہیں، پاکیزہ و مفاد سے بالاتر محبت ہی ناپید ہے یہاں۔''

''وہ کچھ دیر سانس لینے کو رکا، ورشا سن سی بیٹھی رہ گئی۔ کمرے کی ٹھنڈی خنک فضا میں گویا جیسے انگاروں کی تپش برس پڑی تھی۔

ہنستے مسکراتے، اپنائیت و محبت سے لبریز شخص کا یہ کونسا روپ تھا؟

''تم پلیز مائنڈ مت کرنا، میں اپ سیٹ ہوں، مجھے معلوم نہیں میں کیا کہہ رہا ہوں۔'' وہ اسے گم صم دیکھ کر وہ ملائمت سے گویا ہوا۔

''میں برا نہیں مان رہی، اور نہ ہی برا مانوں گی، آپ کے دل میں جو بھی میری طرف سے غبار و غصہ ہے آپ مجھے برا بھلا کہہ کر دل صاف کر لیجیے۔ میں یہی چاہتی ہوں۔'' اس نے تحمل و بردباری سے کہا۔

''کاش، تم اس وقت یہ سب کہتیں تو حالات کس قدر مختلف اور خوبصورت ہوتے، شاید مسرت سے میری سانسیں رک جاتیں۔'' صارم نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے شوخ لہجے میں کہا۔ ''مائینڈ اٹ ورشا، میں ابھی کچھ کہہ نہیں سکتا، تمہاری ذمے داری سے میں غافل نہیں ہوں گا، تمہارا خیال رکھنا، تمہاری ہر ضرورت پوری کرنا بحیثیت شوہر میرا فرض ہے۔ میں تمہاری طرف سے کوئی غفلت و بے پروائی نہیں برتوں گا، لیکن تمہاری طرف لوٹنے میں شاید مجھے کچھ عرصہ لگے۔''

☆☆☆

''آپ نے کیوں بلوایا ہے مجھے؟'' شمشیر خان نے اندر داخل ہوتے ہی سوال کیا تھا۔

''کیوں؟ میں بلوانے کا حق نہیں رکھتی تمہیں؟''

''حق؟ یہ حق کی بھی خوب کہی تم نے، میں کب سے سوچ رہا ہوں، بابا جان سے اپنا حق وصول کرلوں اب بابا جان سے کہوں مجھے میرا حصہ دے دیں میرا اکاؤنٹ خالی ہونے ہی والا ہے اور مجھے بار بار ان کے آگے ہاتھ پھیلاتے ہوئے غیرت آتی ہے۔''

''تمہارا حصہ تمہیں دے دیا جائے تاکہ تم اسے بھی دنیا بھر کی آوارہ، بدکردار عورتوں پر لٹاؤ اور وہ آکر یہاں ہماری عزت پر داغ لگائیں یہ

کہہ کر کہ وہ تمہارے بچے کی ماں بننے والی ہیں؟''

ماں کے بگڑے تیور، کڑوا لہجہ اس نے کبھی نہیں سنا تھا اور ان کے ہونٹوں سے ادا ہوتے والے جملوں نے اسے ششدر و حیران کر ڈالا۔

''کیا کہہ رہی ہو ادے، کون آیا تھا یہاں؟''

''سنا ہے وہ پہلے یہاں ڈاکٹرنی تھی، پھر وہ لوگ یہاں سے چلے گئے۔''

''بالکل غلط سنا ہے۔ میں بھلا اس طرح شادی کر سکتا ہوں؟ میری بیوی اس قبیلے کی لڑکی بنے گی جو عزت دار اور معزز گھرانے سے تعلق رکھتی ہو گی۔ میں کسی ڈاکٹرنی کو نہیں جانتا۔'' وہ ماں کے سامنے صاف مکر گیا۔ لیکن دل ہی دل میں کائنات پر طیش کھا رہا تھا کہ وہ اس کی بلا اجازت یہاں کیوں آئی؟ اس کے حوصلے و جرأت نے اس کے اندر کے حیوان کو بیدار کرنا شروع کر ڈالا تھا۔

''خاناں! میں نے اتنی عمر لوگوں کے درمیان گزاری ہے۔ حیات کے نشیب و فراز چہروں کے اتار چڑھاؤ، سچ جھوٹ، ان سب سے میں بخوبی واقف ہوں۔ اس لڑکی کی باتوں اور تمہارے جھوٹ سے مجھے یقین ہو گیا ہے کہ وہ لڑکی سچ بول رہی تھی۔ میں تمہیں یہ نہیں کہوں گی کہ تم نے ایسا کیوں کیا؟ کیونکہ تم جیسے لوگ ایسے کام کرتے رہتے ہیں لیکن تم نے اس لڑکی کا ڈھول اپنے گلے میں کیوں لٹکایا؟ اسے اتنا حوصلہ اور جرأت کیوں دی جو وہ اس گھر کی دہلیز تک آ پہنچی۔ ایسی عورتیں بہت لالچی اور چالاک ہوتی ہیں۔ دولت بٹورنے کے لیے، جائیداد پر قابض ہونے کے لیے اس طرح کے بچوں کو بھی جنم دے ڈالتی ہیں۔ پہلی فرصت میں ان سے جان چھڑاؤ اور آ کر حویلی میں رہو۔ تمہارے بابا جان کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ وہ اب ہر وقت غصے میں رہنے لگے ہیں۔ زیادہ وقت ان کا مسجد میں گزرتا ہے یا پھر گل خانم کی طرف رہتے ہیں۔ میری تو آواز تک سننے کے روادار نہیں ہیں۔''

گل جاناں مضبوط اعصاب کی عورت تھیں۔ کائنات کی شکل اور باتوں سے انہیں یقین ہو گیا تھا کہ وہ سچ کہہ رہی ہے مگر اسے قبول کرنے کا مقصد تھا کہ جگ ہنسائی اور وہ خواب بھی مر جاتا جو وہ شمشیر خان کی بیوی کی صورت کسی اونچے خاندان کی لڑکی اور لڑکی سے زیادہ اس کے ساتھ آنے والی جائیداد سے محروم ہونا پڑتا۔ اس لیے سختی سے انہوں نے اس کی بات کی تردید کی اور ساتھ ہی بے عزت کر کے اسے حویلی سے نکالا کہ آئندہ کبھی وہ بھول کر یہاں قدم نہ رکھ سکے۔ انہوں نے سوچ لیا تھا کہ وہ شمشیر خان سے اس لڑکی کا پتہ ہی کٹوا دیں گی۔

''بابا جان کو یکدم کیا ہوا ہے؟ وہ تو ادے کو دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے تھے۔'' اس نے کائنات کا ذکر گول کرتے ہوئے استعجابیہ لہجے میں کہا۔

''جادو گری ہے وہ.....''

''ہوں، سب درست کر لوں گا میں، تم بس بابا جان سے کہہ دینا کہ جائیداد اس ہفتے میں میرے نام کر کے پکا کاغذ دے دیں مجھے۔''

''ابھی وقت نہیں آیا کہ جائیداد بانٹی جائے۔ تمہارے دونوں بھائیوں نے آج تک بٹوارے کی بات نہیں کی پھر تم اس قدر بے قرار کیوں ہو؟ دونوں بھائی گھر چھوڑ کر چلے گئے ان کی غیر موجودگی میں یہ کام ہو بھی نہیں سکتا۔'' گل جاناں اس کا حتمی انداز دیکھ کر سمجھانے لگیں۔

''کیوں گئے وہ گھر چھوڑ کر؟ کسی نے انہیں گھر سے نکالا نہیں ہے اگر وہ اس قدر ہی غیرت مند و غیور بنتے ہیں تو مجھے پروا نہیں ہے اور نہ ہی

میں انہیں جائیداد سے ایک روپیہ بھی لینے دوں گا، اب ہر چیز پر میرا حق ہے اگر کسی نے درمیان میں آنے کی کوشش کی تو ٹکڑے ٹکڑے کر کے پھینک دوں گا۔" اس کے لہجے میں سفاکی و قطعیت جھلک رہی تھی۔ گل جاناں دہل سی گئیں۔ اس کی سرخ آنکھوں میں اترتا خون انہیں حواس باختہ کر گیا۔ پہلی بار انہیں اس کی جانب سے تشویش ہوئی کہ وہ بہت آگے نکل چکا تھا۔

وہ کچھ دیر بیٹھ کر واپس آ گیا تھا۔ اس کے ذہن میں مسلسل کائنات کے خلاف غصہ بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ چاہ رہا تھا اڑ کر گھر پہنچ جائے اور اس کا وہ حشر کرے کہ وہ یاد رکھے۔ گھر جلد سے جلد پہنچنے کے خیال سے صمد خان کو بھی فل اسپیڈ سے جیپ چلانے کی تاکید کی تھی۔

جیپ ہوا کے دوش پر گویا اڑ رہی تھی۔ صمد خان مالک کے حکم پر عمل پیرا تھا۔ راستہ بہت خوبصورت تھا۔ سبزہ ہی سبزہ پھیلا ہوا تھا۔ سامنے آسمان کی حدوں کو چھوتے برف پوش پہاڑ تھے جن کی خوشنما پھولوں کی بہتات، چاندی کی طرح چمکتے ہوئے جھرنوں کا رقص سب کچھ بہت دلکش و متاثر کن تھا کہ یکدم ہی وہ لڑکی نہ معلوم کہاں سے نمودار ہوئی تھی، صمد خان اگر ایک دم بریک نہ لگاتا تو وہ زبردست انداز میں جیپ سے ٹکراتی۔ اچانک بریک لگانے سے پہیوں کی چرچراہٹ پر سکوت ماحول میں گونج کر رہ گئی تھی اور ساتھ ہی اس لڑکی کی الہڑ، کھنکتی ہوئی شوخ ہنسی ریشمی چوڑیوں کی طرح بجتی ہوئی وہاں بکھر گئی۔ غصے سے لال بھبوکا شمشیر خان گویا ساکت ہو کر رہ گیا۔ سرخ گھاگھرے، کھلتی ہوئی سبز چولی اور دھنک رنگ دوپٹہ اوڑھے نوخیز دشگفتہ حسن کی رعنائیوں کا مرقع وہ لڑکی ہنستی ہوئی انہیں شوخی بھری نگاہوں سے دیکھتی ہوئی، تیزی سے سڑک عبور کر کے آگے کھیتوں میں گھس گئی تھی۔

"کیسا چاند جیسا حسن تھا اس کا، روشن و مبہوت کر دینے والا۔" شمشیر خان نے آہ بھرتے ہوئے ستائشی لہجے میں کہا۔ نگاہیں اس کی ابھی بھی وہیں مرکوز تھیں۔

"نائی برکت خان کی لڑکی ہے۔ اسی ہفتے گاؤں سے آئی ہے۔ حرا نام ہے اس کا۔"

"یہ تو اصلی ہیرا ہے۔ اس کے حسن کی شعاعوں نے تو مجھے تاریک کر کے رکھ دیا ہے۔"

"خان جی! آپ کا حکم ہو تو لے آؤں اسے ڈیرے پر؟" خان کا شوق و وارفتگی دیکھ کر وہ خوشامدی و ادبا شانہ لہجے میں گویا ہوا۔

"ہاں۔ یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے؟ اب تو جب تک اس کے رخ روشن کا دیدار نہیں ہو جائے گا تب تک یہ بے چینی و بے قراری تو مسلسل رہے گی۔"

☆☆☆

آج بھی انہونی ہوئی تھی۔

کئی لمحے دیگر لوگوں کی طرح وہ بھی حیرانگی و بے یقینی سے آنے والوں کے مسرت سے سرشار چہرے دیکھ رہی تھی۔

"بی بی جان! کیا گزرے وقت نے مجھے اس حد تک بدل دیا ہے کہ آپ مجھے پہچان نہیں پا رہی ہیں؟ یا مجھ سے ملنے کی آپ کو خواہش نہ تھی؟" مسرت سے دمکتے چہرے پر یکلخت حزن و ملال اتر آیا تھا۔

"میری بچی! میری جان، گل خانم! ان آنکھوں کو اعتبار تو آنے دو۔ یہ تم ہو؟ آہ، تم سے ملنے تمہیں دیکھنے کی خواہش تو حیات کی حسرت بن

گئی۔ ظالم وقت نے ہمیں بہت اذیت دی ہے۔"

پہلے تو انہیں یقین نہ آیا کہ ان کی نگاہوں کے سامنے گل خانم کھڑی ہیں۔ وہ گل خانم، جو نہ صرف ان کی لاڈلی چہیتی بھانجی تھی بلکہ ان کے مرحوم بیٹے کی محبت بھی تھی۔ جسے وقت کی سیاہ، آندھی، دشمنی کا لہو رنگ طوفان ان سے دور لے گیا تھا اور آج چالیس برس بعد وہ ان کے روبرو تھیں۔ انہوں نے انہیں اپنے سینے سے لگا لیا اور پھر اشکوں کا دریا سا بہہ اٹھا تھا۔

"میں اپنے اللہ سے ناامید نہیں تھی۔ مجھے یقین تھا وہ ایک دن ایسا ضرور میری زندگی میں دکھائے گا کہ میں اپنے وقتی طور پر جدا ٹکڑوں سے مل پاؤں گی۔ اس رب کا بہت شکر و احسان ہے کہ میں نے آج یہ دن دیکھ لیا ہے۔"

نادم، نادم، بے حد شرمندہ سے وہ مجرموں کی طرح گردن جھکائے بیٹھے تھے۔ انہوں نے ہی آج ان دو دشمنی کی دیوار گرائی تھی اور خود گل خانم کے ہمراہ یہاں آ کر ان لوگوں سے معافی مانگی اور دوستی کے لیے ہاتھ بڑھایا تھا۔ جو بہت محبت و خلوص سے تھاما گیا تھا۔ وہ اب ان سب کے درمیان بیٹھے تھے۔

"ہاں لاکھ لاکھ شکر ہے اس مالک کا جو بندوں کو ان کی دعاؤں سے بڑھ کر نوازتا ہے۔" بابا جانی نے شہباز خان کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کھلے دل سے کہا۔

"یہ تو سب آپ لوگوں کا بڑا پن اور خوش اخلاقی ہے جو مجھ جیسے کمینے و گھٹیا شخص کو معاف کر کے گلے سے لگایا ہے ورنہ۔" شدت جذبات سے ان کی زبان رندھ گئی تھی اور آنسو بہنے لگے۔

"ایسی باتیں کر کے ہمیں شرمندہ مت کرو شہباز خان! تم آج بھی ہمیں اتنے ہی عزیز ہو جتنے کل تھے، غلطی کرنے والا سچے دل سے معافی مانگ لے تو اللہ بھی معاف کر دیا کرتا ہے پھر ہم تو اس کے گناہ گار بندے ہیں۔ ہمارا دل تمہاری طرف سے بدگمانیاں صاف کر چکا ہے۔" بی بی جان نے ان کے سر پر ہاتھ رکھ کر اپنائیت سے کہا۔

حویلی کا ماحول جنت نظیر تھا۔ سب گلے شکوے ختم ہو گئے تھے۔ گلباز خان، گلریز، گلباز سے چھوٹے گل داؤ خان، رانی گل، زرگون خانم اور گل زیبا سب ہی وہاں بیٹھے تھے۔ خوبصورت و خوشگوار باتوں کے ساتھ مشروبات کا دور چل رہا تھا۔

"بی بی جان! اورشا کہاں ہے؟ میں اس سے ملنے کو بہت بے تاب ہوں۔" معاً سجاویہ کی بے قرار و بے چین سی آواز ابھری تھی اور ساتھ ہی گل خانم اور شہباز خان کے چہروں پر بھی بے تابی و محبت کے رنگ گہرے ہو کر جھلک اٹھے تھے۔

"وہ یہاں قدم رکھتے ہی متلاشی نگاہوں سے بیٹی کو دیکھ رہے تھے مگر کچھ جھجک و شرمندگی انہیں سرعت سے آگے آ رہی تھی کہ سجاویہ نے آخر کار ان کی مشکل حل کر دی تھی۔

"بیچی! وہ تو پچھلے ایک ماہ سے کراچی میں رہ رہی ہے۔ صارم نے نیا کاروبار شروع کیا ہے۔ اسے اس لیے وہاں بھیج دیا کہ یہاں رہتے رہتے وہ گھبرا نہ جائے۔ اس سے ملنے کراچی چلی جانا، وہ تو کچھ عرصے بعد دونوں آئیں گے۔ نئے کاروبار کی بہت دیکھ بھال کرنی ہوتی ہے۔" بی بی

جان نے نہایت شفقت سے بتایا تو سجادیہ کو سکون محسوس ہوا، یہ جان کر کہ اس کی بہن خیریت سے ہے اور ان کے شفیق لہجے و پیار بھرے انداز بتا رہے تھے کہ اس نے اس گھر میں ہی نہیں بلکہ ان کے دلوں میں ڈھیروں جگہ بنالی ہے۔

شہباز خان اور گل خانم کے چہروں پر آسودگی و طمانیت کی سرخی چھا گئی تھی۔

زرگون خانم، سجادیہ کو لے کر اپنے کمرے میں چلی گئی تھی تا کہ اس سے گپ شپ کر سکے۔ ویسے بھی ان دونوں ماں بیٹی کا رویہ گلباز خان کے شکستہ رویے سے بدل گیا تھا اور ورشا کے کراچی روانہ ہونے سے قبل دونوں ماں بیٹی نے اس سے معافی مانگ لی تھی۔

گلریز خان اور گل داد خان کسی کام کی وجہ سے معذرت کر کے اٹھ گئے تھے۔

گل زیبا اور زرانی گل کھانے کی تیاری کے لیے ملازماؤں کا ہاتھ بٹانے کی خاطر کچن میں آ گئی تھیں۔ اب وہاں وہ چاروں تھے۔ شہباز خان نے چمڑی بیگ سے نوٹوں کی گڈیاں اور وہ سونا نکالا جو انہوں نے ورشا کے نکاح کرنے کے عوض لیا تھا اور ساتھ ہی ایک بڑی زمین و دوسری جائیداد کے حصے جو ورشا کے نام تھے ان کی طرف سے کاغذات کی طرف بڑھایا تھا۔

''یہ سب کیا ہے؟'' بابا جانی تحیر زدہ لہجے میں استفسار کرنے لگے۔

''خدارا بابا جانی انکار مت کیجیے گا۔ یہ سونے کے سکے اور رنگین کاغذ کے ٹکڑے مجھے سانپ و بچھو بن کر ہر وقت ڈستے تھے۔ ان کے زہر نے ہی میرے ضمیر میری روح کو بیدار کیا ہے۔ مجھے مذہب اور انسانیت سے روشناس کروایا ہے ورنہ تو میں ایک باپ رہا تھا اور نہ اچھا انسان بن سکا تھا۔''

''لیکن شہباز خان!''

''آپ کو اللہ کا واسطہ ہے بابا جانی! مجھے کچھ میری نگاہوں میں سرخرو ہونے دیجیے۔ کل کو بیٹی اور داماد سے نگاہیں ملا کر بات تو کر سکوں گا۔ ساری زندگی اپنی بچیوں کو وہ پیار و محبت نہ دے سکا جس کی وہ حقدار تھیں اب یہ اس کے جہیز کے نام پر جو دے رہا ہوں، وہ میری غفلت و بے پروائی کا کفارہ تو نہیں لیکن میری طرف سے بیٹی داماد کے لیے معمولی سا تحفہ ہے۔'' شہباز خان گلوگیر لہجے میں گویا ہوئے گل خانم خاموش آنسو بہا رہی تھیں۔

''تمہاری حق و صداقت کی طرف واپسی سب سے بڑا تحفہ ہے شہباز بچے! اگر برے وقت کو بھول کر میں نے تمہیں سینے سے لگایا ہے۔ ہم ایک ہو گئے، ہمارا قبیلہ ایک ہو گیا اس سے بڑھ کر خوشی کیا ہو سکتی ہے۔''

''شمشیر خان نے جو ظلم آپ پر توڑا ہے وہ اس کا بدلہ اللہ نے مجھ سے لیا ہے۔ میرے دونوں بیٹے گھر چھوڑ کر چلے گئے اور وہ بد بخت یہاں ہوتے ہوئے بھی نہ ہونے کے برابر ہے۔ دل کرتا ہے اسے اپنے ہاتھوں سے ختم کر ڈالوں۔''

''ایسی بات نہیں کرو بچے! اولاد کی بھلائی کے لیے دعا کو رہنا چاہیے۔''

''میرے دل میں زخم کر دیے ہیں اس نے اب مجھے محسوس ہو رہا ہے بیٹا یا بیٹی اولاد تو اولاد ہوتی ہے۔ یہ سب ہمارے ذہنوں و سوچوں کا تغیر ہوتا ہے۔ میں نے گاؤں میں لڑکیوں کے لیے اسکولز اور مدرسوں کے لیے عمارتیں تیار کروانے کا کام شروع کر دیا ہے۔ آج میں سمجھ گیا ہوں ہمارے سماج میں پھیلے ہوئے اندھیروں اور فرسودہ رسم و رواج کو تعلیم کی روشنی ہی تاراج کر سکتی ہے۔ جس طرح میری بیٹی نے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے باوجود میری

گردن جھکنے نہ دی اور خاموشی سے میرے فیصلے کی بھینٹ چڑھ گئی آج مجھے فخر ہے بیٹی پر اور اس کے نام سے ہی سب اسکولز و مدرسے کام کریں گے۔"

"واہ.....شہباز خان.....واہ! یہاں تم نے ہمیں بھی پیچھے چھوڑ دیا۔" بابا جانی نے خوشی سے نہال ہوتے ہوئے انہیں سینے سے لگا لیا۔

☆☆☆

کائنات کی آنکھ درد کی اس تیز لہر نے کھول دی تھی جو اس کے پورے وجود میں برق کی طرح بھڑکتی جا رہی تھی۔ سانس بھی گویا اکھڑا اکھڑا سا تھا۔ تکلیف سے بند ہوتی آنکھیں اس نے کھول کر بمشکل ارد گرد دیکھنے کی کوشش کی یہ کوئی نامانوس سی جگہ تھی۔

ہر سو اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ ایسی تاریکی تھی کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔

شاید میں مر گئی ہوں؟ کیا یہ قبر ہے؟ اف اس قدر اندھیرا اور وحشت تو قبر میں ہی ہو سکتی ہے۔ موت کا خیال تھا یا قبر کی دہشت کا احساس وہ روح فرسا تکلیف کے باوجود اٹھ کھڑی ہوئی، ٹانگوں میں چلنے کی سکت نہیں تھی لیکن وہ لڑکھڑاتی ہوئی تاریکی میں ادھر ادھر ہاتھ پاؤں مار رہی تھی۔

ذہن میں دھماکے ہو رہے تھے۔ اسے وہ وقت رہ رہ کر یاد آ رہا تھا جب وہ بے خبر سو رہی تھی کہ معاً اسے احساس ہوا جیسے کوئی اس کے چہرے پر مسلسل تھپڑ مار رہا ہو۔ تکلیف کا احساس اتنا شدید تھا کہ اس کی آنکھیں کھل گئی تھیں اور وہ تھپڑ خواب نہیں حقیقت تھا۔ شمشیر خان جھکا ہوا نہایت غصے و بیدردی سے اس کے چہرے پر تھپڑ مار رہا تھا۔ اسے آنکھیں کھولتے دیکھ کر وہ چنگھاڑا۔

"ذلیل، گھٹیا عورت، میری بغیر اجازت تو گھر سے نکلی اور حویلی کی دہلیز تک پہنچ گئی میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

"تم مجھے زندہ نہیں چھوڑو گے؟ میں زندہ تمہیں بھی رہنے نہیں دوں گی خان! تمہیں مزید گھر جلانے نہیں دوں گی، اب تم مزید عصمتیں برباد نہیں کر سکتے۔"

"ہا.....ہاہا، صمد خان لانے والا ہے ابھی ایک تو خیز کلی کو۔ میں تو اس سے دل بہلاؤں گا، مجھے کوئی نہیں روک سکتا۔ تو بھی نہیں، کیونکہ تو قبر کی اندھیری گود میں موت کی نیند سو رہی ہوگی۔" اس نے خوفناک لہجے میں کہا۔

"اگر ایسا ہوا تو یاد رکھنا خان! میں زندہ تمہیں بھی نہیں رہنے دوں گی۔ تم نے ابھی عورت کا انتقام نہیں دیکھا۔" اس کے فولادی گھونسوں، لاتوں تھپڑوں نے بھی اس کی ہمت و عزم میں دراڑ نہیں ڈالی تھی۔

"عورت؟ اور اس کا انتقام! کس طرح چیونٹی کی طرح میں عورت کو مسل کر رکھ دیا کرتا ہوں، تمہیں ابھی بتاتا ہوں۔ تمہارے ساتھ اس ناسور کو بھی ختم کر ڈالوں گا جس کی وجہ سے تم بہت با حوصلہ اور بہادر ہو گئی ہو۔"

اس پر جیسے کوئی جنون سوار ہو گیا۔ کائنات اس کی حیوانیت و وحشی پن کے آگے کوئی مزاحمت نہ کر سکی تھی۔ لحہ بہ لحہ اس کی گردن پر اس کی مضبوط ہاتھوں کی گرفت بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ بری طرح مچل رہی تھی، اس کی گرفت سے آزاد ہونے کے لیے..... مگر..... سب بے سود و بیکار ثابت ہو رہا تھا۔ اس کا دم گھٹتا جا رہا تھا اور آنکھیں حلقوں سے باہر ابل رہی تھیں..... شمشیر خان اس وقت کوئی عفریت لگ رہا تھا۔ خوفناک چہرہ، خون چھلکاتی نگاہیں اور اس کی سانسیں ایک دم رک گئی تھیں۔ آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا، پھر اس کا ذہن اندھیروں میں گم ہوا تو وہ اب بیدار ہوئی تھی تو کہ اندھیرا

بدستور قائم تھا اور اس کا پورا وجود "درد" بنا ہوا تھا۔ کافی دیر اندھیرے میں رہنے کے باعث آنکھیں عادی ہو گئی تھیں۔ یہ اسے محسوس ہو گیا تھا یہ قبر نہیں تھی کیونکہ یہاں کی دیواریں پختہ و فرش ٹھوس تھا اور آگے شاید سیڑھیاں تھیں وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگی کافی سیڑھیاں چڑھنے کے بعد وہ اوپر پہنچی تو یہاں دروازہ نصب تھا اور دروازے کی جھریوں سے اندر آنے والی معمولی سی روشنی اسکے لیے بہت تھی۔ کائنات نے جھری سے جھانکا اور وہ چونک گئی۔ یہ تو اسی کا بیڈروم تھا لیکن اس کے پیچھے تہہ خانہ ہے وہ واقف نہ تھی۔ اس نے دروازے پر دباؤ ڈالا اور دروازہ بے آواز کھل گیا۔ وہ اپنے کمرے میں تھی۔ لکڑی کی بھاری و وسیع وارڈروب اپنی جگہ سے کھسکی ہوئی تھی اور اس کے پیچھے دروازہ صاف نظر آ رہا تھا۔ "تو...... تم نے اپنا کمینہ پن دکھا دیا شمشیر خان، تم مجھے مردہ سمجھے اور تم نے مجھے نیچے تہہ خانے میں پھینک دیا، کسی کو تمہارے گناہ کی خبر نہ ہوتی اور شاید میری ہڈیاں بھی مٹی میں مل جاتیں۔ آہ! مجھے معلوم ہے میں اب زندہ نہیں بچوں گی، میری کوکھ میں موت کے سناٹے پھیل گئے ہیں جو بہت جلد میرے اندر بھی پھیلنے والے ہیں لیکن میں......"

اسی دم باہر سے بھاری قدموں اور کسی لڑکی کے رونے چیخنے کی آوازیں آنے لگیں وہ اٹھی اور اٹیچڈ باتھ میں چھپ گئی۔ ساتھ ہی دروازہ کھولنے کی آواز آئی تھی۔

"لالہ! مجھے چھوڑ دو، کون ہو تم؟ مجھے یہاں کیوں لائے ہو؟"

"خاموش رہو۔ شور مچایا تو گلا دبا کر تہہ خانے میں ڈال دیں گے۔ ابھی خان آ رہے ہیں وہ آ کر تمہیں بتائیں گے۔" صمد خان کے مکروہ قہقہے وہاں گونج اٹھے۔

وہ لڑکی کو چھوڑ کر چلا گیا۔ لڑکی دروازہ پیٹ پیٹ کر رونے چیخنے لگی۔

"سنو خاموش ہو جاؤ۔" اس نے باہر نکلتے ہوئے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کو کہا۔ پندرہ، سولہ سالہ وہ لڑکی کمسنی کے ساتھ ساتھ بے حد حسین بھی تھی۔

"بی بی! مجھے بچا لو، مجھے بچا لو، نہ جانے یہ آدمی مجھے کیوں اٹھا لایا ہے۔ میں اپنی سہیلی سے مل کر آ رہی تھی کہ یہ کھیتوں میں چھپا ہوا تھا۔ میرے وہاں جاتے ہی منہ بند کر کے اٹھا لایا۔" وہ خوف سے کانپتی، سسکیوں سے لرزتے ہاتھوں کو پھیلا کر وہ اس کے پیروں پر جھک گئی تھی۔

"میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے، آؤ میرے ساتھ جلدی پہنچ جاؤ یہاں سے اپنے گھر، وہ درندہ اگر آ گیا تو بہت برا ہوگا۔" وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر بیڈروم کے دوسرے دروازے کی سمت بڑھی جو پچھلی جانب اس حصے کی طرف کھلتا تھا جہاں سے عقبی گلی کا راستہ پڑتا تھا۔ وہاں سے ایک راستہ گاؤں کی بڑی پگڈنڈی کی طرف جاتا تھا اور دوسرا راستہ بہت پرخطر تھا جس جگہ اونچی خطرناک و خیالات کھائیاں تھیں جن کی گہرائیوں کا اندازہ بھی ناممکن تھا۔ اس کی ٹانگوں کا دم نکلتا جا رہا تھا، آنکھوں میں اندھیرا پھیلتا جا رہا تھا۔ سانس بتدریج دھیمی ہو رہی تھی جسم پکے پھوڑے کی مانند ٹیسوں سے بے حال ہو رہا تھا۔ وہ اس ڈری، سہمی، روتی کانپتی لڑکی کا ہاتھ تھامے اس راستے پر پہنچ ہی گئی جس کا ایک راستہ اس پگڈنڈی کی سمت جاتا تھا جو گاؤں کے پررونق علاقے پر ختم ہوتا تھا۔ اس وقت شام ڈھلنے کے بعد وہاں خاصا اندھیرا پھیل چکا تھا۔

"بس اب تم جاؤ، اس راستے پر سیدھی چلی جاؤ، آگے گاؤں آ جائے گا۔ جاؤ پیچھے مڑ کر مت دیکھنا اور نہ کسی کو کچھ بتانا اس واقعے کے

متعلق۔" اس نے بکھرے بکھرے سانسوں، بے ترتیب حالت کے زیر و بم میں بمشکل اسے سمجھایا۔

"بی بی! تمہاری حالت تو بہت خراب ہے، بلکہ....."

اسے رہائی کا یقین ہو گیا تو ملگجے سے اندھیرے میں کائنات کے زخموں سے پر چہرہ اور عجیب سا حلیہ اسے اب نظر آیا تھا۔ وہ خلوص سے بولی۔

"بس.... تم جاؤ.... بلکہ دوڑ کر جاؤ..... مجھے چھوڑو۔" وہ درد کی شدت سے ہونٹ کاٹتی ہوئی اضطرابی انداز میں گیٹ کی جانب بھی دیکھتی جا رہی تھی۔ اسے یقین تھا کہ وہ لڑکی کو کمرے میں نہ پا کر غم و غصے سے پاگل ہو کر اس طرف ہی آئے گا۔ کیونکہ وہ سوچی سمجھی اسکیم کے تحت تمام دروازے کھول کر آئی تھی کہ وہ شکاری بو سونگھتا ہوا وہاں تک پہنچے گا اور"

"میں کیسے آپ کا شکریہ ادا کروں بی بی!"

"میرے لیے دعائے مغفرت کرنا۔ تمہارا سب سے بہترین شکریہ ہو گا میرے لیے۔" اس نے خود سے لپٹی لڑکی کو پگڈنڈی کی جانب دھکیلتے ہوئے کہا۔

لڑکی جیسے ہی نگاہوں سے اوجھل ہوئی، اسی وقت اندر سے شمشیر خان کے چیخنے چلانے کی آوازیں آنے لگیں۔ اس کے اندر جیسے نفرت و حقارت کا طوفان امڈ آیا تھا۔ ٹوٹتے حوصلے و بکھرتی طبیعت کو وہ بمشکل سنبھالے دوسرے راستے کی طرف بڑھنے لگی۔ وہ پر خطر راستہ خاردار جھاڑیوں و زہریلے کیڑوں سے بھرا ہوا تھا لیکن اس وقت وہ موت سے کچھ سانسیں مستعار لے رہی تھی۔ اونچے اونچے راستوں پر لڑکھڑاتی بڑھتی جا رہی تھی۔

چاند اس سے سیاہ بادلوں کی اوٹ میں جا چھپا اور ماحول میں اندھیرا مزید بڑھ گیا۔

"او لڑکی! کہاں جا رہی ہو؟ آگے مت جاؤ..... رک جاؤ۔" شمشیر خان اس لمحے گیٹ سے باہر نکل آیا تھا۔ اندھیرے میں وہ کائنات کو لڑکی سمجھ رہا تھا۔ پھر چیتے کی سی پھرتی سے وہ بھاگتا ہوا اوپر چڑھتا چلا گیا۔

"کہاں بھاگ رہی تھی؟ شمشیر خان کے جال میں پھنس کر کوئی شکار بھاگ نہیں سکتا۔" اس نے اسے بازوؤں میں جکڑتے ہوئے وحشیانہ لہجے میں کہا۔

"آج تم ہار گئے خان!" کائنات کی آواز نے گویا اس کے اندر برق دوڑا دی۔

"تت تم، تم زندہ ہو؟ مم..... مگر میں....."

ہاں..... تم تو مجھے مردہ سمجھ کر تہہ خانے میں پھینک چکے تھے لیکن میں تمہارے بغیر کیسے مر سکتی تھی؟ ہم نے ساتھ جینے یا ساتھ مرنے کی قسمیں کھائی ہیں خان!"

"نہیں..... یہ کس طرح ہو سکتا ہے؟ تم بچ نہیں سکتی تھیں۔"

"تم جیسے لوگ جو فیصلہ ایک بار کر لیں، اس پر عمل کیے بغیر مر ہی نہیں سکتے تم، عورت کو چیونٹی کی طرح مسل کر رکھ دیتے ہو، صفحۂ ہستی سے مٹا ڈالتے ہو، آج اس چیونٹی کی طاقت دیکھنا، کہ کس طرح تم جیسے بدقماش و بدکردار شیطان سے، دنیا کی معصوم و بھولی بھالی دوشیزاؤں کو محفوظ کرتی ہے۔"

"تم...... تم! پاگل ہوگئی ہو۔ چھوڑ دو مجھے۔" وہ خود سے بری طرح لپٹی ہوئی کائنات کو دور کرنے کی سعی میں ہانپ کر رہ گیا۔ حیرت انگیز بات تھی، وہ پہاڑ وجود رکھنے والا مرد اس جیسی عورت کی گرفت سے خود کو چھڑا نہ پا رہا تھا۔ وہ اسے دھکیلتی ہوئی کھائیوں کی طرف لے جا رہی تھی۔

"تمہیں چھوڑ ہی تو نہیں سکتی، اپنے ساتھ لے کر جاؤں گی۔" وہ ہذیانی انداز میں بولتی ہوئی اسے مسلسل گھسیٹ رہی تھی۔ اور وہ گویا اپنی طاقت و قوت کھو بیٹھا تھا۔ رات کی ہولناک تاریکی، پراسرار سرگوشیاں کرتی ہوئی ہوائیں اسے اپنی موت کی آہٹیں ہر سو سنائی دینے لگیں۔

"کائنات! میری جان، میری محبت، مجھ سے بہت بڑی بھول ہوگئی۔ مجھے معاف کر دو۔ میں آئندہ ایسا کوئی کام نہیں کروں گا۔ آج سے دنیا کی ساری عورتیں میری مائیں بہنیں ہیں، میں کسی کی طرف نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھوں گا۔ مجھے چھوڑ دو۔ میں ابھی مرنا نہیں چاہتا۔ یہ دنیا بہت خوبصورت ہے، تم جو کہو گی وہ میں کروں گا۔" وہ رو دینے والے انداز میں اس کی منت و سماجت کر رہا تھا۔

"تم کس قدر سچے قول کے پکے ہو، مجھے معلوم ہے مگر ڈارلنگ! اب وقت گزر گیا اور گزرا وقت لوٹ کر نہیں آتا، تمہیں میرے ساتھ چلنا ہوگا۔"

"نہیں...... نہیں میں مرنا نہیں چاہتا۔ میں مرنا نہیں۔"

کائنات نے موت کے آگے ہتھیار ڈال دیے۔ اس کی آخری ہچکی کے ساتھ ہی اس کے جسم کو ایک زوردار جھٹکا لگا تھا۔ شمشیر خان جو مکمل اسکی گرفت میں تھا اس جھٹکے سے اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا تھا ڈھلوانی سطح پر پھسلتا ہوا اس کا جسم گہری کھائیوں میں گرتا چلا گیا اور اس کی دہشت ناک چیخیں کھائیوں کی گہرائیوں میں گونج کر رہ گئی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی کائنات کا بے روح جسم بھی گرتا جا رہا تھا۔ وہ وفا کی پیکر تھی، دوسرے جہان اپنے محبوب شوہر کو ساتھ لے کر گئی تھی۔

شمشیر خان کا انجام بہت عبرتناک تھا۔ گولی کی زبان میں بات کرنے والے شخص کو دو گز کفن بھی نصیب نہ ہوا تھا۔ پانی کی طرح خون بہانے والے شخص کی آخری آرام گاہ بھی لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل تھی۔ اور ابھی نہ معلوم کتنے عرصے تک اس کی موت کا علم کسی کو نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کے اس خفیہ ٹھکانے سے صرف صمد خان واقف تھا۔ وہاں ایسی کوئی نشانی بھی رہ نہیں گئی تھی جس سے حقیقت کا سراغ لگ جائے۔ وہ آوارہ مزاج تھا ایک عرصہ تو یہ قیاس کیا جائے گا کہ نکل گیا ہوگا کہیں آگے خوبصورتی کی تلاش میں۔

☆☆☆

نئے برس کی نوید لے کر

نئی بہاریں مہک اٹھی ہیں

مجھے خبر ہے مسرتوں کی

محبتوں کی رفاقتوں کی

زمین زرخیز ہو رہی ہے

نئی مسافتوں کا خواب دل میں

مچل رہا ہے

نئی تمنا کی جستجو میں

ہر ایک موسم بدل رہا ہے

کہ جیسے پھر میں

نئی رتوں کے حصار میں ہوں

کسی کے دست شعار میں ہوں

''گاؤں کب چلیں گے؟'' درشا نے خوشی سے سرشار لہجے میں صارم سے دریافت کیا۔ بالوں میں برش کرتے ہوئے ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں نظر آتے اس کے عکس کو بغور دیکھتے ہوئے اس نے گہری نگاہوں سے اس کا جائزہ لیا۔

''میرے پاس ٹائم نہیں ہے۔'' اس کا لہجہ بے تاثر، انداز سپاٹ تھا۔

''زیادہ دن نہیں لگائیں گے۔''

''نہیں ہے وقت میرے پاس ابھی۔ ضد کیوں کرتی ہو بچوں کی طرح؟'' اس نے خاصے جھنک آمیز لہجے میں کہا اور بریف کیس اٹھا کر کمرے سے نکل گیا۔

''میں ضد کر رہی ہوں آپ سے؟ یا آپ مجھے سزا دے رہے ہیں اس رویے کی جو انجانے میں میں نے آپ سے روا رکھا اور جس کی بارہا معافیاں مانگ چکی ہوں اپنی انا و خوداری کو میں نے قربان کر ڈالا اور آپ بدلے میں مجھے کیا دے رہے ہیں؟ بے پروائی، بے نیازی، ذلت و تذلیل، یا پھر خاموشی و نفرت انگیز رویے کی مار؟''

وہ جو پچھلے دو ہفتوں سے اس کے سرد خاموش رویوں کی مار برداشت کر رہی تھی مزید برداشت نہ کر سکی اور پھوٹ پھوٹ کر رہ پڑی۔

شاید، یہ سب ابھی بھی اسی طرح چلتا رہتا کہ اسے گاؤں سے وہ حیات بخش و مسرور انگیز خبر مل گئی تھی کہ اللہ نے معجزہ کر دکھایا تھا اور وہ ہو گیا تھا جو بظاہر ناممکن ترین بات محسوس ہوتی تھی۔

حویلی سے بھی سب نے اس سے بات کی اور دونوں قبیلوں کے ایک ہونے کی مبارکباد کے ساتھ ساتھ یہ انتہائی مسرت انگیز خبر بھی سنائی گئی کہ گلریز خان کے بیٹے سجاد کے لیے سجادیہ کو پسند کر لیا گیا ہے بلکہ بڑوں میں بات بھی طے ہو گئی ہے بس ان کا انتظار ہے کہ جب وہ پہنچیں تب چٹ منگنی و پٹ بیاہ والا کام سرعت سے ہو جائے گا۔

بابا جان نے بھی اس سے بات کی اور پہلی بار ان کے پیار و شفقت کی برسات میں وہ بھیگ گئی۔

اسے اپنا آپ بہت پیارا لگا۔

اپنے بخت پر، خود پر وہ نازاں ہو گئی۔

ماں سے بات کر کے اس کی رگ رگ میں آسودگی و سکون سرایت کرنے لگا اور سجادیہ کو اس نے خوب خوب چھیڑا۔ اس دن کے بعد سے اسے اس درودیوار میں پھیلی خاموشی و تنہائی سے وحشت ہونے لگی وہ صارم کی سرد مہری، بے نیازی کے باوجود وقتاً فوقتاً منت سماجت کرتی رہتی کہ وہ گاؤں چلے۔

''خبردار...... جو تم نے مجھ سے زبان درازی کی کوشش کی تو......''

''میں زبان نہیں چلا رہی، سچ بول رہی ہوں۔'' وہ تیزی سے اس کے آگے راستہ روک کر کھڑی ہو گئی۔

''کیا چاہتی ہو تم؟ کیوں راستہ روک رہی ہو؟''

''میرا دم گھٹتا ہے یہاں پر، تنہائی وحشت برداشت نہیں ہوتی، میں وہاں جانا چاہتی ہوں اپنوں سے ملنا چاہتی ہوں۔''

''اپنے، وہ اپنے جنہوں نے تمہیں کتنے شاندار طریقے سے ''رخصت'' کیا تھا، کس قدر عزت افزائی و احساس تفاخر بخشا تھا تمہیں۔'' وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر تمسخرانہ انداز میں گویا ہوا۔

''بابا جان کس قدر شرمندہ ہیں کتنی معذرت کی تھی انہوں نے فون پر آپ سے بھی۔'' وہ نگاہیں جھکا کر آہستگی سے بولی۔

''ہاں...... میں بھول گیا تھا تم باپ کی حمایت ہی لوگی، ان کی سب خطائیں بخش سکتی ہو، معاف کر سکتی ہو لیکن میرے ساتھ ایسا کوئی جذبہ تمہارے دل میں نہیں ہے، میرے ساتھ تم صرف اور صرف کمپرومائز کر رہی ہو، تقاضے نبھا رہی ہو ورنہ میرے ساتھ نہ کوئی دلی وابستگی ہے تمہاری اور نہ ہی محبت کی کشش۔''

وہ بیڈروم میں چلا آیا بریف کیس سائیڈ میں رکھ کر خشمگیں نگاہوں سے اسے گھور کر گویا ہوا۔

''یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟'' اس کے موڈ کے بدلنے پر وہ حیران ہو کر بولی۔

''مجھے یقین ہے تم آج تک مجھے دل سے قبول نہ کر سکی ہو اور جہاں دل کی خوشنودی و جذبوں میں امنگ نہ ہو تو زندگی ایسی ہی محسوس ہوتی ہے جیسے بغیر چینی کی چائے، بے ذائقہ بدمزہ، پھیکی پھیکی۔'' اس نے یکلخت پینترا بدل کر اسے ہراساں کر دیا تھا۔

کیا تھا وہ شخص؟ پل پل چہرے بدلتا عجیب مزاج کا شخص۔

''یونیورسٹی میں تمہیں مجھ سے یہی شکایت تھی کہ میں زیادہ تر دوشیزاؤں کے جھرمٹ میں رہتا تھا، میرا زیادہ وقت رنگین آنچلوں کی چھاؤں میں گزرتا تھا تو ڈیئر، پہل میری طرف سے نہیں ہوئی تھی، میں ہمیشہ لیڈیز فرسٹ کا شکار رہا ہوں۔ اب تم ہی بتاؤ اگر میں ایسا ویسا ہوتا تو تم تنہائی و وحشت کا شکار ہو سکتی تھیں؟ جو شخص اتنا شریف، باکردار اور نیک ہو کہ بیوی کی رضا کے بغیر اسے حاصل کرنا بھی گناہ سمجھتا ہو تو کسی غیر لڑکی کو کس طرح غلط نظروں سے دیکھ سکتا ہے؟''

''مجھے افسوس ہے...... میں ناحق آپ کی شرافت پر، آپ کے کردار پر شک کرتی رہی، لیکن قصور میرا بھی نہیں تھا۔'' وہ نادم لہجے میں کہہ رہی تھی۔

اچھا...... پھر کس کا تھا؟'' اس کی نگاہوں میں محبت کی روشنی پھیل گئی وہ سینے پر بازو باندھے اسے دلچسپی سے دیکھنے لگا تھا۔

''آپ...... کا......'' بے ساختہ جواب آیا تھا۔

''اوہ......! یہ کیسے کہہ سکتی ہیں آپ؟''

''کل تک میں نے آپ کو دور سے دیکھا تھا اور یہ سوچنے لگی تھی آپ بھی ان بگڑے امیر زادوں کی طرح ہیں جو اپنے اسٹیٹس اور پرسنیلٹی کے زعم میں پھول پھول منڈلانے والے بھنورے ہیں۔''

''اور آج...... تمہاری میرے بارے میں کیا رائے ہے؟''

عجیب پیاس تھی جو اس کے اقرار سے قطرہ قطرہ بجھ رہی تھی، تشنگی گویا تحلیل ہوتی جا رہی تھی اک سلوک سا ہر رگ و پے میں سرایت کر رہا تھا۔

''میں شرمندہ ہوں، اپنی کل کی سوچ پر...... آپ کے قریب آ کر محسوس ہوا آپ وہ نہیں ہیں۔ جو میں سمجھتی تھی، آپ...... آپ میری سوچوں سے بڑھ کر عظیم و معتبر ہیں۔'' اس کی آواز بھرا گئی تھی۔

ندامت

دکھ

خوشی

نہ معلوم کن کن جذبات سے مغلوب ہو کر وہ آنسو بہانے لگی تھی صارم نے آگے بڑھ کر اُسے سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔

''جو میں نے کیا وہ سب تمہیں راہِ راست پر لانے کے لیے ڈرامہ تھا تاکہ تم خود اپنی زبان سے اقرار محبت کرو اور دیکھو ہمارا دعویٰ کس طرح پورا ہوا۔''

''ہوں...... شاید اسی کو کہتے ہیں ہار کے بھی تو بازی مات نہیں۔'' درشا نے شرگیں مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''مات کہاں! اب تو جیت ہی جیت ہے۔''

''پھر ہم گاؤں کب چلیں گے؟''

''گاؤں چلیں گے، گاؤں سے درد و راحت دونوں رشتے ہیں میرے، میں اتنے ماہ تک تم سے بھاگتا رہا، سبریز کی یادوں سے بھاگتا رہا، میں جو کبھی زندگی کو پھولوں کی مانند سمجھتا رہا تھا۔ ان چند ماہ میں معلوم ہوا زندگی صرف پھول ہی نہیں ہے اس میں کانٹے بھی ہیں، شرارے بھی ہیں، فریب ہیں اور...... جدائیاں بھی ہیں جو......'' وہ نہ معلوم کس دکھ کے ساگر میں ڈوبا ہوا کہہ رہا تھا وہ درشا نے بڑے پیار سے اُس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔

''جدائی ہے تو ملن بھی ہے، آپ میری زندگی میں آ گئے، میری قسمت بدل گئی، ہمارا قبیلہ ایک ہو گیا، بچھڑے مل گئے، اب کوئی لبریز خان قتل نہیں ہوگا، کوئی لڑکی جاہلیت و رسم ونی کا شکار نہیں ہوگی۔''

''تھینکس گاڈ! یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں، سبریز کا خون رائیگاں نہیں گیا اور میری محبت بھی...... ہزاروں کٹھنائیوں کے بعد تم...... مجھے مل گئیں......'' وہ اس کے مخروطی ہاتھ کو آنکھوں سے لگاتا طمانیت بھرے لہجے میں بولا۔